العلم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:- سید الطاف علی بریلوی

مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی	" برائے اعظم	12/-	Rs
ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول فورٹ سنڈیمن	" "	12/-	"
ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible]	" "	12/-	"
بیگم یوسف جہاں صاحبہ زبیری	کراچی	10/-	"
محترمہ بیگم آباد احمد خاں صاحبہ لاہور	" "	10/-	"
ڈاکٹر محمد یاسین صاحب زبیری	کراچی	10/-	"
سید معظم حسن صاحب	"	10/-	"
جناب عبدالوحید صاحب سوداگر	"	10/-	"
جناب عبید اللہ صاحب قدسی	"	10/-	"
مولوی مہدی حسن صاحب	"	10/-	"
سید ناصر حسین صاحب	"	10/-	"
سیٹھانہ اینڈ کمپنی	"	10/-	"
جناب جہانگیر صاحب	"	10/-	"
جناب ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب	"	10/-	"
منشی عزیز احمد خاں صاحب راولپنڈی		10/-	"
مظہر الدین صاحب پیسفک شو کمپنی	کراچی	10/-	"
مسٹر شریف الحسن	"	10/-	"
ڈاکٹر عبد الغفور صاحب لاڑکانہ		10/-	"
بیگم " " "		10/-	"
جناب محمد سلطان صاحب شیخ	کراچی	10/-	"
سید عبد الغفور صاحب	"	6/-	"
ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ سکنڈری اسکول جہانگیر روڈ نمبر ۱	کراچی	6/-	"
" " " " ۲	"	6/-	"
جناب طفیل احمد صاحب راولپنڈی		6/-	"
مسٹر محمد ابراہیم باٹا والا	کراچی	6/-	"
حافظ محمد رحیم صاحب دہلوی	"	5/-	"
جناب عبدالکریم صاحب کراچی	"	5/-	"
جناب سید شفیق علی صاحب	"	5/-	"
نعیم الدین صاحب نوبل ٹریڈنگ کمپنی	"	5/-	"
نذیر الدین صاحب معرفت آکسفورڈ کمپنی	"	5/-	"
		5/-	"

ستان ایجوکیـ ... مولوی عبدالحق صاحب منعقد ہوا
ن ترقی اردو میں زیر صدارت جناب بابا...



(۲) سید معین الحق صاحب جنرل

سہ ماہی

العلم

کراچی

جلد ۵ — اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۰ء — شمارہ [illegible]

مضمون	مقالہ نگار	صفحہ
تعلیم میں سیاست (اداریہ)	[illegible]	[illegible]
حسرت موہانی اور ان کے سوانح نگار (۲)	[illegible]	[illegible]
غزل	جناب [illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
غزل	[illegible]	[illegible]
[illegible] پاکستان [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible] ہندوستان ایجوکیشنل [illegible] میں ترقی اردو میں زیر صدارت جناب بابائے [illegible] سر مولوی عبدالحق صاحب منعقد ہوا



دائیں سے بائیں- (۱) بابائے اردو خطاب فرما رہے ہیں (۲) سید معین الحق صاحب جنرل سیکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اپنے مقالہ بعنوان ''اسلامی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی ضرورت'' پر مقالہ پڑھا (۳) سید عین الدین ایڈیٹر قومی زبان (۴) سید الطاف علی

قیمت
سالانہ ۔/۵ روپے
فی پرچہ عمر

فون نمبر
ان- 3577/269
دفتر- 32798

سہ ماہی العلم کراچی

جلد ۵ — اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۵ء — شمارہ ۱

SV02

اداریہ:-

تعلیم میں سیاست

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر سمجھا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

"العلم" کی گزشتہ اشاعت (جولائی تا ستمبر ۱۹۸۰ء) میں ہم نے کانفرنس اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ (ادارۂ تحقیقات علمی) کے اغراض و مقاصد، لائحہ عمل اور اس وقت تک کی روئداد کارگزاری پر اپنا اداریہ سپرد قلم کیا تھا۔ اکیڈمی کے ماہانہ جلسوں اور اُن میں بلند پایہ علمی و تحقیقی مقالات کے پڑھے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ ستمبر ۱۹۸۰ء تک کے تین جلسوں کا حال ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ چوتھا جلسہ ۱۲ را کتوبر کو ۵ بجے شام پرنسپل حسن عادل ایم۔اے کی دعوتِ عصرانہ پر جناح کالج ناظم آباد کراچی میں زیرِ صدارت مولوی سید ظفر حسین واسطی صاحب ایڈوکیٹ وائس پریسیڈنٹ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہوا۔ اور اس میں جناب خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل محکمۂ آثارِ قدیمہ نے "برِ صغیر ہند و پاکستان کے مسلم حکمرانوں کے سکوں پر ایک نظر" کے عنوان پر فاضلانہ مقالہ پڑھا۔ جلسہ نہایت پُر رونق دلچسپ اور مفید تھا۔

پانچواں جلسہ ۲۶ نومبر ۱۹۸۰ء کو پرنسپل قیصر حسین خان بختیاری کی صدارت میں انہیں کی دعوتِ عصرانہ پر گورنمنٹ سنٹرل ٹیچرس ٹریننگ کالج ناظم آباد میں منعقد ہوا اور اس میں جناب مولوی امتیاز محمد خان سابق ڈائرکٹر نوادرات کراچی نے

"فراعنہ کے زمانہ میں مصری تہذیب"

[illegible] ایک عالمانہ تقریر فرمائی یہ جلسہ بھی شہر میں بسوں کے اسٹرائک کے باوجود بہ اعتبار خوبی انتظام اور تعداد حاضرین کافی کامیاب رہا۔

چھٹا جلسہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ۴ بجے شام بمقام انجمن ترقی اُردو سید معین الدین رضوی ایڈیٹر قومی زبان و معتمد انجمن مذکور کی پُرتکلف اور شاندار دعوتِ چائے پر زیر صدارت بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب منعقد پذیر ہوا اور اُس میں جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے ایک نہایت ہی محققانہ مقالہ بعنوان

"مسلمانوں کی تاریخ از سرِ نو لکھے جانے کی ضرورت"

پڑھا۔ اس جلسہ میں شرکاء کی تعداد پچھلے سب جلسوں سے زیادہ تھی۔ اسی طرح انجمن کے کتب خانہ خاص کے خوشنما ہال میں جو علمی ماحول پیدا ہوا وہ لاجواب تھا۔

خالص علمی جلسوں کی مندرجۂ بالا اجمالی کیفیت بہ ہمہ وجوہ دل خوش کن اور روح پرور ہے لیکن اُن کے پس منظر کی سیاست بھی ملاحظہ ہو۔ جناح کالج کے پرنسپل مسٹر حسن عادل اور اُس کے بانی و سکریٹری مسٹر ریاض الدین احمد اکبرآبادی کے درمیان شدید اختلافات ہیں، لہٰذا حسن عادل صاحب کے زیرِ انتظام ہمارا جناح کالج میں جلسہ کرنا ریاض الدین احمد صاحب کی ناگواری کا باعث ہوا۔ بہ تکلف و بہ تکدر وہ اُس میں شریک ہوئے اور اُنہوں نے ہمارے متعلق فتویٰ صادر کر دیا کہ اب ہم اُن کے دوست نہیں رہے بلکہ حسن عادل صاحب کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔

اسی طرح انجمن ترقی اُردو کے اربابِ اختیار اور اُردو کالج کے پرنسپل میجر آفتاب حسن صاحب کے درمیان نہایت مخالف دہ قسم کی کشمکش چل رہی ہے۔ لہٰذا انجمن کے کارکن خصوصی مسٹر معین الدین رضوی کی جانب سے ہمارے جلسہ کی دعوت کا ہونا اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہو گیا کہ ہم میجر آفتاب حسن صاحب کے مخالف گروپ میں شامل ہو گئے ہیں بلکہ مقالہ نگار ڈاکٹر سید معین الحق صاحب بھی سرگروہ مخالفین قرار دیے گئے

دوستوں نے جلسہ کا مکمل بائیکاٹ کیا اور اُن کی پارٹی کے ہمارے بعض نہایت ہی عزیز دوستوں نے مجلس میں جا کر [illegible]
کی ہم سے سخت شکایت کی۔ اور اُدھر اپنی جگہ ہمارا یہ حال کہ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پَر اتنا جانتے ہیں کل وہ نکلا تھا کہ ہم پہونچے

۳۱ر دسمبر کو کراچی یونیورسٹی سینیٹ کے سالانہ جلسہ کا غلغلہ بلند ہوا۔ جلسہ سے قبل ۵ ہر تاریخ کو جناب الحاج محمد ہاشم گزدر صاحب سابق ڈپٹی اسپیکر پاک پارلیمنٹ و ممبر سینیٹ کی کوٹھی پر گیارہ مقامی کالجوں کے نمائندگان کا ایک جلسہ شوریٰ ہوا جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ جناح کالج و اردو کالج کے پرنسپل صاحبان اور ان کالجوں کو قائم کرنے والی جماعتوں کے درمیان اختلافات ختم کرنے کے لیے کراچی یونیورسٹی "اسٹے ٹیوشن" کی دفعات ۲۶ (۳) و (۴) کے اس سقم و ابہام کو دور کرا دیا جائے جو مذکورہ اختلافات کا باعث ہیں۔ چنانچہ بعد مشورہ گزدر صاحب نے ترمیم قانون کی ایک تجویز یونیورسٹی کو [illegible]

اس وقت کراچی یونیورسٹی سے الحاق یافتہ سرکاری و پرائیویٹ کالجوں کی تعداد سترہ ہے۔ از روئے قانون ہر ایک کالج کی ایک بالکلیہ با اختیار "گورننگ باڈی" ہے جس کے ارکان کی تعداد کم از کم گیارہ اور زیادہ سے زیادہ تیرہ مقرر ہے۔ اگر تعداد گیارہ ہو جو عام طور پر ہے تو اس میں دو نمائندے یونیورسٹی کے، ایک پرنسپل کالج، دو ٹیچنگ اسٹاف اور چھ نمائندے اُس جماعت کے ہیں جس نے کالج کو قائم کیا ہے۔ اپنے اپنے مفادات کے اعتبار سے اس طرح پانچ اور چھ کی تعداد کے دو گروپ قائم کیے گئے ہیں۔ آخر الذکر گروپ کی بظاہر ایک کی اکثریت برائے نام ہے جس کو بہ آسانی توڑا جا سکتا ہے اور جناح کالج و اردو کالج میں اس کو توڑ بھی دیا گیا۔ لہٰذا گزدر صاحب نے ترمیم میں ایک سفارش یہ کی کہ اس میں مناسب اضافہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ کالجوں کو قائم کرنے والی جماعتوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے نمائندوں میں حسب ضرورت تبدیلی کر سکیں۔ قانون میں اس بات تک کی [illegible] ثالث حالت یوں تک کہ گورننگ باڈی کی تین سال مدت کو پورا کیا جائے [illegible]

یعنی ملحقہ جامعوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار ہے یا نہیں ؟

پورے قانون کی منشا اور اُس پر عمل درآمد کی تعبیر یہ ہے کہ کالجوں کو قائم کرنے والی جماعتیں ہزار ہا مشکلات اور مصائب و آلام سے گزر کر ادارہ کو جب "چالو" کردیں تو صرف ایک دفعہ اپنے چند نمائندے بھیج دیں اور پھر ہمیشہ کے لئے اُس سے اور کالج سے دست بردار ہو جائیں۔

اس صورت حال کا نتیجہ ہے کہ (۱) تمام گورنمنٹ کالجوں نے اس وقت تک اپنی اپنی "گورننگ باڈی" کو سرے سے بنایا ہی نہیں۔

(۲) کراچی کے دو پرائیویٹ کالجوں نے الحاق سے پہلے یہ شرط منظور کرائی کہ یونیورسٹی اپنے دو نمائندے اُن کے اپنے صوبہ کے لوگوں ہی میں سے نامزد کرے گی۔

(۳) ایک اور بڑے کالج کے بانی نے گورننگ باڈی تو بنائی لیکن تین سال ہونے کو آئے اُس کا کوئی جلسہ نہ ہونے دیا ــــ غرض عجب طوائف الملوکی پھیلی ہوئی ہے اور عملاً "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" کا قانون چل رہا ہے۔

اس جارحانہ قانون کی لاقانونیت اور جناح کالج وأردو کالج کی تکلیف دہ صورت حالات سے متاثر ہوکر گورنر صاحب نے ۱۸ دسمبر کو جلسۂ سینیٹ میں جب ترمیم قانون پیش کی تو اُس کا پہلا انعام اُن کو یہ ملا کہ اُسی روز صبح کی نشست میں سنڈیکیٹ کی رکنیت کے انتخاب میں اُن کو شکست دی گئی اور سہ پہر کو ترمیم پر غور ہوا تو اُس کے عدم جواز میں ایسی ایسی فتنا فنی موشگافیاں کی گئیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

اس ہنگامہ خیز جلسہ میں راقم کی سمجھ میں یہ بالکل نہیں آ رہا تھا کہ قومی و تعلیمی اداروں کی فلاح و بہبود کے متعلق ایک اصولی مسئلہ پر اس قدر جوش و خروش کیوں ہے ؟ اور سرے سے ترمیم کو ہی پیش ہونے دینے میں بااقتدار گروپ کی جانب سے اس قدر رکاوٹ کس لئے ڈالی جا رہی ہے ؟ چنانچہ اپنی تقریر میں راقم نے اکثریت پارٹی کو اُس کی اسی کمزوری کی جانب توجہ دلائی اور صدر محترم عالی جناب پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی سے درخواست کی کہ وہ مداخلت کرکے اس مختلف فیہ مسئلہ کو ذاتی حیثیت سے طے فرما دیں۔

اب لطیفہ ملاحظہ ہو کہ مسٹر حسن عادل پرنسپل جناح کالج جن کی دوستی و موافقت کا الزام ہم پر لگایا گیا تھا یونیورسٹی سینیٹ کے جلسہ کے بعد سے ہم سے اس قدر دور ہو گئے کہ ہم اُن کی صورت تک دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔

دوست اغیار ہو گئے اللہ ؛ کیا زمانے کا انقلاب ہوا

یادش بخیر ۶، ۷ و ۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو ہمارے انجمن والے جلسہ کے مقابلہ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کی ہسٹاریکل سوسائٹی کا چھٹا سالانہ اجلاس تھا۔ کراچی یونیورسٹی مجلس استقبالیہ تھی۔ بہت شاندار اور کامیاب جلسے ہوئے لیکن تاریخ کے ان جلسوں میں بھی سیاست کی کارفرمائیاں قدم قدم پر نظر آ رہی تھیں جس کی وجہ سے ہسٹاریکل سوسائٹی اور استقبالیہ کمیٹی کے کارکنوں کا ان تین دنوں میں خون پانی ایک ہو گیا۔ بیچ لگژری ہوٹل تین تین سو مہمانوں کا استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے ڈنر تھا۔ میزیں خالی پڑی رہیں لیکن ہسٹاریکل سوسائٹی کے ممبروں کو دعوت نامے نہ بھیجے گئے۔ اسی طرح سوسائٹی کے زیر انتظام کھانے پینے کی جو صحبتیں ہوئیں اُن میں استقبالیہ کمیٹی والے بس خال خال ہی نظر آ رہے تھے۔

سطور بالا میں مشتے نمونہ از خروارے چند ہفتوں کی صرف چند صحبتوں کا ہم نے ذکر کیا جو ہمارے ملک کے اونچے سے اونچے ملی، تعلیمی اور ثقافتی اداروں سے متعلق تھیں جن کو ہمارے ملک کی انتہائی نامور شخصیتیں چلا رہی ہیں الا ماشاء اللہ! ہمارے کثیر التعداد اسکول بھی سیاست سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ تعلیم و تعلم سے زیادہ منتظمین اور اساتذہ جنگ زرگری میں مبتلا ہیں اور اسی میں ارجیت کو حاصل زندگی تصور کیے ہوئے ہیں۔

سیاسی توڑ جوڑ۔ دھڑے بندی۔ گروپ بازی اور دوام اقتدار کے لئے دستوری جکڑ بندیاں اور قانونی تحفظات ہمارے نظام تعلیمی کی ایسی لعنتیں ہیں جنہوں نے تعمیری کام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رکھا ہے۔

مثال کے طور پر آنریبل جسٹس اے آر کارنیلیس نے جلسہ سینیٹ میں یونیورسٹی کی رپورٹ کارگذاری پر تبصرہ کرتے ہوئے

حضور والا ارشاد فرمایا کہ ان رپورٹوں سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یونیورسٹی میں علمی و سائنٹفک ریسرچ کا کس قدر کام ہوا اور ادارہ کو جلد از جلد آفاقی بنانے کے لئے کیا اقدامات کئے گئے۔ کثیر مصارف کے مقابلہ میں تعداد طلبہ بڑھانے کی کیا وجہ ہوئی اور جبکہ ہائی اسکول تک ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن بھی اُردو میں دینے کے لئے کس قسم کی سعی کی گئی۔

علمی ریسرچ کے لئے سب سے پہلا کام فاضل ترین اساتذہ کا حصول۔ اُن کے لئے اطمینان و سکون کی فضا پیدا کرنا نیز اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ کی فراہمی ہے لیکن جب یونیورسٹی لائبریری میں صرف چار قلمی کتابیں ہوں تو حقیقت تحقیق علمی کسی مزید تبصرہ کی محتاج نہیں رہتی۔

علمی و تعلیمی اعتبار سے ہمارے ملک کا دُنیا کے انتہا درجہ پسماندہ ملکوں میں شمار ہے اور اس پسماندگی کو ہمارے چھوٹے اور بڑے تعلیمی ادارے ہی دور کرسکتے ہیں۔ جن کی خدمت ہر فرد ملت کا فرض ہے۔ تعمیری خدمت کے دائرہ کو تنگ کرنا یا تعمیری کام کرنے والوں کی تعداد کو محدود و مخصوص کرنا بہت بڑا قومی جرم ہے۔

کراچی یونیورسٹی اُس کے متعلقہ اداروں نیز دوسری علمی جماعتوں کے ارباب اختیار سے ہماری مخلصانہ اپیل ہے کہ وہ نفرت کے بجائے محبت اور تخریب کے بجائے تعمیر کو اپنا شعار بنائیں اور اپنے عہدہ کے شایانِ شان ہر شخص کی صرف اچھی صلاحیتوں سے واسطہ رکھیں اور انہیں کو بروئے کار لانے کی ہر ممکن جدوجہد فرمائیں۔ ع

حافظ وظیفۂ تو دُعا کردن است و بس

سید الطاف علی بریلوی

علامہ اقبالؒ اور ان کے سوانح نگار

(۲) [illegible]

مسلمانانِ برصغیر ہند (بھارت و پاکستان) کے جس نشاۃ ثانیہ کے دور (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء) میں جو اہم شخصیتیں جلوہ گر ہوئیں ان میں علامہ اقبال مرحوم کا بھی ایک خاص اور منفرد درجہ اور مقام ہے۔

اقبال نے فلسفہ و الٰہیات، اخلاقیات، حقائق و معارف اور ادبیات عالیہ کو اس طرح نظم کے سانچے میں ڈھالا کہ پڑھنے والے پر وجد و وجدان بیک وقت طاری ہو جاتے ہیں۔

مگر واہب العطایا نے بجز ایک ذات اقدس صلعم (بابی انت و امی) کے کسی کو ہمہ جہت کبریٰ کا حامل نہیں بنایا لیکن بعض ہستیوں کو بھی ایسی وہبیت سے سرفراز کیا جن کے [illegible] اقبال بھی ان ہی میں سے ایک تھے [illegible] سعدی [illegible] اقبال کا [illegible]

[illegible] کے سوانح [illegible] نے اپنے [illegible]

مگر یہ سوانح نگار ان مقامات کو زیادہ وضاحت سے [illegible] کہیں کہیں بعض ایسے واقعے بھی ہیں جن کی تردید [illegible] ہی کلام و خطوط سے ہوتی ہے۔

اقبال کے عقیدت مندوں اور مداحوں کا کمال [illegible] ہے کہ خطوط سے وہ عبارتیں ہی خارج کر دی گئیں [illegible] خیال میں کوئی اعتراضی یا تنقیصی پہلو نکلتا ہے حالانکہ [illegible] کا حقیقی آئینہ خطوط ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا کمال [illegible] اقبال کے بجز ایک مدحیہ کلام کے باقی کو ان کے مجموعہ [illegible] خارج کیا گیا ہے۔ پھر مصنفین سوانح نے اقبال کی [illegible] کرنے کے لئے عام حلقوں سے بھی رسائی نہیں کی [illegible] کے کارناموں کی ستائش کا اقبال کے ذہن پر [illegible] علاوہ ازیں بعض نے تو مبالغوں کی انتہا کر دی [illegible] میں انتہائی زور بیان دکھایا ہے [illegible] ظہیر الدین جامی نے اقبال کی [illegible] زور [illegible] دکھایا ہے [illegible]

[illegible]

ہیجان اور بلاخیز طوفان پیدا کر دینے کیلئے کافی تھے۔ ایسے ہی تاریک لمحات اور پیچیدہ حالات میں زندگی اپنی راہ آپ متعین کر لیتی ہے اور ایک شفاف اور مصفےٰ قلب شاعر کو آدم گرانہ الہام کے قبول کرنے کے لئے تیار کر دیتی ہے اقبال نے دیکھا کہ مشرق ایک بے روح تصویر بنا ہوا زندگی کے ہرگونہ ذوق اور تڑپ سے محروم صرف اٹلس کی زینت بن کر رہ گیا ہے . . . .

.. پیران کہن حیا سے بیگانہ . . . .
نوجوان عورتوں کی طرح مشغول تن کسی کے دل میں بھی آرزو کا گزر نہیں۔ اپنی ماؤں کے پیٹ سے ہی گویا مردہ پیدا ہوئے ہیں یہ خاک کا ڈھیر ایک قوم تھی شرار سے خالی اس کا دن اس کی رات سے زیادہ تاریک . . . .

. . . . ایک اجنبی غاصب فرمانروا کی قوت و شوکت اس کے لئے معبود بنی ہوئی اور اپنے دین و ایمان کے نقصان میں اس کو اپنا فائدہ دکھائی دیتا۔ صرف آج پر قانع اور مستقبل کے ہر خیال سے اس کا دل خالی۔ پندو عظمت کے دفتر اس کی بغل میں دبے ہوئے لیکن گفتار کے بے عمل کا مجسم نمونہ کعبہ کی اینٹوں سے دیر کی تعمیر بھی اغیار کے ساتھ پیمان وفا اس کا طرۂ امتیاز حق سے بیگانگی نے اس کو موت کی نیند سلا دیا تھا لیکن اس کو اپنی موت کا احساس تک نہ تھا۔ مورخ ملت اپنی دلنشین تقریروں سے اغیار کے منشا و مراد کے مطابق تجدید یا احیائے دین کی فکر میں لگے ہوئے اور مکتب و مدرسہ کا کام صرف اتنا کہ نوجوانوں کا دماغ ان آقاؤں کی مصلحت اور استحکام کی تدابیر سوچا رہے جن کے ہاتھوں قومی وقار اور ملی ناموس کا جنازہ نکل رہا تھا "

پھر شیوخ و صوفیا پر تیر برساتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :—
"اس تشنہ کام انسانیت کے اس بلاخیز اور تاریک وقت میں جبکہ آدمی اپنے مرتبہ اور مقام کے مناسب ایک مستحکم پائیدار اور خوب تر نظام زندگی کے لئے تڑپ رہا ہے اقبال جیسے آدم گر اور پیغام بر شاعر کیلئے ایک خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار کر لینا ناممکن تھا"
خود ساختہ مظاہر کی ان قباؤں اور نمائش کے ان برقعوں میں وہ قرآن کی روح کو دفن پاتا ہے . . . . اور شاید قرآن کے اسی دردناک حشر سے متالم ہو کر رومی نے کہا تھا ؎

درمیاں تنگی دو نگہ زیں عجب
مغز دیں خاہد کہ گویند ش لقب

رومی کی طرح قسمت نے اقبال کو بھی وجد و شعور اور وہ قوت بیانی و سحر کلامی عطا کی تھی کہ

فکری جمود کے اکھاڑوں میں اس نے ہراس وسراسیمگی کی ایک لہر دوڑا دی۔"

مگر اس زمانہ کا بقید زمین جامعی نے تعین نہیں کیا البتہ ایک دوسرے تذکرہ نگار کے بیان سے تعین ہو جاتا ہے۔

"سفر یورپ میں اقبال کو مغرب و مشرق کی ترقی و تنزل۔ احساس و بے حسی۔ بیداری و جمود۔ حاکمی و محکومی کے موازنہ کا موقع مل چکا تھا۔ فلسفہ کے مطالعہ عربی و فارسی علوم کی آگاہی بعض اسلامی ممالک کی سیر اور انگلستان میں حکمائے غرب و شرق کی صحبتوں نے شاعر کی حساس فطرت میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ 1912ء میں جنگ طرابلس الغرب چھڑ گئی مسلمانوں کی بے بسی اور مظلومیت نے اس کے احساسات کو ابھار دیا تھا اس کی قوت فکر نے اسے مشرق اور اسلام کے ان مصائب کے اسباب و علل سے آگاہ کیا اور اس کی عاقبت بین نظر نے ان امراض کا مداوا اور اس پستی و زبوں حالی سے نجات پانے کا راستہ بتایا۔"

(مشہیرِ اقبال)

اس طرح گویا [illegible]ء سے اقبال کا زمانہ شروع ہوتا ہے ان کے کلام کے متعلق مرتب "اقبال نامہ" لکھتے ہیں کہ۔

"میری تجویز و درخواست پر مولوی محمد یسین صاحب عباسی کیفی چریاکوٹی نے جن کے علم و فضل کا احترام خود علامہ کو تھا "تلمیحات اقبال" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی ہے اس کتاب کی اشاعت سے قرآن کریم احادیث نبوی اور تاریخ و ادب اسلامی سے متعلق کلام اقبال میں جو حوالجات اور اشارات پائے جاتے ہیں ان کی تشریح و توضیح سے اقبالیات کی ہر دلعزیز گلکاری میں معقول اضافہ ہوگا۔ اقبال کے کلام کی ایسے طرز پر اشاعت کی ضرورت ہے کہ جس سے اسے عام پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچایا جا سکے"

"سیاسی کارنامہ" کے مصنف بھی سیرت اقبال کے تعارف میں رقم طراز ہیں کہ

"اقبال کو سمجھنا اگر مشکل ہے تو سمجھانا اس سے زیادہ مشکل"

اب پہلے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان پیران کہن میں یہ معرفت نفس نہ تھی کہ وہ اس درجہ کو حاصل کرتے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (اقبال)

یا ان میں کوئی یہ کہہ سکتا کہ ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

لیکن واقعات کی رفتار یہ تھی کہ ان پیران کہن نے ایک تحریک مسلسل پیدا کر دی تھی جو اقبال کی ولادت [illegible]ء سے بھی قبل شروع ہو گئی تھی اور جو روز بروز قوی ہوتی رہی تا آنکہ اقبال کی "آدم گرانہ شاعری" کے آغاز تک اس تحریک کی بدولت مسلمانان ہند نے بہت سے مراحل طے کر لئے ان کے تعلیمی مذہبی و سیاسی اور تمدنی اقدار میں ایک ترقی رونما تھی اور اتحاد

ہمدردی اور قومی خدمت و جذبہ کی لہریں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ انھوں نے اس ملک میں اپنی جداگانہ ہستی اور قومیت کو منوالیا تھا اور عالمگیر اسلامی برادری اور اخوت کی نظری و عملی یاد تازہ کرادی تھی۔ ترکی افغانستان ایران اور عرب سے بھی تعلقات استوار ہو رہے تھے۔

علمی اقدار میں بھی سرسید سید امیر علی اور مولوی چراغ علی وغیرہ کی تصانیف نے مغربی دُنیا میں اسلام کو صحیح طور پر روشناس کرادیا تھا۔ خواجہ کمال الدین اور ان کی جماعت نے تو مغرب میں اسلامی تبلیغ کا مرکز قائم کیا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ ان دونسلوں کے قائد اور رہبر زمانہ کو شانِ ربانی سمجھکر اور اس کے مقتضیات کو ملحوظ رکھ کر قدم بڑھاتے تھے اور ان کی کامیابی کا یہی راز تھا وہ ممولے کو شہباز سے نہیں لڑاتے تھے بلکہ شہباز سے شہباز کا مقابلہ کرتے تھے۔

سرسید تحریک کے اصلاحی اقدار میں نظم کی اصلاح اور اس سے قوم میں ایک جذبہ اور لہر پیدا کرانا بہت تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس سے سب سے پہلے ۱۸۷۴ء میں مولانا حالی متاثر ہوئے اور انہوں نے قوم کو وہ زندہ جاوید نظم ہدیہ کی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا کی تمام قومی نظموں میں جوش و جذبہ وافر کے ساتھ واقعیت اور حقیقت کا کمال ہے پھر زبان سادہ اور سلیس کہ دیہات اور شہروں کے رہنے والے دونوں اس سے بہرہ اندوز ہوں وہ تفسیر و تشریح کا محتاج نہیں اس صدی کے اوائل میں جو اندوہناک واقعات پیش آئے اور قوم میں جو تحریک پیدا ہوئی اس میں بھی اسی جاریہ تحریک کے علمبردار نوجوان مولانا ظفر علی خاں اور علی برادران قائد و سپہ سالار تھے۔

علامہ اقبال نے بھی اس زمانہ میں نظمیں ضرور لکھیں جو نہایت پُرسوز ہیں لیکن وہ اس طوفان مصائب کے زمانہ کو جو کچھ سمجھتے تھے وہ ان کے اس خط میں پڑھنا مناسب ہے جو ۱۹۱۳ء میں مولانا شوکت علی خاں سکریٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی مخصوص دعوت کے جواب میں لکھا تھا۔

> "بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے
> اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانہ میں
> گھر کی چاردیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے
> دُنیا اور اہل دُنیا کے ساتھ تھوڑا بہت
> تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ
> روٹی کمانے کی مجبوری ہے"۔ (اقبالنامہ ص ۲۵۵)

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کے ختم ہوتے ہی خلافت کا مسئلہ شروع ہو گیا اس زمانہ میں علامہ کی نسبت ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ:-

> علامہ اقبال جنگ عظیم کے بعد سے ۱۹۲۶ء
> تک بھی ملکی سیاسیات سے الگ تھلگ
> اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پیغام مشرق" کی
> تکمیل میں لگے رہے لیکن اس زمانہ میں بھی
> وہ لاہور میں بیٹھے بیٹھے کبھی کسی جاں نثار
> قوم پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے
> اور کبھی اس کے غم کی بھی لے لیتے تھے چنانچہ
> مولانا محمد علی کی بیتول جیل میں نظربندی
> پر انہوں نے یہ اشعار کہے:-

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

مولانا محمد علی کی سرکردگی میں جب وفدِ خلافت یورپ گیا تو انہوں نے دریوزہ خلافت کے نام سے حسب ذیل قطعہ لکھا:-

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

لیکن ان قطعات کی جو شانِ نزول ہے وہ صحیح طور پر بیان نہیں کی گئی واقعہ یہ تھا کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۹ء کو علامہ نے مولوی سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ:

"دوسرے صفحہ پر چند اشعار معارف کیلئے لکھتا ہوں۔ مدت سے میرے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی۔ گزشتہ رات زکام کی وجہ سے سو نہ سکا یہ تاثر ایک چھوٹی سی تضمین کی صورت میں منتقل ہو گیا دردِ سر نے زیادہ شعر نہ کہنے دیئے اور نہ طبیعت پر زیادہ زور دے سکا معلوم نہیں آپ کا اس بارہ میں کیا خیال ہے واقعات صاف اور نمایاں ہیں مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن کے شیعوں کے اشارے پر ناچتے چلے جاتے ہیں افسوس مفصل عرض نہیں کر سکتا کہ زمانہ نازک ہے بہرحال اگر یہ اشعار آپ کو پسند ہوں یا رسالہ معارف کے لئے آپ انہیں موزوں تصور نہ فرمائیں تو انہیں بھیج دیجئے۔ اس خط کو پرائیویٹ تصور فرمائیے (قطعہ مذکرہ بالا لکھنے کے بعد) عنوان ان اشعار کا آپ خود تجویز کر لیں اصل فارسی شعر میں "دیگراں" کی جگہ "ناکساں" ہے میں نے یہ لفظی تغیر ارادۃً کیا ہے"

قطعہ میں جو پہلا شعر منقول ہے خط میں اس کی جگہ حسب ذیل شعر ہے:-

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقت خویش آزمائی

اس خط میں بھی تحریف یا ترمیم معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان صفحات کو بدلا گیا ہے حتیٰ کہ کاغذ کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے اور صاف طور پہ چسپاں ہیں۔ بہرحال وفد خلافت یورپ گیا اور سید سلیمان بھی شریک وفد ہوئے اب ان کی مراجعت پر علامہ نے

اور اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لکھا کہ:-

"مراجعت مع الخیر مبارک ہو۔ آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکرگذاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا"

اب ان دونوں خطوں کو پھر دیکھیے کہ ایک سال کے اندر کس طرح خیالات بدل گئے تحسین کے پھول برسانے والا قطعہ بھی تشریح طلب ہے سوانح نگار نے تولاہور میں بیٹھے ہوئے لکھا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس امرت سر میں ہو رہا تھا اس کی روداد میں ہے کہ جب علی برادران بیتول جیل سے براہ راست امرت سر پہنچے اور اجلاس میں آئے تو صاحب صدر کی خیر مقدمی تقریر کے بعد ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ

جناب صدر و حضرات! علی برادران کے اس جلسہ میں تشریف لانے پر جو قبلہ صاحب نے ارشاد فرمایا اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں یہ دونوں بھائی قوم کے عزیز محبوب ہیں نہ صرف ان خدمات کے عوض جو انہوں نے قلمی زبانی یا کسی اور طریقہ سے انجام دی ہیں بلکہ میرے خیال ناقص میں ایک بہت بڑی خدمت کی ہے جس نے انہیں پہلے سے زیادہ مخدوم بنا دیا ہے اس کا ذکر اس وقت ضروری ہے وہ خدمت ان کی دینی استقامت ہے۔ علی برادران کی نظربندی کا زمانہ اور انکی دینی استقامت بمنزلہ ایک چٹان کے ہے جس پر مسلمانوں کی سیرت کا آئندہ محل تیار ہوگا۔

صاحبان! یہ یاد رکھیے کہ اگر اس قوم و ملک میں علی برادران ایسے قابل اور سچے فرزندان اسلام ایک درجن ہی پیدا ہوجائیں تو قوم کی سوشل اور پولیٹیکل اور دیگر حالتوں کی اصلاح کے لیئے کافی ہوں گے کل مجھے معلوم ہوا کہ ان کا تار آیا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ کل صبح امرت سر پہنچیں گے اس موقعہ پر دو تین اشعار میرے خیال میں آئے اور یہ قدرتی بات ہے کہ جو محبت اور اخلاص ان سے مجھے ہے ان کا کسی قدر اظہار ان اشعار میں کیا گیا ہے چنانچہ حافظ کے مندرجہ ذیل شعر پر دو تین شعر موزوں کئے ہیں جو عرض کرتا ہوں ؎

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند"

(رپورٹ ۱۹۱۹ء)

تین خصوصیات ہیں جو نقل کئے گئے ہیں۔

اقبال فکر معیشت سے آزاد نہ تھے ان پر عیالداری کا بوجھ تھا بیک وقت تین بیویاں حبالہ نکاح میں تھیں پیسری سے کچھ نفرت ہی تھی اس لئے نہ علی گڑھ کی پیشکش کی اور نہ عثمانیہ (دکن) کی اور لاہور یونیورسٹی کی پروفیسری بھی مستعفی ہو گئے البتہ امتحانات اور اعزازی لکچروں سے روشناس نہ تھا مگر وہ کوئی مستقل اور معتدبہ آمدنی نہ تھی ان کی پریکٹس کی حالت بھی اچھی نہ تھی سوانح نگار کا بیان ہے کہ

> بیرسٹری کے بہترین زمانہ میں بھی ان کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپیہ سے متجاوز نہیں ہوئی" (آثار اقبال)

سر صاحب کمی کی وجہ لکھتے ہیں کہ :-

> ظاہر ہے کہ یہ آمدنی اقبال کے شایان شان نہ تھی ان کے سامنے معمولی وکلا اس سے زیادہ کما لیتے تھے یہ بات نہ تھی کہ اقبال کی مہارت قانونی میں کسی کو شک نہ تھا جج اور بار دونوں کو ان کی قانون دانی کا اعتراف تھا۔ ایک سے زائد مرتبہ لاہور کی ججی کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا لیکن بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ آمدنی کے نقطۂ نظر سے وہ اپنے زمانہ کے کامیاب وکلا میں شمار نہیں کیے جاتے تھے اور ان کی آمدنی بس یوں ہی سی تھی اس کی اصلی وجہ اقبال کی افتادِ طبع تھی پیشہ وکالت میں کامیابی کا راز قانون سے زیادہ جج کے سمجھنے میں مضمر ہے ایک کامیاب وکیل پہلے جج کو رام کرتا اور قانون کو اپنے موقف تعبیر و توجیہ میں کرتا ہے اور اس کے لئے اس کو وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کو عام طور پر ذرا شریفانہ انداز میں دنیا سازی کہا جاتا ہے تملق و چاپلوسی بھی کرنی پڑتی ہے ڈنر اور عصرانے بھی دینے پڑتے ہیں۔ پھر اگر حاکم حاکم وقت بھی ہو حاکم قوم کا فرد بھی ہو تو نوبت تملق و چاپلوسی طور نر اور عصرانوں سے گزر کر محفل اکل و شرب نائٹ کلب اور ناچ گھر تک پہنچ جاتی ہے اقبال کے زمانے میں بھی کامیاب وکالت کی یہی ترکیبیں تھیں لیکن انہیں ان سے کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ نفرت سی تھی"۔ (زندہ رود سیاسی کارنامہ)

اب دیکھیے کہ یہ ایک عام حملہ کامیاب قانون پیشہ طبقہ پر ہے۔ ہندوؤں سے قطع نظر مسلمان طبقہ تھا مثلاً سید امیر علی۔ قائداعظم۔ بدرالدین طیب جی وغیرہ کو بھی جانے دیجئے خود لاہور میں اقبال کے ہمسر اور تقریباً ہمعصر سر عبدالقادر۔ میاں فضل حسین۔ اور سر شفیع بھی نہایت کامیاب قانون پیشہ تھے کیا ان سب نے ان تدابیر کو استعمال کیا تھا جن سے اقبال کو نفرت تھی اور پھر جیمبر پریکٹس میں تو عدالت جانے اور ججوں کی خوشامد بھی نہیں تھی اگر اقبال قانون پر توجہ کرتے تو خود گھر پر صدہا اہل معاملہ مشورہ کرنے آتے اصل یہ ہے کہ ایک شاعر اور فلسفی کا دماغ شعر و فلسفہ سے کب فرصت پاتا ہے کہ وہ قانونی باریکیوں اور موشگافیوں پر توجہ کر سکے اقبال تو حیدرآباد دکن کے ہائیکورٹ کی ججی کے لئے متمنی اور کوشاں تھے (خطوط شاد و اقبال ملاحظہ ہوں) اگر ان کو یہ عہدہ ملتا تو وہ کیوں نہ قبول کرتے

باشبہاں میں قانونی قابلیت بھی لیکن اس کے اظہار کے مواقع کہاں تھے کہ جس کے لئے ان کا نام لیا جاتا۔

علامہ اقبال کی سیاست پر ان کے سیاسی سوانح نگار نے جو زور قلم صرف کیا ہے اس کے متعلق ایک مستقل اور بسیط تنقیدی مقالہ کی ضرورت ہے لیکن ہم اس وقت صرف ایک ہی مسئلہ کو پیش کریں گے جو اقبال کی فکر سیاسی کا شاہکار ہے" یعنی پاکستان کا تصور۔

اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء سے جب کہ قرارداد لاہور منظور ہوئی اس تصور کو علامہ کی فکر سیاسی کے طور پر اتنی مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ پاکستان اور اقبال مرادف الفاظ بن گئے ہیں لیکن جب ہم ۱۹۳۰ء سے پہلے کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو اقبال کا تصور کئی نمبروں کے بعد آتا ہے۔

پاکستان کی سطح دراصل "دو قومی نظریہ" ہے جس کو سب سے پہلے علی گڑھ تحریک کے ممتاز بانی سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۸ء میں اپنے مشہور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں نمایاں کیا تھا اور پھر جب یہ ملک کمپنی کی حکومت سے نکل کر تاج کے زیر حکومت آیا اور دستوری و آئینی اصلاحات اور کونسلوں میں نمائندگی کا سلسلہ شروع ہوا تو اول ہی مرحلہ پر سرسید نے ہندوستان میں پارلیمنٹری طرز حکومت کی جو واحد قوم کے اصول پر ہوتی ہے اپنے دو قومی نظریہ کے ماتحت مخالفت کی اس مخالفت کا خلاصہ قائد ملت شہید کے اس بیان میں دیکھا جائے کہ

"جب ہندوستانی سیاست اپنے ارتقائی دور کی پہلی منزل پر تھی اور ملکی سیاست ایک خود اختیار حکومت کا خیال بھی ذہن میں نہیں

آسکتی تھی سرسید احمد خاں نے اپنی دوربینی کے تحت اسی وقت پرزور الفاظ میں متنبہ کر دیا تھا کہ برطانوی طرز کے پارلیمانی اداروں جن کا مدار ہم نوع قوم اور ملک پر ہے ہندوستان جیسے مختلف الانواع ملک کے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتے حالانکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں برادرانہ تعلقات کے بہت زیادہ حامی تھے لیکن انہوں نے مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے نظریہ کو برقرار رکھا۔ انہوں نے اس خطرہ کو فوراً محسوس کر لیا جو مسلمانوں کو ہندو قومیت میں ضم ہونے سے ہو سکتا اس لئے انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا۔" (تقریر بمقام میرٹھ ۱۸۸۸ء)

بلاشبہ لفظ نیشن کی تعریف جو انگریزی لغت اور اصطلاح میں ہے اس کے مطابق تمام اقوام ہند کو ایک نیشن ہی کہا جا سکتا ہے لیکن سرسید مسلمانوں کو مذہب کے نقطۂ نظر سے جداگانہ قوم سمجھتے اور کہتے تھے جو نیشن کی تعریف اور ہندوؤں کے ادعا کے مخالف تھی۔

سرسید کے بعد اس صدی کے اوائل میں ان کے رفیقوں اور جانشینوں نے اس نظریہ و اصول کو اور زیادہ قوی بنایا تا آنکہ ۱۹۰۶ء میں جب دستوری اصلاحات میں ترقی کے امکانات کا اعلان ہوا تو مولوی سید مہدی علی (محسن الملک) نے جو اس وقت سرسید کی جانشینی کی منزل پر

ی کر رہے تھے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مسلمانوں کی سیاسی
رسیں اور خواہش کو حکومت میں پیش کرنے کے لئے ایک وفد
ب کیا جس نے بمقام شملہ ایک ایڈریس کی صورت میں
سلم قومیت کی تعریف اسی نقطۂ نظر سے کی جس کو تسلیم
یا گیا اسی کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس ہوئی تاکہ
ہ قوم کے سیاسی حقوق کی حفاظت اور طلب کا ایک مستند
ریعہ ہو چنانچہ یہی ایک ذریعہ بعد کے تمام واقعات میں استعمال
ہوتا رہا۔ اور اسی ادارہ کے ذریعہ اور اسی بنیاد پر بعد کے
زمانے میں حکومت اور ہندوؤں کے ساتھ مذاکرات جاری
رہے۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال سے جدید صوبہ میں مسلمانوں
کو پنپنے کا موقع ملا تھا جو ۱۹۱۱ء میں منسوخ کر دی گئی
اس نے مسلم سیاست میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور
اس میں دو مخالف سیاسی جماعتیں بشکل کانگریس اور مسلم لیگ
صاف طور پر متقابل ہو گئیں۔

گزشتہ صدی کے آخری عشرہ سے ہندوؤں نے
انسداد ذبیحہ گاؤ کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا اور فسادات کو
ایک بڑا ذریعہ بنا لیا تھا مگر ۱۸۹۳ء میں ایک باقاعدہ
گؤرکھشنی سبھا بھی قایم ہو گئی تھی چنانچہ باوجود مسلسل مساعی
اتحاد کے خونریز فسادات کا سلسلہ جاری تھا اور روز بروز
ہندو مسلم تعلقات تلخ ہوتے جا رہے تھے۔

یہ حالات تھے کہ جنگ عظیم شروع ہوئی۔ ایم۔ اے
او کالج علی گڑھ کے دو نوجوان خیری برادران جرمنی میں نظربند
تھے جب جنگ ختم ہوئی اور مراسلت کا موقع ملا تو انہوں
نے سر تھیوڈور ماریسن کو جو کالج کے سابق پرنسپل تھے اور

مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت سے واقف تھے اور ترکی کے
معاملات میں نمایاں حصہ لے رہے تھے اپنے خط کے
ذریعہ سے ہندوستانی معاملات پر توجہ دلائی اور تمام
معاملات کا واحد حل تقسیم ملک ہی کو قرار دیا (یہ خط لندن
دہلی کی تیسری اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) چنانچہ سر
تھیوڈور ماریسن نے اپنی کتاب (ہندوستان میں شاہنشاہی
حکومت) میں اس کی نسبت واضح اشارہ کیا ہے۔

ہندوستان میں گاؤکشی بند کرنے کے لئے فسادات
سے مرعوب کرنے کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ روز بروز
ترقی پذیر تھی ساتھ ہی ہندو مسلم سیاسی مفاہمت تحریک خلافت
میں سربرآوردہ کانگریسیوں کی شمولیت کانگریس لیگ کا اشتراک
اور ترک موالات کے ہنگامے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں بدایوں
کے اخبار ذوالقرنین میں گاندھی جی کے نام ایک کھلا خط
شائع ہوا جس میں ذبیحہ گاؤ پر بحث کے بعد تمام سیاسی
و تمدنی عقدوں کا حل تقسیم ہند ہی قرار دے کر ایک مختصر
اسکیم بھی پیش کی گئی تھی پھر یہی اسکیم نظر ثانی کے بعد
۱۹۲۵ء میں جبکہ علی گڑھ میں یونیورسٹی کے پچاس سالہ
جوبلی کے موقع پر عظیم اجتماع تھا اور مسلم لیگ کا سالانہ
اجلاس بھی منعقد ہوا تھا مسلم یونیورسٹی پریس میں طبع ہو کر
بصورت کتاب شائع کی گئی اس اسکیم میں دکھایا گیا تھا کہ

"مخالفت کی بنیاد صرف گاؤکشی ہی نہیں
بلکہ اردو ہندی کا جھگڑا نظام سلطنت
میں ہمارے حقوق کی مزاحمت۔ انتخاب
جداگانہ سے انکار۔ سرکاری ملازمت
وظیفہ وغیرہ بھی ہیں جن کی بنا پر اتحاد کے موقع

ہیں اس لئے یہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد کہ مذہب کو سیاست سے الگ کیا جائے اور جانبین کے معتقدات سے تعرض نہ کیا جائے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایک زبردست کمیشن مساوی التعداد ہندو مسلمانوں کے معتمد علیہ اشخاص کا مقرر کیا جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کرے۔ (۱) ہندوستان کی تقسیم از سرِ نو قومیت کی بنا پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کے لئے بڑے سے بڑا حصہ اس کی آبادی کا الگ کر دیا جائے اور حصہ اس قوم کا حلقۂ اثر قرار دیا جائے۔ مثلاً مسلمانوں کے لئے حسب ذیل تین صوبجات بنائے جا سکتے ہیں:۔

(الف) سرحد و مغربی پنجاب کے دس اضلاع راولپنڈی۔ اٹک۔ جہلم۔ گجرات۔ شاہ پور۔ میانوالی۔ جھنگ۔ مظفرگڑھ۔ ڈیرہ غازی خاں اور ملتان یکجا کر کے ایک صوبہ بنایا جائے۔

(ب) بنگال میں۔ بوگرا۔ رنگپور۔ تاجپور۔ جلپئی گوڑی۔ نریاد۔ فریدپور۔ ڈھاکہ۔ راجشاہی۔ پبنا۔ میمن سنگھ۔ باقر گنج۔ نواکھالی۔ بیڑا چٹگاؤں کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنایا جائے۔

(ج) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے تیسرا صوبہ بنایا جائے۔ یہ بات اصولاً طے کر لی جائے کہ اس تقسیم کے بعد ہر حصۂ ملک کا نظم و نسق اس کی کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لئے کیا جائے۔"

(۲) قلیل التعداد اقوام کی حفاظت و ادائے مراسم مذہبی و حقوق ملازمت وغیرہ کے لئے قواعد مرتب کئے جائیں اور ان کے لئے قومی و سیاسی اہمیت کی بنا پر حسب ضرورت دارالامن قائم کئے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ ایک بااثر قوم ہے لیکن کسی واحد ضلع میں وہ بلحاظ آبادی کے ہنود یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے جو اس کا حلقۂ اثر بنایا جا سکے اس لئے قومی و پولٹیکل اہمیت کی بنا پر ان کے لئے ایک دارالامن قائم کیا جائے لدھیانہ و امرتسر اس کے لئے بہت موزوں ہیں ان مقامات کا نظام حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے۔

سیالکوٹ عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ قرار دیا جائے اور ان کو وہاں وہی حقوق دیئے جائیں جو سکھوں کو امرتسر و لدھیانہ میں حاصل ہوں اسی طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے

مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کیلئے
خاص انتظام کی ضرورت ہوگی۔
(۴) تبادلہ آبادی کے لئے سہولتیں بہم
پہنچائی جائیں تاکہ قلیل التعداد اقوام کے
افراد جو کسی وجہ سے ترک وطن کرکے خود
اپنی قوم کے حلقۂ اثر میں جانا چاہیں وہ بغیر
زیادہ نقصان کے تبدیل سکونت کرسکیں
کمیشن مجوزہ کا فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت
میں ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے
سامنے بطور ملکی مطالبہ کے پیش کیا جائے"

اس زمانہ میں ہندو مسلم لیڈروں کے مابین بھی مفاہمت اور اتحاد کا موضوع زیر بحث تھا اور مذاکرات بھی جاری تھے ان کے سلسلے میں مشہور کانگریسی لیڈر لالہ لاجپت رائے نے ایک اسکیم تیار کی اور اس میں لکھا کہ:۔

"میری اسکیم کے مطابق مسلمانوں کی چار
ریاستیں ہونگی (۱) پٹھان صوبہ یا مشرقی
و مغربی سرحد (۲) مغربی پنجاب (۳) سندھ
(۴) مشرقی بنگال۔ اگر ہندوستان کے اور
کسی حصہ میں بھی مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت
ہو جس سے بہ آسانی ایک صوبہ کی تشکیل
ہو سکے تو ان کو اس کی اجازت دینی چاہیے
لیکن یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ متحدہ ہند
نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہندو انڈیا
اور مسلم انڈیا میں واضح تقسیم ہے۔ یہ اسکیم
تھی یہ وضاحت بھی تھی کہ ہندوستان
سے باہر ہندوؤں کا کوئی دوست نہیں
اور اگر ہندو مسلمان کسی جھگڑے میں دو
پارٹیوں کی طرح مقابل ہوں تو ہندوؤں
کی ایک جماعت ان کی نمائندہ ہو سکتی
ہے اور وہ ہندو مہاسبھا ہے میں سات
کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا لیکن سات
کروڑ ہندی مسلمان اور ان کے ساتھ
افغانستان۔ مرکزی ایشیا، عرب، میسوپوٹیمیا
اور ترکی کی فوجی طاقتوں کا مقابلہ ممکن نہیں"

اس کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پارٹیز کانفرنس میں ایک قرارداد منظور ہوئی جو وفاقی طرز حکومت کی بنا پر تھی۔ اس میں سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دیئے جانے اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ پر زور تھا۔ پنجاب و بنگال مسلم اکثریت کے صوبے تھے وہ خارج از بحث رکھے گئے یہ قرارداد سر محمد شفیع نے پیش کی اور ڈاکٹر اقبال اور متعدد اصحاب نے تائید کی۔ اس کے ساتھ ہی قائداعظم کے چودہ نکات مرتب ہوئے۔

نومبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی یہاں چودھری رحمت علی کی اسکیم پاکستان کے نام سے شائع ہوئی جس کی نسبت قائداعظم نے اپنے ایڈریس ۱۹۴۳ء بمقام دہلی میں فرمایا کہ

"چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا
ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان
سے الگ کیا جائے اور انہوں نے ۱۹۳۳ء
میں لفظ پاکستان گھڑا انہوں نے پنجاب

سے "پ" اور افغانستان سے "الف" لیا (کیونکہ صوبہ سرحد اس وقت تک افغانستان ہی کہا جاتا تھا) کشمیر سے "ک" لیا اور "تان" بلوچستان سے اس طرح لفظ پاکستان بن گیا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرارداد کی بنا پر ڈاکٹر اقبال نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ منعقدہ الہ آباد میں متذکرہ قرارداد کی نسبت کہا کہ:-

میرے نزدیک اس کا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبہ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انہیں اس امر میں خودمختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشوونما کر سکیں اور پھر ان صحیح عناصر سے ایک آہنگ کل کی تخلیق ہو اور مجھے یقین ہے کہ لیگ کا اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پوری تائید کرے گا جو مذکورہ بالا قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں میری آرزو ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خوداختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا ..

سے باہر، کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی لیکن اس نے اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو اس سے ایک ریاست معرض وجود میں آجائے گی جس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

رائٹ آنریبل سرینواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجائے میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشوونما کا موقع ملے اس لئے کہ اس موقع کا حاصل کرنا اس وحدت قومی کے نظام میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ و تسلط ہو

اب ان اقتباسات ہی کو دیکھ کر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اقبال کا تصور نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر حالات نے پیدا کیا جس کی زمین بھی تیار ہو رہی تھی علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء کے بعد باوجودیکہ متعدد مواقع اس سوال کو پیش کرنے اور توجہ دلانے کے تھے خاموشی ہی اختیار کی۔ البتہ ۱۹۳۶ء میں علامہ نے قائد اعظم کے ساتھ اپنے سلسلہ مراسلت میں ایک آزاد مملکت یا چند مملکتوں اور ملک کی دوبارہ تقسیم کے ذریعہ بڑی مسلم اکثریت کے واسطے ایک یا زیادہ مسلم مملکتوں کی ضرورت پر توجہ دلائی لیکن خود قائد اعظم کے اپنے وسیع دستوری مطالعہ سے بنیادی طور پر یہی نظریات تھے۔

درج بالا معروضات و متعلقہ اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت نگاری کا کام ابھی تک ذمہ داری کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے۔ اور جو چیزیں لکھی گئی ہیں اُن کو اگر تاریخی حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جائے یا خود علامہ کی اپنی تحریروں کی روشنی میں جانچا جائے تو آئندہ نسلوں کی نگاہ میں اُن کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے گی۔

ضرورت ہے کہ علامہ اقبال کا ایک مستند تذکرہ (سوانح حیات) صحیح اصول پر لکھا جائے جس میں تصنع۔ رطب و یابس ضعیف روایات اور محیر العقول واقعات سے اجتناب کیا جائے۔

یہ کام دراصل "اقبال اکیڈیمی" کو انجام دینا چاہیئے۔ یہ قابل قدر ادارہ عرصے سے کراچی میں قائم ہے اور ایک فاضل و قابل ڈاکٹر اس کے ڈائرکٹر اور ان کی مدد کو ایک کمیٹی بھی قائم ہے مالی لحاظ سے نہایت ہی مستحکم ہے اور شائد کراچی کا کوئی قومی ادارہ اس سے بہتر کیا مساوی حالت میں بھی نہ ہوگا۔ لیکن ابھی تک بجز علامہ مرحوم کے متعلق جو دو ایک مقالے لکھے گئے ہیں اس کا کوئی کام منظر عام پر نہیں آیا۔ حال میں علامہ کی ایک غیر مکمل یادداشت کسی کتاب کی نسبت اکاڈیمی کو حاصل ہوئی ہے جو اخبارات میں شائع کرائی گئی ہے بلاشبہ اکاڈیمی کا فرض ہے کہ وہ ان کتابوں کو بھی مرتب کرائے جن کی نسبت علامہ کو سخت بے چینی تھی اور غالباً ان کے ورثاء کے پاس ان کتابوں کے متعلق کچھ نہ کچھ مواد بھی ہوگا اُن کو ہر قیمت پر حاصل کیا جائے اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب تو وہ ہے جس کی نسبت علامہ نے وزیر اعظم حیدر آباد دکن کو اپنے خط مورخہ اپریل ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا کہ،

> فقہ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب
> بزبان انگریزی زیر تصنیف ہے جس
> کے لئے میں نے مصر و شام اور عرب سے
> مسالہ جمع کیا ہے جو انشاء اللہ بشرط زندگی
> شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں
> ایک بے نظیر کتاب ہوگی میرا ارادہ ہے کہ
> اس کتاب کو تفصیل مطالب کے اعتبار
> سے ایسا ہی بناؤں جیسا کہ امام سرخسی کی
> مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی ہے"

علامہ اُس وقت عدالت العالیہ کی رکنیت کے اُمیدوار بھی تھے اور فقہ اسلام میں جدید مسائل زندگی پیش آنے کی وجہ سے اس کی شدید ضرورت بھی تھی اور آج پہلے سے زیادہ ہے۔

غالباً اسی کتاب کے متعلق محمد طاہر صاحب فاروقی

مرتب سیرت اقبال نے لکھا ہے کہ

"رحلت سے قبل ایک اور کتاب فلسفہ
قانون اسلامی کا خاکہ آپ کے دماغ میں
تھا بعض حصوں کو لکھوایا بھی تھا لیکن
باقی کتاب اس فیلسوف اعظم کے بے مثل
دماغ میں ہی رہ گئی"

بہر حال جس قدر حصے لکھے گئے تھے اکاڈیمی کا فرض ہے ان کو شائع کرکے اہل علم و فضل کو اس کی تکمیل کی دعوت دے پیسہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں حکومت سوا لاکھ سالانہ گرانٹ دیتی بھی ہے اور مزید بھی مل جاتا ہے۔

دوسری کتاب زمانہ حاضرہ کے افکار کی روشنی میں قرآن مجید کے تفسیری نوٹس ہے۔ مگر کسی سوانح نگار یا مقالہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ علامہ کے خطوط میں اس کا کافی ذکر و حوالہ ہے۔

اس کتاب کے متعلق علامہ نے سر سید راس مسعود مرحوم کو اپنی معاشی مشکلات اور ان کے حل کے متعلق امید کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں
قرآن کریم پر عہد حاضر کی افکار کی روشنی
میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے
میرے زیر غور ہیں لیکن اب تو نہ معلوم
کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب
شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اگر مجھے حیات
مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے
کا سامان میسر آوے تو میں سمجھتا ہوں
کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر پیش
کوئی پیش کش مسلمانان عالم کو نہیں کر
سکتا" ۲۹ اپریل ۳۵ء

پھر ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں تمنا ہے کہ
مرنے سے پہلے قرآن مجید کے متعلق اپنے
افکار قلم بند کر جاؤں جو تھوڑی سی ہمت
اور طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی
خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں
تاکہ قیامت کے دن آپ کے جد امجد حضور
نبی کریم کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر
کے ساتھ نصیب ہو کہ عظیم الشان دین
کی جو حضور نے ہم تک پہونچایا کوئی خدمت
بجا لا سکا" (۲۳ مئی ۱۹۳۵ء)

چنانچہ اسی کتاب کے لئے حضور نواب صاحب بھوپال نے سید راس مسعود کی توجہ دلانے پر پانصد روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر کر دی اور علامہ کو سید راس مسعود نے باضابطہ اطلاع دی (یہ مراسلت سیرت کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے) بہر حال پنشن فوراً جاری ہو گئی۔ مگر ایک سال بعد علامہ نے مولوی سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی ایک خط میں لکھا تھا

"انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب
لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے
اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال سے
کر رکھا ہے"

اس پنشن کے بعد علامہ ۲ سال زندہ رہے درمیان میں

صحت بھی نسبتاً اچھی رہی لہٰذا مزید علامہ نے کچھ نوٹ لکھے ہوں گے یا لکھوائے ہوں گے۔

بہر این لحاظ بھی اکاڈیمی کا فرض اور پہلا کام یہ ہے کہ علامہ کے ان ارادوں کی تکمیل کی کوشش کرے۔

لاہور کی "بزمِ اقبال" بھی بہترین کام کر رہی ہے اور اکاڈیمی کی نسبت سے زیادہ حال میں اس کا مقالہ "اقبال اور ملا" بہت دلچسپ شائع ہوا ہے۔

اقبال اکاڈیمی کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے اصول پر کام کرنا چاہیئے اس کا قیام سیرت النبی صلعم مرتب کرنے کی غرض سے ہوا تھا مولانا شبلی نے پہلی جلد کا ادھورا مسودہ چھوڑا تھا مگر ان کے جانشینوں نے اس کو مکمل کیا اور کئی جلدوں میں یہ تکمیل کی گئی۔

ساتھ ہی دیگر علمی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ اسی طرح اقبال اکاڈیمی کو ہونا چاہیئے۔ اس وقت تو وہ ایک تنگ کمرہ میں جہاں ڈائرکٹر صاحب اور ایک کلرک کی میز ہے محدود ہے اس کا کتب خانہ بھی جو مختصر ہی ہے لیاقت میموریل لائبریری کے ایک کمرہ میں منتقل رہتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس کی توسیع ہو اور قابل کام کرنے والوں کو دعوت دی جائے۔ ان کے معاوضے اور آنریریم مقرر کیے جائیں۔

غزل

لختِ دل کھاتا ہوں اور خونِ جگر پیتا ہوں میں
آہ کے تاروں سے پھر زخمِ جگر سیتا ہوں میں

ہمدمو! کیا پوچھتے ہو حال میرا۔ کیا کہوں
یہ سمجھ لو سانس آتی ہے ابھی جیتا ہوں میں

اکل و شرب زندگی مجھ کو میسر ہیں مگر
یہ نہ سمجھا ہوں کہ کیا کھاتا ہوں کیا پیتا ہوں میں

اس جہاں میں اب کوئی ہمدم وہ دمساز ہے
روتے روتے صبح کر دی اس طرح جیتا ہوں میں

حالِ دل کیونکر کہوں ناگفتنی نادیدنی
زندگی در گور شد لیکن ابھی جیتا ہوں میں

(دل ہاشمی بدایونی)

جلیل الرحمن اعظمی
([illegible])

حسانؓ کی شاعری اور دیوان پر ایک نظر[1]

کہا جاتا ہے کہ شعر و سخن کی صلاحیت انسان میں ابتدائے آفرینش ہی سے پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت آدمؑ سب سے پہلے شاعر تھے۔ ہابیل کو جب قابیل نے مار ڈالا تو حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے ہابیل کی شہادت پر مرثیہ کے مندرجہ ذیل شعر کہے تھے۔

تغیرت البلادُ ومَن علیہا
فوجہ الارض مُغبرٌّ قبیحُ
نوا اسفا علی ہابیل ابنی
قتیل قد تضمنہ الضریحُ

یعنی دنیا اور دنیا والے میرے لیے بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور زمین کی سطح مجھے غبار آلود و قبیح نظر آرہی ہے۔ افسوس میرا بچہ ہابیل شہید ہو کر قبر میں دفن ہو چکا ہے۔

یہ روایت اپنی جگہ صحیح ہو یا غلط، یہ بات بالکل یقینی ہے کہ شاعری ایک فطری چیز ہے، اکتسابی نہیں ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ابتدائی آفرینش ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی رکھتا ہو۔

انسان کے صحیفۂ قلب پر رنج و غم، خوشی و مسرت اور سوز و گداز کے جو جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں اگر کلام موزوں کی شکل میں ڈھال دیا جائے تو اسی کا نام "شاعری" ہے۔ جن لوگوں کی طبیعت فطرۃً موزوں ہوتی ہے وہ اس فن میں بہت جلد ترقی کر جاتے ہیں۔

عربوں نے فطرۃً بہت موزوں طبیعت پائی تھی

---

[1] یہ مقالہ ۳۰ اگست ۱۹۵۵ء کو زیر صدارت ڈاکٹر زبید احمد صاحب اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کے دوسرے جلسۂ عام منعقدہ بردولت کدہ ڈاکٹر عباد الرحمن خان صاحب ۳ سی پیر الٰہی بخش کالونی کراچی میں پڑھا گیا۔

پھر ان کی زبان شاعری کے لئے بہترین صلاحیت رکھتی تھی، اس لئے دنیا کے متمدن ہونے ہی، عربوں کی شاعری اس معیار پر پہونچ گئی جو آج بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی زمانہ جاہلیت میں بھی جو اہمیت شعر کو حاصل تھی کسی دوسری چیز کو نہیں تھی۔ گو اس زمانہ میں تصنیف و تالیف نہ ہونے کی وجہ سے اشعار کا بیشتر حصہ جو اس دور کا قیمتی سرمایہ تھا ضائع ہوگیا اہم اس زمانہ کا کلام جس قدر ہم تک پہونچا ہے وہ بھی اتنا ہے جو کسی ترقی یافتہ قوم نے صدیوں میں بھی جمع نہ کیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ مولف حماسہ ابوتمام کو زمانہ جاہلیت کی چودہ ہزار نظمیں زبانی یاد تھیں، "حماد" کو ہر ایک حرف تہجی کے قافیہ پر ایک ایک ہزار قصیدے یاد تھے۔ "اصمعی" سولہ ہزار نظموں کا حافظ تھا۔ ان روایتوں میں ممکن ہو کچھ مبالغے سے کام لیا گیا ہو مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اہل عرب کے اشعار کا ذخیرہ بہت ہی بڑا تھا، ہم کو زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے جو کچھ تاریخی حالات معلوم ہوئے ہیں ان سب کا دراصل "ماخذ" ان کی شاعری ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "الشعر دیوان العرب"۔

اہل عرب چونکہ بہت ہی سادہ زندگی گذارنے کے عادی تھے اس لئے وہ جو کچھ کہتے تھے اس میں بھی تکلف اور تصنع بالکل نہ ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک اچھا شعر وہی ہوتا تھا جس کو سن کر سامع بول اٹھے "سچ کہا" حضرت حسان کا شعر ہے ؎

وان اصدق بیت انت قائلہ
بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

(دیوان حسان ۳۵)

شعراء عرب اپنے اشعار میں ہمیشہ سچے جذبات نظم کرتے تھے جن میں تصنع اور مبالغہ کو ذرا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ ان کی مدح ہمیشہ سچی ہوا کرتی تھی اور ہجو بھی صداقت کے معیار سے گرنے نہیں پاتی تھی حضرت حسان رضہ کا مندرجہ ذیل شعر جو انہوں نے "آل جفنہ" کی مدح میں کہا تھا علماء ادب کے نزدیک بہترین خیال کیا جاتا ہے "خطیئہ" جو زمانہ جاہلیت کا ایک زبردست شاعر گذرا ہے، اُن کے اس شعر کو سب پر فوقیت دیتا ہے، حضرت حسان رضہ آل جفنہ کی فیاضی اور دریا دلی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یُغشَونَ حتیٰ ما تَھِرُّ کِلَابُھُم
لَا یَسْئلُونَ عن السوادِ المقبل

(دیوان حسان ۲۴)

یعنی ممدوح اس قدر فیاض ہے کہ اس کے یہاں ہمیشہ مہمان آتے رہتے ہیں ان کے کتے جنہیں پر نہیں بھونکتے اور نہ وہ خود کسی آنے والے سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے ؟

شعراء عرب مفاخرت و منافست میں بہت مشہور تھے، اُردو کی بزم شاعری میں میر و سودا کی نوک جھونک، مصحفی و انشا کی گالی گلوج، آتش و ناسخ کی ہا ہا ہو، غالب و ذوق کی چشمک اور انیس و دبیر کی معرکہ آرائی ضرب المثل ہے مگر شعراء عرب اس معاملہ میں ان سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے وہاں ہر قبیلہ و جماعت

کا شاعر اپنے گروہ کے فضائل و محامد کا علمبردار ہوتا تھا لوگوں کی عزت و ناموس اُن کے قبضے میں ہوتی تھی جس کو چاہتے سربلند کر دیتے تھے اور جس کو چاہتے بدنام و رُسوا کر ڈالتے۔ اُن میں شاعری تفننِ طبع کے لئے نہیں بلکہ قومی اور سیاسی ضروریات کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ قبائل کی آبرو اور حکمرانوں کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بڑے بڑے سردار انکے آگے آنکھیں بچھاتے تھے اور زبردست جنگجو بہادر اُن سے ڈرتے تھے۔ جب وہ کسی کی مدح یا ہجو میں شعر کہتے تو وہ بجلی رَو کی طرح خود سارے عرب میں مشہور ہو جاتے۔

مشرکین مکہ کا جب رسول خدا صلعم پر کچھ زور نہ چلا تو انہوں نے اسی حربہ سے کام لیا اور بانیٔ اسلام اور مسلمانوں کی ہجو میں اشعار لکھ کر شائع کرنا شروع کر دیئے۔ اُن کے اشعار مسلمانوں کو جب زیادہ اذیت پہونچنے لگی تو سب نے حضرت علیؓ سے جواب دہی کی درخواست کی۔ اُنہوں نے اپنی آمادگی کا اظہار فرمایا بشرطیکہ آنحضرت صلعم اس کی اجازت دیدیں۔ یہ سُن کر بعض صحابۂ کرام نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا۔ شعرائے مشرکین ہماری ہجویں کہہ کہہ کر شائع کر رہے ہیں۔ اجازت ہو تو علی مرتضیٰ ان کی دریدہ دہنی کا جواب دے دیں۔

رسولِ خدا نے فرمایا "یہ کام علیؓ سے نہ ہو سکے گا" پھر انصار کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کیا جن لوگوں نے اسلام کی اپنے اسلحہ سے مدد کی ہے وہ اپنی زبان سے اسکی مدافعت نہیں کر سکتے؟"

حضرت حسان یہ سُنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور جس طرح کوئی بہادر سپاہی عہد جانبازی کیلئے شمشیر بُراں اپنے سردار کی خدمت میں پیش کرتا ہے انہوں نے اپنی زبان نکال کر آنحضرتؐ کو دکھائی اور بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"رسولِ خدا! میں اس خدمت کے لئے تیار ہوں، خدا کی قسم مجھے بصرائے شام اور صنعائے یمن کے درمیان اُس کلام سے زیادہ کوئی پسند نہ ہوگا جو دُشمنانِ رسالت کے جواب میں ہو۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "تم اُن لوگوں کی ہجو کیسے کروگے جن کے خاندان سے میں خود ہوں؟"

انہوں نے عرض کیا۔ "میں آپ کو ان میں سے اس طرح نکال لوں گا جس طرح آٹے کے خمیر میں سے بال کھینچ جاتا ہے۔"

بالآخر وہ اس خدمت پر مامور ہوئے۔ خدا نے انکو زبان پر ایسی قدرت بخشی تھی جس نے دُشمنانِ اسلام کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ایک جگہ وہ خود فخریہ فرماتے ہیں،

لسانی صارم لا عیب فیہ
و بحری لا تکدرہ الدلاء

(دیوان حسان ص۱۹)

یعنی میری زبان قاطع تلوار کی طرح تیز ہے جس میں کوئی عیب نہیں ہے اور میرے کلام کا سمندر ایسا صاف و شفاف ہے جو ڈول ڈالنے سے گندلا نہیں ہوتا یعنی کسی ناقد کی تنقید اس میں عیب نہیں پیدا کر سکتی۔

حضرت حسانؓ کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے یہ تھا کہ اُن شعرائے مشرکین کا کلام ہی پیش کیا جاتا جن کے جواب میں حضرت حسان کو زبان و قلم سے کام لینا پڑا اور دونوں میں موازنہ کر کے ان کے شاعرانہ کمال کو اجاگر کر

کہا جاتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اُن میں سے کسی کا کلام مطبوعہ دیوان کی شکل میں موجود نہیں۔ تاریخ و سیر کی کتابوں میں جستہ جستہ پایا ضرور جاتا ہے لیکن ایسی معتدبہ مقدار میں نہیں جن پر تنقیدی نظر ڈالی جاسکے۔

دیوانِ حسان گو فخر و حماسہ، ادب و حکمت قصائد و مراثی اور ہجو وغیرہ تمام اصنافِ شاعری پر مشتمل ہے جن پر تفصیلی ریویو اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں۔ زیرِ نظر مقالہ میں موصوف کے اجمالی حالاتِ زندگی اور ان کے کمالاتِ شاعری پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اُن کے دیوان میں سے صرف وہ اقتباسات پیش کئے جائینگے جن کا تعلق رسولِ خدا صلعم کی ذاتِ اقدس سے ہے۔

نام و نسب

نام حسانؓ، کنیت ابوعبدالرحمٰن۔ کفارِ قریش کا دنداں شکن جواب دینے کی وجہ سے آپ کی کنیت ابوالحسام بھی پڑ گئی تھی لقب "شاعرِ رسولؐ" تھا۔

آپ مدینہ طیبہ کے نامور قبیلہ "خزرج" کے رکن تھے جو رسولِ خدا کے جدِ امجد عبدالمطلب کا ننہال تھا۔ اس لیے گو آپ قریشی نہ تھے لیکن جناب رسالتمآب صلعم سے قرابت ضرور رکھتے تھے۔ آپ کو اپنی شرافتِ نسبی پر بجا طور پر فخر تھا۔ آپ کے خاندان میں بہت سے سردار اور حکمران گذر چکے تھے ایک جگہ آپ اپنے آبا و اجداد پر فخر کرتے ہوئے نسب میں فوقیت جتانے والے کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

الم تعلموا اولادَ عَمرو بنِ عامرٍ
لنا شرفٌ یعلو علیٰ کل مرتقی

یعنی کیا تو نہیں جانتا کہ ہم عمرو بن عامر کی اولاد ہیں جن میں۔ ہم کو ایک ایسا نسبی فخر حاصل ہے جو ہر بلند تر شخص پر فوقیت رکھتا ہے۔

رسا فی قرار الارض ثم سمت لہٗ
فروعٌ تسامی کل نجمٍ محلّق

ہماری خاندانی جڑیں زمین کی تہ تک پہنچ گئی ہیں پھر اس سے ایسی شاخیں بلند ہوئیں جو ہر بلند ستارہ کا مقابلہ کرتی ہیں۔

ملوکٌ و ابناء الملوک کاننا
سواری نجوم طالعات بمشرق

ہم میں بادشاہ اور شاہزادے پیدا ہوتے رہے ہیں گویا ہم چمکتے ہوئے تارے ہیں جو مشرق سے طلوع ہو رہے ہیں۔

اذا غاب منہا کوکب لاح بعدہٗ
شہابٌ تعنّی مایبدّ ولاارض تشرق

جب اس کا کوئی ایک ستارہ غائب ہوا تو دوسرا نمودار ہو گیا۔ جو زمین کو برابر روشن کرتا رہا۔

(دیوان حسان صفحہ ۲۲)

پیدائش و وفات

حضرت حسان نے زندگی کے ساٹھ برس زمانہ جاہلیت میں گزارے اور ساٹھ برس زمانہ اسلام میں گذارے، آپ کے والد ماجد "ثابت" دادا "منذر" اور پردادا "حرام" نے بھی ایک سو بیس برس کی عمریں پائیں تھیں۔ دُنیا میں ایسی مثالیں کم ملیں گی جس میں ایک ہی فیملی کے چار بزرگوں نے پے در پے ۱۲۰ برس کی عمریں پائی ہوں۔ آپ کی وفات عہد معاویہ میں ۵۴ھ میں ہوئی اس لئے ظاہر ہے کہ پیدائش سنہ ہجری سے

تقریباً ۶۰ برس پہلے ہوئی ہوگی۔

آخر عمر میں آپ نورِ بصارت سے محروم ہو گئے تھے لیکن خدا نے آپ کے قلب و دماغ کو نورِ بصیرت سے معمور فرما دیا تھا۔ آپ ایک جگہ فخریہ فرماتے ہیں۔

إن يأخذ الله من عينيّ نورهما
ففي لساني وقلبي منهما نور

یعنی اگرچہ خدا نے میری دونوں آنکھوں سے بصارت لے لی ہے لیکن میری زبان و دل کو ان کے بجائے اپنے نور سے معمور کر دیا ہے۔

قلبٌ ذكيٌّ وعقلٌ غيرُ ذي دَخَلٍ
وفي فمي صارمٌ كالسيف مأثورُ

خدا نے مجھے ایک ذہین دل اور شریف عقل عطا فرمائی ہے، اور میرے منہ میں تلوار جیسی قاطع اور پر تاثیر زبان عطا فرمائی ہے۔ (دیوان حسان ۱۲۵)

آپ کے خاندان میں شاعری کئی پشتوں تک رہی۔ آپ کے آباؤ اجداد بھی شاعر تھے۔ نیز آپ کے بیٹے اور پوتے بھی شاعر ہوئے۔

شاعری میں حسان رضی اللہ عنہ کا مرتبہ

عہدِ رسالت میں بہت سے ایسے شعراء گزرے ہیں جو رسولِ خدا صلعم کے شرفِ صحبت سے فیضیاب تھے۔ مگر جو مرتبہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔ انہیں تین امتیازی خصوصیات حاصل تھیں۔

(۱) زمانہ جاہلیت میں وہ اوس و خزرج جیسے معزز قبائل کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ عہدِ رسالت میں وہ دربارِ نبوت کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ عہدِ خلافت میں وہ سارے یمن و قحطان کے شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔

یہ مسئلہ کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر کون تھا مشکل اور تقریباً لاینحل ہے۔ لوگوں کی طبیعتیں اور مذاق مختلف ہوتے ہیں، جس کا جو رنگ ہوتا ہے وہ اسی رنگ کے کلام کو بہتر سمجھتا ہے۔ شعرائے متقدمین میں فرزدق "امرؤ القیس" کو اشعر العرب سمجھتا تھا۔ جریر کے خیال میں "نابغہ" عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اخطل کی رائے میں "اعشیٰ" افضل الشعراء تھا۔ ذو الرمہ "لبید" کو، ابن مقبل "طرفہ" کو اور کمیت "عمرو بن کلثوم" کو زمانۂ جاہلیت کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا تھا۔ بہرحال شعراء مختلف ہیں، پر علماء ادب کا اتفاق ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے بڑا شاعر کوئی نہ تھا۔ آپ کو لوگ "اشعر اہل المدر" بھی سمجھتے تھے یعنی مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ کے شعراء میں آپ کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ شاعرِ رسول صلعم کے معزز لقب سے بھی مشہور تھے۔ یہ اتنا بڑا اعزاز تھا جو دنیا کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ رسولِ خدا گو خود شاعر نہ تھے اور نہ شعر و سخن سے کچھ دلچسپی رکھتے تھے تاہم آپ اچھے شعر کو پسند ضرور کرتے تھے اور سن کر خوش بھی ہوتے تھے۔ آپ نے بارہا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار کی تعریفیں کیں۔ انہیں دعائیں بھی دیں اور شعراءِ مشرکین کے جواب دینے کی انہیں تلقین بھی فرمائی۔ ان کے اشعار کے متعلق یہ بھی فرمایا کہ "یہ مشرکین پر تیروں سے زیادہ گراں گزرتے ہیں۔" آنحضرت صلعم ان کے لیے مسجدِ نبوی میں خاص طور سے منبر رکھواتے تھے جس پر وہ بیٹھ کر اپنے اشعار سنایا کرتے تھے جن میں وہ ہمیشہ دشمنوں کا جواب ترکی بہ ترکی دیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی

کے ناگفتہ بہ واقعات اور خاندانی حالات میں شرمناک عیوب بیان کئے کہ انہیں شرم دلاتے تھے۔

حضرت حسان رض برجستہ گو شاعروں میں سے تھے۔ حارث بن عوف جو اپنی قوم کا سردار تھا۔ اپنے قبیلے کی غداری پر اٹھا۔ معذرت کے لئے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کو دیکھتے ہی برجستہ دو شعر کہے، جسے وہ سنکر گھبرا گیا۔ اس نے آنحضرت صلعم سے مودبانہ عرض کیا "میں اپنی قوم کا تاوان خود ادا کروں گا، میں اس شخص کی ہجو سے بچنے کے لئے آپ کی پناہ چاہتا ہوں، یہ وہ شخص ہے جو اپنی زبان کی تلخی اگر سمندر میں ملا دے تو خدا کی قسم سمندر کا سارا پانی کڑوا ہو جائے"۔

موصوف کے شاعرانہ کمال کا جوہر اس وقت کھلا جب بنی تمیم کا وفد دربار نبوی میں حاضر ہوا۔ ان کے ہمراہ خطیب و شاعر بھی تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا "ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت ہمارے خطیب و شاعر کا آپ کے خطیب و شاعر سے مقابلہ ہو جائے"۔ آنحضرت نے انکی یہ درخواست منظور فرمائی۔ پہلے اُن کے خطیب عطارد بن حاجب نے تقریر کی جس کا جواب مسلمانوں کی طرف سے ثابت بن قیس خزرجی نے دیا۔ تقریر ختم ہوتے ہی، بنی تمیم کا مشہور شاعر زبرقان بن بدر تمیمی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی قوم کی فضیلت میں ثنا خوانی کرنے لگا جب وہ اپنے اشعار سنا چکا تو حضرت حسان رض نے اسی بحر و قافیہ میں فی البدیہ ایک بہت بڑا قصیدہ پڑھ کر سنایا۔ جسے سن کر بنی تمیم حیران رہ گئے۔ انہوں نے حسان رض کی فضیلت کا اعتراف کیا اور پھر مقابلہ کی جرأت کی

حضرت حسان رض نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اپنے تمام خدمات اسلام اور بانی اسلام کے لئے وقف کر دی تھیں، جنہیں وہ آخر عمر تک بڑے جوش و خروش کے ساتھ ادا کرتے رہے، آپ نے رسول خدا کی شان میں جیسے پُرزور قصائد اور پُردرد مرثیئے لکھے ہیں ویسے ہی دشمنوں کے اعتراضات کے دنداں شکن جوابات اور ان کی ہتک آمیز ہجویں بھی کہی ہیں جن میں سے مختصر اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

قصائد زمانہ جاہلیت کے شعراء میں زہیر بن ابی سلمٰی نابغہ ذبیانی اور اعشیٰ قصیدہ گوئی کے فن میں بڑے باکمال شاعر گذرے ہیں۔ چنانچہ شاعری کے اس باب میں حضرت حسان رض کو ان پر کوئی ترجیح نہیں لیکن ان کے قصائد میں وہ اچھوتی تشبیہیں اور بلیغ استعارات استعمال کیے گئے ہیں جو اُن کے کلام میں مشکل ہی سے ملیں گے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ مضمون میں تصنع اور آورد نہیں بلکہ تمام کا تمام ان کے واردات قلبیہ کا آئینہ دار اور اس کا حسن وحسن اظہار ہے اس میں خوشامدانہ مداحی کو قطعی دخل نہیں۔

قصائد میں ہمیشہ ممدوح کی انہیں صفات کا تذکرہ کرنا چاہیئے جو اس میں واقعۃً پائی جاتی ہوں اپنے ممدوح کی شان میں کوئی ایسی بات کہنا جو دور از عقل اور بعید از قیاس ہو، ایک لغو سی بات ہے۔ حضرت حسان رض نے رسول خدا کی شان میں بڑے بڑے قصیدے کہے ہیں لیکن کبھی کوئی ایسی صفت ان کی طرف منسوب نہیں کی جو ان میں حقیقۃً نہ پائی جاتی ہو۔ دیکھئے ایک جگہ

حضرت صلعم کی بعثت اور اُن کی پاکیزہ تعلیمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کس سادگی سے آپ کی شان میں مدح سرا ہیں۔

نَبِیٌّ اَتَانَا بَعْدَ یَاْسٍ وَفَتْرَۃٍ
مِنَ الرُّسْلِ وَالْاَوْثَانُ فِی الْاَرْضِ تُعْبَدُ

وہ خدا کے ایک نبی ہیں جو مایوسی اور انبیاء کے گزرنے کے بعد ہمارے پاس تشریف لائے، جبکہ دُنیا میں بُتوں کی پوجا ہونے لگی تھی۔

فَاَمْسٰی سِرَاجًا مُسْتَنِیْرًا وَّھَادِیًا
یَلُوْحُ کَمَا لَاحَ الصَّقِیْلُ الْمُھَنَّدُ

وہ ہمارے لیئے روشن چراغ بن گئے اور ہدایت کرنے والے، وہ اس طرح چمکتے ہوئے نمودار ہوئے جیسے ہندی صیقل کی ہوئی تلوار چمکتی ہے۔

وَاَنْذَرَنَا نَارًا وَبَشَّرَ جَنَّۃً
وَعَلَّمَنَا الْاِسْلَامَ فَاللّٰہَ نَحْمَدُ

(دیوان حسانؓ ص۴۱)

انہوں نے ہم کو جہنم سے ڈرایا اور جنت کی خوشخبری سُنائی۔ انہوں نے ہم کو دین اسلام کی تعلیم دی جس پر ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

شعراء عرب جب کسی کی تعریف میں قصیدہ کہتے تھے تو حتی الامکان ایجاز و اختصار سے کام لیتے تھے، اُن کے الفاظ پُرشکوہ اور معانی بہت بلیغ ہوتے تھے، اُن کا قول تھا کہ جب کسی کی تعریف کرو تو اُسکو اس قدر طول نہ دو کہ آخری شعر سُننے سے پہلے شروع کے اشعار تم بھول جاؤ۔ حضرت حسان ؓ کے دو شعر ملاحظہ ہوں جو ایجاز و اختصار میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ رسولِ خدا صلعم کی شان میں کیسے والہانہ انداز میں فرماتے ہیں:۔

مَتٰی یَبْدُ فِی الدَّاجِی الْبَھِیْمِ جَبِیْنُہٗ
یَلُحْ مِثْلَ مِصْبَاحِ الدُّجَی الْمُتَوَقِّدِ

جب تاریک رات میں رسول خدا کی پیشانی نمودار ہوتی ہے تو وہ اس طرح چمکتی ہے جیسے شب تار کا درخشندہ چراغ چمکتا ہے۔

فمن کان او من یکون کاحمد
نظام لحق او نکال لملحد

(دیوان حسان ص۵۹)

رسول خدا جیسا کون تھا یا کون ہو سکتا ہے حق کا مددگار یا ہر ظالم سے انتقام لینے والا۔

حضرت حسان ؓ کے دو شعر اور دیکھئے جن میں وہ رسولِ خدا کے خیر البشر اور بنی نوع انسان میں ایک بے عیب اور بے مثال انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کتنے شگفتہ انداز اور عمدہ پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں:۔

واحسن منک لم تر قط عینی
واجمل منک لم تلد النساء

آپ (رسول خدا) سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے ہرگز نہیں دیکھا نہ آپ سے زیادہ خوبصورت کسی عورت نے کوئی بچہ جنا

خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

(دیوان حسان ص۱۰)

آپ ہر عیب سے پاک پیدا کئے گئے۔ گویا آپ جیسا پسند کرتے تھے ویسا ہی پیدا ہوئے۔

اُمِ مَعبد کا واقعہ سرورِ عالم صلعم کے معجزات میں سے ہے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے ہوئے راستہ میں آنحضرت صلعم کو اُمِ معبد خزاعیہ کا خیمہ پڑا جو اُس گرد و نواح میں بہت ہی سخی اور نیک دل خواتین میں سے سمجھی جاتی تھیں مہاجرین کا یہ مختصر قافلہ جن میں آنحضرت کے علاوہ ابوبکر صدیق رضؓ، اُن کے خادم عامر بن فہیرہ اور زہیر عبداللہ بن اُریقط تھے، اُمِ معبد کے خیمہ کے پاس اُتر پڑے اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں اُس سے لینا چاہیں زمانہ قحط سالی کا تھا، اُمِ معبد نے معذرت کی۔ اسی اثنا میں آنحضرتؐ کی نظر ایک بکری پر پڑی جو خیمہ کے ایک ڈوٹے پھوٹے حصہ میں بندھی ہوئی تھی، آپ نے دریافت کیا۔ کیا اسکے کچھ دودھ ہے؟ اُمِ معبد نے عرض کیا اُسکے تھن خشک ہو گئے ہیں؟ آپ نے فرمایا "کیا تم اجازت دیتی ہو کہ میں اس کو دوہوں؟" اُنہوں نے کہا "بخوشی اگر دودھ ہو تو آپ ضرور دوہ لیں۔" آنحضرتؐ نے بکری طلب فرمائی، اس کے تھنوں پر دستِ مبارک پھیرا اور خدا کا نام لے کر دوہنا شروع کیا۔ کرشمۂ قدرت دیکھئے کہ اس بکری نے اس قدر دودھ دیا کہ آپ کے ساتھیوں کے علاوہ اُمِ معبد کے گھر کے لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا۔ پھر بھی دودھ کا برتن لبریز ہی رہا۔

حضرت حسان رضؓ اس واقعہ سے متاثر ہو کر اہلِ مکہ کی بدبختی پر آنسو بہاتے ہیں اور اہلِ مدینہ کو اس سعادتِ عظمیٰ کے حصول پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

لقد خابَ قومٌ غابَ عنهم نبيهم
وقدّس من يسري اليهم ويغتدي

بیشک نامراد ہوئی وہ قوم جن کے پاس سے انکا نبی چلا گیا اور مقدس و بابرکت ہوئے وہ لوگ جن کے پاس وہ تشریف لائے اور انہوں نے صبح کی۔

هداهم به بعد الضلالة ربهم
وارشدهم من يتبع الحق يرشد

اُن کے ذریعہ خدا نے گمراہی کے بعد ان کو ہدایت کی اور اُن کو سیدھا راستہ دکھایا جو حق کی پیروی کرتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے۔

وهل يستوي ضلالُ قومٍ تسفهوا
عمىً وهُداةٌ يهتدون بمهتدِ

کیا قوم کے وہ گمراہ لوگ جو جہالت و نادانی سے کورگی اور اندھے پن کو پسند کرتے ہیں، اُن ہدایت یافتہ لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جو کسی رہبر کی ہدایت سے فیضیاب ہیں۔

لقد نزلت منهُ على اهل يثرب
ركابُ هدىً حلّت عليهم باسعد

بے شک اہلِ مدینہ پر سواری ہدایت اُتری جو فالِ نیک کے طور پر اُن کے پاس پہونچی۔

نبيٌ يرى ما لا يرى الناس حولهُ
ويتلو كتاب الله في كل مسجدِ

(دیوان حسان ؓ ص۰۰)

وہ خدا کے برگزیدہ نبی ہیں جو اپنے گرد و پیش کے وہ حالات جانتے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں جانتے۔ وہ

خدا کی کتاب ہر مسجد میں تلاوت کرتے ہیں۔

اہاجی

حضرت حسان نے کفار قریش کی ہجو میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں۔ اُن کی ہجو میں وہ گرمی کلام اور تیزی تھی جس سے کفار پناہ مانگتے تھے۔ ان کو اس صنف شاعری سے خلقی مناسبت تھی۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف انہیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے نہ روک سکتا تھا۔ جہاں کسی نے اسلام اور بانی اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی، فوراً انہوں نے اس کی ایسی خبر لی کہ لوگ اُسے سن کر اپنے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے تھے۔

عہد جاہلیت کے فسق و فجور، ضلالت و گمراہی کی سچی تصویریں دیکھنا ہوں تو اُن کے اُن پُرآشوب اشعار کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جنمیں مشرکین کی بے دینی اور بے راہ روی نہایت موثر اور پُرزور الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔ جن سے ان کی قوتِ بیان اور قدرتِ زبان کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کا خاکہ اُڑاتے تھے تو اس کے جزئیات کو بھی نظرانداز نہیں کرتے تھے، اُن کا سارا کلام زور فصاحت سے لبریز ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت حسانؓ سے پہلے بھی بہت سے شعرائے عرب نے اپنے مخالفین کی خوب خوب ہجویں کہی ہیں مگر وہ خوبی جو ان کے اشعار میں ہے کسی دوسرے کے کلام میں پائی نہیں جاتی۔ اُن کے یہاں تو وہ مقابلہ کا ایک نیا بہترین ہتھیار بن گئی تھی۔ ان کے کلام میں "سوفسطائیت" جیسی طعن و تشنیع اور برش پائی جاتی ہے جو دلوں کے اندر فوراً اُتر جاتی۔

دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے ابوسفیان بن حرب نے ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کی ہجو میں کچھ اشعار کہے جب وہ حضرت حسانؓ نے سنے تو رسولِ خدا سے جواب دینے کی اجازت چاہی۔ ارشاد ہوا "ابوبکرؓ سے مشورہ کر لو وہ انساب عرب سے خوب واقف ہیں، پہلے ان سے حالات معلوم کر لو پھر شعر کہو"

آپ نے ایسا ہی کیا۔ پہلے حالات معلوم کئے پھر شعر کہے جو درج ذیل ہیں:۔

لا ابلغ ابا سفیان عنی فانت مجوف نخب ھواء

ہاں! ابوسفیان کو میری طرف سے یہ پہونچا دو کہ تو بزدل ڈرپوک اور بیوقوف ہے۔

ھجوت محمداً فاجبت عنہ وعند اللہ فی ذاک الجزاء

تو نے محمد صلعم کی ہجو کی، میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ مجھے اس کی جزائے خیر خدا سے ملے گی۔

اتھجوہ ولست لہ بکفوء فشرکما لخیرکما الفداء

تو اُن کی ہجو کرتا ہے حالانکہ تو اُن کا ہمسر نہیں پس تم میں کا بُرا تم میں سے نیک اور برگزیدہ پر قربان کر دیا جائے۔

فمن یھجو رسول اللہ منکم ویمدحہ وینصرہ سواء

کون ہے جو رسول خدا کی ہجو کرے جبکہ اس کے علاوہ ساری دُنیا اُن کی تعریف کرتی ہے اور اعانت کرتی ہے۔

فان ابی ووالدہ وعرضی لعرض محمد منکم وقاء

بے شک میرے باپ دادا اور میری عزت و آبرو محمد صلعم کی عزت و حرمت پر قربان ہیں اور اُن کے لئے سپر ہیں۔ (دیوان حسانؓ صفحہ ۱)

"عبداللہ بن الزبعری" قریش کے چوٹی کے شاعروں میں سے تھا۔ وہ اہل مکہ میں سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا تھا اس کو زبان رسولِ خدا اور مسلمانوں کی شان میں [illegible]

...تھی۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کی اتفاقی شکست پر
...نے اپنے اشعار میں حضرت حسان رضؓ کو مخاطب کرکے مسلمانوں
...ب خوب بے نقط صلواتیں سنائیں۔ حضرت حسانؓ اس کی
...ہ سرائیوں کا جواب دیتے ہوئے جنگ کی حقیقی نوعیت
...ی ڈالتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جنگ بدر کا واقعہ یاد دلاکر اسے
...دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

...ت یا ابن الزبعری وقعۃ
کان منا الفضل فیھا لو عدل

ابن الزبعری کو اس جنگ (احد) کا حال خوب
...ہے جس میں، اگر انصاف کرے تو فضیلت ہمارے
لئے ہے۔

...لتم ونلنا منکم
ولذاک الحرب احیانا دول

بے شک تم نے ہم سے اور ہم نے تم سے خوب
...م لیا۔ کبھی کبھی لڑائی اسی طرح ہے کھایا کرتی ہے۔

...ردنا شدۃ صادقۃ
فاجأناکم الی سفح الجبل

جب ہم نے جنگ بدر میں سخت حملہ کیا تو ہم نے
پہاڑی کے نشیب میں ڈھکیل دیا۔

...حنا فی مقام واحد
منکم سبعین غیر المنتحل

ہم نے تم میں سے ستر آدمیوں کو ایک ہی جگہ پچھاڑ دیا
میں ذرا بھی جھوٹ نہیں۔

...س ذا منکم اساودھم
فانصرفتم مثل افلات الحجل

ہم نے تم میں سے بہتوں کو گرفتار کیا اور تم شکست
...رغابیوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔

...ناکل ابن منکم
وقتلنا کل جحجاح رفل

ہم نے تم میں سے ہر سردار کو قتل کیا اور ہر ذی رتبہ
بہادر آدمی کو مارا۔

نحن لا انتم بنی استاھھا
نحن فی الباس اذا الباس نزل

ہم نہیں، تم دُم دبا کر بھاگنے والے ہو، ہم جب لڑائی
ہوتی ہے تو میدان جنگ میں ہوتے ہیں۔

(دیوان حسان ج ۲ صفحہ ۲۴۲)

کفار قریش کا دوسرا شاعر، اسلام اور بانیٔ اسلام کا
کا جانی دشمن "عمرو بن عاص" تھا جو آنحضرتؐ اور مسلمانوں کی ہجویں
لکھ لکھ کر برابر مسلمانوں کو اذیت پہونچاتا رہتا تھا۔ حضرت حسانؓ
اس کو مخاطب فرماکر کہتے ہیں :-

زعم ابن نابغۃ اللئیم بانا
لا نجعل الاحساب دون محمد

خبیث ابن نابغہ (عمرو بن عاص) نے سمجھ لیا ہے کہ ہم
اپنے خاندان کو رسول خدا کے مقابلہ میں کمتر اور حقیر نہ سمجھیں گے

اموالنا ونفوسنا من دونہ
من یصطنع خیرا یثب ویحمد

ہمارے جان و مال ان کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت
نہیں رکھتے یعنی ان پر قربان ہیں جو نیکی کرے گا اس کو ثواب
ملے گا اور اس کی تعریف کی جائیگی۔

فتیان صدق کاللیوث مساعر
ینلقدم یوم الھیاج یسدد

ہم سچے جانباز نوجوان ہیں، ہم بپھرے ہوئے شیروں کی
طرح ہیں جو جنگ میں ہم سے مقابلہ کرے گا وہ بھگا دیا جائیگا

قوم ابن نابغۃ اللئام اذلۃ
لا یقبلون علی صغیر المرعد

ابن نابغہ کی خبیث قوم ذلیل ہے۔ وہ مصیبت زدہ
لوگوں کی فریاد پر آگے نہیں بڑھتے

وبنی لھم بیتا ابوک مقصرا
دنسا ولوما بئس بیت المحتد

اے عمرو! تیرے باپ نے ان کے لئے کفر و ملامت
کا گھر بنایا ہے جس کی بنیادیں بہت ہی خراب ہیں۔ (دیوان حسان ص ۱۲۶)

قریش کا تیسرا باوہ گو شاعر ابوسفیان بن حارث تھا
جس کی گستاخیوں سے مسلمان تنگ آچکے تھے، وہ اپنے کو ہاشمی
بتاکر اہل مدینہ پر فخر کیا کرتا تھا۔ حضرت حسان نے اس کے نسبی
غرور کا مذاق اُڑاتے ہوئے ایک بار اس کی ایسی خبر لی کہ پھر
اس کو اس بارے میں لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ
فرماتے ہیں :-

لعمرک ان الک من قریش کال السقب من رال النعام
تیری جان کی قسم تیرا رشتہ قریش سے ایسا ہی ہے
جیسا کہ اونٹ کے بچہ کا رشتہ شتر مرغ کے بچے سے ہو۔

فلا تفخر بقوم لست منهم ولا تلف کاللئام بنی هشام
تو ایسی قوم پر فخر مت کر جن میں سے تو نہیں ہے، تو
تو خبیث بنی ہشام جیسا بھی نہیں۔ (دیوان حسان ص ۳۲)

سرداران قریش میں "ابوجہل" عداوت اسلام میں سب
سے پیش پیش تھا۔ کفر و اسلام کی پہلی جنگ معرکہ بدر اسی کی
شر انگیزیوں کا نتیجہ تھا جس میں وہ موت کے گھاٹ اُتارا
گیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اس کی شرارتوں سے نجات
مل گئی۔ حضرت حسان رض اس کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

فقد لعن الرحمن جمعا یقودهم دعی بنی شجع لحرب محمد
بے شک خدا نے ایک ایسی جماعت پر لعنت کی
جس کو محمد صلعم سے لڑنے کے لئے ایک جھوٹا مدعی شجاعت
(ابوجہل) لایا ہے۔

مشوم لعین کان قدما مبغضا یبین فیه اللوم من کان یهتدی
وہ خبیث اور لعین ہے ہمیشہ سے اس کو برا سمجھا جاتا
ہے، جو شخص راہِ حق کی طرف ہدایت پاتا ہے وہ اسکی ملامت
کرتا ہے۔

فذالاهم فی الغی حتی تهافتوا وکان مضلا امره غیر مرشد
وہ لوگوں کو گمراہی کی طرف مائل کرتا ہے، حتی کہ لوگ
اس کے گرد جمع ہو گئے، حالانکہ اس کا حکم گمراہ کرنے والا ہے
ہدایت کرنے والا نہیں۔

فانزل ربی للنبی جنوده وایده بالنصر فی کل مشهد
خدا نے نبی کریم کی اعانت کے لئے اپنا لشکر بھیجا
اور ہر جنگ میں خدا نے ان کی نصرت و فتح کی تائید کی۔

وان ثواب الله کل موحد جنان من الفردوس فیها یخلد
ہر خدا پرست موحد کا ثواب جنت الفردوس ہے
جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ (دیوان حسان ص ۱۲)

اعداء اسلام میں "ابولہب" کا وہی مرتبہ تھا جو ابوجہل
کا تھا لیکن دنائت اور خباثت میں اس سے بھی بڑھا ہوا تھا
رسول خدا کا قریبی عزیز ہونے کے باوجود یہ اسلام کا سخت
ترین دشمن تھا۔ حضرت حسان رض اس کی دنائت کا ذکر کرتے
ہوئے اس کی مذمت کرتے ہیں۔

ابالهب ابلغ بان محمدا سیعلو بما ادی وان کنت لائما
ابولہب کو پہونچا دو کہ محمد صلعم فریضۂ نبوت ادا کرنے
کی وجہ سے ضرور بلند مراتب حاصل کریں گے اگرچہ یہ بات
تیری خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

وان کنت قد کذبته وخذلته وحیدا واطاعت الصبیین الضراغم
اگرچہ تو نے اُن کو جھٹلا دیا اور (خاندان میں) تنہا تو نے
ان کو رسوا کیا اور بزدل کمینوں کی تو نے پیروی کی

سمت هاشم للمکرمات وللعلی وغودرت فی کاب من اللؤم جاثما
بنی ہاشم عزت اور بلند مراتب پر فائز ہوئے لیکن تو ملامت
کے رنج و غم میں آلودہ ہو کے چھوڑ دیا گیا۔ (دیوان حسان ص)

"اُبی بن خلف" ابوجہل اور ابولہب کا خاص چیلا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا کہ تم کہتے ہو کہ خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے، بتاؤ اسے کون زندہ کر سکتا ہے؟ حضرت حسان رضؓ اس کی اس حماقت کو بیان کرتے ہوئے اس کی مذمت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

لقد ورث الضلالة عن ابیہ ۔۔۔ اُبَیٌّ یومَ قامَ بِہا الرَّسُولُ

بے شک "اُبی" نے اپنے باپ کی طرف سے گمراہی کا ورثہ پایا ہے، جبکہ اس نے رسولِ خدا سے جدائی اختیار کی۔

اجئتَ محمداً عظماً رمیماً ۔۔۔ لِتُکذِبَہ وَانتَ بِہ جَھُولُ

کیا تو رسولِ خدا کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا ہے تاکہ تو انہیں جھٹلائے، حالانکہ تو خود اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے۔

وَتَبَّا بَنا ربیعۃ اِنْ اَطَاعَا ۔۔۔ اَبَا جَھْلٍ لِاُمِّھِمَا الھَبُولُ

ربیعہ کے دونوں بیٹے تباہ ہو گئے، جب انہوں نے ابوجہل کی پیروی کی۔ ان کی مائیں ان پر رونے والیاں ہیں۔ (دیوان حسان رضؓ صـ۲۰۴)

مراثی

مرثیہ گوئی، عربی شاعری کی ایک نمایاں صنف ہے اس میں حرب و ضرب کے مناظر خوب خوب دکھائے جاتے ہیں۔ معرکۂ کارزار، مبارزین کی جانبازیاں صبح و شام کا سماں، ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معایب کا مفصل بیان ہوتا ہے اور مکمل تصویریں الفاظ میں بے مثل طریقے پر کھینچی جاتی ہیں۔

عرب میں چونکہ شاعری کی ابتدا بہت سادے طریقے سے اظہارِ جذبات سے ہوئی اس لئے وہاں سب سے پہلے شاعری کا رواج مرثیہ گوئی سے ہوا، اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ جذبات فطرت میں رنج و غم، درد و الم کا جذبہ دوسرے جذبات سے قوی تر ہوتا ہے جس جوش و خروش سے رنج و غم کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں دوسرے جذبات ظاہر نہیں ہو سکتے۔

زمانہ جاہلیت میں مرثیہ گوئی کو بہت ترقی ہوئی اس زمانہ کے شعراء نے بڑے بڑے پر اثر مرثیئے لکھے ہیں جن میں "خنساء" اور "متمم بن نویرہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے پُر درد مرثیوں نے سارے عرب میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی اور زمین و آسمان کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔ یہ دونوں عربی مرثیہ گوئی میں اپنے وقت کے امام مانے جاتے ہیں۔

عربی شاعری جب تک کسبِ معاش کا ذریعہ نہیں بنی عرب میں مرثیوں کا زور رہا لیکن جب شاعری ذاتی منافع کا سبب بن گئی تو مرثیہ گوئی کو خود بخود زوال شروع ہو گیا، کیونکہ مدحیہ قصائد کی طرح اس سے کچھ صلہ نہیں مل سکتا تھا۔ تاہم عربوں میں شاعری کی یہ صنف نہیں مٹی، اب بھی کلام کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جس میں وہی جوش و خروش پایا جاتا ہے، جو زمانۂ جاہلیت میں کبھی پایا جاتا تھا۔

حضرت حسان رضؓ کو اس صنفِ شاعری میں گو نمایاں امتیاز حاصل نہ تھا لیکن ان کے کلام کے خصوصیات ان کے مراثی میں بھی پائے جاتے ہیں، خصوصاً وہ مراثی جو آنحضرت صلعم کے وصال پر انہوں نے اپنی گہری عقیدت اور دلی لگاؤ کی بنا پر لکھے ہیں، ان کی شہرتِ جاودانی کے باعث ہیں۔

دیکھئے حضرت حسان رضؓ ایک مرثیہ میں سرورِ عالم صلعم کی وفاتِ حسرت آیات کو کیسے پُر درد الفاظ میں بیان فرماتے ہیں اور آثار و باقیاتِ رسول میں سے ایک ایک کو یاد کر کے خوا

آنسو بہاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

بطیبۃ رسم للرسول ومعہد منیر وقد تعفو الرسوم وتہمد

مدینہ طیبہ میں رسول خدا کی نشانی اور ایک چمکتا ہوا گھر ہے۔ حالانکہ بہت سے آثار مٹ جاتے اور برباد ہو جاتے ہیں

ولا تمتحی الآیات من دار حرمۃ بہا منبر الہادی الذی کان یصعد

مسجد نبوی سے اب تک آثار رسول نہیں مٹے،
اس میں رہبر عالم کا منبر ہے جس پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے۔

بہا حجرات کان ینزل وسطہا من اللہ نور یستضاء ویوقد

اس میں کچھ حجرات ہیں جن میں خدا کا نور (رسول خدا) رہا کرتے تھے جن سے نور حاصل کیا جاتا ہے اور دل روشن کیے جاتے ہیں۔

ظللت بہا ابکی الرسول فاسعدت عیون ومثلاہا من الجفن تسعد

جن کو دیکھ کر میں رسول خدا کے لئے رونے لگا۔ دوسرے لوگ بھی رو پڑے اور بہت سی پلکیں آنسو ٹپکانے لگیں۔

تذکر آلاء الرسول وما اری لہا محصیا نفسی فنفسی تبلد

وہ آنکھیں رسول خدا کی نعمتوں کو یاد کر رہی تھیں، جن کو میں شمار نہیں کر سکتا۔ میرا دل اس کے احصاء سے قاصر ہے۔

وہل عدلت یوما رزیۃ ہالک رزیۃ یوم مات فیہ محمد

کیا کسی ہلاک ہونے والے کی مصیبت اس دن کی مصیبت کا مقابلہ کر سکتی ہے، جس دن محمد صلعم نے وفات پائی۔

یدل علی الرحمن من یقتدی بہ وینقذ من ہول الخزایا ویرشد

وہ خدا کی طرف اس شخص کی رہنمائی کرتے تھے جو انکی پیروی کرتا تھا اور رسوائیوں سے بچاتے تھے اور راہ حق کی طرف ہدایت کرتے تھے۔

فبکی رسول اللہ یا عین عبرۃ ولا اعرفنک الدہر دمعک یجمد

اے آنکھ رسول خدا پر آنسو بہا۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ زمانہ میں کبھی بھی تیرے آنسو خشک ہوں گے

ومالک لا تبکین ذا النعمۃ التی علی الناس منہا سابغ یتغمد

تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو اُن نعمتوں کو یاد کر کے نہیں روتی جو لوگوں کو فیضیاب کئے ہوئے تھیں اور بے شمار تھیں۔

فجودی علیہ بالدموع واعولی لفقد الذی لا مثلہ الدہر یوجد

اے آنکھ رسول خدا پر آنسو بہا اور آہ و زاری کر ایک ایسی ذات کے فنا ہونے پر جو اب زمانہ میں کبھی نہ پائی جائے گی۔

وما فقد الماضون مثل محمد ولا مثلہ حتی القیامۃ یفقد

گزرے ہوئے لوگوں نے محمد جیسی ہستی کبھی گم نہیں کی اور نہ اُن کا جیسا بزرگ اب قیامت تک گم کیا جائیگا۔ یعنی اُن کی جیسی ذات گرامی نہ پہلے کبھی ہوئی نہ اب قیامت تک ہوگی۔

ولیس ہوائی نازعا عن ثنائہ لعلی بہ فی جنۃ الخلد اخلد

میرا دلی رجحان ان کی مدح و ثنا سے باز نہیں رہ سکتا۔ شاید میں اسی ذریعہ سے جنت الخلد میں ہمیشہ رہ سکوں۔

مع المصطفیٰ ارجو بذاک جوارہ وفی نیل ذاک الیوم اسعیٰ واجہد

میں اس مدح و ثنا سے محمد مصطفیٰ کے جوار رحمت میں رہنے کی اُمید کرتا ہوں، میں اُسی مبارک دن کے حاصل کرنے کی سعی اور کوشش کر رہا ہوں۔ (دیوان حسان رضؓ ص...)

اس سے بھی زیادہ دل سوز الفاظ میں حضرت حسان رضؓ

نوحہ سنئے جس میں موصوف نے کچھ عجیب دردانگیز پیرایہ میں سرورِ کائنات کے وصالِ پُرملال کا تذکرہ کیا ہے. فرماتے ہیں:

مابالُ عینکَ لا تنامُ کأنّما   کُحِلَت مآقیہا بکحلِ الأرمدِ

تیری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے جو سوتی نہیں۔ گو ان کی پتلیاں دُکھنے آ گئی ہیں اور اُن میں سرمہ (ارمد) لگا دیا گیا ہے

جزعًا علی المہدیّ اصبحَ ثاویًا   یا خیرَ من وطئَ الحصیٰ لا تبعدِ

رسولِ خدا پر جزع و فزع کرنے کی وجہ سے جو خاک میں مل گئے. یہ آنکھیں دُکھنے آ گئی ہیں۔ اے بہترین اُن لوگوں میں کے جنہوں نے زمین کو روندا تو ہم سے دور مت ہو۔

وجہی یقیکَ التربَ لہفی لیتنی   غُیّبتُ قبلکَ فی بقیعِ الغرقدِ

کاش میں آپ کو مٹی میں ملنے سے بچا سکتا۔ اے افسوس، میں آپ سے پہلے کیوں نہ مدینہ کے قبرستان "بقیع" میں غائب یعنی دفن کر دیا گیا۔

بأبی وأمی من شہدتُ وفاتَہ   فی یومِ الاثنینِ النبیُّ المہتدی

میرے ماں باپ اس ذاتِ گرامی (نبی کریم) پر قربان ہو جائیں جس کے سانحۂ ارتحال میں میں خود موجود تھا جو دوشنبہ کو پیش آیا۔

فظللتُ بعد وفاتہ متبلّدًا   متلدّدًا یا لیتنی لم اُولَدِ

میں اُن کی وفات کے بعد ہوش و حواس کھو بیٹھا میں پریشان تھا. کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

أأقیمُ بعدکَ بالمدینۃِ بینہم   یا لیتنی صُبِّحتُ سمَّ الأسودِ

کیا آپ کے بعد میں مدینہ میں لوگوں کے درمیان ٹھہرا رہوں گا کاش مار سیاہ مجھے ڈس لیتا اور میں مر جاتا۔

واللہِ اسمعُ ما بقیتُ بہالکٍ   إلا بکیتُ علی النبیِّ محمّدِ

خدا کی قسم، میں جب کسی مرنے والے کی خبر سنوں گا تو نبی کریم محمد صلعم کی وفات پر روؤں گا جب تک بھی زندہ رہوں۔

صلّی الالٰہُ ومن یحفُّ بعرشہِ   والطیّبونَ علی المبارکِ احمدِ

خدا اور وہ پاک فرشتے جو اس کے عرش کو گھیرے ہوئے ہیں احمد مجتبیٰ پر رحمت نازل کرے۔

(دیوان حسانؓ ص۹)

ایک اور مرثیہ میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ رحمتِ عالم کی ذاتِ گرامی غربا و مساکین کا ملجا و ماویٰ تھی آپ کا سانحۂ ارتحال ایک ایسا اندوہناک حادثہ ہے جس کی تلافی ممکن نہیں، فرماتے ہیں:

تبّ المساکینَ انّ الخیرَ فارقہم   مع النبیّ تولّی عنہمُ سَحَرا

غربا و مساکین برباد ہو گئے، بے شک بھلائی (رحمتِ عالم) اُن سے جدا ہو گئی اور صبح کے وقت اُن سے روگردانی کر گئی۔

من ذا الذی عندہ رحلی وراحلتی   ورزقُ اھلی اذا لم یؤنسوا المطرا

اب کس کے پاس میرا سفر ہوگا اور کہاں میری سواری جائے گی؟ اور کس سے میرے اہل و عیال کی روزی حاصل ہوگی جب وہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی میں مبتلا ہوں گے۔

أم من نعاتبُ لا نخشی جنادعہ   اذا اللسانُ عتا فی القولِ او عثرا

کیا ہم ایسی ذات والاصفات سے ناراض ہوں گے جس کی شان میں طفلانہ گستاخی سے ہم نہیں ڈرتے تھے، جبکہ زبان غلطی سے حد سے تجاوز کر جائے یا کوئی لغزش کر جائے

کان الضیاءَ وکان النورَ نتبعہ   بعد الالٰہ وکان السمعَ والبصرا

وہ سراپا نور اور ہدایت تھے جن کی ہم خدا کے بعد پیروی

کرتے تھے۔ ہمارے کان اور آنکھیں ان کی اتباع کے لیے وقف تھیں۔

فلیتنا یوم واروہ بملحدہ ... وغیبوہ والقوا فوقہ المدرا

لم یترک اللہ منا بعدہ احدا ... ولم یعش بعدہ انثی ولا ذکرا

کاش اس روز جس دن لوگوں نے ان کو قبر میں چھپا دیا ان کو گم کر دیا اور ان پر مٹی ڈالی، خدا ہم میں سے کسی کو باقی نہ رکھتا اور ہم میں سے کسی مرد و عورت کو زندہ نہ چھوڑتا۔

ذلت رقاب بنی النجار کلهم ... وکان امرا من اللہ قد قدرا

اس روز تمام بنی النجار کی گردنیں جھک گئیں، اور یہ خدا کا ایک حکم تھا جس کا پورا ہونا پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا (دیوان حسان صفحہ ۱۳۱)

مرثیہ کے دو شعر اور ملاحظہ ہوں جس میں حضرت حسان رضؓ نہایت ہی بلیغ انداز میں فرماتے ہیں کہ "آپ میری آنکھوں کی پتلی تھے، آپ کے بعد دنیا میرے لیے تاریک ہو گئی اب کوئی مرے یا جیے، میں تو صرف اسی روز بد سے ڈرتا تھا" فرماتے ہیں:۔

کنت السواد لناظری ... فعمی علیک الناظر

من شاء بعدک فلیمت ... فعلیک کنت احاذر

مواعظ و حکم

حضرت حسان رضؓ کے مجموعۂ سخن میں حکمت و موعظت پر بھی بہت ہی بیش بہا اور نادر کلام موجود ہے، دیکھیے ایک جگہ وہ لوگوں کو مخاطب کر کے فحش گوئی، بد کرداری وغیرہ سے پرہیز کرنے، اچھے اور نیک لوگوں میں بیٹھنے اٹھنے اور ان کے طور طریقے سیکھنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اعرض عن العوراء ان اسمعتها ... واقعد کانک غافل لا تسمع

بری باتوں سے پرہیز کرو کہ تم کو سنائی جائیں، ایسی جگہ اس طرح غافل ہو کر بیٹھو کہ گویا تم کچھ سن نہیں رہے ہو۔

ودع السؤال عن الامور وبحثها ... فلرب حافر حفرة هو یصرع

ہر معاملہ کے متعلق سوال کرنا اور اس کی بحث میں پڑنا چھوڑ دو، بسا اوقات گڑھا کھودنے والا خود ہی اس میں گرتا ہے۔

والزم مجالسة الکرام وفعلهم ... واذا اتبعت فابصرن من تتبع

شریف لوگوں کے ساتھ بیٹھو اٹھو اور ان کے افعال و اعمال کی نقل کرو اور جب کسی کی پیروی کرو تو غور کرو کہ تم کس کی اتباع کر رہے ہو۔

لا تتبعن غوایة لصبابة ... ان الغوایة کل شر تجمع

عشق و محبت کی گمراہی میں مت پڑو، بیشک اس قسم کی گمراہی تمام برائیوں کو جمع کر دیتی ہے

والموت اعداد النفوس ولا اری ... منه لذی هرب نجاة تنفع

موت لوگوں کی تعداد کے برابر ہے۔ میں نہیں دیکھتا ہوں کہ اس سے بھاگنے والے کو نجات، فائدہ پہنچا دے گی۔ (دیوان حسان صفحہ ۲۱۲)

ایک اور جگہ خود غرض اور بے وفا دوستوں کی مذمت کرتے ہیں اور اخوت دینی پر زور دیتے ہوئے ناصحانہ انداز میں فرماتے ہیں:۔

اخلاء الرخاء هم کثیر ... ولکن فی البلاء هم قلیل

خوشحالی کے زمانہ کے دوست بہت ہوتے ہیں لیکن تنگدستی اور مصیبت میں وہی بہت کم رہ جاتے ہیں۔

فلا یغررک خلة من تؤاخی ... فما لک عند نائبة خلیل

تم کو اس شخص کی دوستی دھوکہ نہ دے جسے تم نے

بھائی بنا یا ہو اس لئے کہ مصیبت میں تمہارا کوئی دوست کام نہ آوے گا۔

وَکُلُّ اَخٍ یَقُولُ اَنَا وَفِیٌّ وَلٰکِن لَیسَ یَفعَلُ مَا یَقُولُ

ہر دوست یہی کہتا ہے کہ "میں وفادار ہوں"

لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے، وقت پر اس پر عمل نہیں کرتا

سِوَیٰ خِلٍّ لَہُ حَسَبٌ وَدِینٌ فَذَاکَ بِمَا یَقُولُ ھُوَ الفَعُولُ

سوائے اس دوست کے جو شریف النسل اور دین دار ہو، وہ جو کچھ کہے گا وہی کرے گا۔

(دیوان حسان صفحہ ۲۴)

غزل

پروفیسر آغا صادق کوئٹہ

شریک اختلافِ کفر و ایماں ہم نہیں ہوں گے
کوئی ہو در پئے آزارِ انساں ہم نہیں ہونگے

اُمنڈتی ہیں بلائیں آسمانوں سے اُمنڈ آئیں
سپر اندازِ پیشِ چرخِ دوراں ہم نہیں ہونگے

وہ ہوں گے اور ہی جو زندگی سے جی چراتے ہیں
کشاکش ہائے ہستی سے گریزاں ہم نہیں ہونگے

ارے سے ہونگے ہمارے جامۂ ہستی کے سو پرزے
کیا ہوگا جنہوں نے چاک داماں ہم نہیں ہونگے

کچھ ایسا ہی مآلِ ساز و ساماں ہم نے دیکھا ہے
کہ جینے جی حریصِ ساز و ساماں ہم نہیں ہونگے

کسی قیمت پہ ناموسِ چمن بکنے نہیں دینگے
بہاروں میں کبھی ننگِ بہاراں ہم نہیں ہونگے

جفا و جور سے ہوگا نہ دامن اپنا آلودہ
ڈبو دے کشتِ دہقاں جو، وہ طوفاں ہم نہیں ہونگے

زباں پر ہم جو لائینگے وہ کر کے بھی دکھائینگے
فقط گفتار ہی کے مرد میداں ہم نہیں ہونگے

پریشاں کرنے والوں کو پشیمانی بہت ہوگی
قسم ہے مطمئن دل کی پریشاں ہم نہیں ہونگے

کم از کم ہم کو اپنے آپ پر پورا بھروسا ہے
جو انسانوں کے دشمن ہیں وہ انساں ہم نہیں ہونگے

یہ کہدو چارہ سازوں سے ہمیں پہچان لیں صادق
ہم اہلِ درد ہیں محتاجِ درماں ہم نہیں ہونگے

قبل از عہدِ غزنوی ہندوپاکستان کا حصہ[1]
عربی زبان وادب کی ترقی میں

(ڈاکٹر زبید احمد ایم۔اے منشی فاضل مولوی فاضل پی ایچ ڈی (لندن))

عرب اور پاک و ہند ایسے ممالک ہیں جو ہمسایہ اور پڑوسی ہونے کے باوجود ایک بحرِ وسیع بحیرۂ عرب کے درمیان حائل ہونے کے باعث نسل اور زبان میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ عرب قوم سامی النسل ہے اور ہند آریائی قوم تھا۔ عربی کا تعلق السنہ کے سامی خاندان سے ہے اور سنسکرت کا آریائی خاندان سے۔ یہی حال چین اور ہند کا ہے کہ دونوں ہم سایہ ممالک ہیں لیکن کوہ ہمالیہ کے سدِ راہ ہونے کی وجہ سے دونوں ملکوں میں نسلی و لسانی فرق بہت زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں ایران کو لیجیے وہ بھی ہندوستان کا پڑوسی ہے لیکن چونکہ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جیسی کہ عرب اور ہندوستان کے درمیان ہے۔ اسلئے ایران اور ہند کی نسلیں بھی ایک ہیں اور ایرانی و سنسکرت زبانیں بھی ایک ہی خاندان کے رکن ہیں۔

ہند و عرب نے ایک دوسرے کے قریب اور پڑوسی ہونے کے باعث باوجود اس کے کہ دونوں کے درمیان بہت بڑا سمندر حائل ہے ایک دوسرے کی زبان اور ادب کے ارتقا میں کافی حصہ لیا ہے۔

عربی زبان وادب کی وسعت، ہمہ گیری اور اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ تمام بلادِ اسلامیہ نے اس کی ترقی و توسیع کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ عراق، یمن، شام، فلسطین تو جزیرۂ عرب ہی کے حصے ہیں مگر دیگر بلادِ اسلامیہ میں چونکہ مصر، طرابلس، تونس، مراکش وغیرہ ممالک کی مادری زبان پہلے کے بعد سے عربی ہو گئی ہے۔ اس لیے ان ممالک نے بھی عربی کی توسیع و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ ازیں سعی میں [illegible] کی بھی عربی تصنیف و تالیف کی پیداوار بے اندازہ تھی۔ رہ گئے وہ ممالک اسلامیہ جن کی مادری زبان عربی نہیں۔ ان میں سے ترکی، ایران، اور ہندوستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں کوئی شک

---

[1] یہ مقالہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس [illegible] کے زیر اہتمام [illegible] جو ڈاکٹر سید معین الحق صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی کے دولتخانہ [illegible] کراچی، [illegible] سوسائٹی میں زیرِ صدارت [illegible] منعقد ہوا۔

نہیں کہ ترکی و ایران کا بھی خاصکر ایران کا فروغ ادبی عربی کے دربار میں کچھ کم نہیں۔ ہند میں عربی تصانیف و تالیف کا سلسلہ باقاعدہ تو عہد غزنوی سے شروع ہوتا ہے مگر ہم اس مقالے میں مختصراً صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عربی زبان و ادب کے ارتقاء میں ابتداء آفرینش سے عہد غزنوی یعنی دسویں صدی عیسوی تک ہند کا کیا حصہ ہے۔

شروع میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہید کے طور پر ہند و عرب کے تعلقات کا مختصر سا خاکہ بیان کر دیا جائے تاکہ اس پس منظر کی روشنی میں اصل مقصد کی وضاحت پوری طور پر ہو جائے۔

ہند و عرب کے تعلقات قبل از تاریخ

قدیم روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند و عرب کے درمیان تعلقات آغاز آفرینش سے قایم ہیں حدیثوں اور تفسیروں کی بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند و عرب کے درمیان تعلقات آغاز آفرینش سے قائم ہیں حدیثوں اور تفسیروں کی بہت سی روایتوں میں ہے کہ جب حضرت آدم جنت سے نکالے گئے تو سراندیپ میں ایک پہاڑ پر ان کا ہبوط ہوا جہاں ہنوز ان کا نشان قدم موجود ہے چنانچہ اس پہاڑ کا نام حضرت آدم کے نام پر ہے[1] اس حصۂ ملک کا نام ابن جریر وغیرہ کی تفسیروں میں دجنا ہے جو غالباً دکھنا کا معرب ہے۔ چونکہ سراندیپ ہند کے دکھن میں ہے اس لئے اسے دجنا (دکھنا) کہا گیا۔

چونکہ عرب سوداگر سراندیپ سے خوشبوئیں اور مسالے وغیرہ چیزیں اپنے ملک میں لے جاتے تھے اس لئے ان کا خیال ہے کہ حضرت آدم جو چیزیں اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے یہ خوشبوئیں اور مسالے ان کی یادگار ہیں۔ ایک روایت کے مطابق امرود لیمو اور کیلے بھی جنت ہی کے میوے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جب خداوند تعالٰے نے حضرت آدم کی توبہ قبول کر لی تو وہ عرفات کے میدان میں لائے گئے جہاں وہ حضرت حوا سے ملے۔ حضرت حوا جدے میں اُتری تھیں۔ یہ بھی مروی ہے کہ حضرت آدم کی وفات سراندیپ ہی میں ہوئی اور مرنے سے پہلے مکہ مکرمہ کئی بار آئے گئے۔ ایک روایت کے مطابق ہابیل و قابیل کا قصہ سراندیپ ہی میں پیش آیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ جنت سے چار دریا نکلے۔ نیل فرات جیحون اور سیحون۔ نیل مصر کا، فرات عراق کا جیحون ترکستان کا اور سیحون ہندوستان کا دریا ہے۔ یہ سب روایتیں نہ صرف مذہبی کتب میں پائی جاتی ہیں بلکہ جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں میں بھی مثلاً ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ مقدسی المتوفی ۳۸۰ھ اور یاقوت الحموی المتوفی ۶۲۶ھ میں یہ روایتیں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔[2] غلام علی آزاد بلگرامی نے ہندوستان کی بابت سبحۃ المرجان لکھی ہے۔ وہ اس میں ہند کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر حضرت آدم سب سے پہلے ہند میں اُترے اور یہاں اُن پر سب سے پہلے وحی نازل ہوئی تو اس کے معنی ہوئے کہ ہند ہی وہ ملک ہے جہاں سب سے پہلے کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ اور چونکہ حضرت آدم کی پیشانی پر

[1] ۔۔۔ جلد ۱ ص ۱۱۹۔ تفسیر طبری ۔۔۔ متعلقہ سورۂ بقرہ آیت ۳۷

[2] سید سلیمان ندوی۔ ہند و عرب کے تعلقات ۔۔۔ احسن التقاسیم ۔۔۔ یاقوت کا معجم جلد ۔۔۔

قدیمی تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول کا ابتدائی ظہور اسی ملک میں ہوا۔

اگرچہ تمام روایتیں فن حدیث کے اصول کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور ہیں بلکہ بعض موضوع بھی ہیں مگر ان سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ نسلی و لسانی اختلافات کے باوجود ابتداء آفرینش سے ان دونوں ملکوں کے درمیان کچھ نہ کچھ تعلقات قایم رہے۔

ابن ندیم نے سنسکرت کی ایک ایسی کتاب کا ذکر کیا ہے جس میں آدمؑ کے حالات ہیں اور جس کا عربی میں ترجمہ ہوا جس کا نام ہے کتاب الہند فی قصۃ ہبوط آدم علیہ السلام ہے (ابن ندیم ص ۴۲۲)۔

تاریخی تعلقات۔ یہاں تک تو ہم نے ماورا التاریخ کے روایتی علائق بیان کئے۔ اب ہم تاریخی روابط کا ذکر کرتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی رشتہ تو ساتویں صدی عیسوی میں قایم ہوا مگر تجارتی تعلقات نسل و زبان کے اختلاف کے باوجود ساتویں صدی قبل مسیح میں قایم ہو گئے تھے۔ بلکہ مورخ رولن سن[۱] (Rawlinson) اپنی مشہور تالیف انٹرکورس بٹوین انڈیا اینڈ دی ویسٹ (Intercourse between India and the Western World) میں اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ تجارتی تعلقات تاریخ کی یاد سے پہلے قایم ہوں۔

عہد عتیق میں ہند اور یورپ کے درمیان تجارت کے جو تین[۲] راستے تھے ان میں سے دو عرب ہو کر گزرتے تھے پہلا راستہ تو دریائے سندھ کے دہانے سے شروع ہو کر سمندر میں سے ہوتا ہوا فرات کے ساحل پر اس مقام تک ختم ہوتا تھا جہاں سے دو راستے بحیرۂ روم کے بندرگاہوں تک چلے جاتے تھے۔ اس راستے کی تجارت سلطنت بابل کے زمانہ میں اوج پر پہونچ گئی تھی۔ زوال بابل کے بعد اس راستے کو بھی زوال آ گیا۔

دوسرا راستہ جو پہلے راستے سے اہم تھا ساحل ہند سے یمن اور حضرموت جاتا اور وہاں سے بحر احمر کے کنارے کنارے شام اور وہاں سے یا تو براہ راست یا براہ مصر و اسکندریہ یورپ پہنچ جاتا تھا۔ اسی راستے کی وجہ سے ازمنہ قدیمہ میں جنوب مغربی عرب نہایت خوشحال اور متمول تھا۔ جب اہل یونان ہندوستان سے سامان تجارت براہ راست اسکندریہ لانے لگے تو جنوب مغرب عرب کے راستے کی گرم بازاری ختم ہو گئی۔

اس راستے کو جو یمن سے شام جاتا تھا قرآن پاک میں امام مبین (کھلا ہوا راستہ) کہا گیا ہے۔ سورۂ حجر کی ایک آیت میں ہے۔ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ اور یہ دونوں سدوم وایکہ کھلے ہوئے راستے پر ہیں۔ کلام پاک کی ایک دوسری آیت جس میں کاروان سبا کا ذکر ہے اس راستے کی رونق و گرم بازاری پر روشنی ڈالتی ہے۔ سورۂ سبا میں ہے وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ (ہم نے ان کے اور بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی ایک دوسرے سے متصل دیہات

۱؎ رولن سن باب اول

۲؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۲۲۔ ۳؎ تمدن عرب ص ۹۹

بنائے تھے اور ان میں آمد و رفت کا امن مقرر کر دیا تھا کہ رات دن بے خوف و خطر چلتے رہیں اس آیت میں قریٰ سے مراد پاس پاس بسے ہوئے دیہات ہیں۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ میں رحلۃ الشتاء والصیف یعنی گرمی اور سردی کے سفروں سے مراد وہی سفر ہیں جو اس کے قبل اہل عرب کیا کرتے تھے[۲]

تاریخ سے ثابت ہے کہ موتیوں کی تجارت کے باعث عربوں کو سراندیپ کا علم قدیم زمانے سے تھا اور عربوں نے تجارتی منڈیاں ظہور اسلام سے تین صدی پہلے قائم کر لی تھیں البتہ یہ معلوم نہیں کہ مسلمان کب اور کیونکر وہاں پہونچے۔ تاریخ بلاذری سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابن قاسم کے حملہ سندھ سے بہت پہلے مسلمان سوداگر سراندیپ پہونچ چکے تھے۔ چنانچہ محمد ابن قاسم کے حملے کی وجہ ہی یہ تھی کہ دیبل کے بحری قزاقوں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا تھا جنہیں سراندیپ کے بادشاہ نے مسلمانوں کے اہل و عیال کو بھیجا تھا۔

غرض ہندوستان میں عہد غزنوی سے پہلے مسلمانوں کا پہلا مرکز سراندیپ تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ دوسرا مرکز الدیپ، تیسرا مرکز ملیبار، چوتھا مرکز کارومنڈل، پانچواں گجرات اور چھٹا مرکز سندھ تھا۔

یہاں تک تو ذکر عرب کے ابتدائی تجارتی تعلقات کا ہوا۔ رہ گئے سیاسی روابط۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے (۱۳ھ) سے شروع ہوتے ہیں جبکہ ساحل ہند پر اسلامی حملے ہونے لگے۔ مگر شروع شروع میں یہ حملے صرف ساحلوں تک محدود رہے تاآنکہ ۹۳ھ میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں محمد بن قاسم نے ملتان اور سندھ باقاعدہ طور پر فتح کئے۔

یہاں تک ایک خاکہ تھا ہند و عرب کے ان باہمی تعلقات و روابط کا جو تاریخ کی یاد سے پہلے سے شروع ہو کر عہد غزنوی تک قائم رہے۔

اب اس تمہید کے بعد ہم اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ ابتداء آفرینش سے لیکر عہد غزنوی تک ہند نے عربی زبان و ادب کی کیا کیا خدمتیں کیں یا یوں کہا جائے کہ عربی زبان و ادب کی توسیع و ترقی کے لئے ہند نے کیا کیا مواد بہم پہنچائے۔

۱۔ پہلی چیز جو ہند نے عربی زبان و ادب کو دی وہ سراندیپ میں حضرت آدم علیہ السلام کے ہبوط کی روایت ہے۔ جب مسلمان عرب پہلی بار سراندیپ گئے ہوں گے تو انہوں نے وہاں کے پہاڑ کے غار سے متعلق مقامی روایتیں سن کر ان کو اپنے عقائد کے مطابق ڈھال لیا ہوگا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر سراندیپ نہ ہوتا اور مسلمان عربوں کا گذر وہاں نہ ہوتا تو وہ سب روایتیں جن میں سے چند اوپر مذکور ہوئیں پیدا نہ ہوتیں۔

۲۔ دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات کی وجہ سے عربی زبان میں بہت سے ہندی الفاظ داخل ہو گئے۔ عرب سوداگر جنہوں نے

---

[۱] تفسیر طبری جلد ۳۰ ص ۲۹۸ [۲] ایضاً پارہ ۳۰ ص ۱۹۸ [۳] بلاذری۔ فتوح البلدان ص ۴۳۵
[۴] سید سلیمان ندوی: ہند و عرب کے تعلقات ص ۲۵۹ اور بعد کے صفحات

[illegible] مسالے، کپڑے وغیرہ لے جاتے تھے لہذا یہ فطری تھا کہ ان چیزوں کے اکثر نام انہوں نے ہند کی زبانوں سے مستعار لے کر اپنی زبان میں داخل کرلے۔ ایسے الفاظ کو علم لغت میں دخیل یا معرب کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر چند الفاظ بیان کئے جاتے ہیں:۔

لہ خوشبوؤں اور مسالوں کے نام

موشکا	عربی میں مشک ہوگیا	
چندن	صندل	
کپور	کافور	
کنک پھل	قرنفل	لونگ
کوپل	فوفل	سپاری
ننرنجا بیر	زنجبیل	سونٹھ
ایل	ہیل	(الائچی)
نیلوپھل	نیلوفر	
پپلی	فلفل سیاہ مرچ۔	pepper انگریزی میں
تامبول	تنبول	

ادویہ

جائے پھل	جائفل
تری پھل	اطریفل
بہیڑہ	بلیلج
ہرڑہ	ہلیلج

پھل

ناریل	نارجیل	
آم	انبج	
موشہ	موز	کیلا
لیمو	لیمون	انگریزی میں لیمن ہوگیا

کپڑے

چھینٹ	شیت
پٹ (لنگی)	فوطہ

رنگ

نیل	نیلج	
کرمج	سے	قرمز

بعض صورتوں میں عربی الفاظ کے ساتھ لفظ ہندی لگا دیا گیا۔ مثلاً عود ہندی۔ قسط ہندی۔ تمر ہندی یعنی ہندوستانی کھجور یعنی املی۔ انگریزی میں یہ لفظ Tamarind ہوگیا۔

بحری سفر[لہ] کی وجہ سے کچھ ہندی لفظ عربی میں داخل ہوگئے جنمیں سے تین قابل ذکر ہیں۔

بارجہ جسکی جمع بوارج ہے یہ معرب ہے بیڑے کا مگر اس کے معنی ہیں بحری قزاق کے۔ چونکہ بحری قزاق بیڑوں میں بیٹھکر قزاقی کیا کرتے تھے اس لئے بارجہ قزاق کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ دوسرا لفظ قابل ذکر دونج ہے جس کی جمع دوانج ہے۔ یہ معرب ہے ڈونگی یا ڈونگے کا۔ تیسرا لفظ قابل ذکر ناخودہ ہے جس کی جمع نواخذہ ہے۔ اصل میں یہ لفظ ناوخدا تھا۔ خدا یعنی مالک۔ ناوخدا ناؤ کا مالک۔ فارسی میں ناؤخدا۔ ناخدا ہوگیا۔

جرجی زیدان[سلہ] جو مصر کا مشہور عیسائی فاضل ہے کہتا

لہ عرب و ہند کے تعلقات سلہ ایضاً ص۲۲ سلہ زیدان کی آداب اللغۃ العربیہ جلد اول ص۴۹

عربی کے تین الفاظ[1] مشہور ہیں اور یہ سنسکرت الاصل ہیں ہونکہ یہ الفاظ دوسری سامی زبانوں (یعنی سریانی وعبرانی وغیرہ) میں نہیں پائے جاتے۔

قرآن پاک میں بھی ہندی الاصل الفاظ پائے جاتے ہیں بعض مفسرین نے طوبیٰ اور ابلعی (یا ارض ابلعی مارکس ویانا الخ) کو ہندی الاصل کہا ہے مگر یہ تو لغو ہے۔ تاہم تین ہندی الاصل الفاظ قرآن پاک میں ضرور آئے ہیں۔ ایک تو زنجبیل[2] ہے دوسرا کافور۔ تیسرا مسک[3] چہارم ہندی[4] تو عرب میں خاص طور پر مشہور ہے یا سے مہند، ہندوانی اور ہندی بھی کہتے ہیں۔ یہ کلمات ادب عربی میں بہت مستعمل ہوتے ہیں خود لفظ ہند، عربوں کو اتنا مرغوب ہوا کہ وہ اپنے معشوقوں اور محبوبوں کا یہ نام رکھنے لگے۔

۳۔ تیسری اہم چیز جو ہند نے عربی زبان کو دی وہ ہندسے ہیں اسی وجہ سے ہندسوں کو عربی میں رقوم ہندیہ کہتے ہیں۔ پہلے عربی زبان میں ہندسوں کی بجائے حروف ابجد مستعمل ہوتے تھے۔ تاہینکہ آٹھویں صدی عیسوی میں ہندی ہندسے بغداد پہونچے تو سب سے پہلے محمد بن موسیٰ خوارزمی نے ان کو اخذ کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا استعمال عام ہو گیا۔ یہ ہندسے عربی سے یورپ گئے اس لئے وہاں یہ رقوم[5] عربیہ کہلاتے ہیں۔

۴۔ چوتھا مواد وہ ہے جو مختلف علوم کی سنسکرت کتابوں کے عربی تراجم سے عربی ادب کو ملا۔

دوسری صدی ہجری میں جبکہ خلافت عباسیہ عروج پر تھی اور بغداد میں بیت الحکمۃ اور دار الترجمہ قائم ہوئے تو مختلف غیر زبانوں کی اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہونا شروع ہوا۔ انہی غیر زبانوں میں سنسکرت بھی تھی چنانچہ ہند کے پنڈتوں کی مدد سے بہت سے علوم کی سنسکرت کتب کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ یہاں ہم چند علوم کے تراجم کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

(الف) علم ہیئت و علم حساب عربوں کو ہیئت کا تھوڑا بہت علم ضرور تھا۔ جو غالباً انہوں نے کلدانیوں سے حاصل کیا تھا۔ علم ہیئت کی کتابوں میں سب سے پہلے اس علم کی مشہور ترین کتاب برہمسپت سدھانت کا ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمہ عربی میں السند ہند کہلاتا ہے۔ اس کے دو ترجمے ہوئے۔ پہلا ترجمہ فزاری نے کیا۔ دوسرا ترجمہ مذکورۂ بالا محمد بن موسے خوارزمی نے کیا ہے[6]۔ پھر آریہ بھٹ کا ترجمہ ہوا جسے عربی میں ارجبند کہتے ہیں۔ تیسری کتاب کھنڈ کھادک ہے جو عربی میں آرکند یا ارقن کہلاتی ہے آخر میں البیرونی[7] نے سند ہند پر ایک کتاب لکھی جس کا نام جوامع الموجود فی خواطر الہنود فی حساب التنجیم ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل بیان ہے کہ عربی علم ہیئت میں کم از کم دو[8] لفظ سنسکرت الاصل اب تک رائج ہیں۔ ایک لفظ توجیب ہے جو علم مثلثات کی اصطلاح ہے جو ہندی لفظ جیوا کا معرب ہے اور عربی الاصل لفظ جیب سے مختلف ہے جس کے معنی گریبان کے ہیں اور فارسی میں بھی پاکیٹ استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا لفظ اوج ہے جو ہندی لفظ اوچ کا معرب ہے۔ کتب علم ہیئت کے ترجموں کے ساتھ ہندی حساب کا طریقہ بھی عربی میں منتقل ہوا۔ اور اسی وجہ

[1] [illegible] [2] قرآن پاک سورہ دہر [illegible] [3] قرآن سورہ [illegible] [4] [illegible]
[illegible] [5] [illegible] [6] [illegible] [7] البیرونی [illegible] [8] [illegible]

سے علوم ہندیہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے عربی میں داخل ہو گئیں۔

(ب) علم طب: طب کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ ابن ندیم نے اپنی مشہور کتاب الفہرست میں ایسے ہندی مصنفوں کے نام بیان کئے ہیں جن کی تصانیف سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان مصنفین میں چرک[1] اور سسرت[2] خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو سنسکرت کے مستند ترین مصنف تھے۔ ہندی اطبا کے ناموں کے بیان میں بھی ایک کتاب سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے ان تراجم میں سے کوئی ترجمہ بجز رسالہ شاناق موجود نہیں ہے۔ رسالہ شاناق کا ایک مخطوطہ میں نے برلن لائبریری میں دیکھا تھا۔ یہ شاناق معرب ہے چانکیہ کا جو ہند قدیم کا مشہور مفکر و مصنف ہے۔ اس رسالے کا نام کتاب السموم ہے۔ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چار مقالے ہیں۔ پہلا مقالہ بطور مقدمہ کے ہے جس میں زہر کے خواص بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا استعمال بادشاہوں کے سوا کسی اور شخص کے لئے جائز نہیں۔

دوسرے مقالے میں مختلف قسم کے زہروں کے علامات کا ذکر ہے۔ تیسرے مقالے میں مختلف قسم کے زہر بنانے کی ترکیبیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک ترکیب مثالاً بیان کی جاتی ہے:-

چمگادڑ کا بچہ زہریلے سانپ کو نگلوا دیا جائے پھر اس سانپ کو تانبے کی دیگچی میں بند کر کے گھوڑے میں گاڑ رکھا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد جب سانپ اور چمگادڑ کا بچہ دونوں پھول کی طرح گل سڑ جائیں تو دھوپ میں خشک کر لیا جائے۔ اس سفوف کی ذرا سی مقدار بھی قاتل ہے۔ آخری مقالے میں علاج اور تریاقوں کا ذکر ہے۔ علم کیمیا کی ایک سنسکرت کتاب بھی عربی میں ترجمہ ہوا۔ ترجموں کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ طب سے متعلق کئی الفاظ از قسم اطریفل، طرنجبات وغیرہ علم طب میں مستعمل ہیں۔

(ج) علوم ہیئت و طب کے علاوہ علوم جبّاری و جفر و رمل و شعبدہ جات کی بھی سنسکرت کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔[3] حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ مہابھارت کا بھی عربی قدیم میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ عربی ترجمہ تو ناپید ہے۔ لیکن اس عربی ترجمہ کا فارسی ترجمہ بنام مجمل التواریخ پیرس کی لائبریری میں موجود ہے۔[4] اسی طرح سیاسیات، راجنیتی اور فن جنگ سے متعلق بھی سنسکرت کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان سب کا ذکر ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں کیا ہے۔ منطق میں ہندی منطق کا ترجمہ بنام کتاب حدود منطق الہند ہوا۔ سنسکرت کے معانی و بیان کے ایک رسالے نے بھی عربی جامہ پہنا۔

(د) ابن ندیم کئی سنسکرت قصوں کے نام بیان کئے ہیں جن کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ ان قصوں میں سے تین کلیلہ و دمنہ، الف لیلہ و لیلہ اور بوداسف بلوہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ یہ عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ پنڈت بیدپا نے گجرات کے ایک راجہ کے لئے سنسکرت میں جانوروں کی کہانیوں کی ایک کتاب لکھی تھی جس کا نوشیرواں کے زمانہ میں پہلوی

[1] [illegible] سنسکرت کی کتب طب [2] [illegible] سنسکرت ادب [illegible] [3] ابن ندیم [4] [illegible] عرب کے تعلقات [illegible]

میں ترجمہ ہوا۔ عہد اسلامی میں ابن مقفع نے اسے عربی جامہ پہنایا اور کلیلہ و دمنہ اس کا نام رکھا۔ رودکی شاعر نے اسے نظم کیا ابو المعالی نے اسے فارسی میں نثر میں منتقل کیا پھر ملا واعظ کاشفی نے انوار سہیلی کے نام سے از سر نو فارسی میں لکھا۔ ابو الفضل نے عیار دانش کے نام سے اس کی تلخیص کی۔ کلیلہ و دمنہ عربی ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔ اور زبان و مضمون دونوں لحاظ سے بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ دوسری کتاب الف لیلہ و لیلہ ہے اس کے حصے بھی بڑی حد تک ہندی الاصل ہیں یوزاسف و بلوہر میں بدھ کے حالات بیان کئے گئے ہیں مگر افسانے کا رنگ غالب ہے

۵۔ علوم و فنون کے تراجم کے علاوہ ہند کے دو سنجیدہ کھیلوں نے عربی ادب کی مزید رونق بڑھائی۔ یہ دو کھیل چوسر اور شطرنج ہیں لفظ شطرنج چترنگ کا معرب ہے۔ یہ دو کھیل فلسفے کے دو متضاد مسلکوں کی تمثیل ہیں۔ نرد تو مسلک جبر کی تمثیل ہے کیونکہ چوسر میں ہار جیت پانسے پر منحصر ہے اور وہ کھیلنے والے کے اختیار میں نہیں۔ اسی طرح انسان زندگی کی چوسر میں مجبور محض ہے۔ شطرنج مسلک اختیار کی تشریح ہے کیونکہ ہار جیت کھیلنے والے کی ذاتی قابلیت پر منحصر ہے یعنی بساط حیات پر انسان کی کامیابی و ناکامی اس کی کوششوں پر مبنی ہے۔ ان دو کھیلوں کے متعلق مذہب اسلام میں یہ مسئلہ اہمیت رکھتا ہے کہ آیا نرد اور شطرنج کھیلنا جائز ہے یا نہیں۔ نرد کی بابت تو بالاتفاق فیصلہ ہے کہ حرام ہے کیونکہ اس کا دار و مدار پانسے پر ہے جس پر کھیلنے والے کو کوئی قابو نہیں لیکن شطرنج کی بابت اختلاف ہے۔ حضرت شافعی کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ عربی طلبہ میں یہ فقرہ مشہور ہے الشطرنج اباحنی فتی ہو الشافعی۔ اور ناواقف طالب علم سے امتحاناً اس کے معنی دریافت کرتے ہیں اس کے معنی تو یہ ہیں کہ شطرنج کو میرے لئے ایک جوان نے جو شافعی ہیں مباح کیا لیکن اباحنی کتی ہو الشافعی پڑھنے میں ابا حنیفہ ہو الشافعی آتا ہے۔ اس لئے ناواقف طالب علم اسے ایسا جملہ پاتا ہے جسمیں کوئی فعل نہیں صرف دو اماموں کے نام ہیں لہذا وہ مطلب کہنے سے قاصر رہتا ہے۔ شطرنج کا دار و مدار چوسر کی طرح بخت و اتفاق پر نہیں ہے بلکہ کھیلنے والے کی قابلیت اور مہارت پر ہے۔ لہذا جس طرح تیر اندازی۔ اسپ دوانی اور کشتی وغیرہ کھیل یا آج کل کے فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، ٹینس وغیرہ کھیل جائز ہیں کیونکہ ان سے جسمانی ورزش ہوتی ہے۔ اسی طرح شطرنج بھی جائز ہے کہ اس سے دماغی ورزش ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ہر وہ چیز یا فعل جو انسان کو خدا سے غافل کر دیتا ہے ناجائز ہے۔ اس سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ شطرنج اس حد تک جائز ہے کہ ضرورت سے زیادہ انہماک نہ ہو کہ کہیں نماز وغیرہ کی ادائیگی نہ ہو سکے۔ ضرورت سے زیادہ انہماک کی صورت میں تو ہر جائز چیز ناجائز ہو جاتی ہے۔ یہ ذکر تو ضمناً آگیا ہے متعلقہ بات تو یہ ہے کہ ان دو کھیلوں سے عربی ادب میں کئی استعارات و تشبیہات کا کام لیا گیا ہے۔

۶۔ ہند نے عربی ادب کو جو چیزیں دی ہیں ان میں البیرونی کی کتاب الہند خاص طور پر شمار کی جا سکتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ بعض مصنفین کے نزدیک وہ قصبہ نیرون واقع سندھ کا باشندہ

۱؎ ہند عرب کے تعلقات

[illegible]۔ کیونکہ اس لئے کہ اس کتاب کا نام مواد ہند سے لیا گیا ہے
البیرونی کو عالم ریاضی و عالم ہیئت کی حیثیت سے جو عالمگیر
شہرت حاصل ہے وہ محض اس وجہ سے کہ وہ ہند کے علماء فضلا
کی تصانیف اور ان کی صحبت سے مستفیض و مستفید ہوا۔

۷۔ حضرت ابو حفص ربیع بن صبیح تبع تابعین تھے اور مستند
راوی حدیث بعض کے نزدیک وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی
میں کتاب تصنیف کی آپ سندھ میں تشریف لاکر متوطن ہو گئے[۱]
تھے آپ کی وفات ۱۶۰ھ میں ہوئی۔ آپ نے جو پہلی کتاب
عربی میں لکھی ہوگی وہ حدیث ہی پر ہوگی لہٰذا وہ کتاب جہاں تک
علم حدیث کا تعلق ہے ہند کی طرف سے نذرانہ ہے عربی ادب
کی جناب میں اور اگر انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی تو وہ سب
احادیث جو آپ نے روایت فرمائیں اور جن کی روایت
کے ذریعہ آپ نے علم حدیث کی اشاعت میں مدد دی۔ ہند
کے لئے باعث فخر و ناز ہیں۔

۸۔ جس طرح بے شمار لوگ عرب سے آکر ہند میں سکونت
پذیر ہوئے اسی طرح بہت سے ہندوستانی اصحاب عرب جاکر
آباد ہو گئے۔ ایسے لوگوں کا حال بہت کم معلوم ہے۔ سمعانی نے
کتاب الانساب میں سندھی نسبت کی تحت میں دو نام دیئے
ہیں ایک ابو معشر کا اور دوسرے ابو عطا افلح سندھی کا اول الذکر
محدث تھے اور سیرت نبوی پر سند شمار ہوتے تھے۔ ان کی
عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا
تو خلیفہ ہارون الرشید نے جنازے کی مشایعت کی۔ سمعانی
نے منصوری (دیبلی) دیبلی (ٹھٹھہ) لاہوری اور ہندی نسبتوں
کی تحت میں چند نام دیئے ہیں۔ وہ سب محدثین تھے۔ جب
مقدسی دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تو وہ سندھ
میں بہت سے محدثین سے ملا جن میں سے وہ خاص طور
پر ابو محمد منصوری کا ذکر کرتا ہے جو کئی تصانیف کے مالک تھے
ان تمام محدثین کی تصانیف اور روایت کردہ احادیث
جہاں تک علم احادیث کا تعلق ہے عربی ادب کی خدمت
کہا جا سکتا ہے۔

ابو عطا افلح سندھ کا باشندہ تھا عرب جاکر بنی اسد کا
ہو گیا تھا یہ شاعر تھا۔ اس کی شاعری کے پائے کا اندازہ اس
سے ہو سکتا ہے کہ ابو تمام نے اپنے مشہور حماسے میں اس
کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں۔ کتاب الاغانی کے مصنف نے پانچ
میں اس کا حال لکھا ہے[۳]۔ اس نے اموی و عباسی دونوں عہد
دیکھے ہیں عہد اموی میں اموی خلفا کی مدح لکھتا رہا جب عباسیوں
کا زمانہ آیا تو وہ ان کی شان میں قصائد لکھنے لگا۔ مگر چونکہ وہ ان کے
دشمنوں کی پرزور تعریف کر چکا تھا۔ اسلئے انہوں نے اسکی قدر افزائی نہ کی
اسکی زبان میں تتلاہٹ تھی وہ جیم اور سین کا لفظ ادا نہیں کر سکتا تھا
حتی المقدور ایسے الفاظ نہیں بولتا تھا جنمیں یہ دو حرف آتے ہیں
اسی تتلاہٹ کی وجہ سے وہ اپنے قصائد خود نہیں سنا تا تھا
عطا نامی نوجوان اس کے ساتھ رہتا تھا وہ اس کا کلام سنایا
کرتا تھا۔ یہ نوجوان اُسے اس قدر محبوب ہوا کہ اس نے عطا کو [illegible]
بنا لیا اور اسکے نام سے کنیت اختیار کی۔ ابو عطا افلح کے کلام کو
عربی شاعری کا تعلق ہو ہند کا خراج سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ مختصر سا خاکہ ہے اس مواد کا جو ہند نے عہد غزنوی تک
عربی ادب کو ترقی و ترویج کے لئے بہم پہنچایا۔ اگر اس موضوع پر تفصیل سے
[illegible] جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

[۱] حاجی خلیفہ جلد اول [illegible] [۲] جواہر ہات [illegible] [۳] سمعانی کتاب الانساب [illegible]
[illegible] ۲۲۶ – ۴۹۲ – ۵۹۲ [illegible]

ہندوستان کے قدیم مسلم سکہ جات پر ایک نظر*

(از مولوی ظفر حسن صاحب پنشنر ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ)

اہمیت سکہ خرید و فروخت میں ذریعہ تبادلہ ہونے کے علاوہ سکہ کو سیاسی اور تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے
[اس]لامی تہذیب و تمدن نے سکہ کی اس اہمیت میں نمایاں [اض]افہ کیا۔ وہ نشان و دلیل حکومت متصور تھا۔ یعنی سوائے حاکم [و]قت کے کوئی دوسرا شخص اپنے نام کا سکہ رائج نہیں کر سکتا تھا [س]لاطین تخت نشینی کے وقت اپنے نام کا سکہ جاری کرتے [تھ]ے اور وہ مثل خطبہ اعلان تخت نشینی ہوتا تھا۔ اسی طرح ایک [حکمر]ان کسی دوسرے بلند مرتبہ حکمران سے اظہار اطاعت و وفاداری [می]ں آخر الذکر کا نام اپنے سکہ پر درج کرتا تھا۔ اس کی مثال [سلاطین د]ہلی کے وہ سکے ہیں جن پر خلفائے عباسیہ کے نام درج ہیں۔
[ع]بارت سکہ میں مذہب علیٰ و گر تھا جو اسلامی تہذیب و تمدن پر [ہم]یشہ حاوی رہا ہے چنانچہ القاب سلاطین مذہبی رنگ میں ہوتے [تھ]ے اور اکثر سکوں پر کلمہ طیب، آیات قرآنی، احادیث نبوی [و] دعائیہ فقرے مندرج ہوتے تھے۔ سن ضرب اور ٹکسال کے اندراج سے سکے کو تاریخی حیثیت حاصل تھی۔ حکومت [ک]ے لئے سکہ بمنزلہ امانت تھا اور وہ اس کے وزن و کھوٹ [ک]ے ہاکی کی ذمہ دار تھی۔ سکوں کی اصلی قیمت دھات متعلقہ کے ہموزن ٹکڑوں کی قیمت کے مساوی مانی جاتی تھی یعنی مسلم کرنسی اسٹرلنگ کرنسی تھی۔ . . . .
. . . . ہندوستان کے مسلم سکہ جات ان خصوصیات کے حامل ہیں۔

ایک عرصہ دراز تک ان سکہ جات میں سونے چاندی اور تانبے کے سکوں کے علاوہ ایک مصنوعی دھات کے سکے بھی شامل رہے۔ اس مصنوعی دھات میں تانبہ اور قدرے چاندی کی آمیزش تھی۔ انگریزی اصطلاح میں اس مصنوعی دھات کو بلن (Billon) کہتے ہیں جس کا اردو ترجمہ ملون کیا جا سکتا ہے۔ ملونی سکوں کا رواج مسلم کرنسی کو ہندو کرنسی سے ورثہ میں ملا تھا۔

ہندوستان کی قدیم اسلامی کرنسی

محمد بن قاسم کی فتوحات سندھ اور محمود غزنوی کے حملوں کے قطع نظر ہندوستان میں اسلامی حکومت کی ابتدا معز الدین محمد بن سام کی فتح دہلی سے ہوتی ہے جو ۵۸۹ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں واقع ہوئی۔ ہندو کرنسی اس زمانہ میں

* مقالہ میں مولوی ظفر حسن صاحب کے ... سلسلہ مضامین کے اقتباسات شامل ہیں جو ... میں شائع ہو چکا ہے۔

سونے اور ملون کے چھوٹے چھوٹے ریزوں پر مشتمل تھی۔ طلائی سکوں کے رُخِ راست پر لکشمی دیوی کی تصویر تھی اور رُخِ چپ پر راجہ کا نام تھا۔ ملونی سکوں کے رُخِ راست پر شیوا کے بیل کی شکل اور راجہ کا نام تھا اور رخ چپ پر ایک گھوڑے سوار کی شبیہ تھی۔ مسلمانوں نے ہندو کرنسی میں فوراً تبدیلی مناسب نہ سمجھی اور اُس کو موجودہ حالت پر برقرار رکھا اپنے سکے بھی اسی وضع اور قطع کے جاری کئے اور صرف اس قدر تبدیلی روا رکھی کہ ہندو راجہ کے نام کے بجائے مسلمان بادشاہ کا نام اور وہ بھی بخط ناگری اُن پر درج کیا۔ ملونی سکوں کے رُخ چپ پر جہاں صرف ایک گھوڑے سوار کی شبیہ تھی سری حمیر مزید کندہ کیا۔ سری ہمیر ہندی میں امیر کے لقب کو ظاہر کرتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ عمل رعایا کے لئے جو عام طور پر ہندو تھے سہولت کی بنا پر تھا۔ ان کو یہ احساس ہوا کہ کرنسی کی فوراً تبدیلی سے خرید و فروخت اور کاروبارِ تجارت میں ابتری پیدا ہوگی اور مخلوق خدا کو تکلیف اور دقت کا سامنا کرنا ہوگا ورنہ غور اور غزنی میں اسلامی کرنسی رائج تھی اور اس کا اجرا مفتوحہ ملک ہندوستان میں دشوار نہ تھا۔ یہ خیال رہے کہ ہندو کرنسی پر تصاویر تھیں جو اسلامی عقیدہ و تعلیم کے منافی تھیں لیکن رعایا کی سہولت کی خاطر مسلمانوں نے یہ کراہیت گوارا کی۔ یہ ہی وہ مسلمان تھے جن کو زمانہ حال کے یورپین اور غیر مسلم مورخین نے متعصب، مذہبی دیوانوں، خونخوار، اور ظالموں کی شکل میں دکھایا ہے۔ اُن کے قدیم سکے بمصداق "مشتے نمونہ از خروارے" اُن کی مذہبی رواداری، انسانی ہمدردی، رعایا پروری اور سیاسی تدبر کی ادنیٰ مثال ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

مسلمانوں نے ہندو کرنسی میں تبدیلی کی لیکن رفتہ رفتہ و بتدریج۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ہندو کرنسی سونے اور ملون کے چھوٹے چھوٹے ریزوں پر مشتمل تھی۔ سونے کے سکے تو خال خال تھے لیکن ملونی سکے کرنسی پر قبضہ کئے ہوئے تھے مسلمانوں نے بھی اس پر عمل کیا۔ چنانچہ ان کے ابتدائی طلائی سکے ہندو وضع کے کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ ملونی سکے اس قسم کے کثرت سے ملتے ہیں۔ ہندو کرنسی میں پہلی تبدیلی مسلمانوں نے یہ کی کہ اس میں تانبہ کے سکوں کا اضافہ کیا اور ان پر عبارت بزبان و خط عربی درج کی۔ ان کے بھی بعض بعض اقسام پر بیل اور گھوڑے کی تصاویر اور ناگری خط میں بادشاہ کا نام برقرار رکھا۔ ملونی سکوں میں نئی صنعتیں اختراع کیں جن پر سلطان کا نام و لقب عربی خط میں درج کیا۔ اس کے بعد نقرئی سکہ کا اضافہ ہوا اس پر عربی عبارت درج کی گئی اور یہ سکہ قطعی اسلامی وضع کا تھا۔ وزن اُس کا ایک تولہ تھا یہ ہی وضع طلائی سکہ نے بھی اختیار کی۔ طلائی اور نقرئی سکے قدیم ہندو کرنسی سے مختلف ایک جدید یعنی اسلامی کرنسی کے مظہر تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ملونی تصویری سکوں کی وضع میں تبدیلی عمل میں آئی۔ اولاً رُخِ راست پر بیل کی شکل اور بادشاہ کا نام ناگری خط میں متروک ہوئے اور ان کی جگہ عربی عبارت نے لی۔ بعدہ رُخِ چپ پر گھوڑے سوار کی شبیہ بھی مبدل بہ عربی عبارت ہوگئی جس کے ساتھ بادشاہ کا نام ناگری خط میں درج کیا گیا۔ تصاویر کی قطعی برطرفی غیاث الدین بلبن کے اختتام حکومت پر عمل میں آئی جس کا انتقال ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۸۷ء میں ہوا۔ لہٰذا اسلامی کرنسی میں ہندو تصویری سکے ۱۱۹۵ء سے ۱۲۸۶ء تک تھے

پورا نوے سال تک رائج رہے اور تصاویر کی برطرفی بتدریج ہوئی۔ ناگری خط میں سلطان کے نام کے اندراج کی رسم ملوتی سکوں پر غیاث الدین تغلق کے دور حکومت تک رہی محمد شاہ تغلق نے اس کو ترک کر دیا جس کا اتباع سلاطین سید و لودی نے بھی کیا۔ شیر شاہ سوری نے اس رسم کو پھر جاری کیا اور سلاطین سوری کے طلائی اور نقرئی سکوں پر عربی عبارت کے ساتھ ناگری خط میں سلطان کا نام ملتا ہے۔ سوری حکومت کے بعد یہ رسم ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اسلامی کرنسی میں ملونی سکہ کا رواج لودی سلطنت کے اختتام تک رہا۔ سلاطین سوری کے سکے اس دھات کے نہیں ملتے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی کرنسی میں اس مصنوعی دھات کا استعمال شہنشاہ بابر نے ترک کیا اور سلاطین سوری نے اس کا اتباع کیا۔ . . . .

. . . . . شاہان مغلیہ کے دور حکومت میں ہندوستان کی کرنسی قطعی طور پر اسلامی کرنسی ہو گئی اور ہندو کرنسی کا کوئی نشان اُس میں باقی نہ رہا۔

اس تمہید کے بعد چند مسلمان حکمرانوں کے سکوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے جو دہلی کے تخت شاہی پر متمکن ہوئے اور انہوں نے اپنے نام کے سکے جاری کئے ان سکوں سے اسلامی کرنسی کی نوعیت کا پتہ چلے گا نیز اُن تبدیلیوں کا جو وقتاً فوقتاً ہندو کرنسی میں عمل میں آئیں اور آخر کار اس ملک کی کرنسی نے خالص اسلامی کرنسی کی وضع اختیار کر لی یہ خیال رہے کہ ہند مسلم سلطنت کے ابتدائے قیام سے آخر تک اُس کا دارالخلافہ دہلی رہا اور وہ اب تک اس برصغیر میں اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ متصور ہوتا ہے لہٰذا مضمون ہٰذا میں شاہان دہلی کے سکوں پر اکتفا کیا گیا ہے اور صوبائی حکومتوں کے مسکوکات کا ذکر نہیں ہے۔

معزالدین محمد بن سام

زمانہ سلطنت ۵۸۹ھ تا ۶۰۲ھ مطابق ۱۱۹۳ء تا ۱۲۰۶ء۔

محمد بن سام نے اجمیر کے راجہ مسمی رائے پتھورا کو تلاوڑی کے میدان میں شکست دے کر اُس کی راجدھانی اجمیر پر قبضہ کیا۔ رائے پتھورا جنگ تلاوڑی میں گرفتار ہو کر قتل ہو چکا تھا۔ . . . .

. . . . محمد بن سام نے اپنی بے مثال فراخ دلی و فیاضی سے رائے پتھورا کے بیٹے کو اجمیر کا حاکم مقرر کیا اور وہاں سے دہلی کا رُخ کیا جس پر آسانی سے اُس کا قبضہ ہو گیا۔ ان فتوحات سے ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی جس کا دارالحکومت دہلی منتخب ہوا۔ محمد بن سام اس مفتوحہ ملک کا حاکم قطب الدین ایبک کو مقرر کر کے غزنی کو واپس چلا گیا۔

قطب الدین ایبک نے محمد بن سام کے نام کے سکے رائج کئے جو ہندو کرنسی کے مطابق تھے وہ سونے اور ملون کے چھوٹے چھوٹے ریزے ہیں۔ طلائی سکے کے رُخ راست پر لچھمی دیوی کی تصویر ہے جو چار زانو بیٹھی ہوئی ہے اور رُخ چپ پر سری ہمیر محمد سام ناگری خط میں کندہ ہے۔ ملونی سکوں کے رُخ راست پر بیل کی تصویر اور اُس پر سری محمد سام ناگری خط میں درج ہے۔ رُخ چپ پر گھوڑے سوار کی تصویر اور اُس پر سری ہمیر ناگری خط میں منسج ہے۔ عام طور پر محمد بن سام کے سکے اس وضع کے ملتے ہیں [illegible] ملونی

سکے ایسے بھی ملتے ہیں جن پر ناگری تحریر کے علاوہ عربی تحریر بھی ہے لیکن ایسے سکے بہت کمیاب ہیں۔

اپنے دورِ حکومت کی ابتدا سے مسلمانوں نے ہندوستانی کرنسی میں مسی یا تانبہ کے سکے شامل کئے جو طلائی سکہ کے مقابلہ میں بہت کم قیمت تھے۔ اُن پر زیادہ تر عربی عبارت صرف کی جاتی تھی۔ محمد بن سام کے تانبہ کے سکہ ملتے ہیں جنکے رُخ راست پر معزالدین اور رُخ چپ پر فالدین درج ہے بعض سکوں کے رخ راست پر معز اور رخ چپ پر عدل ہے۔

ظاہر ہے کہ مسی سکوں کا اجرا کرنسی کی ترقی اور توسیع کے لئے کیا گیا تھا کہ غریب اور مفلس رعایا میں بھی سکہ کا استعمال عام ہوجائے اور وہ بھی کرنسی سے مستفید ہو سکیں تعجب ہے کہ ہندو کرنسی میں تانبہ کے سکے مفقود تھے۔ اس سے یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندو محلیت ملی اور قومی سرمایہ داری ذہنیت کے تھے اور حکومت نے اس ذہنیت کی حمایت میں غربا اور مفلسوں کی سہولت کے لئے کم قیمت تانبہ کے سکے جاری کرنے کی پرواہ نہ کی۔

شمس الدین التمش

زمانہ حکومت ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۵ء

التمش نے کرنسی میں خاص طور پر اظہار دلچسپی کیا۔ اس میں ترمیمات کیں اور اس کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی ابتدا کی۔ التمش نے نقرئی یعنی چاندی کا سکہ جاری کیا جس کا وزن ایک تولہ تھا اور اس پر کلمۂ طیب، خلیفہ بنو عباس کا نام ٹکسال کا نام، اور سن ضرب درج کیا۔ یہ طرز عبارت آئندہ اسلامی سکوں کے لئے ایک حد تک نمونہ ہو گئی اور بعدہٗ سلاطین ہندوستان نے اس عبارت کو قدرے تغیر اور تبدل سے اپنے سکوں پر درج کیا۔

التمش کا نقرئی سکہ

رُخ راست (وسط میں) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ المستنصر باللہ امیر المومنین۔ (چوٹی پر) دہلی (حاشیہ پر) ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین۔

رُخ چپ (وسط میں) السلطان الاعظم شمس الدنیا والدین ابو المظفر ایلتمش السلطان (چوٹی پر) دہلی (حاشیہ پر) ضرب فی شہور سنہ ثمان وعشرین وستمایہ۔

التمش کا دوسرا نقرئی سکہ

رُخ راست (وسط میں) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ الناصر لدین اللہ امیر المومنین (حاشیہ پر) تدالضرب فی شہور سنہ اثنی عشرین وستمایہ۔

رُخ چپ۔ السلطان المعظم شمس الدنیا والدین ابو المظفر ایلتمش السلطان یمین خلیفۃ اللہ ناصر امیر المومنین۔

التمش کے طلائی سکے بہت کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ ایک دو سکے جو ملے ہیں وہ اُس کے نقرئی سکہ کے مطابق ہیں۔ اُس نے چھوٹے چھوٹے طلائی سکے یعنی دینار کی قسم کے جاری نہیں کیے۔ البتہ طلائی سکہ کے رُخ راست وسط میں گھوڑے سوار کی تصویر ہے اور حاشیہ پر عربی عبارت درج ہے۔ اس وضع کے بعض نقرئی سکے بھی ملتے ہیں۔ التمش نے طلائی سکے بھی الگ نہیں وضع کے جاری…

سکے عربی کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر عبارت زیادہ تر عربی زبان میں ہے۔ اس نے متعدد ٹکسالیں قائم کیں تو فیروز کا جانشین سے کرنسی کو ہر دلعزیز بنایا اور اس کو وسعت دی ۔۔۔ ۔۔۔ تانبے کے چھوٹے چھوٹے سکے جن میں سے بعض کا وزن ایک ماشہ تک تھا جاری کئے تاکہ غریب و مفلس عوام بھی کرنسی سے مستفید ہو سکے۔ التمش کے تانبے کے سکے التزام وضع کے ملتے ہیں کہ ان کے دونوں رُخ پر عربی عبارت درج ہے۔

التمش کا مسی سکّہ

رُخِ راست ۔ عدل السلطان
رُخِ چپ ؛ شمس الدنیا والدین

التمش کا دوسرا مسی سکّہ

رُخِ راست ؛۔ التمش
رُخِ چپ ؛۔ السلطان

سلطانہ رَضیَہ

زمانہ سلطنت ۶۳۴ھ تا ۶۳۷ھ مطابق ۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء

سلطانہ رضیہ شمس الدین التمش کی دختر تھی۔ اپنے بھائی رکن الدین کی معزولی کے بعد وہ تخت شاہی پر رونق افروز ہوئی اور جلالۃ الدنیا والدین کا لقب اختیار کیا۔ سلطانہ رضیہ کے علاوہ اسلامی حکومت میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملتی کہ صنفِ نازک کے کسی فرد نے تاج و تخت شاہی کو رونق بخشی ہو۔ اس کے سکوں کی عبارت جب اس کے القاب شامل ہیں خالی از دلچسپی نہیں۔

سلطانہ رضیہ کے طلائی سکے نایاب ہیں ابھی تک کسی کا پتہ نہیں چلا۔ چاندی کے سکہ کے لئے لفظ نقرہ مستعمل ہوا ہے جس کے معنی چاندی کے ہیں۔

سلطانہ رضیہ کا نقرئی سکہ

رُخِ راست : (وسط میں) فی عہد الامام المستنصر امیر المومنین (حاشیہ پر) ضرب ؛ ہذا الفضہ بلکھنوتی فی شہور سنہ اربع ثلثین ستمائیۃ ۔

رُخِ چپ (وسط میں) السلطان الاعظم جلالۃ والدین ملکۃ التمش ابنت السلطان ناصرۃ امیر المومنین

سلطانہ رضیہ کا ملونی سکّہ

رُخِ راست ؛۔ السلطان الاعظم رضیہ الدنیا والدین۔

رُخ چپ ؛ گھوڑے سوار کی تصویر اور ناگری خط میں سری ہمیر

سلطانہ رضیہ کا مسی سکہ

رُخِ راست ؛۔ بیل کی تصویر اور ہندی عبارت
رُخِ چپ ؛۔ رضیہ

غیاث الدین بلبن

زمانہ سلطنت ۶۶۴ھ تا ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء

بلبن نے بہت سی نئی ٹکسالیں قایم کیں۔ ملونی سکوں میں مزید تبدیلیاں کیں۔ بیل اور گھوڑے سوار کی تصاویر کے بجائے عربی عبارت درج کی لیکن ہندی عبارت قایم رہنے دی۔

بلبن کا سونے کا سکہ

رُخِ راست :(وسط میں) الامام المستعصم امیر المومنین (حاشیہ پر) ضرب ہذا السکہ بحضرت دہلی فی سنہ احدی و سبعین و ستمائۃ

رُخِ چپ : (وسط میں) السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین ابو المظفر بلبن السلطان (حاشیہ پر) ضرب ہذہ السکہ بحضرت دہلی فی سنہ احدی و سبعین و ستمایہ۔

چاندی کے سکّوں پر عبارت مثل سونے کے سکّوں کے ہے۔ البتہ بعض بعض پر بجائے سکہ کے فضہ درج ہے۔

بلبن کا ملونی سکّہ

رُخِ راست :۔ السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین

رُخِ چپ :۔ (وسط میں) بلبن (حاشیہ پر) ناگری خط میں سری سلطان غیاث دین۔

بلبن کا مسی سکہ

رُخِ راست :۔ السلطان المعظم

رُخِ چپ :۔ غیاث الدنیا والدین

علاالدین خلجی

زمانہ سلطنت ٦٩٥ھ تا ٧١٥ھ مطابق ١٢٩٦ء تا ١٣١٦ء

علاالدین حکومت و بادشاہی کے لئے ہمہ صفت موصوف تھا۔ اُس کو مثل سکندر افسانوی کے روئے زمین پر حکومت کی آرزو و خواہش تھی۔ چنانچہ اُس نے لقب سکندر الثانی اختیار کیا اور اپنے سکوں پر یہ لقب درج کیا۔ خلیفہ عباسیہ کا نام اپنے سکوں پر سے ترک کر دیا لیکن اظہار اطاعت کے لئے القاب یمین الخلافت اور ناصر امیر المومنین اُن پر درج کیا۔

ملونی سکوں پر سن ضرب اب تک رونما نہیں ہوا تھا علاالدین نے اس کی ابتدا کی اور یہ رسم سلاطین مابعد کی کرنسی میں جاری رہی۔

علاالدین خلجی کا طلائی سکّہ

رُخِ راست : السلطان الاعظم علا الدنیا والدین ابوالمظفر محمد شاہ السلطان۔

رُخِ چپ :۔ (وسط میں) سکندر الثانی یمین الخلافۃ ناصر امیر المومنین۔ (حاشیہ پر) ضرب ہذہ السکہ بحضرت دہلی فی سنہ ست و تسعین و ستمایہ۔

علاالدین کے نقرئی سکّے مثل طلائی سکوں کے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ اُن پر بجائے سکّہ کے فضہ درج ہے

علاالدین کا ملونی سکّہ

رُخِ راست :۔ السلطان الاعظم علا الدنیا والدین

رُخِ چپ:- ابو المظفر محمد شاہ السلطان ۷۰۱

دوسرا ملونی سکہ

رُخِ راست:- السلطان الاعظم علا الدنیا والدین۔

رُخِ چپ:- (وسط میں) محمد شاہ (حاشیہ پر) ناگری خط میں سری سلطان علا الدین اور ۷۰۸ ناگری ہندسوں میں ہے۔

علا الدین کا تانبہ کا سکہ

رُخِ راست:- السلطان الاعظم

رُخِ چپ:- علا الدنیا والدین

محمد بن تغلق

زمانہ سلطنت ۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء۔

محمد بن تغلق کا اصلی نام فخر الدین جونا تھا۔ اپنے باپ غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بعد ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں محمد بن تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ ہمہ صفت موصوف تھا۔ فرائض جہانبانی اور امور سلطنت میں از حد توجہ کرتا اور ان کو خود انجام دیتا۔ چنانچہ حسب عادت اس نے کرنسی میں بھی دلچسپی لی اور اس میں بہت کچھ تغیر وتبدل کیا سکوں پر ہندی عبارت ترک کردی اور صرف عربی عبارت ان پر درج کی یہ رسم سلاطین لودی کے اختتام حکومت تک جاری رہی۔ مزید نئی ٹکسالیں قائم کیں اور سکوں پر سن ضرب اور ٹکسال کے نام کے اندراج کو رواج دیا۔ محمد بن تغلق نے متعدد وضع (طرز) اقسام کے سکے رائج کئے۔ جو تاریخی معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ مورخین قدیم و حال نے اس پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں اور اسکو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ ان الزامات میں سے بعض کی تردید اس کے سکوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً:-

(الف) پدر کشی

(ب) باشندگان دہلی کی دولت آباد کو جبریہ منتقلی بسلسلہ تبدیلی دار الخلافہ۔

(ج) کھوٹی کرنسی کا جبریہ اجرا۔

الزام پدر کشی

اس الزام کا ماخذ سفرنامہ ابن بطوطہ ہے۔ وہ مراکش کا باشندہ تھا۔ بغرض سیر و سیاحت ہندوستان آیا۔ محمد بن تغلق نے اس کی آؤ بھگت کی۔ کچھ عرصے ہندوستان میں مقیم رہ کر وہ اپنے وطن کو واپس گیا راستہ میں اس کا جہاز طوفان سے تباہ ہوگیا اور کل سامان جو اس کے ساتھ تھا ضائع ہوگیا۔ لہٰذا اس کا سفرنامہ محض یادداشت پر مبنی ہے جس سے اس کی صحت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال ابن بطوطہ نے اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ محمد بن تغلق اس حادثہ کا ذمہ دار تھا جو غیاث الدین تغلق کی وفات کا باعث ہوا۔

مضمون ہٰذا میں ہمارا تعلق سکہ جات سے ہے لہٰذا اس حادثہ کی تفصیل اور ابن بطوطہ کے بیان کی تحقیق و تنقید بے محل ہوگی۔ محمد بن تغلق کے سکوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے دورِ حکومت کی ابتدا میں چند سکے اپنے والد کے

ث الدین تغلق کے نام کے جاری کیے جن پر سلطان
کا نام اس عزت و احترام سے درج ہے جو ایک
وت مند فرزند کو اپنے شفیق پدر سے لازم تھا۔ ایسے
طلائی نقرئی اور ملونی ہر دھات کے ملتے ہیں۔ ظاہر
کہ ان سکوں کا اجرا غیاث الدین تغلق کی وفات کی
گار کے طور پر ہوا۔

یادگاری طلائی سکہ

رُخِ راست:۔ السلطان السعید الشہید الغازی
ث الدنیا والدین۔

رُخِ چپ:۔ (وسط میں) ابوالمظفر تغلق شاہ
سلطان انار اللہ برہانہ (حاشیہ پر) ضرب ہذہ السکہ فی
رۃ تغلق آباد سنہ ست وعشرین وسبعمایہ

یادگاری نقرئی سکہ

رُخِ راست:۔ وہ ہی عبارت جو طلائی سکے پر ہے
رُخِ چپ:۔ وسط میں وہ ہی عبارت جو طلائی
سکے کے وسط میں ہے (حاشیہ پر) ضرب ہذہ السکہ فی ملک
تلک سنہ خمس وعشرین وسبعمایۃ

یادگاری ملونی سکہ

رُخِ راست:۔ وہ ہی عبارت جو طلائی سکہ پر ہے
رُخِ چپ:۔ وہ ہی عبارت جو طلائی سکے کے وسط
میں ہے۔ لیکن اس کے نیچے سن ضرب ۷۲۹ درج ہے
ہندسوں میں ہے۔

الزام باشندگان دہلی کی دولت آباد کو جبرہ منتقلی

دارالخلافت سے بعد اور دور دراز فاصلہ کی وجہ سے ملک دکن میں آئے دن بغاوت اور فتنہ و فساد برپا ہوتے تھے جن کے رفع کرنے اور اقتدار حکومت برقرار رکھنے کے لئے فوج کشی کی ضرورت ہوتی تھی۔ محمد بن تغلق کو اس کا حل یہ نظر آیا کہ دارالخلافہ دہلی سے دکن کو تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہاں شاہی قیام سے اس شور و شر کا سدباب ہو سکے۔ چنانچہ دیوگیر دارالخلافہ کے لئے منتخب ہوا۔ اس کا نیا نام دولت آباد رکھا گیا جس پر خطابات قبتہ الاسلام اور دارالملک کا اضافہ کیا گیا۔ یہ تبدیلی دارالخلافہ سنہ ۷۳۰ھ میں عمل میں آئی۔ لیکن محمد بن تغلق کو اس تدبیر سے بھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ دہلی میں مستقل حکومت نہ رہنے کی وجہ سے صوبجات مغربی و شمالی میں بغاوت اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا اور اب اس کو دولت آباد سے ان مقامات پر رفع شور و شر کے لئے فوج کشی کرنی پڑی۔ اس تجربہ سے محمد بن تغلق کو معلوم ہوا کہ تبدیلی دارالخلافت کی تدبیر اس کی وسیع مملکت میں تنظیم حکومت کے لئے خاطر خواہ کارگر نہ ہوئی۔ اس نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور اس سے رجعت کی۔ سنہ ۷۳۵ھ میں وہ دولت آباد سے ترک اقامت کر کے مع خدم و حشم دہلی کو واپس ہوا جس نے تقریباً پانچ سال کے بعد پھر مرکزیت دارالخلافہ پر سرفرازی حاصل کی۔

دارالحکومت کی تبدیلی ایک معمولی بات ہے جو

ہر ملک اور ہر زمانہ میں حسب ضرورت پیدا ہوتی رہی ہے محمد بن تغلق پر یہ الزام ہے کہ اُس نے باشندگان دہلی کو ترک سکونت کرکے دولت آباد کو جانے کے لئے مجبور کیا اور تبدیلی دار الخلافہ اس طرح عمل میں آئی کہ دہلی کی کل آبادی جبریہ دولت آباد کو منتقل کی گئی جو دہلی کی ویرانی اور ساکنانِ دہلی کی تباہی کا باعث ہوئی۔ اس الزام کا ماخذ بھی سفرنامہ ابن بطوطہ ہی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ محمد بن تغلق کا منشا تبدیلیِ دار الخلافہ سے دہلی کے تمام باشندگان کو دولت آباد لے جانا تھا اور اُس کا یہ حکم تھا کہ کوئی متنفس خواہ وہ لولا لنگڑا، اندھا اور اپاہج بھی ہو دہلی میں مقیم نہ رہنے پائے بقول ابن بطوطہ ایسا ہی عمل میں آیا اور دہلی قطعی غیر آباد و بے چراغ ہو گئی۔ ابن بطوطہ کے اس غلو و مبالغہ پر مورخین نے مزید حاشیہ آرائی فرمائی ہے۔ مطالعہ سکہ جات سے اس امر کی تردید ہوتی ہے کہ دہلی بحکم محمد تغلق تبدیلیِ دار الخلافہ کے ذیل میں خالی از نفوس انسانی ہو گئی۔ متعدد سکے محمد بن تغلق کے ایسے ملتے ہیں جو ۷۲۷ھ سے لیکر ۷۳۲ھ تک ٹکسال دہلی سے جاری ہوئے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جبکہ دولت آباد دار الحکومت رہا دہلی سے سکہ جات برابر جاری ہوتے رہے۔ اور یہ دہلی کے نفوس انسانی سے خالی ہونے کی حالت میں ممکن نہ تھا نہ اس کی ضرورت تھی۔ یہ سب سکے علامتی کرنسی کے ہیں جو کھوٹی کرنسی کے نام سے مشہور ہے اور جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ جس زمانہ میں دولت آباد دار الحکومت قائم کیا گیا محمد بن تغلق نے علامتی کرنسی جاری کی تھی لہٰذا اس زمانہ کے سب سکے علامتی کرنسی کے ہیں۔

الزام کھوٹی کرنسی

محمد بن تغلق سکہ کی غرض و غایت سے بخوبی واقف تھا کہ وہ خرید و فروخت میں محض ذریعہ تبادلہ ہے۔ اُس کو اس کا بھی احساس تھا کہ ملک میں قیمتی دھاتوں یعنی سونے اور چاندی کی قلت ہے جس کی وجہ سے کرنسی میں طلائی اور نقرئی سکوں کی کمی ہے اور یہ کمی فروغ تجارت میں رکاوٹ کا باعث ہے لہٰذا اس نے یہ تدبیر کی کہ خالص کرنسی کو جس کے مطابق سکہ اپنی ذاتی قیمت پر چلتا تھا ترک کر دیا اور محض تانبہ کی کرنسی جاری کی جس میں سکہ کی ذاتی قیمت کا لحاظ نہ تھا بلکہ اُس کی قیمت منجانب حکومت مقرر کردہ تھی جس کی ضامن حکومت تھی۔ یہ کرنسی فی زمانہ ٹوکن کرنسی (Token Currency) کہلاتی ہے اور ہم نے اس کا اُردو ترجمہ علامتی کرنسی کیا ہے محمد بن تغلق نے علامتی کرنسی کو جو فی زمانہ ہر مہذب و متمدن ملک میں علامتی کرنسی کے نام سے رائج ہے اور تہذیب و ترقی کا طرۂ امتیاز ہے چھ سو برس سے زیادہ ہوئے کہ جاری کیا تھا لیکن اُس کی علامتی کرنسی کو کھوٹی و جبریہ کرنسی موسوم کیا گیا ہے اور اُس کا اجرا سفلتی پر محمول ہوا ہے۔ یہ علامتی کرنسی تقریباً دو سال ۷۳۰ھ سے ۷۳۲ھ تک رائج رہی۔ اس کو بھی وہ ہی دقتیں اور مصیبتیں پیش آئیں جو فی زمانہ علامتی کرنسی میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی تلبیس سکہ۔ اُس زمانہ میں مشینیں اور کلیں نہ تھیں کہ ٹکسالی سکے اُن سے تیار ہوتے اور کوئی امتیاز اُن میں ایسی کی جاتی جو دستکاری سے ناممکن ہوتی ٹکسالی سکے سناروں کی دستکاری سے تیار ہوتے تھے۔ علامتی سکے کی افزائش قیمت نے اس قسم کے جعلی سکوں کی ازدیاد ونفاذ میں

کردی۔ بقول ضیاء الدین مصنف تاریخ فیروز شاہی ہر سنار
مرادوکان ٹکسال بن گیا جو تانبہ کو سکہ کی صورت میں ڈھال کر مقررہ
قیمت پر فروخت کرتا تھا جعلی سکوں کی شناخت اور پرکھنے
کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور وہ ٹکسالی کے مقصود ہو کر بغیر کسی روک
سے کے رائج تھے محمد بن تغلق تلبیس سکہ کی روک
تھام نہ کر سکا اور یہ دیکھ کر کہ علامتی کرنسی خرید و فروخت میں سہولت
پیدا کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کے بجائے رعایا اور حکومت
کو مضرت رساں اور نقصان دہ ہے اس نے علامتی کرنسی کا اجرا
بند کر دیا۔ یہی نہیں کیا کہ اس کرنسی کو ممنوع قرار دیا بلکہ اسکی
جو ذمہ داری حکومت پر عائد تھی وہ بھی بخندہ پیشانی پوری طور پر
ادا کی۔ یعنی اس نے رائج شدہ کل علامتی سکے خواہ وہ ٹکسالی تھے
یا جعلی مقررکردہ قیمت پر واپس لے لیے۔ چنانچہ ضیاء الدین
برنی کے بیان کے مطابق علامتی سکوں کے انبار و ڈھیر دار الحکومت
میں لگ گئے اور خزانہ شاہی سونے اور چاندی سے خالی ہو گیا۔

یہ الزام کہ محمد بن تغلق کی علامتی کرنسی کھوٹے سکوں پر
مشتمل تھی جن کا اجرا جبریہ عمل میں آیا سراسر غلط اور بے بنیاد
ہے۔ طلائی کرنسی پر کھوٹ کا اطلاق ہی نہیں ہوتا جبکہ ہوتا
سکہ کی قیمت کا انحصار اس کی ذاتی قیمت پر نہیں ہوتا بلکہ
سکہ کی قیمت معین کردہ حکومت ہوتی ہے۔ رہا جبریہ اجراء
اس کا روایت یا درایت سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ تاریخ تو
اس بارہ میں خاموش ہے کہ محمد بن تغلق نے اپنی علامتی کرنسی
کی ترویج میں کوئی تعزیری رویہ اختیار کیا۔ خود علامتی
سکوں پر بھی اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ بلکہ ان پر جو مختلف
اقسام کی عبارت درج ہے وہ مشتمل ہے آیات قرآنی و احادیث
نبوی پر ہے جن سے مراد متعلقہ سکوں کی مقبولیت کی ترغیب ہے

بعض سکوں پر ان کی قیمت بھی درج ہے جو کہ والا خالص کرنسی
یعنی اسرفی تنکہ کرنسی کے معین کی گئی تھی اور یہ حوالہ طلائی اور
نقرئی سکہ جات تک محدود تھا یعنی علامتی سکے طلائی سکوں کی
قیمت کے نہ تھے۔ بطور نمونہ چند علامتی سکوں کی عبارت پیش
کی جاتی ہے۔

(۱) علامتی سکہ سادہ

رُخِ راست :- من اطاع السلطان۔ محمد ۷۳۰ھ

رُخِ چپ :- فقد اطاع الرحمٰن۔ تغلق

(۲) علامتی سکہ سادہ

رُخِ راست :- اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر
منکم۔ محمد۔

رُخِ چپ :- لا نا السلطان لا کل الناس بعضہم بعضا۔
تغلق۔

(۳) علامتی سکہ جس پر قیمت درج ہے

رُخِ راست :- (وسط میں) من اطاع السلطان فقد
اطاع الرحمٰن (حاشیہ پر) در اقلیم تغلق پو عرف ترسیت سال
بر مقصد سی۔

(رُخِ چپ) مہر شد تنکہ رائج در روزگار بندہ امیدوار
محمد بن تغلق۔

تنکہ خالص کرنسی میں چاندی کا سکہ تھا۔ علامتی کرنسی
کے اس قیمت کے سکہ پر تنکہ رائج درج کیا گیا ہے جس سے
مفہوم ہے کہ وہ اصل تنکہ نہیں ہے بلکہ تنکہ کی قیمت پر چل
رہا ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ برخلاف رسم جام کے

سکہ کی عبارت بجائے عربی زبان کے فارسی زبان میں ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

(۴) علامتی سکہ جس پر قیمت درج ہے

رُخ راست :- ضرب ہذا النصفی فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ۔

رُخِ چپ :- محمد بن تغلق بحضرت دولت آباد سنہ ثمثین وسبعمایہ۔

خاص کرنسی میں ایک ملونی سکہ نصفی نام کا ملتا ہے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس سکہ کا نصف ہے غالباً اُس سکے سے مراد نقرئی تنکہ ہے جس کی نصف قیمت پر یہ سکہ چلایا گیا تھا۔ بہر حال یہ علامتی سکہ اپنے ہم نام ملونی سکہ کی قیمت کی برابر تھا۔

(۵) علامتی سکہ جس پر قیمت درج ہے

رُخِ راست :- ضرب الربعی فی زمن العبد محمد بن تغلق

رُخِ چپ :- بحضرت دولت آباد سن ثلثین وسبعمایہ

ربعی نام کا سکہ خاص کرنسی میں نہیں ملتا۔ غالباً شل سعنی نام کے سکے کے وہ نقرئی تنکہ کی چوتھائی قیمت پر چلایا یا گیا تھا۔

محمد بن تغلق کے عام سکے

مذکرہ بالا سکوں کے بعد جن سے محمد بن تغلق پر چند الزامات کی تردید ہوتی ہے اُس کے عام مسکوکات کا بھی تذکرہ ضروری ہے۔ درستی انتظام سلطنت کے ذیل میں محمد بن تغلق نے کرنسی میں کافی دلچسپی لی۔ اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کیا۔ نئی ٹکسالیں قائم کیں۔ عبارت سکہ میں جس نے ایک مستقل طرز اختیار کر لیا تھا ترمیم و تنسیخ کی۔ اس کے سکوں کی گوناگوں عبارت سے اس کے اسلامی جذبہ مذہبی عقیدہ سیاسی واقتصادی نظریہ، اتباع شریعت اور سنت نبوی شکل المزاجی اور اخلاقی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ القاب شاہی جو اس کے سکوں پر مندرج ہیں اُن سے بجائے شان وشوکت سلطانی کے اظہار انکسار ہوتا ہے۔ بعض سکوں پر تو صرف اس کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے اور آخری دورِ حکومت کے سکوں پر تو اُس کا نام بھی نہیں ملتا۔ جس کے بجائے نام نہاد خلیفہ عباسیہ کا نام درج ہے۔

طلائی سکہ

رُخ راست :- (وسط میں) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (حاشیہ پر) ضربت ہذہ السکہ بحضرت دہلی فی سنہ خمس عشر وسبعمایۃ۔

رُخِ چپ ، (وسط میں) المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ۔ (حاشیہ پر) ابوبکر۔ عمر۔ عثمان۔ علی۔

اسمائے خلفائے راشدہ سکوں پر محمد تغلق کے زمانے سے شروع ہوئے۔

(۲) طلائی سکہ

رُخِ راست :- اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔

رُخ چپ ، (وسط میں) الواثق بتائید الرحمٰن محمد السلطان ۔ (حاشیہ پر) ہذا الدینار بحضرت دہلی

ستہ عشرین و سبعمایۃ۔

ملاحظہ ہو کہ اس سکہ پر بجائے کلمہ طیب کے کلمہ شہادت درج ہے جو اور کسی سکہ پر نہیں ملتا۔ سکہ کا نام دینار درج ہے۔

(۳) طلائی سکہ

رُخِ راست:۔ (وسط میں) فی عہد محمد بن تغلق۔

(حاشیہ پر) بحضرت دہلی سنہ ست وثلثین وسبعمایۃ

رُخِ چپ:۔ واللہ الغنی وانتم الفقرا۔

(۴) طلائی سکہ

رُخِ راست:۔ (وسط میں) لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

(حاشیہ پر) ہذا الدنیار بحضرت دہلی فی سنہ ست وعشرین و سبعمایۃ۔

رُخِ چپ:۔ ضرب فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ محمد بن تغلق۔

(۵) طلائی سکہ

رُخِ راست:۔ محمد بن تغلق

رُخِ چپ:۔ محی سنن خاتم النبیئن

نقرئی سکے محمد بن تغلق کے کم ملتے ہیں اور وہ مثل طلائی سکوں کے ہیں۔ ملونی سکے محمد بن تغلق کے قابل توجہ ہیں۔

(۶) ملونی سکہ

رُخِ راست:۔ المجاہد فی سبیل اللہ

رُخِ چپ:۔ محمد بن تغلق شاہ ۷۲۵ھ

(۷) ملونی سکہ

رُخِ راست:۔ السلطان العادل

رُخِ چپ:۔ محمد بن تغلق شاہ ۷۲۶ھ

(۸) ملونی سکہ

رُخِ راست:۔ ضرب فی زمن العبد الراجی رحمۃ اللہ محمد بن تغلقشاہ۔

رُخِ چپ: الدرہم بدار الملک دہلی ثلثین وسبعمایۃ

(۹) ملونی سکہ

رُخِ راست:۔ الملک والعظمۃ للہ

رُخِ چپ:۔ عبد الراجی محمد بن تغلق ۷۳۰ھ

بلحاظ عبارت محمد بن تغلق کے مسی سکہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ عام طور پر ان پر سن ضرب درج نہیں ہے۔

(۱۰) مسی سکہ

رُخِ راست:۔ حسبی ربی ۷۳۰ھ

رخِ چپ: عبد محمد بن تغلق

(۱۱) مسی سکہ

رُخِ راست:۔ الملک والعزۃ للہ

رُخِ چپ (وسط میں) محمد تغلق۔

(حاشیہ پر) سال پر ہفصد سی دو

(۱۲) مسی سکہ

رُخِ راست :۔ السلطان ظل اللہ
رُخِ چپ :۔ محمد بن تغلق شاہ

(۱۳) مسی سکہ

رُخِ راست :۔ الامام العادل
رُخِ چپ :۔ محمد بن تغلق شاہ

(۱۴) مسی سکہ

رُخِ راست :۔ محمد رُخِ چپ :۔ تغلق شاہ

کچھ عرصہ سلطنت کے بعد محمد بن تغلق کو یہ محسوس ہوا کہ اسلامی ملی نقطۂ نظر سے اُس کی بادشاہت بغیر تصدیق امام المسلمین امیرالمومنین کے بے قاعدہ ہے۔ دُنیائے اسلام میں یہ اعزاز خلفائے بنو عباس کو حاصل تھا جو اُن کو ورثہ میں ملا تھا۔ خلافت عباسیہ ہلاکو خاں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکی تھی اور اُس خاندان کے پسماندگان مصر میں پناہ گزین تھے اور مصری سلاطین کے وظیفہ خوار تھے۔ باوجود تخت و تاج اور حکومت و سلطنت کے مٹ جانے کے قدیمی وقار کی جھلک اس خاندان میں باقی تھی اور سروار قبیلہ امام اور امیرالمومنین کے القاب سے ممتاز تھا۔ چنانچہ ۷۴۱ھ میں محمد بن تغلق نے امیرالمومنین المستکفی باللہ کے نام کے سکے جاری کئے اور خود اپنا نام سکوں پر درج کرنا ترک کر دیا۔ نیز ایک سفارت مصر کو امیرالمومنین کی خدمت میں برائے طلب سندِ حکومت روانہ کی۔ المستکفی باللہ ۷۴۰ھ میں انتقال کر گیا تھا اور سفارت اُس کے جانشین الحاکم بامر اللہ کی خدمت میں باریاب ہوئی۔ جس نے مطلوبہ سندِ حکومت عطا کی۔ سفارت کی واپسی ۷۴۴ھ میں ہوئی اور اس وقت تک ہندوستان میں سکے المستکفی باللہ کے نام کے چلتے رہے۔ سفارت کے واپس آنے پر الحاکم بامر اللہ کا نام سکوں پر درج ہوا۔ یہ رسم محمد بن تغلق کے اختتام حکومت تک رہی۔

(۱) طلائی سکہ خلیفہ کے نام کا

رُخِ راست :۔ ضرب ہذا الدینار خلیفی فی الدہلی شہور سنہ احدی و اربعین و سبعمائتہ۔
رُخِ چپ :۔ فی زمان الامام المستکفی باللہ امیرالمومنین ابو ربیع سلیمان خلد اللہ خلافتہ۔

ملاحظہ ہو کہ سکہ کا نام دینار خلیفی درج کیا گیا تھا۔

(۲) طلائی سکہ خلیفہ کے نام کا

رُخِ راست :۔ فی زمان الامام امیرالمومنین امیر الحاکم بامر
رُخِ چپ :۔ اللہ ابو العباس احمد خلد ملکہ

(۳) طلائی سکہ خلیفہ کے نام کا

رُخِ راست :۔ خلیفۃ اللہ فی شہور رُخِ چپ :۔ المستکفی باللہ ۳

(۴) طلائی سکہ خلیفہ کے نام کا

رُخِ راست :۔ الحاکم بامر اللہ رُخِ چپ :۔ ابو العباس احمد

(۵) مسی سکہ خلیفہ کے نام کا

رُخِ راست :۔ اللہ الکافی رُخِ چپ :۔ والخلیفہ المستکفی

(۶) مسی سکہ خلیفہ کے نام کا

رُخِ راست :۔ الحاکم بامر اللہ ۷۴۵ رُخِ چپ :۔ ابو العباس

[illegible]

(تیسری قسط)

سُلطان احمد تنبل

(محمد رحیم دہلوی)

بابر کا ستارہ عروج پر تھا۔ سلطان احمد تنبل کو ہٹانے کے لئے اتنی بڑی کمک بابر کو اس سے پہلے کبھی نہ ملی تھی۔ آدھے سے زیادہ ماوراء النہر اور دو ایک کو چھوڑ کر تمام بااثر شخصیتیں اس وقت بابر کے ساتھ تھیں۔ اس سے بھی زیادہ تنبل کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے تمام نامور ساتھی دشمن کی قوت اور تعداد سے مرعوب ہو کر بابر سے جا ملے تھے اور تنبل کے کئی ماتحت قلعہ داروں نے بابر کے لئے اپنے قلعوں کے پھاٹک کھول دئے تھے۔[1]

اندجان کے سوا تنبل کے پاس اس وقت کچھ بھی نہ تھا اور وہ اس وقت اندجان سے دور ایک میدان میں خندق اور شاخ بندی سے گھرا ہوا اپنے بچے کچھے لشکر کو لئے پڑا تھا۔ پھر بھی اس کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ وہ بابر اور اس کے لشکر جرار کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ذرا بھی موقع ملتا تو چپ چپاتے اپنی کمین گاہ سے نکلتا اور شب خون مار کر اور بابر کی فوج کو ہراساں کر کے پھر اپنے حصار میں جا بیٹھتا۔

تنبل پر بابر کا بس نہ چلا تو اس نے تنبل کی رہی سہی قوت کو توڑنے کے لئے اندجان پر قابو پانے کی تدبیریں کیں۔ اندجان کے چاروں طرف کے دیہات پہلے ہی بابر کے قبضے میں آ چکے تھے۔ اندجان کا ایک اکیلا شہر تھا جو ہر طرف سے بابر کے مقبوضہ علاقوں میں گھرا ہوا تھا۔ پھر بھی اس پر حملہ کر کے فتح پانا بابر کے خیال میں آسان نہ تھا۔ اس لئے اس نے شہر کے امراء کو تنبل سے توڑنے کی تدبیریں کیں۔ بابر خود تزک میں لکھتا ہے:۔

میں نے سوچا کسی رات کو اندجان کے قریب جاؤں اور کسی قاصد کو بھیج کر وہاں کے امراء کو ترغیب دوں کہ کسی طرف سے راستہ دیدیں تاکہ ہم شہر میں جا لیں۔

ایک رات بابر نے اپنی اسی تدبیر پر عمل کیا اور اپنے بہت سے ساتھیوں اور سرداروں کو ساتھ لیکر چپ چپاتے اندجان کے قریب پہنچ گیا۔ بابر اور اس کا لشکر شہر سے ایک کوس دور ٹھہر اور چند سرداروں کو اچھی طرح سمجھا اور پڑھا کر آگے بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر شہر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر وہاں کے امراء سے بات چیت کر لیں اور معاملہ طے کرنے کے بعد بابر کو بلا لیں۔[2]

---

[1] مقام قبا۔ اوش۔ کند۔ مرغینان اور اندجان کے وہ تمام دیہات جو دریائے خجند سے اس طرف تھے سب کے سب بابر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ آ چکے تھے اور سوائے اندجان کے سب کو بابر کے مطیع کر لیا تھا۔ صرف اندجان تنبل کے قبضے میں رہ گیا تھا۔

[2] بابر اوش سے چل کر اندجان سے ایک کوس کے فاصلہ پر چل دختران (جان لیڈی کے الفاظ میں چلہ خزان) کے سامنے جا کر ٹھہرا تھا اور قنبر علی بیگ اور کئی سرداروں کو اندجان کی طرف بھیجا تھا۔

بابر کو اس رات اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنے قاصدوں کے انتظار میں ایک پل کے لیے بھی گھوڑوں کی پیٹھ سے نہ اترے۔ ہر لمحہ انہیں انتظار تھا کہ اب خوشخبری آتی ہے اور اب آتی ہے اس مسرت انگیز خبر کے انتظار میں آدھی رات سے تین پہر رات تک گھوڑوں پر سوار کھڑے رہے۔

اس وقت تنبل کی تقدیر زوروں پر آئی سا ایک اتفاقیہ حادثہ ہوا اور چند فوجیوں کی غلطی سے پانسہ پلٹ گیا اور بابر کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بابر اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی تو اونگھ رہا تھا اور کسی کی آنکھ لگ گئی تھی کہ یکایک غل غپاڑے کے ساتھ طبل جنگ کی آواز آئی وہ سب میدان میں ایک دم سر پہ پیر رکھ کر بھاگے۔

ہوا یہ کہ جس وقت بابر اندجان آنے کے لئے اپنے ساتھیوں کو لے کر چپ چاپ اپنے لشکر سے چلا تھا۔ اسی وقت اس کے لشکر کے ایک اور حصے سے بہت سے مغل اوشیدہ[1] طور پر اندجان کے ان نواحی علاقوں کو لوٹنے نکلے جو خود بابر کے زیر نگیں تھے اور اندجان کے قریب پہنچ کر رات کے اندھیرے میں اپنے ہی لشکر سے ٹکرا گئے شور و غل سے قیامت بپا ہو گئی

قاعدہ یہ تھا کہ لڑائی کے وقت مخفیہ الفاظ مقرر ہوتے تھے تاکہ معرکہ کارزار میں جب دو آدمی آپس میں ملیں تو شناخت ہو سکے۔ ایک آدمی پہلا لفظ کہتا۔ دوسرا آدمی اس کے جواب میں دوسرا لفظ کہتا۔ اس طرح دوست دشمن میں تمیز ہو جاتی تھی۔

اس رات "تاشقند" اور "سیرام" خفیہ اشاروں کے طور پر مقرر تھے۔ لیکن اندھیری رات میں ایک ہی لشکر کے دو حصوں کا جو یکا یک آمنا سامنا ہوا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اور صحیح خفیہ اشارہ زبان پر نہ آسکا۔ ایک طرف سے تاشقند، تاشقند کہا گیا تو دوسری طرف کے لوگ بھی گھبراہٹ میں تاشقند، تاشقند کہنے لگے یہ اس بات کی علامت ہے کہ دو دشمن آمنے سامنے آ گئے اس غلط فہمی میں دونوں طرف سے تیروں کا مینہ برسنے لگا اور شور و غل سے قیامت بپا ہو گئی۔ اس طرح تنبل کے ساتھی بیدار ہو گئے اور پھر جو انہوں نے نظر کی تو بابری لشکر کے دونوں حصے ناٹ لا کے بعد سر پر پیر رکھ کر بھاگے

بابر نے اس یادگار رات کا حال لکھا ہے وہ کہتا ہے:-

"شاید ہمیں پہر رات گذری ہوگی کہ ایک دفعہ
ہی غل غپاڑے کے ساتھ طبل جنگ کی آواز آئی۔
ہمارے ساتھی نیند میں غلطاں تھے انہوں نے
نہ تو دشمنوں کی کمی بڑھتی تعداد کو پرکھا
نہ ایک نے دوسرے کی خبر لی۔ دفعتاً سب سے
کے سب بھاگ نکلے"

پھر بھی بابر نہایت حوصلہ مند اور بے جگر سپاہی تھا اس نازک وقت میں بھی اس نے اپنے اوسان بحال رکھے اور دشمن کی طرف جھپٹا اس وقت تین جاں نثاروں[2] نے اس کا ساتھ دیا اور یہ چاروں مل کر دشمن پر لپکے۔

یہ ذرا ہی آگے بڑھے تھے۔ کہ دشمن تیروں کا مینہ برسا

---

[1] یہ مغل جنہوں نے بابر کی بے خبری میں اندجان کے اس نواحی علاقے کو لوٹنا چاہا تھا جس پر بابر کا قبضہ تھا ایوب بیگ چک کے میا سے تھے اور جس وقت یہ لشکر بابر کے زیر کمان تنبل سے مقابلہ کے لئے میدان جنگ میں پڑا ہوا تھا

[2] یہ تین جاں نثار۔ میر شاہ قوچین۔ بابا شیرزاد اور دوست ناصر

سے آپڑے ایک سوار جس کے گھوڑے کے ماتھے پر ٹیکہ لگا ہوا تھا
بکلفر بیب جا پہنچا۔ بابر کے تیر کے ٹھونسے کا کام تمام کر دیا اور دشمن
پاکی تعداد تتر بتر ہو گئے۔

بابر کے تینوں ساتھی بابر کی جرأت کے حامی نہ تھے وہ
کہتے تھے رات اندھیری ہے اور دشمنوں کی تعداد نہ جانے کتنی ہو۔ ہمارا
سارا لشکر بھاگ گیا ہے ہم تین چار آدمی کتنے آدمیوں کو مار سکیں
گے ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ چیتے پہلے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں
کو سمیٹیں پھر لڑنے آئیں گے۔ مجبوراً بابر نے باگ پھیری۔ دشمن نے
دیکھا کہ یہ تین چار آدمی ہی ہیں تو وہ تعاقب میں دوڑے اور تین
چار کوس تک یہ دوڑ جاری رہی۔ اس کے بعد بابر کے ساتھیوں میں
سے ستر آدمی مل گئے۔ بابر نے چاہا کہ پلٹ کر حملہ کرے
لیکن اس کے اچھے اچھے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ کر لیتے بھاگ
گئے کہ انہوں نے پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔ اس سے شب خون مارنے
کی تجویز دھری کی دھری رہ گئی اور بابر کو ناکام لوٹنا پڑا۔

چند دن بعد بابر کو پھر خبر ملی کہ تنبل کے بہت سے
آدمیوں میں بے چینی ہے کئی اس کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور
اس کی طاقت جو پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی اب بالکل ہی دم توڑ گئی
بہت کچھ آدمی ایسے بھی تھے جو بابر سے آملے تھے اور انہوں نے ان خبروں
کی تصدیق کی۔ بابر کے لئے یہ خوشخبری ایسی نہ تھی کہ وہ نچلا بیٹھا رہتا
وہ جس وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آپہنچا تھا۔ چنانچہ بابر پھر
اندجان پر دھاوا بولنے چلا۔

اندجان پر تنبل کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی سلطان
محمد گل بیگ[3] حاکم تھا۔ بابر جب اندجان کے قریب پہنچا[4]۔ مخبروں
نے اسے بتایا کہ گل بیگ اس وقت شہر سے باہر آیا ہوا ہے اور اپنے
آدمیوں کے ساتھ باغات میں ہے۔ بابر کے لئے حملہ کا اس سے بہتر
وقت اور کیا ہو سکتا تھا۔ کہ دشمن شہر پناہ کے باہر موجود تھا اس نے
فوراً حملہ کی ٹھان لی۔ فوج کی وہ ٹکڑی جو آگے روانہ ہوئی تھی پورے
طور پر پہنچ نہ ہونے پائی تھی بابر نے اس کے انتظار میں وقت کو
ضائع نہ کیا [illegible] وقت ہاتھ لگا کر [illegible] آدمی اس کے پاس
تھے [illegible] نے اسی کو ساتھ لیکر حملہ بول دیا گل بیگ کیا تھ
بھی بابر کے [illegible] الفاظ میں اتنے ہی آدمی تھے۔

بابر [illegible] اٹھائے ہوئے ایک دشمن کے سر پر جا پہنچا
وہ پہنچتے ہی دشمن کے پیر اکھڑ گئے۔ اور تلوار کے دو دو ہاتھ
بھی نہ ہونے پائے [illegible] گل بیگ پیچھے مڑ کر بھاگا۔ بابر کا لشکر دشمنوں
کو مارتا کاٹتا شہر کے پناہ گاہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت شام
ہو چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ بابر چاہتا تھا کہ آنکھیں

۱۔ بابر کے دشمنوں نے پیشہ ور قزاقوں اور لٹیروں (انگریزی مترجم مسز بیورج کے الفاظ میں [illegible]) سلاح پوش کا تعاقب کیا تھا۔

۲۔ بابر اس حملے میں ناکام ہونے کے بعد "اوش" واپس چلا گیا تھا جو اندجان سے گوشہ جنوب مشرق [illegible]

۳۔ سلطان محمد گل بیگ جلیبہ

۴۔ بابر [illegible] سے اندجان گیا تھا۔ [illegible] فوج کی ایک ٹکڑی آگے بھیج دی تھی [illegible] کشتی میں [illegible] تھا۔

بند کئے ہوئے شہر کے پھاٹک میں گھس جاتے لیکن [1] امرا میں سے جو بڑے بوڑھے ساتھ تھے انہوں نے اندھیرے میں شہر کے منہ میں جانا پسند نہ کیا۔ بابر نے اپنے بڑے رفیقوں کے الفاظ نقل کئے ہیں انہوں نے کہا۔

"اندھیرے میں شہر کے پاس جانا بے عقلی ہے
اس وقت مناسب یہی ہے کہ یہاں سے کسی قدر
ہٹ کر ٹھہر جائیں۔ صبح کو یہ لوگ سوائے اس کے
کہ شہر ہم کو دے دیں اور کیا کر سکتے ہیں۔؟"

بابر نے اپنے تجربہ کار امراء کا کہنا مان لیا۔ لیکن بعد میں وہ ہمیشہ اس پر پچھتایا۔ وہ تزک میں لکھتا ہے۔

"اس وقت ہم شہر کے دروازے پر جا پہنچتے تو
بلاشک و شبہ شہر ہمارے ہاتھ آجاتا۔"

بابر امراء کے کہنے میں آکر اس زبردست غلطی کا مرتکب ہوتا تو المناک شکست کا منہ نہ دیکھتا۔

[illegible] کا وقت تھا جو بابر اپنے ساتھیوں کو لے کر رات ٹھہرنے کے لئے ندی [2] سے اترا اور ایک گاؤں کے قریب خیمہ زن [illegible] راستہ میں ایسے مقامات تھے جہاں حفاظت [3] کے کچھ نہ کچھ [illegible]رتی انتظامات موجود تھے۔ لیکن یہ لوگ انہیں نظر انداز [illegible]کے ایسے چٹیل میدان میں آ گئے جو کسی طرح محفوظ نہ تھا

اس پر طرہ یہ کہ چوکی پہرہ کا انتظام نہ کیا اور بے فکر ہو کر صبح ہونے تک سارا لشکر غفلت کی نیند سو رہا تھا کہ یکایک ایک خبر ملی دوڑتا اور چلاتا ہوا آیا اور غنیم کے آنے کی خبر دیتا ہوا نکلا چلا گیا۔ درحقیقت اتنا وقت ہی نہ تھا کہ وہ ذرا بھی ٹھہر سکتا۔

بابر اس کے زمانے میں بھی پورا لباس پہن کر سوتا تھا وہ جلدی سے اٹھا اور اسنے بھی تلوار اور ترکش لگا کر گھوڑے پر چڑھ بیٹھا۔ نشان بردار کو اتنا بھی وقت نہ ملا کہ وہ جھنڈے کو درست کر سکتا۔ جھنڈے کی خالی لکڑی ہاتھ میں لئے ہوئے سوار ہو گیا۔

بابر کی ہمت مردانہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے دشمن کی طرف لپکا آٹھ دس جاں نثار اس کے ساتھ تھے بہ مشکل تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ دشمن کے اگلے دستے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بابر تیر مارتا ہوا اس پر جھپٹا وہ پسپا ہو کر پیچھے ہٹے لیکن تھوڑی ہی دور پر تنبل تقریباً سو آدمیوں کے ساتھ راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس نے بابر کو دیکھتے ہی اپنے جوانوں کو ابھارا۔ لیکن اس وقت اس کا لشکر کشمکش میں مبتلا تھا کہ ٹھہریں یا نہ ٹھہریں۔ بابر کے ساتھ اس وقت صرف تین [4] آدمی رہ گئے تھے بابر نے تنبل کو تیر مارا اور دوسرا تیر نکالنے کے لئے ترکش میں ہاتھ ڈالا تو ایک سبز تیر اس کے ہاتھ میں آیا۔ یہ اس کے ماموں محمود خاں [5] نے اسے تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ بابر کا جی نہ چاہا کہ وہ تیر اپنے سے جدا کرے اسکو پھر ترکش میں ڈال دیا۔ لیکن اس میں بڑا قیمتی وقت ضائع ہو گیا

---

[1] بعض امراء ایسے ناصر بیگ نے (جو دوست بیگ کا باپ تھا) اور قنبر علی بیگ نے یہ مشورہ دیا تھا۔
[2] بابر [illegible] (سالان) کی ندی کو اتر کر [illegible] گاؤں کے پاس خیمہ زن ہوا تھا۔
[3] [illegible]
[illegible]
[illegible]

اور اتنی دیر تک کی جتنی دیر میں کہ دو تیر باب چلتے ہیں میدان کارزار میں اور عین مقابلے کے دوران میں جب کہ تنبل جیسا دشمن نظروں کے سامنے کھڑا تھا ایسی شدید غلطی حیرت ناک ہے۔ لیکن بعض اوقات آدمی جذبات کی رو میں بہہ کر شدید غلطیوں کا مرتکب ہو جاتا ہے ایسے نازک وقت میں بابر سے بھی ایسی ہی عظیم غلطی ہوئی۔

بابر نے ترکش سے ایک دو تیر نکالا۔ اور آگے جھپٹا اس کے تینوں ساتھی بھی اس وقت بہت پیچھے ہو گئے تھے اس وقت بابر کے سامنے جو دو آدمی آئے ان میں ایک اس کا دشمن جانی تنبل تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکے بیچ میں ایک سڑک تھی۔ وہیں مقابلہ ہوا۔ بابر کا سیدھا ہاتھ تنبل کی طرف اٹھا۔ تنبل کے پاس گھوڑے کی زرہ کے علاوہ سارا سامان جنگ موجود تھا اور بابر کے پاس صرف تلوار اور تیر کمان تھی اور تلوار بھی ایسی کہ جس کے متعلق بابر نے خود کہا کہ زنگ آلود تھی اس لئے اس کو نکالنے کی مہلت نہ ملی۔ بابر نے کمان کو کان تک کھینچ کر ایک تیر تنبل کے مارا۔ اسی وقت ایک تیر بابر کی ران میں آکر لگا۔ اور وہ آر پار ہو گیا۔ بابر سر پر لوہے کی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا۔ تنبل نے جھپٹ کر ایسا ہاتھ مارا کہ بابر کا سر سن ہو گیا۔ اگرچہ ٹوپی کا ایک تار بھی نہ ٹوٹا مگر بابر کا سر بری طرح زخمی ہو گیا اور وہ دشمنوں میں اکیلا گھر گیا۔ اب جان بچا کر بھاگنے کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی۔ بابر خود تزک میں لکھتا ہے:

"میں بہت سے دشمنوں میں اکیلا گھر گیا۔ اب
ٹھہرنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے گھوڑے کی
باگ الٹی پھیر دی۔ اتنے میں تلوار کا ایک اور
ہاتھ میرے تیروں پر پڑا۔"

بابر سرپٹ بھاگا تو دشمن نے کچھ دور پیچھا کیا۔ آگے چل کر ایک بڑی اور گہری ندی[1] پڑتی تھی۔ اتفاق سے بابر اس کے کنارے پر ایسی جگہ پہنچا جہاں پانی بہت کم تھا۔ راستہ میں اس کے کئی زخمی سردار ملے۔ دوست ناصر کو تنبل کی تلوار کا زخم لگا تھا۔ زید طغائی کی ران کے نیچے بھی تیر کا زخم تھا۔ اگرچہ تیر آر پار نہ ہوا لیکن اسے بیحد تکلیف تھی۔ بہ مشکل یہ لوگ گرتے پڑتے اوش کی پہنچے[2]۔ لیکن اس لڑائی نے بابر کی قوت کو بری طرح توڑ دیا تھا۔ کئی نامور سردار اس لڑائی میں مارے گئے[3]۔ اور بابر کے اچھے اچھے آدمیوں کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا۔

بابر تنبل سے مار کھا کر لوٹا تو ایک اور دردناک خبر نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ اس کے دونوں ماموں سلطان محمود خاں اور احمد خاں[4] جو اس کے اپنے سگے تھے اور تنبل کے مقابلے پر اپنے بھانجے کی مدد کو آئے تھے اس سارے علاقے کو دبا بیٹھے جس پر بابر قابض تھا۔ محمود نے بابر کو طفل تسلیاں دیں

[1] اس ندی کا نام "ایلخ جاکلان شاہ" ہے بعض ترجموں میں "اریخ جاکلان شاہ" بھی تھا

[2] بابر نے اس وقت دشمن کے ڈر سے عام راستے کو چھوڑ کر ایک راستہ اختیار کیا جو قرابوق اور خرافیہ کے بیچ میں جو ٹیلے ہیں ان سے ہو کر نکلتا تھا۔ بابر اس پیچ دار راستے سے ہو کر "اوش" پہنچا۔

[3] اس لڑائی میں نامی گرامی سرداروں میں سے ناصر بیگ، محمد علی مبشر، خواجہ محمد علی، خسرو کوکلتاش اور نعمان چہرہ مارے گئے تھے

[4] بابر اپنے چھوٹے ماموں "احمد خاں" کو چھوٹے خان دادا کہتا تھا اس نے ترکی میں اسکو "کیپ چپ خان" بھی لکھا ہے۔

اور اسے سمجھایا کہ شیبانی خان ازبک جیسے عظیم دشمن نے سمرقند جیسی مرکزی جگہ چھین لی ہے اور اس کی قوت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اس قوت کو توڑنے کے لئے احمد خاں کو ہم نے اتنی دور سے بلایا ہے لیکن چونکہ یہاں اس کے قبضے میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اس کا ملک یہاں سے بہت دور ہے۔ اس لئے خجند کے جنوب میں جتنا علاقہ اندجان تک ہے وہ اس کو دے دیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی چھاؤنی ڈال سکے۔

اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات اس نے یہ کہی کہ دیائے خجند کے شمال سے آخشی تک کا علاقہ جب فتح ہو جائے گا تو وہ تمہیں دے دیا جائے گا پھر اس کے بعد ہم سمرقند فتح کریں گے اس وقت سمرقند تمہارا اور پھر سارا فرغانہ احمد خاں کا۔ گویا جو کچھ تمہارے پاس تھا۔ وہ تو احمد خاں کو دیدیا ہے اور جو کچھ پاس نہیں ہے۔ وہ تمہارا ہے۔ بابر اس کھلے ہوئے فریب پر تلملا کر رہ گیا مگر کیا کر سکتا تھا۔ خود لکھتا ہے :۔

"ساری باتیں مجھے دھوکہ دینے کی تھیں علاوہ فتح بھی ہو جاتا تو یہ وعدہ پورا ہوتا معلوم نہ دیتا تھا۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ مجبوراً راضی ہونا پڑا۔"

بابر کے امراء میں سے قنبر علی بیگ سلاخ بڑا جز بز ہوا اور اس نے بابر کو مشورہ دیا کہ اس وقت اوش۔ مرغینان اور کنند وغیرہ ہمارے ماتحت ہیں ابھی یہاں سے چلئے اور ان قلعوں کا انتظام کیجئے اور تنبل کے پاس آدمی بھیج کر اس سے

مسئلہ محمود خاں اور احمد خاں کی سستی کم ہوگئی۔ ان کے ہاتھ پیر پھول ابھی تنبل کا محاصرہ چھوڑ چھاڑ کر وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ ڈبائیں۔

... اور اپنا آدمی بابر کو اپنے ماموں ... بلا کے ... باوجود وہ ان سے اپنے تعلقات درست ... سلسلہ ... کہا ماموں میرے بزرگ ہیں۔ تنبل پھر غیر ہے بگاڑ پیدا کر کے غیروں سے ملنا نہیں چاہتا۔ قنبر علی۔ ... طرح ... دیکھا کہ اس کے مشورہ کا اثر الٹا ہوا اور بابر نے اس کو اپنوں اور غیروں کا سوال بنا لیا ہے تو وہ سخت بگڑا اور اس ڈر سے کہ کہیں بات کھل کر خوانین تک پہنچ جائے وہ بابر کو چھوڑ کر تنبل کے پاس چلا گیا۔

چند دن تک بابر اپنے زخم کی وجہ سے دشمن پر کوئی یلغار نہ کر سکا۔ زخم اچھا ہوا تو فوج کشی کی تدبیریں ہونے لگیں۔ تنبل کا چھوٹا بھائی شیخ بایزید آخشی پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اور شہباز کاشان پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ محمود اور احمد خاں نے بابر کو دو ہزار آدمیوں کا لشکر دے کر ان دونوں کو زیر کرنے بھیجا۔ اور اپنے بڑے بڑے امراء اور سرداروں کو ساتھ کیا۔[1] خبر ملی کہ شہباز اس وقت کاشان کی بجائے قلعہ نوکند کے آگے پڑاؤ ڈالے پڑا ہے۔ بابر مارا مار اس پر حملہ کے لئے دوڑا۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے ہی لشکر منزل مقصود پر پہنچا امراء کا مشورہ تھا کہ شہباز ہماری آمد سے باخبر ہو گیا ہے اس لئے اچانک اور بے ترتیب حملہ کی بجائے لشکر کی صفوں

[1] ان امراء میں ایوب بیگ چک۔ حسین (یعنی جان حسین) مرزا اور سلیق باش مرزا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ سب کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں۔

آراستہ کرکے ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔

شہباز دراصل دشمن کی آمد سے بے خبر تھا۔ جب بابر کاشان کے قریب پہنچا۔ تو وہ ایک دم ہوشیار ہوا اور آناً فاناً بھاگ کر قلعہ میں جا بیٹھا۔ بابر کہتا ہے:۔

"شہباز حقیقتاً بے خبر تھا ہمارے قریب پہنچنے کے بعد اسے خبر ہوئی۔ اور وہ بھاگ کر قلعہ بند ہو بیٹھا اکثر یہ غلطی ہوئی ہے کہ ہم نے دشمن کو ہوشیار خیال کرکے تساہل کیا اور موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ قابو پانے کے لئے کوشش میں کوئی کسر نہ کی جائے ورنہ پچھتانا پڑتا ہے اور پچھتانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

دن نکل آنے کے بعد قلعہ کے چاروں طرف کچھ دیر لڑائی ہوتی لیکن بابر گرم ہو کر نہ لڑا اور قریب کے علاقوں کو لوٹنے چلا گیا شہباز کے لئے یہ کافی تھا کہ دشمن ذرا دور ہٹ جائے اب جو اسے راستہ ملا۔ تو وہ نکل کر آرام سے کاشان چلا گیا۔

بابر کچھ دن تک ادھر ادھر لوٹ مار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کاشان پر دھاوا بولا۔ شہباز مقابلہ کے لئے نکلا مگر شکست کھانی پڑی[1]

بابر کی اس فتح کا ایک اثر یہ ہوا کہ قلعہ "پاپ" سے اسے طلب بھیجا کہ تشریف لائیے قلعہ حاضر ہے۔ آخشی کے علاقہ میں اس قلعہ کو مضبوطی میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ بابر نے اپنے امراء میں سے سید قاسم کو کچھ فوج کے ساتھ وہاں بھیجا۔ اور اس نے وہاں جاکر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ تنبل کو جو یہ خبر ملی تو اس نے اپنے امراء[2] کے ساتھ دو سو چیدہ سپاہیوں کو وہاں بھیجا سید قاسم ایک رات بے خبر پڑا سوتا تھا جو احتیاطیں کرنی چاہئیں وہ نہ کی تھیں۔ تنبل کے سپاہی سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھ گئے انہوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور پل کا تختہ گرا دیا۔ [illegible] آدمی اندر گھس گئے تو قاسم کو خبر ہوئی وہ اسی حالت میں دوڑا چند اور ساتھی بھی اس کے ساتھ آملے اور انہوں نے تیروں کا ایسا مینہ برسایا۔ کہ تنبل کے ساتھی الٹے بھاگے۔

بابر کے دونوں ماموں سلطان احمد اور سلطان محمود تنبل کا محاصرہ کئے اندجان کے دروازے پر پڑے ہوئے تھے لیکن شہر کے لوگ انھیں پاس نہ آنے دیتے تھے تنبل کے ساتھی کبھی کبھی باہر نکل کر دشمن پر ضرب لگاتے اور فوراً واپس چلے جاتے تھے۔

اسی دوران میں آخشی سے شیخ بایزید نے بابر کو پیغام بھیجا کہ آپ یہاں آجائیے۔ سب معاملات طے ہو جائیں گے۔ بابر کا یہ خیال تھا کہ دراصل یہ پیغام تنبل نے بھجوایا ہے اس کی خواہش یہ ہے کہ بابر سے صلح کرکے اسے اس کے ماموؤں سے توڑ لے لیکن وہ اس کے لئے تیار نہ ہوا اور اس نے خواجہ کو اس بھید سے آگاہ کر دیا۔

---

[1] اس مقابلہ میں اولاد حسن کا منہ بولا بیٹا میرم شہباز کے ساتھ تھا۔ وہ مارا گیا۔

[2] تنبل نے جن امراء کو لشکر کے ساتھ بھیجا تھا۔ ان میں ابراہیم چاروق طغائی۔ احمد قاسم کوہبر، [illegible] ازغون اور شیخ بایزید وغیرہ شامل تھے۔

انہوں نے بابر کو صلاح دی کہ دشمن نے ہمارے لئے جو پھندہ بنایا۔ وہ اسی کے گلے میں ڈال دو۔ بایزید کے پاس جاؤ اس سے صلح کی بات چیت کرو اور جیسے ہی موقع ملے اُسے گرفتار کر لو۔ لیکن بابر نے اس مشورے کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ عہد کر کے مکر و فریب کرنا میرا کام نہیں ہے۔ خود کہتا ہے :-

"جس آدمی سے عہد کر لیا ہو۔ اس لئے
مکر و فریب کرنا میرا دستور نہ تھا اس لئے
میں یہ بد عہدی کس طرح کرتا۔"

پھر بھی بابر، بے خوف بایزید کے پاس گیا۔ اس لئے نہیں کہ فریب دے کر اسے پکڑ لے۔ بلکہ اس لئے کہ شاید بایزید تنبل سے ٹوٹ کر ہم سے آملے۔ جانے سے پہلے باہم عہد و پیمان ہو گئے۔ اس کے بعد بابر پہنچا تو بایزید پیشوائی کے لئے آیا اور بابر کے سوتیلے بھائی ناصر مرزا[1] کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ بابر کو قلعہ سنگین میں اس کے باپ کے کمروں میں سے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔

دشمن کے گھر میں مہمان ہونے کے بعد سیاسی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بابر کو نہ وہاں رہتے بن پڑی اور نہ بھاگتے بن پڑی اور وہ خطرے میں پھنس کر رہ گیا۔ ہوا یہ کہ تنبل نے اپنی مدد کے لئے محمد شیبانی خاں کو بلا بھیجا تھا۔ محمد شیبانی ماوراء النہر میں سب سے بڑی طاقت[2] تھی۔ اس کی آمد کا حال

سنکر محمود خاں اور احمد خاں کی ہستی گم ہو گئی۔ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے اور تنبل کا محاصرہ چھوڑ چھاڑ کر وہ سر پر پیر رکھکر بھاگے۔

احمد خاں، بابر کے الفاظ میں بڑا عادل اور دین دار آدمی تھا لیکن اس کے امراء اور عام فوجیوں نے رعیت پر بڑے ظلم کئے تھے۔ اب جو وہ سراسیمہ ہو کر بھاگنے لگے تو شہر والوں نے ان سے خوب خوب بدلے لئے۔ انھیں لوٹا۔ پکڑا۔ مارا اور بری طرح دھکے دیکر نکال دیا۔

دونوں خوانین جو بھاگے تو تنبل نے دور تک ان کا پیچھا کیا۔ اور انھیں دریائے خجند کے پار بھگا دیا۔

یہ خبریں بابر کو پہنچیں تو وہ بیحد پریشان ہوا۔ تنہا تنہا وہ اس وقت شیر کے بھٹ میں بیٹھا تھا۔ حالانکہ بایزید سے عہد و پیمان ہو چکے تھے لیکن اب تو تنبل خوانین کے محاصرہ سے آزاد ہو کر باہر نکل آیا تھا۔ اور بایزید کی اپنے سرپرست کے آگے کیا چل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بابر کے دشمن شیبانی خاں کے آنے کی خبریں تھیں۔ وہ چنگل میں آئے ہوئے بابر جیسے دشمن کو قلعہ سنگین سے کیسے نکل جانے دیتا۔ اور پھر خوانین جن کے ہونے سے بابر کو کچھ ڈھارس ہو سکتی تھی اپنی جانیں بچا کر بھاگ چکے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ان نئے اور اچانک پیش آنے والے واقعات سے بایزید کی نیت بدلنے میں بھی کیا دیر لگتی تھی۔ بابر بے حد خوف زدہ تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا

---

[1] ناصر مرزا کی ماں اندجان کی رہنے والی تھی۔ اس کا نام امید تھا۔ وہ باندی تھی۔ عمر شیخ مرزا نے اسے بیوی بنا لیا تھا۔ ناصر بابر سے چار سال چھوٹا تھا۔

[2] ملاحظہ فرمائیے مقالہ "محمد شیبانی خاں" مرتبہ محمد رحیم دہلوی شائع کردہ ہسٹری کانفرنس کراچی

کیا کرے۔ ٹھہرے رہنے کی صورت میں وہاں والوں پر اعتماد نہ تھا اور وہاں سے بغیر کسی وجہ کے بھاگ جانا بھی اچھا نہ لگتا تھا۔

حالات نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی کہ بابر کے لئے "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والی بات تھی کہ یکایک ایک اور مصیبت آپڑی۔ بابر کا سوتیلا بھائی جہانگیر مرزا[1] عرصہ دراز سے تنبل کی سرپرستی میں تھا اور تنبل کے جھنڈے تلے بابر سے برابر دشمنی اور مخالفت کرتا رہا تھا اور تنبل جسطرح چاہتا تھا جہانگیر مرزا کو استعمال کرتا تھا۔ اب نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی۔ کہ وہ تنبل کے پاس سے بھاگ کر بابر کے پاس قلعہ سنگین میں چلا گیا جس دن صبح کو وہ اچانک بابر کے پاس پہنچا ہے تو وہ حمام میں تھا۔ عرصہ دراز کے بعد بھائی آیا تھا۔ بابر فوراً جہانگیر مرزا سے ملا۔ لیکن جہانگیر مرزا کے یوں چلے آنے سے حالات نے جو نازک تر صورت اختیار کرلی تھی۔ اس سے اندیشہ تھا۔ وہ اس وقت تنبل کے ایک زیر تحت آدمی کے پاس مہمان تھا اور تنبل کے ہاتھ سے جہانگیر مرزا جیسے اہم اور قیمتی ہیرے کے نکل جانے سے بایزید کو جو پریشانی لاحق ہوسکتی تھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ بایزید نے جو جہانگیر مرزا کو دیکھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ بے حد پریشان ہوا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں

جہانگیر مرزا کے یوں ایکا ایکی چلے آنے سے بایزید اور بابر دونوں اپنی اپنی جگہ پریشان تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ جہانگیر مرزا اور ابراہیم بیگ نے بابر کو صلاح دی کہ بایزید کو گرفتار کرکے قلعہ کو قبضہ میں کرلینا چاہیئے بابر کہتا ہے:۔

"ہونا یہی چاہیئے تھا۔ لیکن میں نے کہا میں عہد کرچکا ہوں۔ میں عہد شکنی نہیں کرسکتا"

بایزید بھی کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا کہ وہ کیا کرے اس لئے وہ قلعہ کے اندر چلا گیا۔ اس لئے بابر کے لئے بڑا نازک وقت تھا تنبل محاصرے سے آزاد ہوچکا تھا اور ہر لمحے اس کے قلعہ میں پہنچنے کی امید تھی۔ ایسی صورت میں بابر کی طرف سے کم از کم پل کا انتظام ہونا بہت ضروری تھا۔ تاکہ مدافعت کی ضرورت پڑتی تو کچھ تو کیا جاسکتا بابر خود کہتا ہے:۔

"پل پر کسی نہ کسی کو متعین کرنا ضروری تھا۔ لیکن ہم نے کسی ایک آدمی کو بھی تعینات نہیں کیا یہ سب غلطیاں ہماری ناتجربہ کاریوں کا نتیجہ تھیں۔"

صبح کو بروم تنبل دو تین ہزار کے لشکر کے ساتھ پل پر سے اتر کر قلعہ میں آگیا۔ بابر کے پاس سو آدمیوں سے کچھ زیادہ ہوں گے اس نے ان ہی کو جگہ جگہ تقسیم کیا۔ بازاروں اور گلی کوچوں کے نکڑوں پر انھیں تعینات کیا اور وہ بھی ابھی اسی میں مصروف تھا کہ اتنے میں بایزید، قنبر علی اور محمد دوست تین آدمی تنبل کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر آئے۔

بابر نے اپنے سپاہیوں میں سے جن کو جہاں متعین کردیا اس کو اسی طرح ٹھہرنے کی ہدایت کرکے جہانگیر مرزا کو بلایا اور یہ سب صلح کے امکانات پر غور کرنے کے لئے بابر کے باپ کے مقبرے میں چلے گئے۔

صلاح و مشورے جاری تھے کہ محمد دوست اپنے دونوں ساتھیوں کو چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ جہانگیر مرزا اور ابراہیم چاپوق نے اپنے دونوں دشمنوں کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جہانگیر مرزا نے

[1]۔ جہانگیر مرزا، بابر کا سوتیلا بھائی تھا اور بابر سے دو برس چھوٹا تھا۔ اس کی ماں کا نام فاطمہ سلطان تھا اور وہ قوم مغل کے گروہوں کے سرداروں میں سے تھی۔

بابر کے کان میں کہا۔ ان کو پکڑ لو۔ انھیں جانے نہ دینا۔ بابر نے کہا عجلت نہ کرو۔ اب پکڑنے کا وقت نہیں! صبر کرو۔ شاید سیدھی انگلیوں گھی نکل آئے اور کوئی مفید صورت پیدا ہو اس کے علاوہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ہم بہت تھوڑے ہیں۔ اور مرے پر سو درے کہ ہم شہر میں ہیں اور یہ قلعہ میں ہیں۔

بایزید اور قنبر علی ان سے الگ مشورے میں مصروف تھے جہانگیر مرزا نے ابراہیم کو اشارے سے منع کیا لیکن شاید وہ اشارہ کا مطلب الٹا سمجھا۔ یا دیدہ و دانستہ حملہ کر بیٹھا۔ اس نے ایکا ایکی بایزید کو پکڑ لیا۔ اور جو سپاہی وہاں موجود تھے انہوں نے لمحہ بھر میں دونوں کو گرفتار کر لیا۔ بابر کی مصلحت دھری کی دھری رہ گئی اب بابر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان پر پہرہ چوکی مقرر کیا۔ اور خود لڑنے کے لئے سوار ہو گیا۔

شہر کا ایک رخ جہانگیر مرزا کے سپرد کیا گیا۔ اس کے پاس آدمی کم تھے۔ بابر نے اپنے آدمیوں میں سے کچھ آدمی اس کو دئے اور جگہ جگہ ان سب کو متعین کیا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک وسیع میدان تھا۔ وہاں بھی پہرہ بٹھایا گیا۔ یہی وہ میدان تھا جہاں دشمن نے سب سے پہلے حملہ کیا اور بابر کے سپاہیوں کو مار مار کے ایک تنگ گلی میں دھکیل دیا — بابر کو جو خبر ملی تو وہ ہوا کے پروں پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ اس کو دیکھتے ہی دشمن پیچھے ہٹا۔ بابر ان سب کو گلی میں سے بھگا کر میدان میں لے جانا چاہ رہا تھا۔ اور تلواروں پر تلواریں مار رہا تھا کہ اتنے میں کسی نے گھوڑے کے پاؤں پر تیر مارا۔ گھوڑا جھک کر اچھلا اور بابر دشمنوں کے بیچ میں زمین پر جا پڑا

بابر جھٹ کھڑا ہو گیا۔ ایک خدمت گار[1] کے پاس ایک مریل سا گھوڑا تھا وہ اس پر سے اتر پڑا اور جھٹ بابر کی خدمت میں پیش کیا۔ بابر اس پر سوار ہوا اور میدان میں پھر کچھ آگے بڑھ کے گلی کی طرف چلا۔ سلطان محمد ویس نے جو دیکھا کہ بابر کے پاس بے دم گھوڑا ہے تو اس نے اپنا گھوڑا بابر کو دیدیا۔

اسی وقت خبر آئی کہ جہانگیر مرزا پر دشمنوں نے زبردست یورش کی تھی۔ جہانگیر مرزا کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ فرار ہو گیے بابر پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ تزک میں کہتا ہے :-

"یہ سنتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔"

اسی اثنا میں سید قاسم جو بابر کی طرف سے قلعہ باپ کو تھامے بیٹھا تھا۔ قلعہ چھوڑ کر چلا آیا۔ اس نازک وقت[2] لیے مضبوط قلعہ کا ہاتھ سے نکل جانا اور بھی مصیبت تھا وہ قبضہ میں ہوتا تو اس وقت سر چھپانے کو جگہ تو ملتی۔

بابر کی آنکھوں میں اس وقت دنیا تاریک تھی بس چھپانے کو کوئی گوشہ نہیں ملتا تھا۔ اس نے سید قاسم سے اس کی رائے پوچھی کہ اب کیا کریں۔ لیکن وہ پہلے ہی زخمی اور زخم کی تکلیف سے زیادہ یہ مصیبت تھی کہ اوسان ہار چکا تھا۔ ہر طرف دشمن کا غلبہ دکھائی دے رہا تھا اور جہانگیر مرزا کے بھاگ جانے کے سبب شہر کے ایک پورے حصہ پر دشمن پوری طرح قابض ہو چکا تھا۔ ایک حصہ جو ابھی تک اپنے قبضہ

[1] اس خدمتگار کا نام صاحب قدم (اور مسٹر جان لیڈی کے الفاظ میں "کاہل") تھا

[2] یہ خبر قنبر علی بیگ لایا تھا جو قاسم بیگ کا بیٹا تھا۔

رہا تھا۔ اس کو سنبھالنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ قاسم[۹] بابر کو کوئی معقول رائے نہ دے سکا۔ لیکن خود بابر کے خیال میں اور دوسرے امراء[۱۰] کے مشورے کے مطابق یہ طے تھا۔ کہ یہاں سے فرار ہونے ہی میں عافیت ہے۔

اتنی دیر میں بایزید تین چار سواروں کے ساتھ بابر کے سامنے آگیا۔ جہانگیر مرزا بھاگتے وقت بایزید کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ایک دفعہ ارادہ ہوا تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ لیکن بعد میں رائے بدل گئی۔ اور صرف قید رکھنا ہی مناسب جانا۔ لیکن وہ قید سے رہا ہو گیا اور فوراً ہی مورچہ پہنچ کے بابر کے سامنے آگیا۔ بابر کی کمان میں جو تیر تھا اس نے بھی بایزید کے کھینچ مارا۔ وہ اس کی گردن کو زخمی کرتا ہوا نکل گیا۔ زخم کاری تھا۔ بایزید گھبرا کر مڑا اور بھاگتا چلا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ جو تین آدمی تھے انہیں سے ایک پیدل سپاہی نے بابر کے ایک تیر مارا جو اس کی بغل میں لگا اور اس کی زرہ کے پتروں میں چھید کر انھیں کاٹ ڈالا۔

حالت اتنی نازک ہو گئی تھی کہ بھاگ جانے ہی میں سلامتی دکھائی دی۔ لیکن بھاگتے بھاگتے بھی بابر اور اس کے ساتھی ہمت مردانہ کے جوہر دکھا جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ بجلے[۱۱] تو دکھا جانا چاہتے۔ جب میدان چھوڑ کر بھاگا ہے تو اس کے ساتھ بیس پچیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ جیسے ہی انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگ پھیریں دشمن کے بہت سے آدمی تعاقب میں لپک پڑے اور انہوں نے ایک ایک کر کے بابر کے آدمیوں کو گرانا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں ابراہیم بیگ نے چلا کر بابر کو مدد کے لئے پکارا۔

بابر کہتا ہے :-

"میں نے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بایزید کے ایک غلام نے ابراہیم بیگ کو آلیا ہے۔ میں نے فوراً باگ موڑ دی[۱۲]۔

لیکن جان قلی بیان قلی[۱۳] نے جو بابر کے پہلو میں تھا بابر کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہنے لگا "یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں؟ یہ پلٹنے کا وقت ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ وقت واقعی بہت نازک تھا۔ بابر اکیلا کیا پہاڑ پھوڑتا۔ مجبوراً ابراہیم کو اس کی تقدیر کے حوالے کر کے آگے بڑھا۔ اور بھاگتا چلا گیا۔ دشمن برابر پیچھے لگا ہوا چلا آرہا تھا لیکن آخر وہ تھک کر رہ گیا[۱۴]۔ اس وقت بابر

---

۱۰ - بابا شیراز وغیرہ کی رائے یہی تھی۔

۱۱ بابر، خواجہ میر میراں، سید قاسم، دوست ناصر، ابراہیم بیگ، مرزا قلی کوکلتاش، کیپک علی اور سلیمان نے خوب خوب مردانگی کے جوہر دکھائے۔ سلیمان، محمد علی مبشر کا نوکر تھا اور کیپک علی، سلطان محمد دلیس کا ملازم تھا۔ ہندوستان فتح کر لینے کے بعد بابر نے کیپک علی کو کول کا جو اب علیگڑھ کے نام سے مشہور ہے حاکم مقرر کر دیا تھا۔

۱۲ یہ واقعہ آخشی سے ایک کوس پرے گنبد زین۔ کہ مقام پر پیش آیا تھا۔

۱۳ بعض قلمی نسخوں میں جان قلی، بیان قلی دو آدمی لکھے ہیں لیکن بعض نسخوں میں اسے ایک ہی آدمی مانا ہے۔ جان قلی کا نام بعض نسخوں میں قلی تی بھی لکھا ہے۔

۱۴ سنگ ایک مقام کا نام ہے۔ یہ آخشی سے دو کوس ہے وہاں دشمن نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔

اپنے ساتھیوں کو گنا تو بابر سمیت صرف آٹھ آدمی تھے[1]
دشمن پیچھے رہ گیا تھا۔ پھر بھی خطرہ بدستور موجود تھا احتیاط کی بڑی ضرورت تھی۔ چنانچہ ان آٹھوں نے عام گذرگاہ چھوڑ کر ایک ایسی پگڈنڈی اختیار کی جو کھڈوں میں سے ہوتی ہوئی دریا جا رہی تھی معلوم دی۔ آگے چل کر اس پریشان اور تباہ حال قافلے نے دریا کو سیدھے ہاتھ چھوڑا اور ایک اور تنگ راستے کو پکڑا کھڈوں میں بل کھاتا ہوا دور تک چلا گیا تھا۔ شام کو عصر کے وقت یہ تھکے ماندے لوگ ایک میدان میں پہنچے۔ دور ایک سیاہی نمودار ہوئی۔ بابر نے جھٹ ساتھیوں کو ایک آڑ میں ٹھہرایا اور وہ چٹان پر چڑھ گیا۔ اتنے میں پیچھے کے ٹیلے پر بہت سے سوار چڑھ آئے۔ وہ تعداد میں بیس پچیس ہوں گے۔ لیکن خدشہ یہ تھا کہ ان کے پیچھے فوج کا کوئی دستہ ان کی مدد کے لئے ضرور ہوگا اس لئے ان آٹھوں نے پھر اپنے گھوڑوں کو بھگایا اور بھاگے چلے گئے۔

جان قلی نے بابر سے کہا۔ اگر ہم اسی طرح بھاگتے رہے تو ایک ایک کرکے سب مارے جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ دو جاندار گھوڑے لیکر آپ اور مرزا قلی کوکلتاش آگے نکل جائیے شاید اسطرح آپ اس مصیبت سے بچ سکیں۔ بابر کہتا ہے:۔

"اس کا مشورہ صحیح تھا۔ لڑائی کا دم نہ تھا تو
نکل جانے کی تدبیر کرنی چاہیئے تھی کہ ایسے
وقت میں مجھے اپنے ساتھیوں میں سے کسی
ایک کو بھی چھوڑ دینا گوارا نہ ہوا"

بابر نے جس صورت کو گوارا نہ کیا۔ وہ خود بخود ہو گئی اور وہ سب ایک ایک کرکے رہ گئے۔ لیکن اس تجویز کو نہ ماننا بابر کی عالی ہمتی کی بے نظیر اور جرات کی دلیل ہے۔ ہوا یہ کہ جب بابر نے اس تجویز کو مسترد کیا تو کچھ ہی دور چل کر بابر کا گھوڑا سستی کرنے لگا۔ جان قلی فوراً اپنے گھوڑے سے اترا اور اس نے اپنا گھوڑا بابر کو پیش کر دیا۔ اور خود بابر کے گھوڑے پر بیٹھ گیا اسی اثنا میں ناصر اور قدوس پر دشمنوں نے قابو پالیا اور انہیں گھوڑوں سے گرا لیا اس کے بعد جان قلی بھی پیچھے رہ گیا۔ بابر نے تزک میں لکھا ہے:۔

"اس کی مدد کرنے کا وقت نہ تھا جہاں
تک گھوڑوں میں طاقت دیکھی انہیں دوڑائے
چلے گئے جس کا گھوڑا بیکار ہوتا گیا وہ رہتا گیا"

اس کے بعد دوست محمد کے گھوڑے نے بھی ہمت ہار دی اور وہ رہ گیا۔ اس کے بعد بابر کے دوسرے گھوڑے نے بھی ہار مان لی۔ اس نازک ترین وقت میں اپنی جان کو موت کے منہ میں دے کر جس نے اپنا گھوڑا بابر کو پیش کیا وہ قنبر تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا بابر کو دے کر اس کا گھوڑا خود لے لیا اور پیچھے رہ گیا۔ اس کے بعد حسینی کی باری آئی اور اس نے بھی ساتھ چھوڑا۔ اب صرف بابر اور قلی رہ گئے تھے اور ان دونوں کے گھوڑوں میں بھی تیز اڑنے کا دم نہ رہا تھا۔ آخرکار قلی کے گھوڑے نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ بابر نے کہا تجھ کو اکیلا چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ آ جلدی آ۔ ہمارا تیرا مرنا جینا ایک ہی جگہ ہو تو اچھا ہے۔ بابر بار بار مڑ کر قلی کو دیکھتا تھا اور آگے بڑھتا تھا۔ قلی نے کہا میرا گھوڑا تھک چکا ہے۔ آپ میرا ساتھ دیں گے تو رہ جائیں گے اور بچ جائے

---

[1] بابر، دوست ناصر، قنبر علی قاسم بیگ، جان قلی بیان قلی، مرزا قلی کوکلتاش، شاہم ناصر، عبدالقدوس سیدی قرا اور خواجہ حسینی باقی بچے تھے۔

جائیں گے اس لئے آپ جانے شاید آپ نکل جائیں۔ بابر کہتا ہے :۔

"اس وقت میری عجیب حالت تھی مرزا بھی
پیچھے رہ گیا اور میں اکیلا رہ گیا :"

بابر کے تنہا رہ جانے کے بعد تنبل کے دو آدمیوں نے اسے دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک بابا سیرامی دوسرا بندہ علی تھا ان دونوں نے بابر کے پیچھے گھوڑے ڈال دئے۔ بابر کا گھوڑا تھک چکا تھا لیکن سامنے کوس بھر پرے ایک پہاڑ تھا۔ بابر نے سوچا کہ پہاڑ تک پہنچ جاؤں تو اوپر چڑھ کر دشمن پر تیر برسا سکتا ہوں۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھنے کے لئے اسے اپنی تیز روی پر پورا بھروسہ تھا وہ اسی دھن میں آگے بڑھا چلا جا رہا تھا لیکن گھوڑے کی قوت برابر کم ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار دونوں دشمن ایک تیر کے زد تک پہنچ گئے۔ بابر اپنے تیر بچانا چاہتا تھا۔ وہ دونوں بھی پیچھے رہے اور بابر کے بہت زیادہ قریب نہ گئے۔ لیکن اس کا پیچھا بھی نہ چھوڑا۔ مغرب کا وقت آگیا تھا جو بابر پہاڑ کے نزدیک پہنچا دشمن نے پیچھے سے للکار کر کہا :۔

"کہاں بھاگ کر جاتے ہو، اس طرح بچ نہیں سکتے ناصر مرزا پہلے ہی تنبل کے پاس قید تھا۔ جہانگیر مرزا کو بھی پکڑ کر لے آئے ہیں :"

یہ سن کر بابر کی جان نکل گئی، اس نے سوچا کہ تینوں بھائی ایک ساتھ مارے گئے تو خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ بابر نے کہا :۔

"ان کی باتیں سنکر میرے رونگٹے کھڑے
ہو گئے خوف یہ تھا کہ ہم سب پکڑے گئے
تو بڑے اندیشہ کی بات تھی :"

خوف کے مارے بابر کا بُرا حال تھا۔ ان کی باتوں کا جواب کیا دیتا جان بچانے کی کوشش میں برابر آگے بڑھتا رہا۔ آخر عشاء کے وقت وہ پہاڑ کی ایک بڑی چٹان پر پہنچ گیا اور اس کے پیچھے کی جانب ایسے ڈھلوان ٹیلوں پر چڑھنا شروع کیا جہاں گھوڑے کا قدم نہ ٹک سکتا تھا۔ وہ دونوں بھی برابر ساتھ لگے ہوئے تھے انہوں نے بھی گھوڑوں کو چھوڑ دیا۔ اور پھر نرمی اور ادب سے بولے۔

"رات اندھیری ہے۔ رستہ ہے نہیں۔ یوں کہاں تک پھرو گے اور پھر قسم کھا کر کہنے لگے۔ تنبل آپ کو بادشاہ بنانا چاہتا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ واپس چلئے :"

وہ بابر جس کو بعد میں ایک دن برصغیر ہند و پاک میں مغل سلطنت کے جھنڈے گاڑنے تھے۔ اور اس سرزمین کو فتح کر کے جس کو تاریخ میں لازوال نام پیدا کرنا تھا وہ اس وقت تنبل کے خوف سے یکا و تنہا مارا مارا پھر رہا تھا اور جنگلوں اور بیابانوں تک میں اسے منہ چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ تنبل کی طرف سے اس کو بادشاہت کی بھیک دی جا رہی تھی لیکن اسے یقین نہ آتا تھا اور نہ یقین آنے کی بات تھی۔

بابر نے دشمن کی میٹھی میٹھی باتوں پر اعتبار نہ کیا۔ اور کہا۔

مجھے تمہاری باتوں کا یقین نہیں۔ میں تنبل کے پاس نہیں جاؤں گا لیکن تم میری خدمت کرنی چاہتے ہو تو اس وقت خدمت کا ایسا موقع ہے جو برسوں میں بھی ہاتھ نہیں آتا۔ مجھے ایسا راستہ بتا دو جس سے میں اپنے ماموؤں کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں تمہیں اتنا کچھ دوں گا جو تمہارے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گا لیکن اگر تم میرے ساتھ یہ سلوک بھی نہیں کر سکتے تو اتنا کرو کہ جدھر سے آئے ہو ادھر ہی چلے جاؤ۔ میری قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ پورا ہو گا۔ تم اس وقت میرے ساتھ اچھا ہی کرو کہ مجھے

میری قسمت پر چھوڑ دو تو میں اسے بھی تمہارا سلوک جانوں گا۔

وہ بابر جس نے ہمیشہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اس وقت تنبل کے ملازمین سے اپنی جان کی امان چاہ رہا تھا اور وہ نہ ملتی تھی۔

دشمنوں نے اسے جھکا دیا اور کہا۔ کاش ہم آپ کے پیچھے نہ آتے اور جب آ گئے ہیں۔ تو ایسے بُرے وقت میں آپ کو تنہا چھوڑ کر کس طرح پلٹ جائیں؟ آپ تنبل کے پاس نہیں چلتے تو جہاں جی چاہے وہاں چلیے ہم آپ کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بابر نے کہا یہ منظور ہے۔ بشرطیکہ تم وعدہ کرو انہوں نے حلف اور قسم کے ساتھ وعدہ کیا۔ بابر کو قدرے اطمینان ہوا لیکن پورا بھروسہ نہ ہو سکا وہ کہتا ہے:-

"انہوں نے عہد کر لیا تھا مگر مجھے
پورا بھروسہ نہ تھا"

اس لئے اس نے ان دونوں کو اپنے آگے آگے رکھا اور آپ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس نے کہا۔ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ اس گھاٹی کے پاس ایک چوڑی سڑک ہے۔ اسی طرف چلو۔ دو کوس آگے چل کر جب وہ ایک بڑے دریا کے پاس پہنچے۔ تو وہ سڑک مل گئی۔ بابر نے کہا وہ سڑک شاید یہی ہے۔ لیکن ان دونوں نے اسے جھانسہ دیا اور کہا وہ سڑک ابھی بہت دور ہے آدھی رات تک وہ اسی طرح بابر کو بھرماتے رہے۔ پھر بولے۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ وہ سڑک وہی تھی۔ بابر بہت پریشان ہوا پھر وہ کہنے لگے آگے ایک اور سڑک ہے وہاں تک چلیے۔ چلتے چلتے رات کے پچھلے پہر دریائے کرنان[1] پر پہنچے

بابا سیرامی کہنے لگا۔ آپ دونوں یہاں ٹھہریں۔ میں راستہ دیکھ آتا ہوں تھوڑی دیر بعد آ کر اس نے جو خبر سنائی تو بابر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کہنے لگا۔ ادھر چلنا ممکن نہیں ہے وہاں سے کئی آدمی اسی طرف آ رہے ہیں۔ بابر تزک میں لکھتا ہے:-

"یہ سن کر میں گھبرایا وجہ یہ تھی کہ چاروں طرف
سے نرغے میں تھا اور صبح قریب تھی اور منزل
مقصود کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میں نے
کہا کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں دن کو چھپا رہوں"

بابر کی تجویز یہ تھی کہ دن کہیں چھپ کر کاٹیں اور رات کو کہیں سے دریائے خجند کے پار اتر جائیں۔

وہ بولے یہاں ایک ٹیلہ ہے وہاں چھپنے کی جگہ موجود ہے بندہ علی کرنان کا داروغہ رہ چکا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ اب ہم اور ہمارے گھوڑے بھوکے نہیں رہ سکتے۔ میں کرنان جاتا ہوں اور کھانے کے لئے جو کچھ ملتا ہے وہ لے کر آتا ہوں پھر وہ بابر کو کرنان کی طرف لے چلے جب کرنان کوس بھر رہ گیا تو بابر اور سیرامی ٹھہر گئے اور بندہ علی چلا گیا۔

صبح سر پر چلی آ رہی تھی اور اس کا پتہ نہ تھا۔ بابر کی گھبراہٹ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ آخر دن نکل آنے کے بعد وہ آیا۔ اور صرف تین روکھی روٹیاں اپنے ساتھ لایا۔ گھوڑوں کے لئے کہنے لگا کچھ انتظام نہ ہو سکا۔ بابر کہتا ہے:-

"ہم تینوں نے ایک ایک روٹی بغل میں
مار لی"

وہ بابر جس نے بعد میں جشن آگرہ کے موقع پر ایک

---

[1] بعض نسخوں میں اس دریا کا نام "کرگان" لکھا ہے

ایک سپاہی کو ہلاک کر دیا تھا۔ اور کابل میں جو لوگ رہ گئے تھے ان کو تمام بنام آثرہ سے تحائف کے انبار بھیجے تھے اسوقت اس نے کئی وقت کے فاقوں کے بعد ایک روکھی سوکھی روٹی پائی اور اسی کو بغل میں مار کر ٹیلے کے پیچھے چھپ گئے۔ تینوں تھوڑی تھوڑی دور الگ الگ سمتوں پر بیٹھ گئے جہاں سے دور دور تک کا حال دکھائی دیتا تھا۔ دوپہر کے قریب احمد قوشچی[1] جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ چار سوار تھے۔ بابر نے چاہا کہ اسے بلا کر اور وعدے وعید لیکر ان کے گھوڑے لے لئے جائیں کیونکہ ان کے گھوڑے چوبیس گھنٹے کے مسلسل دوڑ کے بعد تھک کر چور ہو چکے تھے اور اس عرصہ میں انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا لیکن میر احمد کو بلاتے ہوئے بابر کو خوف معلوم دیا۔ اور اس پر بھروسہ نہ ہو سکا۔ پھر صلاح یہ ہوئی کہ یہ لوگ رات کو کرنان میں ٹھہریں گے۔ رات کو جب یہ سو جائیں تو ہم تینوں چل کر ان کے گھوڑے چرا لائیں۔ اس کے بغیر کسی دور دراز جگہ پہنچنا ممکن نہ تھا۔

دوپہر کو حد نگاہ پر ایک گھوڑے پر چمکتی ہوئی چیز نظر آئی لیکن یہ لوگ اسے پہچان نہ سکے۔ دراصل وہ باقر بیگ تھا جو عرصہ دراز تک بابر کے پاس رہا تھا اور اس کا نمک خوار تھا۔ آخشی میں بھی وہ بابر کے زیر کمان تھا اور جب یہ سب وہاں سے بھاگے ہیں۔ اس وقت یہ بھی جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گیا اور اب اسوقت دشمنوں سے چھپتا چھپاتا پھر رہا تھا اس وقت اگر بابر اسے پہچان جاتا تو ایک سے ایک مل کر گیارہ ہو جاتے اور بابر کو جو دوگنا گ دشمنوں کے نرغے میں نظر بند تھا۔ اس کے آجانے سے بڑی ڈھارس

ہو جاتی۔ اور پھر ان دونوں سے چھٹکارا پانا بھی آسان ہو جاتا۔ لیکن قسمت بعض اوقات عجیب عجیب رنگ دکھاتی ہے خوش قسمتی دور سے اپنی جھلک دکھاتی ہے اور پھر بدقسمتی کی پشت کے پیچھے جا چھپتی ہے۔

عصر کے وقت ایک اور سوار جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بابر اسے پہچان گیا وہ قادر بردی تھا اور غوا کے رؤسا میں شامل تھا۔ حالانکہ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا پھر بھی بابر نے اسے بلوالیا۔ اس سے وعدے وعید کئے اس کو اپنی خالی کا یقین دلایا۔ اور گھوڑوں کے لئے دانہ اور دریا کے پار ہونے کے لئے ضروری سامان منگوایا۔ اس نے بابر کو یقین دلایا کہ میں یہ سب چیزیں لیکر عشا تک آتا ہوں۔ لیکن دونوں ساتھیوں نے علیحدگی میں اس سے کہا کہ فوراً تنبل کے پاس جاؤ اور بابر کا پتہ اسے دے دو۔

مغرب کے بعد ایک اور سوار جاتا ہوا دکھائی دیا اس سے پوچھا کون ہے وہ وہی بابر کا نمک خوار باقر تھا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چھپتا پھر رہا تھا اس نے اس طرح آواز بدل کر جواب دیا کہ کوئی اسے پہچان نہ سکا اور اس کے چلے جانے سے بابر کو یہ خوف ہوا کہ ممکن ہے وہ دشمنوں میں سے کوئی ہو اور جا کر ساتھیوں کو خبر کر دے۔

جاڑے کا موسم تھا سردی خوب پڑ رہی تھی اور پہاڑ کی چوٹی یوں بھی غیر محفوظ تھی اس لئے وہاں بیٹھ کر عشا تک قادر کا انتظار نہ کیا جا سکا۔ بندہ علی نے مشورہ دیا کہ کرنان کے اردگرد ایسے بہت سے باغات ہیں جہاں آسانی سے چھپا جا سکتا ہے کسی کو وہم تک بھی نہ ہوگا کہ ہم وہاں چھپ سکتے

[1] قوشچی ۔ شکاری

ہیں۔ وہیں سے کسی کو قادر کے پاس بھیج دیا جائے گا اور اسے وہیں بلا لیں گے۔ بابر ان کے کہنے میں آ گیا اور انہوں نے وہاں پہنچ کر جھوٹ موٹ بابر سے کہہ دیا کہ قادر کو خبر بھیج دی ہے۔

آدھی رات گذر گئی اور قادر نہ آیا۔ تو ان دونوں نے بابر کو نیا چکر دیا۔ کہنے لگے۔ جب تک وہ نہ آئے۔ ہمیں یہاں سے کہیں اور نہ جانا چاہیئے۔ لیکن ہم اس وقت جس جگہ ہیں۔ یہ بیچوں بیچ میں ہے اسی علاقے کی انتہا پر ایسے باغیچے ہیں جن میں مکانات بھی بنے ہوئے ہیں۔ وہاں ہم دشمنوں کی نظروں سے قطعی محفوظ رہیں گے بابر سوائے اس کے کہ ان کے ہر مشورے پر عمل کرتا اور کر ہی کیا سکتا تھا ان کے کہنے سے وہاں چلا گیا۔

جس مکان میں ٹھہرے سیرامی اس کے بالا خانے پر چڑھ گیا اور ادھر اُدھر کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ دوپہر کے قریب وہ نیچے اترا اور بابر سے کہنے لگا۔ غضب ہو گیا۔ یوسف داروغہ آ رہا ہے۔ بابر کہتا ہے:۔

" میں نہایت خوفزدہ ہوا اور اس سے کہا پوچھو تو سہی
کیا وہ میری خبر سنکر آیا ہے؟ "

وہ باہر گیا۔ نہ جانے اس سے کیا کیا باتیں کہیں سنیں۔ پھر آکر بابر سے کہا۔ یوسف کہتا ہے کہ مجھے آخشی کے دروازے پر ایک سپاہی ملا تھا۔ اس سپاہی نے مجھے بتایا کہ بابر کرنان میں فلاں جگہ پر چھپے ہوئے ہیں۔ یوسف نے بتایا کہ میں نے کسی کو اس کی خبر نہیں کی ولی خزانچی اور وہ سپاہی میرے ساتھ یہاں تک آئے تھے میں نے انہیں ایک مکان میں تبدیل کر دیا ہے اور میں بھاگا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں امراء میں سے کسی کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں ہے۔

بابر نے سیرامی سے پوچھا تری کیا رائے ہے؟ کہنے لگا۔ وہ سب آپ کے نوکر چاکر ہیں۔ سوائے اس کے کہ آپ کو بادشاہ بنا کر نوکر ہی کیا سکتے ہیں آپ کو واپس چلنا چاہیئے۔

بابر نے کہا اتنا غدر مچا اور اتنی لڑائیاں ہو گئیں اب میں کس بات پر بھروسہ کر کے چلوں اتنے میں یوسف اندر آ گیا اور جھک کر آداب بجا لایا۔ اور کہنے لگا آپ سے کیا چھپاؤں۔ تنبل کو تو آپ کی خبر نہیں ہے لیکن بایزید کو آپ کا حال معلوم ہو چکا ہے اور اس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ بابر نے تزک میں لکھا ہے:۔

" یہ سنتے ہی مجھے سناٹا آ گیا سچ یہ ہے کہ دنیا
میں جان کے خوف سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے
میں نے کہا سچ سچ بتاؤ۔ اگر کچھ ایسی ویسی بات
پیش آنے والی ہے تو میں وضو کر لوں "

بابر کو زندگی کی امید نہ رہی۔ موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی لیکن چارہ کار کچھ نہ تھا۔ بابر نے اس سے پہلے اور اس کے بعد بہت سے میدان مارے۔ بڑی بڑی جنگیں لڑیں اور سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ لیکن تنبل کے سبب اس باغیچے میں بابر نے جو ذلت اٹھائی اور زندگی سے جس قدر نا امید ہوئی اتنی شاید کبھی کہیں نہ ہوئی تھی اور نہ آئندہ ہوئی۔

یوسف نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا۔ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں رتی بھر جھوٹ نہیں ہے لیکن بابر کہتا ہے:۔

" اس کی قسموں کا یقین کون کرتا۔ میں نے محسوس
کیا کہ میری روح تحلیل ہوئی جا رہی ہے۔ میں
اٹھا اور باغیچے کے کونے میں گیا اور دل میں سوچا
کوئی سو برس جیئے یا ہزار برس زندہ رہے لیکن
آخر ایک دن مرنا ہے "

تاریخ کے گمشدہ اوراق اس واقعہ کے نتیجے کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔ کہ اس کے بعد کیا ہوا اور بابر دشمنوں کے نرغے سے کس طرح بچا۔ تزک میں جو خود بابر کی خود نوشت سوانح عمری ہے

اس باب میں اپنے لب سے ہوسکے پہلا باب کچھ نہیں بتاتی کہ اس
ذہنیت تک نظر بندی سے بابر نے کس طرح رہائی پائی۔

گزارانی کے باغیچے میں مذکورہ واقعات ۹۱۰ھ[1] ہجری کے
آخر میں پیش آئے تھے۔ ۹۱۱ھ ہجری کے حالات ترک میں بھی
نہیں ملتے بابر نے ترک میں اول سے آخر تک اپنے حالات مسلسل بیاں
نہیں بتلائیں۔ تین مقامات اس میں ایسے آتے ہیں جہاں حالات غائب
ملتے ہیں یا چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ جس عرصہ میں
بابر پر مصیبت کے زیادہ پہاڑ ٹوٹے۔ ان دنوں میں وہ اپنی اس
ادبی اور تاریخی کاوش کو جاری نہ رکھ سکا۔ دوسری تاریخوں میں بھی
بابر کے اتنے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ جن سے بابر کی ان کہی باتوں
پر سے پردہ اٹھ سکتا۔

اس عرصہ میں تنبل کی سرگرمیاں بھی پردہ راز میں پوشیدہ
ہیں البستہ تاریخ اتنا بتاتی ہے کہ ۹۱۰ھ میں محمد شیبانی خاں
نے اندجان پر حملہ کیا اور تنبل کو گرفتار کر لیا۔

شیبانی بابر کا وہ زبردست دشمن ہے جس کی وجہ سے
بابر کو ماوراء النہر سے اپنا بوریا بستر باندھ کر ہندوستان کی طرف
بھاگنا پڑا اور شیبانی ہی وہ سلطان ہے جس نے خسرو شاہ[2] اور تنبل
جیسے دشمنوں کو جنھوں نے بابر کو انگلیوں پر نچا رکھا تھا چٹکیوں میں
مسل ڈالا۔ اور صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ اور پھر وہ بابر کے لئے بھی
ایسا قہر بن گیا۔ جس کے سامنے بابر کی سخت جانی جاں کنی کی شکل
میں بدل گئی۔ اور بے خوفی نے ڈر اور خوف کے سامنے ہتھیار ڈال
دیئے اور بابر کے لئے ماوراء النہر سے نکل جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

سلطان احمد بیگ تنبل نے تو آخر میں شیبانی سے شکست
کھائی اور تاریخ نے اس کو بھلا دیا لیکن جہاں تک بابر سے مقابلہ کا
تعلق ہے۔ تاریخ کے دھندلے اوراق آج بھی ہم کو بتاتے ہیں کہ وہ
نہایت سخت جان، موقع شناس، بے خوف لڑاکا اور نڈر سپاہی تھا
میدان جنگ میں خطروں سے کھیل کر اس نے قدر اندازی، شاہسواری
اور تیغ آزمائی کے جو جوہر دکھائے ہیں وہ تنبل کی شخصیت میں
بلا کی کشش پیدا کرتے ہیں اور اس کے عزائم کی بلندی کا اعتراف
کرتے ہیں۔ بابر کو ہر معرکہ میں نیچا دکھا کر تنبل نے تاریخ میں جگہ
پائی ہے جو تنبل کی زندگی میں بابر کو نصیب نہ ہو سکی بابر کو شکستوں
پر شکستیں دے کر تنبل نے اپنے نام کو تاریخ میں لازوال بنا لیا ہے۔

۔ ختم شد ۔

مُتَفَرَّقَات

میں کہ فطرت مری خود گل سے بھی نازک تر ہے
مجھکو حیرت ہے کہ خاروں سے الجھتا ہوں میں

لَو دے رہا ہے ہر بُنِ مو سوزِ عشق سے
آیا نہ اشک گر سرِ مژگاں تو کیا ہوا

غمِ دوراں کی بھلا کیوں ہو مجھے کچھ تشویش
غمِ جاناں کو جو سینے سے لگا رکھا ہے

---

[1] مطابق ۱۵۰۵ء

[2] دیکھئے مقالہ "خسرو شاہ" مرتبہ محمد رحیم دہلوی شائع کردہ۔ رسالۃ العلم " آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

ملت پاکستان — ایک اخلاقی جائزہ

(از جناب محمود سا اکبر آبادی)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

پاکستان کا سیاسی وجود قائم ہو جانے پر، اب قوم کو سکون و فکر کی اس منزل میں ہونا چاہیئے جہاں ٹھنڈے دل سے خیر و فلاح کے مصالح پر غور کیا جاتا ہے۔ اس محل پر اقبال کا یہ مصرع یاد آتا ہے جو اس نبرد گوار نے عرب قوم کے ذکر میں کہا ہے۔

جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

جہانگیری کا مرحلہ برعظیم کی تقسیم نے طے کر دیا۔ جہانداری کی راہ میں کوئی دشواری حائل نہیں ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کو پاکستان کا آزاد و خود مختار وجود تسلیم ہے۔ پاکستان اقوام متحدہ کا ایک رکن ہے۔ جو قائد اعظم ارشاد فرما گئے ہیں کہ یہ مملکت قائم رہنے کے لئے بنی ہے۔

اب جہان بانی (ایڈمنسٹریشن)، اور جہاں آرائی کے منازل سامنے ہیں۔ اول الذکر اس مقالے کا موضوع نہیں۔ مجھے جہاں آرائی کا جائزہ لینا ہے۔ جو قوم کی تقدیر کا دوسرا نام ہے۔

جب گھر رہنے کو مل جاتے تو گھر کی پرداخت کا خیال پیدا ہوتا ہے، تعمیر منزل کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور طبیعت آرائش کی طرف آرائش کو بھی چاہتا ہے لیکن ہماری قوم کے لئے تو آرائش سے پہلے سدھار کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حکومت کی جڑ مضبوط ہو، تو قوم کی جڑ مضبوط ہو جائے، لیکن یہ ایک مغالطہ ہے، قوم کی جڑ مضبوط حکومت سے مستحکم نہیں ہوا کرتی، عامۃ الناس کی قوت سے استوار ہوتی ہے۔ عامۃ الناس کی قوت، افراد کے کردار کی اصابت کا نام ہے۔ کردار، ان اجزا کے اخلاق کے مجموعی اثر کا مترادف ہے۔ جو قوم کی معاشرت میں روز بالمرۃ کار فرما اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ آج ہم اپنی معاشرت کے کیف و مزاج کا جائزہ لیں تو بہت ممکن ہے کہ خون کے آنسو روئیں اور اگر یہ نہ ہو، تو ہماری آنکھیں ہی کھل جائیں۔

معاشرے کے تمدنی اجزا میں تعلیم کو مسلمہ خصوصیت حاصل ہے۔ قوم کے تمدن کی اہمیت کا اندازہ، نظام تعلیم کی نوعیت سے کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے رائج الوقت نظام تعلیم کی ہنگامی دشواری یا سہولت، خامی یا پختگی پیش نظر نہیں۔ عذر یہ ہے کہ اس مملکت نے "نہ کچھ" (اسکریچ) سے جنم لیا ہے، ابھی یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ اسکریچ کی منزل کتنی طویل ہے، اس کے اعلیٰ وارفع یا بلند ترین و عملی نظریات تعلیم کے رواج کا ابھی اور انتظار کرنا ہے یہ اصولی بات ہے، اس کا تعلق ماہرین تعلیم سے ہے، اس معمولی قسم کے بنیادی سچائیوں کو کوئی بحث نہیں ہونی چاہیئے اس

بھی بحث نہیں ہونی چاہیئے کہ آٹھ برس کی مدت میں سینٹ پیٹرک کونونیٹ جیسی ایک درسگاہ بھی مسلمان بچوں کے لئے ، دارالخلافہ میں قائم نہ ہوئی ۔ یہ باتیں تو ستیزہ سے متعلق ہیں ۔ اگر ، وجود پذیر نہیں ہوئیں ، تو خیر ، نہ سہی ۔ لیکن ان سے قطع نظر جب اپنے بچوں کی تعلیم میں ، ان ابتدائی ، لازمی ، ناقابل ترک اجزاء کا فقدان نظر آئے ، جن کے بغیر تعلیم نامکمل اور تشنہ رہ جاتی ہے ، جو کسی متمدن قوم کی تعلیم سے حذف نہیں کئے جاسکتے ، تو ، دل کو کیا کہہ کر سمجھایا جائے ۔

تعلیمی مسلمات نے ، دوسرے حواس و قوٰی کے ساتھ حسن جمال کی تربیت لازمی قرار دے دی ہے ۔ زندگی کے لئے ، خوشنما اور بدنما ، پاکیزہ اور گندے ، حسین اور بھیانک کا شعوری امتیاز ناگزیر ہے ، اس لئے کہ جمال زندگی کا حسن اور بھیانک پن زندگی کے لئے مضر ہے ۔ دونوں اپنی اپنی قوت کے بہ قدر ، اخلاق پر موثر ہوتے اور زندگی کی تدوین میں نمایاں تعیز پیدا کرتے ہیں ۔ برطانوی عہد حکومت میں جمالیاتی عنصر ، سرکاری طور پر داخل نصاب تھا ۔ لیکن بعض بلند پایہ مدارس جن میں چند مشن اسکول ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہے ، اس نوع کی تربیت پر اصرار کرتے تھے اور یورپین اسکول ہیں ، جو ، کوہستانی مقامات اور بڑے بڑے شہروں میں بدیشی اور دولت مندیوں کے لئے قائم تھے ، اس تعمیری پہلو پر خاص توجہ کی جاتی تھی ۔

ہندوستان بالخصوص یو۔پی کے شہروں میں دیواروں پر گالیاں لکھی اور گندی تصویریں بنی نظر آتی تھیں ۔ محلے کی دیواروں کے علاوہ ، یہ نقوش مدرسوں ، سینماؤں ، ہوٹلوں ، اسٹیشن کے اقامت گاہوں ، روئٹنگ روم ، اور پبلک اداروں کے پاخانوں ، حد یہ ہے کہ ریل کے تیسرے اور انٹر کے ڈبوں میں بھی نظر آتے تھے ۔ اکثر کے محلوں میں ، ان مناظر کی یہ کثرت و فراوانی تھی کہ بعض محلوں کے لڑکے ، اس فن کے امام اور مجتہد سمجھے جاتے تھے ۔ انھیں یہ کمال حاصل تھا کہ فساد اور بلوے کے دوران میں بھی ، وہ ہندو محلوں میں در آکر ، دیواروں پر موٹی موٹی گالیاں لکھ آتے اور لالہ اور للیا ئن کی تصویر نقش کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں ۔

حضور ، آپ کی جھنجلاہٹ ، غیض و غضب ، عصبیت سے مرعوب ہو کر میں یہ جبال پارے ہندو لڑکوں کے سر کیسے تھوپ دوں ، ہندو بچوں میں یہ صلاحیاں وضع کرنے اور رسم خط اردو لکھنے کی قدرت ہوتی ۔ تو ہمارے اقبال کا ستارہ نصف النہار پر نہ ہوتا ۔ ہماری تقدیر نہ جاگ رہی ہوتی ۔ صاحب اگر ہندو بچوں کو گالیاں اردو میں لکھنی آتیں ۔ تو ، انجمن ترقی اردو کا دفتر دلی سے کراچی کیوں آجاتا ۔ برعظیم میں اردو ہندی کا قضیہ کیوں اٹھ کھڑا ہوتا ۔ پیر الٰہی کالونی ۔ پاکستان چوک ۔ مارٹن روڈ جہانگیر روڈ ۔ لالو کھیت ۔ گولی مار کی گلیوں میں ۔ اس صنعت کی ترقی اور احیا پر ہم کیسے مباہات کرتے ۔

آپ کہیں گے یہ تو بچوں کا کام ہے ۔ لاریب یہ بچوں کا کام ہے ۔ لیکن بچے تو بڑوں کے بچے ہیں ۔ بڑوں میں یہ حس کیوں نہیں اور اگر ہے تو کیوں مردہ ہو گئی ۔ انھیں موٹی موٹی گالیوں اور ان عملی تصویروں سے اذیت کیوں نہیں ہوتی ۔ جن دیواروں کو ان کی مائیں بہنیں ، بیٹیاں ، بہوئیں دیکھتی ہیں ۔ ان پر خرافات فاحش اور شرمناک نقوش و عبارت کی موجودگی کو ، وہ اپنی ذات پر حملہ اور انسانیت کی توہین کیوں نہیں سمجھتے ۔ لیڈران قوم اور پدران شہر نے اس کی روک تھام کیوں نہیں کی ۔ کتنے کلچرل ہوم کتنے پوسٹر شائع ہوتے ۔ کتنے جلوس نکلے ۔ بیسیوں ایڈیٹر جاریوں نے محراب و منبر سے کیا احتجاج کیا ۔ سامنے کام کرنا

کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ حکومت کو تاحق الزام دے کر اپنی ذمہ داری ٹالنے سے کیا حاصل ہے۔ مغربی ملکوں کو دیکھ لیجئے۔ زندہ قومیں سارا معاشرتی کام خود اپنے ذمے لیتی چلی جا رہی ہیں۔ حکومت کا بوجھ ہلکا کر رہی ہیں۔

پردۂ سیمیں کی حیا سوز تصویروں نے معاشرت میں افیون کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ان کے بغیر ہمیں زندگی روکھی روکھی پھیکی پھیکی محسوس ہوتی ہے۔ باپ، بھائی، شوہر، سرپرست، استاد، علماء، مشائخ، لیڈر، اکابر، حکام سب ہی ملاحظہ فرماتے ہیں مگر کوئی احتساب نہیں کرتا۔ نوجوان لڑکوں، لڑکیوں، نوخیز بچوں کو والدین خود اپنے ساتھ لے جاتے ہیں لیکن یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ جنسی شہوانی سمیت روزانہ نونہالوں کے ذہن میں سرایت کر رہی ہے۔ جسمانی مرض سے بچوں کو محفوظ رکھنے کا خیال سماج کی دولت مند ماؤں کو پیدا ہو گیا ہے لیکن ذہنی امراض سے اتنی بے خبری ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ پردۂ سیمیں ایک طرف، ڈھنڈورچی اخبار اور رسائل میں سینمائی مناظر کی جو ہولناک تصویریں شائع ہوتی ہیں وہ نوجوانوں کے بدن میں آگ لگا دینے، زندگیاں برباد کر دینے کے لئے کافی ہیں مگر معاشرہ احتجاج نہیں کرتا۔

معاشرے کو احتجاج اور اشتہار بازی کا کام خوب آتا ہے۔ انتخاب، الاٹمنٹ، لیڈری، تفریحات، انشٹیٹیوشن جیسے موضوعات مسائل سے متعلق آواز برابر بلند ہوتی رہتی ہے۔ ہوا بازی بالخصوص کرکٹ کا ایک مستقل کالم اخباروں میں قائم ہے اس طرح کے احتجاج اکثر جلسے اور ہنگامے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں مگر قوم کے فرزندوں کی تربیت، پرداخت اور اخلاق کا مسئلہ جس سے قوم کا مستقبل وابستہ ہے بزرگانِ قوم کے لئے گرانی میں کوئی ہیجان و اضطراب پیدا نہیں کرتا، کیا امانت سینما کے مستحق والدین پر جیسا کہ صد دو سالوں پر تھا [illegible]

جس کیفیت عاشقانہ کی تصویریں منتقل ہو کر آدمیاں رکھی جاتی ہیں وہ سینما کی فیاضی سے سارے ہی شہر کے مفاد کے لئے ہوتی ہیں۔ ان میں عورت کے سینے، پیٹ، رانوں کی نمائش و فحش نمائش میں جس دلیری، قدرت اور کمال سے کام لیا جاتا ہے، اس پر فنکاری مزید مباہات کرتی ہوگی مگر اخلاق بیچارہ آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ پرانی ملکی کہاوت چلی آتی ہے کہ جنگ کے دوران میں فنون و صناعت کی دیویوں کو نیند آ جاتی ہے۔ پاکستان میں یہ کہاوت یوں رائج ہے کہ جب خود نمائی، عریانی، بے حیائی کی وبا پھیلتی ہے، تو احتجاج کرنے والوں کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔

ہم میں ایک جماعت معاشرے کے تنزل کا الزام امریکی سامراج کے سر تھوپتی ہے اور دوسری روسی کمیونزم کے سر، لیکن داخلی مرض پر کوئی نباض انگلی نہیں رکھتا۔ اس دیمک کو کسی نے نہیں سمجھا تا، جو اندر ہی اندر شجرِ ملت کی جڑ کھوکھلی کر رہی ہے۔ خدا کے لئے بتائیے کہ ہمیں اگر اپنے گھر کی خبر نہیں، اگر ہم اپنے اولین فرض سے غافل ہیں، اگر اپنی گاڑھی کمائی کا روپیہ اپنے پیاروں کی گمراہی پر صرف کر لیتے ہیں، اگر ہمیں اپنے بچوں کی تربیت، ذوق اور تہذیب و اخلاق سے آنکھیں بند کر کے، ختنہ، روزہ کشائی، مجلس اور قوالی پر روپیہ لٹانے کا شوق ہے، تو اس میں امریکہ اور روس کا کیا قصور ہے۔

سینما کا وسیلہ، عہد جدید کا مفید ترین آلۂ کار ہے۔ مغرب نے اس وسیلے سے متعدد مفاد حاصل کیا ہے۔ تعلیم کی ترویج میں اس نے دو صرف دست راست کا کام کیا ہے، بلکہ وہ مدد دی ہے جس کی اہمیت اور گہرائی کا اندازہ دشوار ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں نے عوام کی تقدیر بنانے کا کام کیا ہے، ہم اسی سے اپنی تقدیر بگاڑ رہے ہیں۔ یہ مفید وسیلہ ہمارا تریاق ہمارا سمِ قاتل بن گیا ہے۔ اس کثیر رقم سے جو بے شمار مبتذل تصویریں دیکھنے میں مسلسل طور پر صرف ہو رہی ہے، قوم کے فرزند [illegible]

ایک نیشنل گیلری قائم کرسکتے ہیں، جس میں چوٹی کے مصوروں کے خوش نما شاہکار آویزاں رکھے جائیں۔ جن سے قوم کی نئی پود میں ذوقِ جمال، صحیح نظر اور پاکیزہ خصائل پیدا ہوں اور جو کردار کی تربیت میں اعانت کریں۔ بس ماحول کے بدلتے ہی بچوں میں وہ محاسن بروئے کار آئیں گے جو آئندہ زندگی میں انھیں صحیح معنی میں انسان بنا دیں گے، ایسے انسان جو فلم کے ظلم و فسق کا عنوان ہی بدل کر رکھ دیں گے۔

فلم سازوں کی طرف سے سعی اصلاح کا جواز پیش کیا جاتا ہے تصویر کا انجام کار یا اخلاقی نتیجہ شہادت میں لایا جاتا ہے لیکن یہ جواز خود فریبی بھی ہے اور ابلہ فریبی بھی۔ تماشا ختم ہونے پر اگر بچے کے سامنے کوئی اخلاقی پہلو پیش بھی کیا جائے۔ تو اس کا اثر جلتے توے پر بوند کا سا ہوتا ہے۔ تین گھنٹے رنگ رلیوں، بوس و کنار، برہنہ رقص، سینہ و گردن کی عریانی، ساق و کمر کی لچک، برق فگن لباس آرائش سے شل و مضمحل ہو جانے کے بعد، خام، نوخیز، تاثر پذیر دماغ میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ نازک اخلاقی نکتے کا اثر قبول کرے۔ بجلی کے چراغاں کے بعد، دیئے کی ٹمٹماہٹ کا احساس محال ہے قلاقند کھا لینے کے بعد چائے پھیکی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اخلاق کی کوئی حس بیدار بھی نہیں ہونے پاتی کہ لذت کا خمار، قلب و دماغ پر مسلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو ماحول پیش کیا جاتا ہے، اس میں لڑکے لڑکیاں و کنار سیہ کاروں کے قدم ڈگ جانے کا پورا اہتمام ہوتا ہے۔ تین گھنٹے سر سینما کی فضا میں گھمانے پھرانے کے بعد ایک منٹ کے لئے، آپ، اگر گلستان ارم کی ہوا کھلا دیں، تو، وہ پاک ہوا وبائی اور ٹائیفائڈ(?) کے جراثیم ہلاک کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔

سینمائی محاذ کی مسلسل بوچھاڑ کا اخلاق کی جان ناتواں پر جو اثر ہے، وہ پوشیدہ نہیں۔ مستقبل کا علاج ایسی معاشرت کے رنگ میں مضمر ہے جس کا کیف و مزاج مشرقی روایات سے بالکل مختلف ہے۔ لڑکے۔ امریکی کاؤبوئے اور دہقان کا روپ دھارنے پر نازاں ہیں اور لڑکیاں فلمی ستاروں کا بہروپ بھرنے پر مباہات فرماتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس کا نام جدت طرازی، یا، ترقی پسندی ہے۔ جہاں کی نقل کی جاتی ہے۔ کاش وہیں کی مستند معاشرت پر نظر ڈالی جائے۔ مغرب میں اکابر بھی ہیں اور شرفاء بھی علماء بھی ہیں اور ثقات بھی۔ کیا وہاں کے اعلےٰ متمدن لوگوں کی یہ معاشرت ہے، جو ہم اپنے بچوں کو سکھا رہے ہیں اور اگر ہے تو بھی۔ ہماری انفرادیت کہاں ہے۔ پاکستان ہم نے اپنی انفرادیت کی حفاظت و بقا کے لئے بنایا ہے کیا کوئی قوم نقال بن کر خودداری باقی رکھ سکتی ہے۔ کیا کوئی قوم مدغم ہو کر آزاد کہلا سکتی ہے۔

امریکہ نے سب کچھ انگلستان سے سیکھا ہے۔ جدید امریکی خرافات خود انگلستانی ثقہ طبقے میں بری نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ انگلستان میں آکسفرڈ اور کیمبرج جیسی برگزیدہ یونیورسٹیاں سیکڑوں برس کی مدت سے قائم ہیں۔ عہد حاضر میں دنیا کے بیشتر سیاسی اور اخلاقی لیڈر، مفکر اور علماء، استاد اور محقق ان ہی محافل علم و ہنر کی پیداوار ہیں۔ پھر اگر ہمیں مغرب ہی سے سیکھنا ہے۔ تو، مغرب کے سرچشموں سے کیوں نہ سیراب ہوں، مسخ نمونے کو اپنا مطمح نظر کیوں بنائیں۔ لیکن صحیح د(?) اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے۔ آپ اپنے روایات و معاشرت کی حفاظت کرتی ہے۔ اس لئے وہ وقت آگیا ہے جب ہم اپنے گرد و پیش سے باخبر ہو جائیں۔ اپنی لیبر اپنے امیر زادوں، اپنے طلباء، اپنی اولاد کے افعال و حرکات کا احتساب کریں۔ بے فکری اور سہل انگاری کا بازار گرم ہے، وارداتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، عیش پرستی کا سیلاب جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا ہے۔ ناتی جاتا یا [illegible] حیا [illegible] سولہ سنگھار کرکے، پردہ پوش [illegible] یا بند [illegible] میں داخل کرانے سے آتی ہیں [illegible]

کر سکتیں۔ مگر بچاری امتحانی سے سینائی لب ولہجے میں مکالمہ فرماتی ہیں اور وہ بچاری پھٹے پرانے کپڑوں والی جاہل، احساس کمتری کے بوجھ سے دب کر مر مر جاتی ہے۔ صاحبزادیوں کے نام کے سانچے حسن ترکیب کا معجزہ بن کر رہ گئے ہیں، جنس کی پہچان لسانی ختم ہو چکی ہے۔ خورشید سلطان۔ قیصر جہاں۔ گیتی افروز، اقبال تنویر، جہانگیر آرا، سکندر سلطانی اور قیصری اور جہانگیری بر طرف ظریف کا یہ شعر یاد آتا ہے:۔

نسبے یا بادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی
جنس ہی ظاہر نہیں ہوتی ہے، سیتا رام کی
ظریف لکھنوی

میں پھر دہراتا ہوں کہ سینما، عہد جدید کی ایک برکت ہے، مگر جو فلم دکھائے جاتے ہیں، وہ لعنت ہیں۔ جلد ایسے فلم مہیا کرنے اور بہ فراوانی دکھلائے جانے کا وقت آچکا ہے جن سے اخلاق پاکیزہ ہو، جو حوصلہ بلند کریں، جو تحقیق و دریافت کا درس دیں، جو عزت نفس، خودداری جیسے جذبوں کو اجاگر کریں، جو حب وطن اور حب قوم کی لگن لگائیں، جو عیش و خود پرستی پر ایثار و خدمت خلق کی فوقیت کا آوازہ بلند کریں، جو انسانی خواری کی جگہ انسان کی عظمت کا جلوہ دکھائیں۔

قانون کی پابندی

ملک کے قانون کی پابندی ایک اخلاقی فریضہ ہے۔ نہ اس لئے کہ قانون خود اس کا مطالبہ کرتا ہے، اور بہ جبر مطالبہ کرتا ہے، بلکہ اخلاقی فریضہ ہے۔ اخلاقی اس لئے کہ قانون کی پابندی سے ملک کا امن اور بہتری کا بہبود براہ راست وابستہ ہے۔

سقراط کے ہم وطن ایتھنز والوں نے، جب اسے مار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو، آخر کار قید خانے میں ڈال دیا۔ اس کے شاگرد، جن میں افلاطون بھی تھا، وہاں۔ اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ ان میں بعض دولت مند اور با اثر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے طور پر پورا پورا انتظام کر لیا کہ پوشیدہ طور پر، اپنے استاد کو قید خانے سے نکال لیں، اور راتوں رات، دوسرے شہر میں پہنچا دیں، جو ایتھنز کے قانون کی زد سے باہر تھا۔ جب یہ تجویز سقراط کو بتائی گئی، تو، اس نے فرار ہونے سے انکار کیا۔ شاگردوں نے طرح طرح سے اصرار کیا، مگر، اس ہمت کے دھنی نے، ایک نہ مانی۔ دلیل یہ تھی کہ ایتھنز کے قانون کی پابندی میرا فریضہ ہے۔ جب یہ قانون میری حفاظت کرتا تھا، تو میں خوشی خوشی اس کا پابند رہا۔ بلکہ جب اس نے مجھے سزا دی ہے، وہ سزا صحیح ہو، یا غلط، تو یہ دیانت کے خلاف ہے کہ میں اس سے بچ نکلنے کی کوشش کروں۔ شاگردوں کے اصرار کو، اس نے خلاف اخلاق بتایا، اور صبح ہونے پر جو پلا دیا ہوا جام زہر پی کر، بہ ہزار سکون جان دی۔

زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں
اور یوسف سے برادر کو دغا دیتے ہیں
حالی

چنانچہ قانون کی پابندی، خود بخود اور بہ خوشی کرنی چاہیے۔ پولیس کے ڈر سے، قانون کی پابندی کی گئی تو پولیس کی حکومت ہوئی، خود اپنی حکومت نہ رہی۔ اپنے میلان سے پابندی کی، تو نفس پر اپنی حکومت رہی۔ جب قوم کے افراد پر آپ اپنی حکومت ہو، وہی قوم آزاد اور خود مختار ہے، بہر طرح۔ آزاد اور خود مختار قوموں کے افراد کا اولین فرض یہ ہے کہ قانون کی پابندی کریں۔ خیر و فلاح، حکومت اور عامۃ الناس کے خوشی خوشی کا نام ہے، نہ کہ روس کی تھُکا فضیحتی اور توتو میں میں کا۔ برطانیہ، امریکہ، روس میں یہ تفاوت صاف نظر آتا ہے۔

آزادی کے اس سیدھے سادے، عام فہم نظریے کی روشنی میں، اب، ہم اگر اپنی زندگی کے چند پہلوؤں پر غور کریں، تو بہت سی باتیں پیش نظر ہو جائیں۔

(۱) کراچی شہر میں بسیں چلتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ شہریوں کے مفاد کے لئے چلتی ہیں۔ پولیس نے ان کا ایک نظام مرتب کر رکھا ہے۔ رفتار، راستہ، کرایہ، ٹھہرنے کا مقام، مسافروں کی تعداد معین ہے۔ اول تو کنڈکٹر کو خدا نے یہ توفیق نہیں دی کہ وہ ضوابط کی تمام و کمال پابندی کرے۔ پولیس کے دباؤ سے، مجبور ہو کر جب وہ اپنا فریضہ ادا کرنے پر مائل نظر آتا ہے، تو بھائی، اس کی راہ میں یہ دشواری حائل کر دیتے ہیں۔ تعداد سے زیادہ بٹھانے پر اسے مجبور کیا جاتا ہے۔ اندر گھس آنے والے کو ہر سہولت بہم کی جاتی ہے۔ رواداری، بھائی چارے، تکلیف اٹھا لینے، حسن سلوک کا فلسفہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسلامی اخوت کا ایسا ثبوت دیا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ لوگ ہم آہنگ ہو کر، ایک فریق بن جاتے ہیں، اور کنڈکٹر بیچارے کو دوسرا فریق بنا دیتے ہیں۔ یہی میل ملاپ، اگر، چند منٹ بعد تک قائم رہے۔ تو، واللہ مسلمانوں کا بیڑا پار ہو جائے۔ کوئی تنازعہ مسئلہ باقی نہ رہے۔

بہر نوع معینہ تعداد سے زیادہ بیٹھنا اور بٹھانے والا، دونوں قانون شکنی کرتے ہیں، مگر احساس شہریت کے تعطل کا یہ عالم ہے کہ سارے مسافروں کی حمایت قانون شکن کی معاون ہو جاتی ہے۔ کسی نہ کسی حیلے بہانے، خوشامد درآمد، دھونس دباؤ سے نئے مسافر کو اندر بلا لیا جاتا ہے، اور اس کامیابی پر نہ صرف مباہات کی جاتی ہے بلکہ دبی زبان سے کنڈکٹر کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے شخص کھڑے ہو جاتے ہیں، اور سیٹ پر زیادہ گھس جاتی ہے۔ ان بدعنوانیوں سے جو حادثے رونما ہوتے ہیں، وہ پوشیدہ نہیں۔

* اصولاً، کنڈکٹر بس کا حاکم اور مسافروں کا محکوم ہے۔ کراچی کی فضا میں کنڈکٹر اور مسافر کے درمیان ایک مستقل عداوت قائم ہے۔ ہر مسافر بس پر اپنی حکومت سمجھتا ہے، کنڈکٹر کو اپنا زر خرید غلام تصور کئے ہوئے ہے اور اس کی کوئی ہدایت ماننے کو تیار نہیں۔ اس تضاد سے جنگ زرگری کا ایک وسیع میدان کھلا ہوا ہے جس میں معرکہ لڑا جاتا رہتا ہے۔ فرائض اور حقوق کا عرفان، یہ دشواری دور کر سکتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ حقوق کا مطالبہ جانتا ہے مگر فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے۔ فلسفۂ قانون کی نظر میں حق اور فرض لازم و ملزوم ہیں۔ ہر حق کے ساتھ ایک فرض وابستہ ہے۔ بس میں بیٹھنا، اگر آپ کا حق ہے، تو، بس کے ضوابط کی پابندی بھی آپ کا فرض ہے۔ بس کا پہلا ضابطہ یہ ہے کہ کنڈکٹر کی ہدایت کی پابندی کی جائے۔ بس میں چڑھتے چڑھتے یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے۔ کنڈکٹر اگر، گنوار، بدتمیز، بے ایمان ہے تب بھی اس کی ہدایت کی۔ (اور اگر آپ خدا ہوں تو عرض کروں حکم کی) — پابندی فرض ہے۔ وہ اگر آپ کی رائے میں غلط ہدایت کر رہا ہے تو، اس وقت، اس کی پابندی فرض ہے۔ لیکن بعد کو، بس کمپنی یا پولیس سے اس کی شکایت کر کے، اور اس شکایت میں دلچسپی لے کر اور سرگرمی دکھا کر، اس کو سزا دلوائیے۔ ہم بس میں شیر ہو جاتے ہیں، لیکن وہ وقت نکل جانے کے بعد ہر ذلت پی جاتے ہیں۔ حکام کی توجہ دلانے، اور، اپنی بے جا توہین کا بدلہ لینے کی سعی نہیں کرتے۔ جواب یہ ہے کہ میاں نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ کراچی میں کون کس کو منہ لگاتا ہے: اچھا یہ سچ ہی لیکن آپ اگر بار بار کہیں گے۔ تو ایک وقت آئے گا کہ شنوائی ہوگی، اور اصول کی جیت ہوگی۔ بقول شاعر:

جو چھپ کر پانی چڑے مسلسل
تو بہ ختم کہیں جائے پتھر کی سل

[illegible]

ں وجہ لیس یہ کہ یہ پاکستان ہے جو اب ہم آزاد ہیں فوراً خود حاکم بن جاتے ہیں اور فوراً قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اس کا نام راہ راست سے ہٹ جانا ہے۔ اس کا نام قانون شکنی ہے۔ سوئے اتفاق سے، اگر کنڈکٹر بھی، اسی ہمت لے اور طرزِ خیال کا آدمی ہے، تو مسافروں کے چند لمحے بڑی دلچسپی سے گزر جاتے ہیں۔ ایسے انجنوں کا تبادلہ ہوتا ہے کہ مزہ آجاتا ہے۔ اکثر یہ ملال رہ جاتا ہے کہ بس میں، ریکارڈنگ مشین نہ لگی ہوئی تھی، ورنہ آزاد پاکستانیوں کے مکالمے سے پوری قوم لطف اندوز نہ ہو سکی۔ یہ مکالمے آپ برطانیہ۔ امریکہ۔ روس سوئیڈن۔ ترکی میں نہیں سن سکتے۔

ٹھنڈے دل سے، ایک ہی منٹ، اگر آپ سوچیں، تو واضح ہو جائے گا کہ یہ ذہنیت، نہ صرف غلط اور خلافِ قانون ہے، بلکہ اصل میں آزادی کے مفہوم کے منافی ہے۔ اس سے معاشرہ بے راہ رو بنتا ہے، اور آہستہ آہستہ حکومت کی جڑ کھوکھلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی اپنے ہاتھوں اپنی جڑ کٹتی ہے۔ ہم اسی گدے کو کاٹ رہے ہیں جس پر بیٹھے ہیں۔ آزادی کے معنی مطلق العنانی، بے لگام بیل بن جانے یا اندھیر نگری چوپٹ راج کے نہیں ہیں۔ آزادی، اصل میں منظم پابندی، اور جائز پابندی کا نام ہے۔ آزاد قوم کا ہر فرد پابند ہوتا ہے، قانون کا پابند ہوتا ہے، یعنی خود اپنا پابند اور محکوم ہوتا ہے۔ یہی اس کی عزت ہے، یہی اس کی شان ہے۔ یہی اس کا مقام مہارت ہے۔

قانون بے لچک اور بے رحم چیز ہے۔ ایک طرف قوس کی طاقت اور کشتی بے پناہ ہے اور دوسری طرف، کرم کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ آدمی تو آدمی، قانون بے جانوروں کو بھی حقوق دے دیے ہیں۔ جانور بے زبان ہے، فریاد نہیں کر سکتا، لیکن پولیس ان حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔ بالفرض ہٹا دیجیے تو پولیس پکڑ لیتی ہے

کہ فوراً ظالم کا چالان کرے۔ بہرنوع قانون۔ انسان کا محافظ ہے اور انسان اگر قانون کا احترام کرے۔ تو خود قانون اس کا احترام کرنے لگتا ہے۔ یہ بات حقیقت میں بہت بڑی بات ہے، اور انسان کی عظمت کی کھلی دلیل ہے۔

لیکن بے راہ روی، قواعد کا بطلان، قانون شکنی، یہ سب ایک نوع کا ظلم ہے۔ جو لوگ یہ حرکتیں کرتے ہیں، وہ ظالم ہیں، خود اپنے وجود پر ظلم کرتے ہیں اور اپنی قوم پر ظلم کرتے ہیں اور ایسے یہ ظلم پولیس نہیں روک سکتی۔ مثل مشہور ہے کہ قانون انسان کا اخلاق نہیں سدھار سکتا۔ اخلاق، نفس کی بیداری سدھارتی ہے۔ ہم اگر اپنے نفس کو شانہ ہلا کر بیدار کریں۔ اور خود اپنے وجود کو بے راہ روی، قانون شکنی۔ بے قاعدگی کی لعنت سے آزاد کریں، اسی وقت ہمیں قانون کی برکتوں کا علم ہو سکتا ہے۔

باہمی اخلاق

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ خیر بس کے مسافروں کے باہمی اخلاق کا مظاہرہ اس سے زیادہ عبرتناک ہے۔ کنڈکٹر کے خلاف محاذ قائم کرنے میں تو یہ آزاد قوم کے آزاد انسان، ایک زبان ہیں۔ کنڈکٹر سے لڑ لڑا کر گھس آنے والے کو فوراً بٹھا لینے، زمین پر بیٹھنے یا کھڑا رہنے، یا دروازے اور کھڑکی کے سامنے دیوار بنانے کی اجازت دینے کو فوراً تیار ہیں۔ لیکن، صرف اس نوع کے معاملوں کو چھوڑ کر، دوسری قسم کے بے شمار ساز دوں کے ساتھ اخلاق، رواداری، حسنِ سلوک برتنے کا کوئی سوال نہیں۔ دھکا دینا، کہنی مارنا، ناک توڑ دینا، پاؤں کچل دینا، کہنیوں سے دوسروں کو سرکا کر گھس کر بیٹھ جانا، جہاں جگہ نہ ہو وہاں، اپنے تن و توش کی چٹان اوپر سے گرا دینا، کمزوروں کو کھینچ کر نیچے ڈالنا، دوسروں کے بیگ کا اچھال کر گمر سے جہاں دوسرے کا ہاتھ رکھا ہو وہاں

اپنا ہاتھ رکھ دینا، جماہی لینا، چھینکنا، تھوکنا، ناک سنکنا اس طرح کہ خوب آواز ہو، اور ہوا کی چھینٹیں اڑیں، روزمرہ کی باتیں ہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میرے ایک ہم شانہ، ہم سفر نے یکایک جماہی لی۔ دہانہ اپنے پورے عرض و طول کے ساتھ وا ہوا۔ منہ اور حلق کا غار کھل گیا۔ گندی ڈاڑھیں، بھونڈے چڑھے دانت چمکنے لگے۔ کاندھی کا رٹون قریب تھا۔ معلوم ہوتا تھا شیر نے اپنے کٹہرے میں منہ پھاڑ دیا۔ ان کی جماہی کا دنگل ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ میرے دوسری طرف والے ہم رنگ کو بھی جماہی نے گدگدایا۔ انہوں نے بھی اسی شدومد سے منہ پھاڑا۔ میں دہل گیا لیکن وہ میری طرف متوجہ نہ تھے۔ زبانِ حال سے پہلے صاحب سے کہہ رہے تھے کہ چونکہ تم مجھے نہیں نگل گئے، اس سزا میں، میں تمہیں نگلے جاتا ہوں۔ میں دل ہی دل میں "نادِ علی" کا ورد کر رہا تھا۔ اللہ پہلے سے [illegible] سکی، ایسا نہ ہو، یہ دوسرا دھوکے میں مجھے نگل جائے۔ خدا خدا کر کے یہ قادم جماہیں (الا ماشاء اللہ) ختم ہوا اور گردوپیش پھر ذرا سکون سا ہو گیا۔

کوئی صاحب اگر یہ پوچھ بیٹھیں کہ بس کے سفر میں، حسنِ اخلاق کے سارے تجربے، مجھ ہی کو کیوں ہوتے، تو اس کا میں یہ جواب دوں گا کہ اپنی اپنی تقدیر۔ مجھے تو یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ ایک صاحب کا دوہتڑ اس زور سے میرے سر پر پڑا کہ اگر موٹا سولا ہیٹ نہ ہوتا تو یقیناً کھوپڑی چٹخ جاتی۔ کئی منٹ تک آنکھوں میں اندھیرا رہا۔ یہ تو ایک حادثہ ہے دوسری مرتبہ ایک صاحب کی کہنی کے گرز سے میری ناک کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا۔ اس مرتبہ چکر آ گیا اور بمشکل طبیعت سنبھلی۔ اب میری ناک اتنی حساس ہو گئی ہے کہ کسی کی کہنی کا رخ میری طرف ہوا، اور بانسے میں میٹھا میٹھا درد شروع ہو گیا، سلسلاہٹ ہونے لگی۔ لطف یہ ہے کہ ان دونوں موقعوں پر ظالم نے مظلوم سے معذرت بھی نہ کی۔

"معذرت بلند درجہ ہے، ما التفات بھی نہ کیا

بدن سے بدن بھڑا کر۔ بیٹھنے، یا کھڑے ہونے کی عادت معیوب ترین ہے۔ جن کا احساس کند اور تربیت گھٹیا ہے اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن وہ جنہیں مشاہدے اور تجزیے کی عادت ہے۔ جن کی آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں، اس بے حسی سے بہت کبیدہ خاطر اور بڑے آزردہ ہوتے ہیں۔ مغربی معاشرت میں، جسم کا جسم سے اس طرح چھو جانا، قیامت ہے۔ معافی اور التجائے معافی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ نادانستہ۔ اتفاقیہ۔ حماقت کر بیٹھنے والا، کچھ کچھ جا[تا] ہے۔ یہاں پاؤں کچلے ڈالتے ہیں، ناک توڑے ڈالتے ہیں، کہنی مارتے چلے جا رہے ہیں، مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔

لمسِ جسدین کے باب میں، اسلام نے محرم و نامحرم کا جو اصول وضع کیا ہے، اس کی نفاست و پاکیزگی، حرفِ آخر ہے۔ ایک زمانے میں جب مسٹر جیمس مسٹن (بعد کو لارڈ مسٹن ہوئے) یو۔پی کے گورنر تھے، لکھنؤ کے مجتہد العصر جناب سید باقر اعلی اللہ مقامہ کو شمس العلماء کا [خطاب] مرحمت کیا گیا۔ سند لینے کے لئے گورنر کے دربار میں شرکت بھی لازمی تھی۔ اس تقریب میں بوترابی بزرگوار کو یہ سب کچھ بہت شاق تھا۔ طوعاً و کرہاً شرکت کرنی پڑی۔ گورنر سے ہاتھ ملایا گیا۔ جب لیڈی مسٹن سے ہاتھ ملانے کی نوبت آئی تو، اس جناب نے رومال ہاتھ [پر] لپیٹ کر، ہاتھ ملایا، لیڈی مسٹن نے ذاتی توہین محسوس کی۔ گو[رنر] بہت افروختہ ہوا، لکھنؤ کے معاشرے میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ [مگر] بازپرس ہوئی۔ سادہ سا شرعی جواب حاضر تھا، مجھ لیڈی مسٹن [کے] لئے نامحرم ہیں، اگر ان کا جسم چھو لیتا، تو اپنے عقائد کے منافی کرتا۔ انہوں نے ان کا جسم چھونا خلافِ احترام سمجھا۔ اس جواب سے سار[ے] اکابر کی باچھیں کھل گئیں۔ گورنر کی طرف سے شکریہ ادا کیا گیا۔ لیڈی [کی] طرف سے معذرت کی گئی۔ نہ صرف یہ، التفات بڑھ گئی، [illegible]

کے اس تصور پر ذہنی فہم، انگلی دانتوں میں دبا کر رہ گئے ہوتے یا بی گرد نشین کا بول بالا ہوگا۔

فلسفۂ قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر شخص کا جسم خود اس کی ملکیت ہے اور مقدس ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے لمس سے دوسرے کے بدن کی حرمت زائل کرے۔ چنانچہ قانون کی نظر میں لمس غیر محرم ہے۔ بغیر مرضی اگر کوئی کسی کا جسم چھو لے تو وہ اس شخص کو عدالت فوجداری سے سزا بھی کرا سکتا ہے اور عدالت دیوانی کے ذریعے اس سے توہین، ہتک یا ازالۂ حیثیت کا ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔ زندہ قوموں میں اس حرمت کا شدید احساس موجود ہے لیکن ہمارے ملک میں جہاں مرد، عورتوں کے مجمع میں اپنی رانیں کھجا سکتے ہیں۔ اس نوع کی نفاست ہوتا ہے۔ ہم میں معدودے چند، پانی کی چھینٹ سے ضرور بھاگتے ہیں۔ مگر اس نوع کی پاکیزگی سے محروم ہیں۔ ذہنی یا داخلی پاکیزگی، مادی یا خارجی پاکیزگی سے بہت مختلف ہے، نوعی اختلاف رکھتی ہے۔

گندگی اور صفائی

صفائی مسلمان کا فطری اور پیدائشی حق ہے۔ پیدا ہوتا ہے، تو نہلایا جاتا ہے، رخصت ہوتا ہے، تو نہلایا جاتا ہے۔ دنیا میں اسلام پہلا مذہب یا اسوۂ حیات ہے جس نے اپنے فقہ کے ذریعے، طہارت کا نظام مدون کیا ہے۔ یہ نظام کسی زمانے میں مدرسے کے نصاب میں بھی داخل تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دوسرے مذاہب طہارت کے تصور سے نابلد ہیں۔ یہ کہتا ہوں کہ اسلام کی سی شرح و وضاحت کے ساتھ، طہارت کے اصولوں کی تدوین کسی مذہب نے نہیں کی۔ سنسکرت، لاطینی یا انگریزی زبانوں میں، اس فن سے متعلق غالباً کوئی تصنیف میسر نہیں آتی۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں بہت سی کتابیں اور صحیفے موجود ہیں۔

بہرنوع مذہب اور قوم دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں نے طہارت کو زندگی کا ایک اہم فرض قرار دیا ہے۔ حمام کے موجد مسلمان ہیں۔ حمام ترکی تمدن کا جزو اعظم اور اعلیٰ ترین عنصر سمجھا گیا ہے۔ آج بھی دنیا کے چند بڑے شہروں میں حمام قائم ہیں۔ وہ اس نسبت کی بنا پر، "ٹرکش باتھ" کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ تولیوں اور صابنوں کا نام تخصیصاً "ٹرکش باتھ" رکھا جاتا ہے۔ قدیم تاریخ شاہد ہے کہ اسپین میں، جہاں مسلمانوں کی حکومت سات سو برس سے زیادہ رہی، طہارت عیسائی اور مسلم کا مابہ الامتیاز تھی۔ یہ مغربی مؤرخوں نے مسلمانوں کے مذاق طہارت کے اپنی تصنیف میں جابجا حوالے دیئے ہیں۔ عیسائی کی زندگی میں نہانا گناہ تھا۔ اسپین میں جو عیسائی ذرا صاف ستھرا نظر آتا تھا، اسے پرائیویٹ صحبت میں مسلم ہونے کا طعنہ دیا جاتا تھا۔

آج مسلمانوں کے لئے کوئی چیز مقدس نہیں رہی۔ مسجد، امام باڑے، مزار، خانقاہ کی دیوار سے، بے دھڑک پیشاب کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ درسگاہوں کی دیواروں پر بے تکان تھوکتا ہے، گالیاں لکھتا ہے۔ لڑکیوں کے مدرسے کی دیواروں پر گھناؤنی تصویریں بناتا ہے۔

قوم کے پچھتر فی صدی انسانوں نے تھوکنے کی عادت ڈال لی ہے۔ کراچی میں اس کا بدترین مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہاں مخصوصین اور منفردین پیش نظر نہیں۔ متوسط اور ادنیٰ طبقے کا ذکر ہے۔ جو قوم کی نوے فی صدی آبادی بنتا ہے۔ چند آدمیوں کے مجمع میں کھڑے ہو جایئے۔ تو، چند ہی منٹ میں "پچر پچر" کی کرخت آواز کان میں آنے لگے گی، اور آس پاس کی زمین تھوک، رال، بلغم اور بیک آلود نظر آئے گی۔ گندگی کا ذکر کرتے گھن آتی ہے لیکن جب ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہو، تو، چارہ کار کیا ہے بجز ذکر ... نفس

مشرقی وکشمیسید ڈیپرنالباً ایک فٹ مربع زمین ایسی نہیں، جو پیک سے رنگین نہ ہو۔ گھر، ہوٹل، مدرسے، قومی ادارے، عدالت کے احاطے، سب ہی رنگے نظر آتے ہیں۔ پنواڑیوں کی دکانوں کے سامنے قطعات کا ذکر کیا ہی کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیک سے ہولی کھیلی گئی ہے۔ شہر کی حسین اور قابل فخر عمارتوں مثلاً کلفٹن کی سیڑھیاں، کارپوریشن اور پرانی سندھ یونیورسٹی کے مرمریں زینوں، اسمبلی اور چیف کورٹ کی عالیشان عمارتوں کی چار دیواریوں پر بالخصوص کرم کیا گیا ہے۔ قومی نشر گاہ ریڈیو پاکستان ہاؤس کے صدر برآمدے کی بائیں جانب کی کیاری جس کے قریب سے ڈائرکٹر جنرل، ڈائرکٹر نیوز، کے علاوہ اور بھی کئی ڈائرکٹر، روز کئی کئی مرتبہ گزرتے ہیں، اسی کرم کی مرہون منت ہے۔

پان ہندوستانی معاشرت کا ایک تمدنی چوچلہ ہے۔ یہ رواج اس ملک میں مدت مدید سے چلا آتا ہے۔ مغلوں نے بھی اس مذاق کو اپنی معاشرت میں داخل کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پان کے مسالے میں چونے کا اضافہ، نورجہاں نے کیا، اسی جزو سے لبوں پر سرخی پیدا ہوتی ہے۔ پیک تھوکنے کی مذموم گندی عادت، غالباً مغلیہ عہد کے لوگوں میں نہ تھی۔ یا کم سے کم، اتنی بے دھڑک، بے ہنگام، بے محل نہ تھی۔ ورنہ مغلیہ عہد کی عمارتوں میں پیک کے دھبے نظر آتے۔ آگرے (اکبر آباد) میں فتح پور سیکری کے محلات قلعے، سکندرے، اعتماد الدولہ، تاج کے صحنوں میں، زینوں میں، روشوں پر، دہلی کے لال قلعے اور دوسری عمارتوں میں پیک کے پرانے داغ کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتے۔ مگر نہیں ہیں۔ پرانے سلاطین کے محلوں، امراء کے قصروں، دیوان خانوں، حویلیوں میں پیک دان، اگالدان رہتے تھے۔ معمولی حیثیت کے لوگ بھی اپنے گھروں میں یہ اشیاء رکھتے تھے۔ رہنے سہنے، بیٹھنے اٹھنے کے

مقامات پر سرراہ مجمع کے سامنے تھوکنا، پیک اتنا عام نہ تھا جو اروا ضروری تھا۔ اعلیٰ تربیت، خوش مذاقی، ثقاہت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ راستوں میں اگر پیک کی ضرورت ہوتی تھی، تو، راہگزر سے ہٹ کر، علیحدگی میں، خموشی سے، نالیوں، نابدانوں، جھروکوں میں یہ ضرورت پوری کی جاتی تھی تاکہ دوسروں کی نفرت کا باعث نہ ہو۔ مگر آج تو اعلیٰ ترین عمارتیں، شاہراہیں، مختصر یہ ہے کہ ہر جگہ پیکدان سمجھی جاتی ہے اور اس عادت نے ڈھٹائی، بے حیائی، علالت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ قدم قدم پر پان کی دوکانیں ہیں جن کے اردگرد پیک کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ، از کجاست تا بہ کجا

عدالت کے برآمدوں، کارپوریشن کے زینوں، سینما کے ایوانوں اور جگہ جگہ کے پیک دان قیام پاکستان کے بعد سے، آج تک صاف نہیں کئے گئے۔ یہ تساہل اور سہل انگاری دیکھ کر فکر کرنے والے کا دماغ، کسی نہ کسی فوری فرد جرم جا ملتا ہے۔

دنیا کی دوسری قوموں نے اگر یہ لکھا ہے کہ ان کے پاخانے اور غسل خانے بھی، رشکِ فردوس نظر آئیں، تو ان کو کسی نے کیا طعنہ دیا، اور اگر ہماری مسجدوں کی چار دیواریاں گندگی آلودہ، اولیاء اکابر کے مقبروں کی دیواریں پیشاب سے تر نظر آتی ہیں، تو ہمارا کسی نے کیا بگاڑ لیا۔ آپ اگر، یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں، تو ضرور کہیے لیکن آنکھوں والوں کو نظر آرہا ہے کہ ان کے خصائل نے ان کا سب کچھ بنا دیا، اور ہمارے خصائل نے ہمارا سب کچھ بگاڑ دیا

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

وہ ترقی یافتہ کہلاتے ہیں اور ہم پسماندہ، وہ قیادت کرتے ہیں ہم پیچھے گھسٹ رہے ہیں۔ وہ خیرات دیتے ہیں اور ہم بھیک

سے کنارہ رہیں - آہ

بے زری کرد بہ من آنچہ بہ قارون زر کرد

شراب، افیون، کوکین، بھنگ، چرس، گانجا، سارے ہی نشے، انسان کی جسمانی اور ذہنی حیات کے دشمن ہیں۔ اعلیٰ شراب اگر اعتدال قائم رہ سکے تو ذہن کو تیز اور تیز تر کرتی ہے۔ لیکن "اعلیٰ اور اعتدال" ان دونوں خصوصیات کا حصول دشوار ہے۔ ہزاروں میں ایک کو اعلیٰ شراب میسر ہو سکتی ہے۔ اور اعتدال کا امکان اس سے بھی بعید تر ہے۔ پینے والے جن میں حکام، امراء، اکابر تجار، شعراء، قومی اور مذہبی لیڈر یا نام نہاد لیڈر شامل ہیں عموماً شعر سے پر اتر آتے ہیں۔ پان، تمباکو، سگریٹ، بیڑی، نسوار کی عادت نشہ نہیں کہی جاتی مگر نشہ ہے۔ یہ چیزیں خصوصیت سے تھوک پیدا کرتی ہیں۔ تمباکو اور پان کی بدولت ملک کا لاکھوں روپیہ غیر ملکوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ خیر، اس پر بھی صبر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان چیزوں سے تھوکنے کی جو گندی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے کیسے نجات ہو۔ تھوک سوکھ کر ذروں کی شکل میں ہوا میں ملتا اور سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ ان بھوکے، بے بس، فقیر کے فقیروں کے پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ جنھیں آجکل کی سیاسی زبان میں لکڑی سے ہنکائے جانے والے گونگے مویشی کہا جاتا ہے۔ ان کے پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ جو اس گندی عادت سے بری ہیں ان بھولے بھالے معصوموں کے پیٹ میں بھی جاتا ہے جو آج بچے ہیں۔ اور کل قوم بننے والے ہیں۔

افیون نے جو نقصان چینیوں کو پہونچایا۔ وہی نقصان پان اور تمباکو اس ملک کو پہونچا رہے ہیں۔ اگرچہ چائے نے بھی چین جیسے قیمتی کا پانی شامل رہتا ہے۔ قومی بُری عادت (نیشنل ہابٹس) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن عامۃ الناس کے لئے اس کا شمار طعام میں ہے۔ وہ اگر ایک طرف "لت" ہے، تو دوسری طرف پیٹ بھرنے کا اہم کام بھی انجام دیتی ہے صبح اور تیسرے پہر کا ناشتہ ہے۔ اور جسم کا کسل اور تھکاوٹ دور کر کے فوری پھرتی بھی پیدا کرتی ہے۔ لیکن تمباکو، پان اور نسوار تو مضرت ہی مضرت ہیں۔ ان سے حلق خراب رہتا ہے۔ دانت رفتہ رفتہ تباہ ہو جاتے ہیں، ہاضمے پر مضر اثر پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ بھوک گھٹ جاتی ہے۔ قبض رہنے لگتا ہے۔ خون پتلا پڑ جاتا ہے جس سے کاہلی اور بے دلی پیدا ہوتی ہے کام سے دل ہٹ جاتا ہے۔ نیند ہی نیند آتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اچھا خاصا تنومند انسان چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔

کراچی میں شاید ہی کوئی پٹھان ایسا ہو جسے نسوار ملنے کی عادت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پٹھان عموماً کاہل اور بیدل نظر آتے ہیں۔ اچھا خاصا نوعمر، تندرست انسان صبح ۹ بجے بھی سوتا نظر آتا ہے۔ مزدور، چوکیدار، ہوٹل کے ملازم، دس دس گیارہ گیارہ برس کے پھول سے چہرے والے پٹھان نونہال، جنھیں قوم کی مفلسی، بے حسی نے جوتوں پر پالش کا کام سپرد کر رکھا ہے۔ اس موذی مرض میں گرفتار ہیں۔ دن بھر دانتوں پر نسوار ملتے اور تھوکتے ہیں۔ جب چار پانچ ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں، تو کیچڑ سی کر دیتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سو پچاس چڑیوں نے مل کر ایک جگہ بیٹ کر دی ہے۔ کراچی میں غیر ممالک کے باشندے بھی کثرت سے ہیں وہ ان خصائل کو دیکھتے ہیں اور ہم روز ان کی نظروں سے گرتے چلے جا رہے ہیں۔

کیا قوم کا فرض نہیں ہے کہ ان افلاس زادوں بے بس مخلوقات پھولوں کو اس عذاب سے نکال لے۔ پالش کے برش کی جگہ ان کے ہاتھ میں دانش اگر نہیں دیا جا سکتا تو کم سے کم ان کی صحت کر ایسا تو

دکھا جائے کہ یہ کسی دوسرے ستھرے پیشے سے اپنی روزی کمالیں یہاں اس پیشے کو یا کسی دوسرے جائز پیشے کو ذلیل نہیں بتانا۔

پیشے میں عیب نہیں، رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا
(غالب)

میرا مطلب یہ ہے کہ نوکروں کی ذہانت اور قوت سے دوسرا اہم تر کام لیا جا سکتا ہے۔

سگریٹ اور بیڑی فی الحال نہ سہی۔ مگر پان اور نسوار تو حکماً اور قانوناً فوراً بند کئے جا سکتے ہیں۔ کارپوریشن کے کسی نہ کسی ضابطے سے ان کی فروخت مفاد عامہ کے خلاف اور جرم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس اقدام سے چند آدمی، چند روز کے لئے ضرور بے روزگار رہ جائیں گے۔ مگر قوم کا بڑا حصہ عذاب الیم سے نجات پائے گا۔ روشہر سے بدترین گندگی کا ازالہ ہو جائے گا۔

پسماندہ، نا تربیت یافتہ، جاہل قوم کے افراد کو ترقی یافتہ قوموں کے افراد پر نکتہ چینی، ان کا مذاق اڑانے اور حسد سے ان سے جلنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ یہ بد رویہ اصل میں خود اپنی ہی پسماندگی کا ایک خبیث نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن اس علیل ذہنیت کا جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ خود بخود منکشف ہو جاتا ہے کہ جو چیز نفرت بن کر سامنے آتی ہے وہ خود اپنا ہی احساس کمتری ہے۔

اس کو سمجھ کر، یہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ترقی یافتہ قوم میں کون سی ایسی بات ہے، جس نے اسے تمدن کی دوڑ میں اتنا آگے بڑھا دیا۔ ترقی کے منازل میں ہم سے اتنا آگے کر دیا، بعض صورتوں میں معراج کمال پر پہنچا دیا۔ یہاں ایک نئی مزیدار بات یاد آ گئی۔

"لندن کے زیر زمین اسٹیشنوں پر اور سرنگوں میں جا بجا یہ لکھا ہوا ہے۔

عبداللہ بھی نہیں"

اللہ اللہ، اس جملہ کی اشارتی لطافت کتنی دلنواز ہے عبداللہ مارکہ سگریٹ دنیا کے بہترین سگریٹوں میں شمار کیا جاتا ہے اور انگلستان میں بہت مرغوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سگریٹ پینا ممنوع ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ عبداللہ جیسا نفیس و محبوب سگریٹ پینے کی خواہش بھی یہاں ضبط کیجئے۔ وہاں کی کارپوریشن کے ارباب حل و عقد کو احتیاط بھی منظور ہے۔ اور اپنی قوم کی نزاکت مزاج کا بھی پاس ہے۔

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ایسے لطیف ادبی انداز میں ہدایت کی ہے کہ بات بھی بن جائے اور ترقی یافتہ قوم کے نشوونما پائے ہوئے دماغوں کو بگڑ کر چلانے کا الزام بھی عائد نہ ہو جائے۔

اب ذرا خدا کے لئے اس سرنگ پر نظر ڈالئے جو وکٹوریہ روڈ کراچی پر ادھر سے ادھر جانے کے لئے بنائی گئی ہے۔

یہ فرق فوراً ان کے اداب و اخلاق کی برتری و پاکیزگی کی صورت میں نظر آ جائے گا۔ قانون کی پابندی۔ یا حکم یا ہدایت ماننے کی خو، غیر شعوری طور پر، ان کے افعال و اطوار کو اتنا منضبط، اور مربوط بنا دیتی ہے کہ کسی بیرونی دباؤ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہاں کی پولیس کو ٹریفک کنٹرول کے بارے میں یا وہاں کے محکمہ کسٹم کو ممنوع چیزوں کے درآمد و برآمد کا قانون نافذ کرنے کے بارے میں یا وہاں کے محکمہ انکم ٹیکس کو آمدنی کی تلاش و جستجو کے لئے دقتیں پیش نہیں آتیں۔ جو یہاں کا دستور ہے۔ جو باتیں یہاں مذہب کی

جاتی ہیں۔ وہ وہاں اپنے آپ خود بخود ہوتی ہیں۔

قانون کی پابند قوم میں رواداری، حسن سلوک اور مراعات جیسے پاکیزہ جذبے ابھرتے ہیں۔ اس کے حکام و عمال سختی و خشونت کی جگہ، نرمی اور رافت سے کام لینے لگتے ہیں۔ اور کام نکلتا ہے۔ میں نے ایک رسالے میں پڑھا تھا کہ بلجیم (یورپ) کے کسی ریلوے اسٹیشن پر ایک سیاح خاتون کا مفلر (گلوبند) گر پڑا۔ ٹرین حرکت میں آچکی تھی۔ لیکن کنڈکٹر گاڑی رکوا کر اترا اور اس نے خود مفلر اٹھا کر اس خاتون کے سپرد کر دیا۔ کنڈکٹر کو چند منٹ گاڑی روک دینا منظور تھا۔ لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ ایک مہمان کو بدمزگی ہو۔ دوسرا قصہ تو میرے ایک دوست نے اسی ملک کا بیان کیا۔ وہ غلطی سے دوسری ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اور کئی اسٹیشن نکل جانے کے بعد انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سوئے اتفاق سے واپسی کا نقد روپیہ بھی پاس نہ تھا۔ مگر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر نے نہ صرف سخت سست نہ کہا، بلکہ ریلوے کی ٹکٹ دے کر واپسی کا انتظام کر دیا۔ انھوں نے کئی روز بعد منی آرڈر سے ٹکٹ کی قیمت روانہ کر دی۔ بات ختم ہو گئی۔

بدیشی اخلاق کے یہ دونوں افسانے کانوں سے سنے ہیں۔ اب اپنے اخلاق کے دو واقعے آنکھوں دیکھے، سن لیجئے۔

چند ولایتی ملاح اپنے جہاز سے چھٹی لے کر سیر کے لئے شہر آئے۔ انھیں کسی رومن کیتھولک گرجے میں بھی جانا تھا۔ ایمپریس مارکیٹ پر پہنچ کر وہ راستہ بھول گئے۔ لیکن جس کسی سے بھی وہ راستہ پوچھتے تھے انھیں غلط بس بتا دی جاتی تھی۔ اور جب وہ پھر پھرا کر اسی مقام پر پلٹ آتے تھے تو ان کی ہنسی اڑائی جاتی تھی۔ اس طرح وہ بیچارے گھنٹے بھر سے زیادہ سرگرداں رہے۔ ان کے کئی چکروں کا تماشا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آخر کار ایک بھلے آدمی نے سیدھا راستہ بتا کر انھیں ہدایت کی کہ اب لوگوں کے چکمے میں نہ آنا۔ اس پر ان میں سے ایک نے سوکھے منھ سے کہا:۔

"یہاں کے لوگ بہت مہربان معلوم ہوتے ہیں۔"

کاش! وہ وحشتی یا خشونت، گالی سے اپنے ملال کا اظہار کرتا۔ اس کی اس سنجیدگی اور نرمی نے میرا دل پاش پاش کر دیا۔ میں گڑ کر رہ گیا۔ اس کی چٹکی کا ٹیس آج بھی دل میں موجود ہے۔

یہ بات تو ایک طرف رہی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ کراچی میں، ترکی کے صدر اعظم جلال بیار کے ہمراہیوں کے جوتے چوری ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ یہ حادثہ مسجد میں پیش آیا۔ اسی مسجد میں بارہا بتایا گیا ہے کہ جناب سرور کائنات مہمان کے ساتھ کس حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ یہ اسی حسن سلوک کی برکت ہے۔ جس نے عرب مہمان نوازی کو دنیا میں ضرب المثل بنا دیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی اپنے برادران قوم سے کتنا واقف تھا جس نے مدتوں پہلے کہہ رکھا ہے ؎

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں!
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قرآں یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں!
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ بھی ہوا کہ شہر کے جوتے والوں نے نمازی ترکوں کو فوراً بے قیمت جوتے مہیا کئے۔ مگر یہ مداوا، اس بدسلوکی کا بدنما دھبہ قوم کے دامن سے نہیں دھو سکا۔ یہ کہنا کہ یہ چند بدردیہ لوگوں کا فعل ہے، اس میں قوم کا کیا قصور ہے، اس لئے غلط ہے کہ ہنڈیا میں ایک چاول دیکھا جاتا ہے۔ عامۃ الناس کا اخلاق، ملک کے اخلاق کا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

مکروہ عادتیں

قومی حیثیت سے ہم بہت سی مکروہ عادتوں میں مبتلا ہیں جن کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ ہم نصیحت پسند ہیں، بدگو ہیں حاسد ہیں، بے سروپا باتوں میں مزہ لیتے ہیں۔ عورتوں کے مجمع میں سنورا برتاؤ کرنا نہیں جانتے۔ بیشتر آداب معاشرت سے نابلد ہیں۔ دو وجوہ بے حسی اور احساس کمتری، ان مصائب کے ذمہ دار ہیں۔ بعض کو جو حد سے زیادہ متمرد اور سرکش قسم کے لوگ ہیں پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے کیا نامناسب بات سرزد ہوئی یہ بے حسی کی مثال ہے۔ احساس کمتری دو صورتیں اختیار کرتا ہے پہلی یہ ہے کہ بعض ذہنی اعتبار سے اتنے فرومایہ ہوتے ہیں کہ انھیں قدم قدم پر اپنے کو بڑا جتانے۔ بڑا منوانے، بڑا کہلانے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن پر یہ خواہش بخار کی طرح چڑھی ہوئی ہے۔ احساس کمتری کی دوسری صورت یہ ہے کہ بعض لوگ معاشری زندگی میں اتنے بزدل اور پسماندہ ہوتے ہیں کہ ان میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ پلٹ کر معافی مانگ لیں۔ احساس کمتری میں گرفتاروں کا طبقہ تو بدنیت بھی ہوتا ہے۔ لیکن بزدل بیچارے اپنی نیک نیتی کے باوجود حرکت میں نہیں آسکتے۔

لیکن ایک صورت حال جہاں بے پرواہی بھی نہیں ہوتی اور کسی نوع کا احساس کمتری بھی نہیں ہوتا۔ ان دونوں سے زبوں تر، مگر قابل رحم ہے اور یہ بے تربیتی کی صورت ہے۔ بعض نیک نفس اور شریف مزاج لوگوں سے جب نادانستہ یا اتفاقاً یا مجبوراً دوسرے کو کوئی اذیت پہونچ جاتی ہے تو ان کو دل میں اس کا ملال ضرور ہوتا ہے۔ مگر وہ تربیت یا روشن خیالی سے اتنے محروم ہوتے ہیں کہ سماج کی اس فہمائی قرارداد سے واقفیت نہیں رکھتے کہ معافی مانگ لینا بھی کوئی چیز ہے۔ اگر انھیں معاشری رسم سے آگاہی ہوتو فوراً معافی مانگیں اور بڑی التجا سے مانگیں۔ یہ صورت حال قابل رحم ہے۔ خود معاشرے کے لئے شرمناک ہے جس نے اس نیک نفس طبقے کو اتنا بھلا رکھا ہے۔ ان بھلے لوگوں کو تربیت دینے کا ظلم کس کے سر ہے بتلایئے۔ خدا کے لئے بتایئے۔

اپنے معاشرے کی ساری برائیوں کا بیک وقت جائزہ لے لینا تو محال ہے، لیکن چند پیش پا افتادہ اس وقت پیش نظر ہیں۔

بعض حضرات کی گفتگو مجمع میں یا تو صرف اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہے، یا پھر بھونڈی پھبتی۔ معاشرے میں خوددار لوگ بھی رہتے ہیں اور ذہین بھی۔ وقت بے وقت۔ وجہ بے وجہ۔ سبب بے سبب ذاتی مفاد، ذاتی نمود، ذاتی وجاہت کی راگنی سنتے سنتے خودداروں کے کان پک جاتے ہیں۔ اس نوع کی بے کیف وبے رنگ یک رخی معاشرت انسانیت کی توہین سی معلوم ہونے لگتی ہے پھبتی کو۔ خواہ وہ کتنی ہی احتیاط سے بگھاری جائے۔ ذہین لوگ فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ بدنما چیز ہر حال میں بدنما رہتی ہے۔ مستزاد یہ ہے کہ بدمزگی اور تنفص کا سبب بن جاتی ہے۔ اس مزاج کے دوست اور بھائی بند، ثقافت کے جلسوں، علمی صحبتوں احباب کی بزموں میں لطف کی جگہ کدورت پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ جنھیں ذرا غور کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ اس حیرت میں پڑ جاتے ہیں، کہ اللہ، زندگی سے اتنا تجاہل بھی ممکن ہے۔

ہماری ایک عادت یہ بھی ہے کہ کسی اختلافی مسئلے پر گفتگو شروع ہوئی اور ہم آپس میں لڑنے لگے۔ جھوٹی موٹی بحث میں اعتدال، رواداری، تحمل قائم رکھنا، ہمارے لئے محال ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ محسن الملک کے مشہور مقالے "موجودہ تعلیم وتربیت کی تشبیہ"

کا ذریعہ ہونے لگتا ہے۔

بعض میں سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ اس نوع میں کچھ ایسے ہیں جو صرف ایک، دو پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ یعنی خیریت اور مزاج پرسی کی حدود سے اگر تھوڑا آگے بھی بڑھ جائیں تو بے تکلفی، اور مشرقی اخلاق کے ذیل میں آکر بات بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن یہ عادت جب بڑھ جائے تو عیب بن جاتی ہے اور اذیت کا سبب ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بہت سے بے اٹکل لوگ جب سوال پوچھنا شروع کر دیتے ہیں تو پوچھتے چلے جاتے ہیں۔ پے در پے پوچھتے ہیں دوسرا کوئی سوال و جواب کا یہ مکالمہ سنے تو سمجھے کہ عدالت میں کسی جھوٹے گواہ سے جرح ہو رہی ہے۔ یا کوئی پرانا ہومیوپیتھک ڈاکٹر کسی الجھے ہوئے مریض سے زندگی کے واقعات دہرا رہا ہے۔ ان سوالات میں آمدنی، رشوت، بنک بیلنس، دفتری تعلقات، مکان، بیوی، اولاد، گھریلو معاملات، شادی بیاہ، سب ہی کچھ شامل ہوتا ہے۔ سوالات کی اس بارش میں بعض اتنے کڑوے، بے ہنگام یا پرائیوٹ ہوتے ہیں جن کا جواب ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ مگر پوچھنے والے صاحب ہیں کہ طرح طرح سے مجبور کئے جاتے ہیں۔ صید زبوں کبھی کبھی اتنا عاجز اور پراگندہ ہو جاتا ہے کہ چار و ناچار ہر سوال کا جواب دیتے ہی بنتی ہے۔ ایسے صاحبان انفرادیت، اتنے کھرے، اور الا کثر کم ہوتے ہیں کہ آنکھیں بدل کر صاف منع کر دیں کہ صاحب یہ پرائیوٹ معاملات ہیں۔ آپ کو ان سے کیا سروکار۔ آپ کیوں پر لنتر چلائے چلتے ہیں۔

مختلف مزاجوں کے دو آدمی، جب ایک جگہ ہو جائیں تو اس عادت سے ہنگامہ برپا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ بے دھڑک، مسلسل سوالات کئے جا رہے ہیں دوسرے صاحب ہیں کہ ہر سوال پر پیچ و تاب (غصہ) کھا رہے ہیں۔ پہلو بدل رہے ہیں۔ ہونٹ چبا رہے ہیں۔ نہایت اکراہ سے ادھورے، کٹے کٹے جواب دے رہے ہیں۔ دامن صبر و تحمل ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔ مگر موٹی کھال کے سید صاحب، شیخ صاحب، مرزا صاحب، خان صاحب ہیں کہ باز نہیں آتے، جان نہیں چھوڑتے۔

اس معیوب عادت سے بڑی بدمزگی کی نوبت آجاتی ہے۔ تنازعہ ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب سمجھتے ہیں کہ اتنی باتیں پوچھ کر یگانگت اور محبت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ دلسوز ہیں، نیک نیت ہیں، با اخلاق ہیں، پرانے خاندانی شریف ہیں۔ جو صاحب اس سے چڑتے ہیں وہ نہایت کج خلق، تنگ مزاج، بدتمیز ہیں۔ دوسرے صاحب کو یہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے کہ پرائیوٹ زندگی اور معاملات سے متعلق اتنے سوالات پوچھنا، نامعقولیت، جہالت، دیوانگی سب ہی کچھ ہے۔

قول فیصل یہ ہے کہ اعتدال کو پس پشت ڈال کر اتنے سوالات کرنے والا عموماً تربیت سے محروم اور خود فریبی اور ایذا فریبی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی نیت میں صرف تجسس اور بدتمیزی ہوتی ہے۔

احباب اور اعزا، وقت بے وقت، بے اطلاع، بے ضرورت ملنے چلے آتے ہیں۔ اور آ بیٹھے تو پھر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ آپ چپ بیٹھے ہیں، مگر وہ نہیں مانتے۔ آپ تکان کا عذر کر رہے ہیں مگر وہ نہیں مانتے۔ گھر میں سے کھانے کا بلاوا آ رہا ہے۔ مگر ان کے بلائیں بھی نہیں۔ ایک صاحب کو کچھ پرائیوٹ ضروری باتیں کرنی ہیں اور وہ بار بار اشاروں، اشاروں میں یہ ظاہر بھی کر رہے ہیں مگر وہ صاحب ڈٹے ہوئے ہیں۔ چپ ہو جائیے۔ آنکھیں بند کر لیجئے ان کے پاؤں تلے نمک بچھوا دیجئے، مگر وہ بندۂ خدا نہیں ٹلتے۔

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
سر بسجدہ ہیں مسیحا کہ مری بات رہے

ایک بڑا مضرت رساں، معاشرتی عیب یہ ہے کہ ہم اہم مسائل پر بے سوچے سمجھے گفتگو اور اظہار خیال کرنے لگتے ہیں۔ ایک لمحہ غور کئے بغیر ایسے مسائل پر رائے زنی شروع کر دیتے ہیں، جن سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ پرائیوٹ صحبتوں کے علاوہ ہوٹلوں، قہوہ خانوں، بسوں، گزرگاہوں، چوراہوں، پارکوں میں سنجیدہ موضوعات پر غیر سنجیدہ بےبکام اور بے لگام گفتگو بکثرت ہوتی ہے۔ اور یہ گفتگو جہلا یا مزدور طبقے کے لوگ نہیں کرتے پڑھے لکھے اور متوسط طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف خود اپنا خیال و اعتقاد بے راہ رو ہو جاتا ہے بلکہ دوسروں کے خیال و اعتقاد پر بھی بہت برا اثر پڑتا ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اس نوع کی بے سوچی سمجھی، بےمقصد و مدعا گفتگو سے بہت پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔

کن کن باتوں پر توجہ دلائی جائے۔ دوسروں کے سامنے بیچ سے لمبی سی جماہی لینا، ناخن چبانا۔ ناخن تراشنا، انگلیاں چٹخانا، ناک کریدنا، اور دانت، کان کا میل نکالنا، ناک سنکنا، کھنکارنا، تھوکنا، مٹکانا، ڈکار لینا، جماہی لینا، اس طرح کھانسنا کہ کف اڑ کر دوسروں کے چہروں پر پڑے، پاؤں کے میل چھڑانا، برابر والے کے قریب سگریٹ بیڑی کا دھواں چھوڑنا ہمارے معاشرے میں روزمرہ کی باتیں ہیں۔ ایسی جن پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ توجہ دلائیے تو التفات نہیں ہوتا، شکایت کے طور پر کہئے تو فوراً بگاڑ ہو جاتا ہے اور اگر دونوں طرف ذرا گرم مزاج کے لوگ ہوتے ہیں تو فوراً ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ فساد ہو جاتا ہے بلوے کی نوبت آ جاتی ہے۔

بعض حضرات جب ملنے آتے ہیں تو برابر آپ کی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ میز، الماری، اسٹینڈ کی کوئی چیز ان کی عاشقی و آنی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہر چیز کو اٹھاتے دھرتے، الٹتے پلٹتے رہیں گے۔ چاقو، کاغذ تراش، قلم، پنسل، پن سے کھیلتے رہتے ہیں۔ اکثر پن کش سے پن نکال کر کبھی ناخن کبھی دانت کا میل نکالنے لگتے ہیں۔ دانت سے خون نکل آتا ہے۔ تو برابر تھوکتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے بینک کے منیجر کی میز سے ایک بھاری وزن کا پیپر ویٹ اٹھا کر اپنے ماتھے پر ملنا شروع کر دیا۔ ان کا رنگ گورا تھا اور سوئے اتفاق سے پیپر ویٹ کے نیچے سرخی لگ گئی تھی۔ حضرت سلامت کا ماتھا اور گال سرخ ہو گئے بڑی ہنسی ہوئی۔ بڑا مزہ رہا۔ ایک صاحب نے جو ایک کالج میں استاد ہیں چند روز ہوئے میری تصدیق کی مہر ہاتھ سے کھیلنا شروع کیا۔ مہر کے حروف نوچتے رہے۔ آخر ایک نوچ کر بیکار کر دی۔ میں نے دل میں ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے لکھنے کا ایک موضوع مرحمت فرمایا۔

چابیوں کے چھلے کی زنجیر گھمانے والوں کو یہ دورہ ہر جگہ پڑ سکتا ہے۔ گھر دفتر، دوکان، سڑک، بس، بس کا کیو، بارات، سینما، کلب، کیاری، بندرگاہ، کوئی جگہ ان سے محفوظ نہیں۔ بعض جو غیر شعوری طور پر ایسا کرنے لگتے ہیں، وہ قابل معافی ہیں۔ بعض شعوری طور پر ایسا کرتے ہیں۔ تفخر یا اعزاز یا حکومت جتانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ مقصد یہ جتانا ہوتا ہے کہ دیکھو ہم جو چاہیں اور جب چاہیں اور جہاں چاہیں کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں آپ کی آنکھ پھوٹ جائے، ناک زخمی ہو جائے، کان کٹ جائے ہماری جوتی کو پرواہ نہیں۔ یہ بیچارے ذہنی علالت میں مبتلا ہیں۔ علمائے نفسیات کی نظر میں یہ جارحانہ قسم کا احساس کمتری

فضا اس سے بچا ہیں رکھے۔ ان بیمار گزیدگان کے لئے پاکستان میں کوئی ہسپتال نہیں۔ خوش رہ انسان، اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتے۔

مونچھیں مروڑنا، داڑھی پر متواتر ہاتھ پھیرتے رہنا، بار بار تبسم تبسم کا منہ بنانا۔ لمحہ بہ لمحہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے کر کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہنا۔ ایسی عادتیں ہیں جو جدید نفسیات میں میزازم کہلاتی ہیں۔ یہ عادتیں ذہنی تحویہ تکیہ کلام کے تحت میں آتی ہیں۔ جس طرح بعض آدمیوں کو تمہارے صاحب "سمجھے صاحب" سنا صاحب "یا خیال شریف میں" "دیکھئے نا" "سنئے" ارے میاں، اچھا خیر بھئی، یار وغیرہ وغیرہ کہنے اور کہتے رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح اس نوع کے افعال و حرکات کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ اُستاد اور ایڈوکیٹ کے لئے یہ عادتیں بڑی مذموم بھی جاتی ہیں۔

پسماندہ قومیں ہی اس مرض میں مبتلا نہیں ترقی یافتہ قوموں میں بھی اس نوع کے معائب پائے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں میں تعداد اور افتاد مزاج کا فرق نمایاں ہے۔ یعنی یہ کہ اوّل تو ان میں اہل معائب کی تعداد کم ہے، دوسرے وہ تربیت پذیر ہیں۔ وہ اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہوں یا نہ ہوں ان عیبوں کی بدنمائی سے واقف ہیں۔ ان کی توجہ دلا دی جائے فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف متنبہ ہو جاتے ہیں فوراً معافی بھی مانگ لیتے ہیں۔ ہمارے بھائی برادر اوّل تو دوسرے کی لکساہٹ نمایاں نفرت کا احساس نہیں کرتے۔ اور اگر انہیں اس طرف متوجہ کیا جائے تو فوراً بدسلوکی پر آمادہ ہو جاتے ہیں، بدگفتاری شروع کر دیتے ہیں، لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، چنانچہ صلح پسندوں نے یہ رویّہ اختیار کیا ہے کہ خاموش رہو، الگ تھلگ رہو، دیکھتے ہیں اور خون کا گھونٹ پی کر چپ رہ جاتے ہیں

قہر درویش برجان درویش

ہماری ان عادتوں نے دیمک کی طرح ہمارا اخلاق کھا لیا ہے، شجر حیات کھوکھلا کر ڈالا ہے۔ ان کے تسلسل اور تواتر سے اجتماعی احساس اتنا کند، معاشری شعور اتنا غبی، سماج کا ذوق اتنا بھونڈا ہو گیا ہے کہ افراد بالکل شل اور مضمحل ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ محراب و ممبر سے رہنمائی کی جاتی ہے، نہ پلیٹ فارم سے ہدایت دی جاتی ہے۔

عورتوں میں یہ سلیقہ نہیں کہ بچوں کو جب گھر سے باہر لے کر نکلیں تو انہیں ضروریات سے فارغ کرا لیں، تاکہ تفریحی مقامات پر، بازاروں میں، دوسروں کے گھروں پر بچے تنگ نہ کریں۔ بعض لوگوں کو اس سے بڑی گھن آتی ہے کہ دوسروں کے بچے اُن کے یہاں آتے ہی پیشاب پاخانے کو جائیں۔ پاکستان کے بین الاقوامی صنعتی میلے میں ماؤں نے پاکستانی بچوں کی موجودگی میں، روسی چینی، امریکی نمائش گاہوں کے سامنے سبزے پر پیدی کرائیں۔

"دور پہونچی ہے میری رسوائی"

اس سے بدتر یہ ہے کہ علیل بچوں کو لے کر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ آشوب چشم، زکام، کھانسی، نزلہ، کھجلی، داد، سوکھیا، اورام غدود میں بچہ گرفتار ہے، چیچک کے کھرنڈ ابھی اکھڑنے نہیں پائے ہیں مگر ماں جان ہیں کہ بچے کو گود میں لئے لئے مٹکتی پھر رہی ہیں مستزاد یہ ہے کہ ان بچوں میں کوئی زکام سے کوئی دودھ کے لئے بلکتا ہے۔ کوئی تھوکتا ہے کوئی ابکائی لیتا ہے کوئی قے کرتا ہے کوئی اس سے بدتر اور زیادہ گندے حال سے گزرتا ہے مگر ماں کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں کیا کر گزری

الغرض میزبان کا نالہ میں دم ہو جاتا ہے اور نفاست پسند اور نازک مزاج قسم کے میزبان کی تو جان پر بن جاتی ہے۔

یہ ساری بیماریاں اور ان کے اثرات اور متعدی ہیں ان کے اڑ کر لگنے کا اندیشہ ہے۔ بہتر بانوں کے گھروں میں بھی بچے ہوتے ہیں۔ اتنی خود غرضی اور بے حسی بہت معیوب ہے کہ ماں اپنی ذرا سی تفریح کی خاطر خود اپنے علیل بچے کو ہلکان کر ڈالے اور دوسروں کے تندرست بچوں کو خطرے میں ڈال دے۔

عورتوں اور مردوں دونوں کا فرض ہے کہ بچوں کے باب میں احتیاط اور فکر سے کام لیں۔ ترقی یافتہ مغربی قوموں نے اس باب میں بھی، حیات و معاشرت کے اصول و آداب مرتب کئے ہیں، ان کا مطالعہ مفاد کا سر چشمہ بن سکتا ہے۔

ترقی یافتہ قوموں پر ہنسنے اور ان کے خصائل کا مذاق اڑانے ان کے سوچے سمجھے رویوں کو معیوب سمجھنے، ان سے حسد کرنے، ان سے جلنے سے کام نہیں چلتا۔ وہ وقت گزر گیا جب ہم بعض قوموں کو کافر اور خنزیر۔ خوار کہہ کر ان سے نفرت کیا کرتے تھے عاقل و صاحب فراست انسان کا پہلا فرض ہے کہ محاسن اور معائب دونوں کا مطالعہ کرے۔ یہ چھان بین کرنی چاہیئے کہ زندہ اور بیدار، رہنما اور پیش رو قوموں کی عظمت اُن کی برتری، ان کی ترقی کا راز کیا ہے۔ اس کا ہمیں ہر وقت خیال ہے کہ ان کے محاسن سیکھ لیں اور معائب نظر انداز کر دیں۔

افسوس یہ ہے کہ تعلیم کے دوران میں ہمیں اس نوع کی تربیت نہیں دی جاتی کہ ہم

غذا صفا، اور وح ماکدر

کے حصول پر کاربند ہو جائیں۔ ہمارے خصائل خود رو ہیں

شعوری سعی و کاوش منصفانہ تہذیب و ترتیب کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ہمارے بچوں کو ضبط و تربیت سے صحت مند و توانا شہری نہیں بنایا جاتا۔

بعض اور معیوب عادتیں

خود بینی، خود نمائی، خود ستائی، رعونت، تکبر۔ تمرد نفس کے ادنےٰ جذبے ہیں، اور غلام قوموں کے افراد میں کثرت و فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بات بات پر بگڑنا ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جانا، بار بار اپنی توہین محسوس کرنا قدم قدم پر اپنی وجاہت کا اظہار۔ تنگ مزاجی۔ تنگ ظرفی بے حوصلگی کی دلیلیں ہیں۔ آزاد قوموں کے فرد، تعلیم یافتہ انسان، تربیت یافتہ ذہن ان امراض سے بری ہوتے ہیں۔ ان میں تحمل، انکسار، خوش مزاجی، ایثار، بلند حوصلگی ہوتی ہے، اس سے ان کے نفس کی طمانیت اور پاکیزگی کا پتہ چلتا ہے۔

نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین (سعدی)

یہی نفسی خوبیاں، ان انسانوں کے دنیاوی اور مادی جوہر بن جاتی ہیں اور انہیں بنی نوع کی نظروں میں ممتاز کر دیتی ہے اور خود ان کی اور ان کی قوم کی سرفرازی اور مادی منفعت کا سر چشمہ بنتی ہے۔

بہت سے پرانے یار و آشنا، پاکستان میں ایک دوسرے سے بیگانے کے طور پر ملتے ہیں۔ ہندوستان کے ملے ملے پکتان میں ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دوڑیں۔ گلے لپٹ جائیں آبدیدہ ہو جائیں۔ ہانپنے لگیں، گریہ گلوگیر ہو جائے۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔ سرد مہری چھائی نظر آتی ہے۔ اتنی سرد مہری کہ برف کے تودوں کو اپنی گرمجوشی پر فخر ہونے لگتا ہے الغرض

ب تجرّد کے دورے میں مبتلا۔ تکبّر کے مرض میں گرفتار
تے ہیں، دفتری، مالی، وجاہتی، آئی ترقی کے سہارے
ت کے زینے کی اس سیڑھی پر پہنچ چکے ہیں، جہاں سے پرانا
ت حقیر جانی زندگی ادنیٰ پرانے حالات معیوب نظر آتے
مکتب میں خالق باری' اور کریما پڑھنے والے کو یہ یاد رہتا تھا

تکبّر عزازیل را خوار کرد !
بہ زندان لعنت گرفتار کرد !

لیکن ہندوستان کی پرانی سیکریٹریٹ کے بہت سے
امر تبت کلرکوں نے بیشک پرانے مکتبی نصاب کے مطابق
تدائی گھریلو تعلیم نہیں پائی، ورنہ وہ اخلاق کے اُن رموز
سے آشنا ہوتے، جو مسلمان بزرگوں کی رگ و پے میں سرایت
ئے ہوئے تھے اور جنہوں نے لفظِ مسلمان کو معاشرے میں
ش اخلاقی، حلم، فراخ دلی کا مترادف بنا دیا تھا۔

آزادی، تکبر اور رعونت کی دشمن ہے۔ جو انسان ان
ہنی امراض میں مبتلا نظر آتے ہیں وہ آزاد نہیں ہوتے۔ وہ
زادی کے نام سے احساس کمتری کی لعنت میں گرفتار ہیں انہیں
دم قدم پر یہ جتانا پڑتا ہے کہ ہم بڑے ہیں، ہم بڑے ہیں
بان حال سے یہ آواز بلند کرنا پڑتا ہے کہ، ہمیں بڑا مانو، ہمیں
بڑا مانو"

حاکم قوم کا جبر حکومت ہٹتے ہی محکوم قوم آزاد نہیں ہو جاتی
جو قوم جتنی مدت محکوم رہتی ہے اتنی ہی مدت بھی آزادی کے
حصول میں صرف ہوتی ہے۔ ہتھکڑی کٹ جاتی ہے مگر ہتھکڑی کا
نشان ہاتھ پر باقی رہتا ہے۔ حاکم کے ڈنڈے کا جبر ہٹنے سے
ذہنی محکومی کی گتھی پر توجہ ہو جاتی ہے۔ علالتِ محکومی کا علاج
شروع کرنے کی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ غلامی کے دوران میں
جن معائب کی تولید جاری رہتی ہے، آزادی کے حصول کے
بعد اس کے بند ہو جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طویل
دورِ حکومت جو علالتیں ورثے میں چھوڑ گیا ہے۔ ان کا علاج شروع
کر دینا ضروری ہے۔ اس علاج کے اسپتال تعلیمی ادارے ہیں
لیکن وہ ادارے اگر سوئے اتفاق سے منضبط اور ساز و برگ
سے مزیّن نہیں ہیں، تو معاشرے کے ہر ذی ہوش کا فریضہ ہے
کہ اپنے اپنے مقام پر قوم کی ذہنی علالت کا علاج شروع کرے
رعونت، تکبر، منافقت، بدنیتی، بے حیائی، بے وفائی، جھوٹ
غداری کو خاک میں ملانے کی کوشش کرے۔ ہاں ایک چنا بھاڑ
نہیں پھوڑتا، لیکن ایک چنا کئی چنوں کے مجموعی وجود کا ضروری جزو
ہے اور کئی چنے مل کر ضرور بھاڑ پھوڑ سکتے ہیں۔

پاکستان قائم ہوئے اس وقت تک آٹھ سال سے زیادہ
ہو چکے۔ جدید دور حرکت میں یہ مدت طویل مدت ہے۔ فرزندانِ
ملت کی ساری ذاتی آرزوئیں اس وقت تک پوری ہو چکی ہیں
ساری مقید حسرتیں نکل چکی ہیں۔ ما قبل تقسیم ملک کے ہندو
کی ہوشمندی، بیداری، تیز روی نے حکومت۔ سیاست، تجارت
معاشرت کی دنیا میں جن مقامات و منازل کا حصول مسلمان
کے لئے جائز طور پر بند اور محال عقلی کر دیا تھا، وہ سارے مقامات
و منازل بہ افراط و فراوانی حاصل ہو چکے ہیں۔ چوندیا دینے والے
جلسے۔ متحیر کرنے والے اکابر عالم کی ملاقاتیں۔ دلبرانِ ارض کی
ہمنشینی، وجاہت کی بلند آہنگی۔ دولت کی فراوانی۔ راحت
کی بے پایانی، سیمرغ کی سواری۔ علاؤ الدین کا چراغ شہرزاد
احمد کا قالین سلیمان کی انگوٹھی جمشید کا جام خدائی کی ساری
سب ہی نعمتیں حاصل ہو چکی ہیں اس لئے ۔۔۔

اب جاگ پڑنے ہوش میں آجانے کا وقت ہے،

ہو سکتا ہے، اور ہوا ہے دور ابتلا آتا ہے، دور حماقت

آتا ہے، لیکن گزر بھی جاتا ہے، حال ایک حقیقت ہے، تو ماضی

اور مستقبل بھی اتنی ہی اہم دو حقیقتیں ہیں۔ انسان گمراہ رہ کر راہ راست

پا سکتا ہے، بگڑ کر بھی بن سکتا ہے۔ مرض کو دائمی یا لاشفا سمجھ لینا

خود ایک مرض ہے۔ مرض کو نامتناہی بنانا خود پر دری نہیں خودکشی

ہے عقل و فراست کے منافی ہے۔ رندی و تن پروری سے سیر

ہو کر خدمت و ایثار کی طرف بڑھنا ازالۂ لذت نہیں تنوع لذت ہے،

انسان اعلیٰ وہی ہے جو یہ سمجھ لے کہ شہنشاہ سے بلند تر

بھی ایک درجہ ہے۔ وہ درجہ خدمت خلق ہے۔ خدمت خلق

ہی نہیں۔ ایثار سے، شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔ شہادت کے

معنی گولی کھانے یا گلا کٹوانے ہی کے نہیں ہیں، شہادت کے

معنی اپنے نفس پر لگام لگانے، اپنے نفس کو قربان کرنے کے

بھی ہیں۔

اعتدال کو زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، مگر یہی

چیز آج ہماری زندگی میں سے مفقود ہے۔ ذرّے ذرّے سے

جلدی کرو، جلدی کرو۔ جلدی چلو۔ جلدی چلو کی آوازیں آ رہی

ہیں۔ بھوکا ہو نہ ہو، دب مرو۔ پس جاؤ کی صدا بلند ہے۔ جہاز

سی ہوئی ہوا ہے۔ رفتار کا جنون۔ قوت کی دیوانگی۔ دولت

کا نشہ۔ الامان الحفیظ۔ لائسنسوں کا بیوپار۔ ذخیرہ بازی کا

بول بالا۔ چور بازاری کی گرماگرمی۔ سیمنٹ شکر کے بھاؤ۔ لوہا

ہونے کے دام۔ خدا کی پناہ۔ خدا کی پناہ۔ فرقہ وارانہ

انجمنیں، مذہبی مظاہرے لمبے لمبے جلوس۔ مے نوشی کی صحبتیں

کلب وطن کا استقبال۔ بین الاقوامی مجرے۔ کرکٹ میچ، گھوڑ دوڑ

کشتیاں۔ نمائشیں، میلے، جشن، وہ جوش و خروش ہے

کہ حشر سا برپا ہے۔ قومی ذہن بحران میں گرفتار ہے۔ جھوٹی

عدالتی کارروائیاں۔ سنجیدہ موقعوں پر تمسخر اور استہزا۔ بے پرواہی

سہل انگاری، حیا سوز اقدام عدالت۔ دفتر۔ کالج۔ یونیورسٹی

میں سوٹ کے ساتھ زریں سلیم شاہی جوتا۔ دفتر میں دوپلی

ٹوپی چوڑی دار پاجامہ اور سفید بھک جوتی، انمل بے جوڑ باتیں

اناپ شناپ، بہتات، کثرت۔ دماغ کو گرم سے گرم تر کرتی جاتی ہے

صور اسرافیل پھک رہا ہے۔ ہر چیز کے بھک سے ہو جانے کا

اندیشہ ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے

کلاس سے ماسٹر صاحب میلہ دیکھنے چلے گئے ہیں، باقی پر سے

آنکس اُٹھ گیا ہے۔

اُستاد و معلم چو بود بے آزار۔

خرسک بازند کودکان در بازار

(سعدی)

مہاجر کو فٹ پاتھوں پر پڑے رہنے دینا۔ مہاجر پر ظلم ہی نہیں

نہیں قوم اور ملک پر ظلم ہے۔ شہر کے حسن نظام، صفائی

و آبیاری اور بد روی کو بگڑنے دینا مہاجر کے ساتھ سلوک

نہیں۔ خود اسی کی صحت، اور قوم کی تنومندی کے ساتھ بدسلوکی

ہے۔ ذوق پاکیزگی، ذوق سکون، ذوق جمال کو اُلٹی چھری

سے ذبح کرنا ہے۔ سخت وقت نکل چکا ہے۔ کڑی منزل جوں تُوں

طے ہو چکی ہے۔ اب بھی تساہل و بے راہ روی کو جائز رکھنا بہت

نہیں مضرت ہے۔ مہاجر کو اب مہاجرت کے جال سے نکل کر

خود اعتمادی اختیار کرنے کا وقت ہے اپنے پاؤں پر کھڑے

ہونے کا وقت ہے۔

قانون کی ہیبت، عدالت کا وقار، پولیس کا رعب

اُستاد کی عظمت، اُن سب اُترے شعلوں کو جن کا نام مرد کب ہر گز

ہے اب پھر سے بس جانا چاہیئے۔

خشونت، رعب کا جزو اعظم ہے۔ رنگین، ہونٹ اور کھرا پن، ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ لاکھا اور خاکی وردی، انمل بے جوڑ چیزیں ہیں۔ پرانی چال کے : یوا بچی ایک طرف نئی قماش کے صوبہ دار صاحب کے گال ہیں۔ اگر بیڑا دبا نمایاں ہو۔ تو وقار غائب ہو جاتا ہے۔ تھانے سے نکلتے وقت سڑک پر یا کچہری کے حلقے میں، یا دورانِ تفتیش میں اکثر اتنی لمبی پیک تھوکی جائے کہ بالشت در کنار دو فٹ سے ناپی جائے تو برقی نظام کا مزہ ضرور منہ میں رہ جاتا ہے لیکن زورِ حکومت ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ حلوائی کی دوکان اور دادا جی کی فاتحہ ضرور مثل مشہور ہے۔ لیکن تنبولی کی دوکان اور پولیس افسر جیا ذا باللہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں۔

حکومت کا وقار جو بڑی نازک چیز ہے کسی نوع کی سہل انکاری کا متحمل نہیں۔ عدالتوں۔ دفتروں۔ محکموں کے چپراسیوں کے پاس نہ وردی ہے، نہ چپراس۔ ایک بڑے افسر کا قول ہے کہ افسر اپنے چپراسی سے پہچانا جاتا ہے یہ بے شک درست ہے، درست سے کچھ زیادہ ہو مسلمات میں سے ہے۔ انگریز افسر اپنی صورت اور ہندوستانی بیچارہ اپنے چپراسی کی وساطت سے پہچانا جاتا تھا جس چپراسی کا سر ننگا، گلا کھلا، بال بکھرے۔ پاؤں میں چپل، کپڑے میلے چہرہ ہونق۔ اس پر پان اور بیڑی مستزاد۔ وہ لاکھ پٹے والا کہلائے مگر پٹہ کہاں۔ کیسے پہچانا جائے، کس طرح ہیبت پر رعب ڈالے۔ کیونکہ اس کا افسر اس کے واسطے سے پہچانا جائے کیونکہ وقار قائم ہو۔ بے فکرے۔ زنخے۔ بھکاری۔ سودائی نیم دیوانے اور کوڑھی بے لگام کچہری کے احاطے میں گشت لگائیں گے۔ پیک تھوکیں گے۔ یا بد معاشی فرمائیں گے۔

جو تم بیزار کریں گے اور کوئی یہ پوچھنے والا نہ ہوگا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ کبھی مسلم لیگ زندہ باد کا نعرہ لگتا ہے۔ کبھی کوئی پری پیکر اسیرانِ بند و سلاسل کی فریاد کا آوازہ بلند کرتی گزر جاتی ہے اور کبھی کوئی صاحب اپنے مہدی موعود ہونے کا اعلان کرنے لگتے ہیں۔ مگر آہ چنگیز خان کی وہ بات دار آواز اب کہاں :-

"کیوں بے! یہ کچہری کا مدہ ہے!"

جہاں آتے پہلے بڑے بڑے تیس مار خانوں کے پر جلتے تھے۔ وہاں اب بے فکروں کو کوئی ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے والا بھی نہیں۔

یہ وہ وقت ہے کہ حکومت کے پروگرام سے بالکل الگ رہ کر اور قطعی بے نیاز ہو کر عامۃ الناس کی بلسیوں کسانوں "انسان سدھار" کا کام شروع کریں۔ افضل الاشغال خدمت الناس اپنے ذمہ لیں اور پاکستان کی گم کردہ راہ پبلک کو انگلی پکڑ کر چلائیں، سہارا دے کر دلدل سے نکالیں۔ انہیں معاشرے قانون، استاد کی عظمت کا درس دیں۔ یہ وقت صرف سونے۔ عیش کرنے، کلفٹن کے میلے میں شرکت، ہاکس بے پر جشن کرنے۔ کینڈ لیک اور پونی ٹیک میں تجنز طرازی پریزادوں کے ساتھ رقص کرنے، جام پر جام لنڈھانے اور شاہانہ قمار بازی کا نہیں ہے۔ اور کاموں کا بھی ہے۔ وہ اور کام کیا ہیں؟ ملک کے دولتمندوں اور صاحبانِ اقبال سے پوشیدہ نہیں۔

حافظ نے تو قمار بازی کی حمایت کی ہے۔

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم
چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

مجھے بھی اہل قمار پر اعتماد ہے ایمان کی یہ ہے کہ بعض صورتوں

میں اہل فکر کو صاحبان صوم سے زیادہ ارباب قمار پہ اعتماد ہے، مگر وہ خدا کے لئے چونکیں تو ادر ابنی بے پایاں ذہانت اور فراست سے جو اس وقت رہن ہو، گرو قمار، اور وارفتۂ صنم ہے کچھ کام تولیں۔

لیکن سب سے پہلے، ان آزادگان پاکستان کو پابند کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے کے سارے عیوب بے نظمی کی پیداوار ہیں۔ کاش ہمیں ہر لمحہ یہ یاد رہے کہ ہمارے قائد اعظم نے مرتے مرتے جن تین باتوں پر زور دیا ہے ان میں "عقیدت" اور "دیانت" کے علاوہ "نظم" بھی ہے غالباً لاکھوں پاکستانیوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ بانیٔ پاکستان قائد اعظم بننے سے پہلے مقنن اعظم بن چکا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر محمد علی جناح دو ہی مستند آئینی مقنن تسلیم کیئے جاتے تھے۔ یہ بات ان جناب کے بدترین دشمنوں کو بھی احتجاج پاکستان کے بدترین دور میں بھی تسلیم تھی۔ لیکن بہترین دوستوں کو یہ بات آہ پاکستان بن جانے پر بھی تسلیم نہیں۔ اگر تسلیم ہوتی تو پاکستان میں ان کا تمغائے امتیاز ان کا محبوب ترین نقطۂ نظر "نظم عمل" رائج ہوتا۔ اس طرح رائج ہوتا کہ زندگی میں رچ بس گیا ہوتا، خون میں مل گیا ہوتا۔ لوگ سوتے جاگتے، ہنستے کھیلتے، جیتے مرتے نظم قایم رکھتے اسی کو حیات اور اسی کو ایمان سمجھتے۔ کاش ہمیں سبت۔ ہدایت یہ صبت کی ترکیب کا پاس ویان جمال کے لئے اور ستا الکہری جبروت کے لئے مشہور ہے ہی کاش پاکستان "نظم عمل" کے لئے دنیا میں منفرد ہو جاتا[1]

---

[1] یہ مقالہ جس خلوص اور دردمندی کا آئینہ دار ہے اور جیسے موثر طریقے پر سپرد قلم ہوا ہے اس کا اقتضا ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے لہٰذا ہمدرد ملت ناظرین کرام "العلم کراچی" کا حوالہ دے کر پمفلٹ کی شکل میں اسے طبع کرا کر اپنے بھائیوں میں مفت تقسیم کرائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ (ایڈیٹر)

اُردو

پروفیسر آغا سروش

[illegible]

اردو سے عداوت ہیں جو [illegible] ہے
اپنے پرائے کی [illegible] ہے
سب آگ لگی ہے [illegible] غلامی کی خو ہے
[illegible]

[illegible]

قطعہ تہنیت

بخدمت عالیجناب فضیلت مآب ابوالقاسم فضل الحق صاحب وزیر تعلیم حکومت پاکستان[1]

(از جناب شرف آسی۔ ڈھاکہ)

مژدہ اے آنکہ نشئے امن و رفاہ و انصاف — آمد ہمہ رو رعایا ز پس پردہ برون
با نشاط و طرب و عزت و جاہ و اقبال — سال فرخندہ و وقت خوش و روز میمون
آنکہ اندر قلم رافت و عدل و کرمش — آمد این ناحیہ از جملہ مفاسد مامون
خُلق جان پرور و گفتار روان آسائش — متصرف بدل خلق چو سحر و افسون
بے ریا عاطفت و بے غرض احسانش را — از سر صدق دل و جان جہانے ممنون
آن دبیرے کہ جہان را دم بے آرامی — جنبش خامۂ اوی دہد آرام و سکون
کرسی مرتفع سلطنت پاکستان — یافت آرائش و زینت ز لباس موزون
تو کہ مسرور ز اکرام خداوند کریم — نمی زیبد کہ ثنا خوان تو ماند محزون
گلے از باغ جوانی پسر فیض الحق — بکنار آید و اقبال شود روز افزون

قدردان شرفا مہر عطا فضل الحق
۱۹ ۶ ۵۵
عیسوی گفت شرف سال وزارت اکنون

[1] آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس بھی آنریبل موصوف کی خدمت گرامی میں ہدیہ تبریک پیش کرتی ہے موصوف کا کانفرنس کا تعلق ۱۹۰۶ء سے قائم ہے۔ آپ نے اجلاس پٹنہ ۱۹۳۸ء اور اجلاس پونا ۱۹۴۰ء کی صدارت کی اور اجلاس کلکتہ ۱۹۳۶ء کی صدارت مجلس استقبالیہ کے فرائض انجام دیے۔ اب آپ بحیثیت وزیر تعلیم پاکستان آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خصوصی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ (سید الطاف علی بریلوی)

چند محسن!

بھائی جان

(از سید الطاف علی بریلوی)

۱۔(الف)

مرکزی اسمبلی کے ۱۹۳۴ء کے انتخاب میں یو۔پی کے ہفت شہری حلقہ سے ابتداً مولانا شوکت علی اور مولوی سر محمد یعقوب میں مقابلہ کی تیاری تھی۔ مولوی اکرام عالم صاحب ایڈوکیٹ کی کوٹھی واقع سول لائن بریلی میں ایک روز بعد مغرب حامیان سر محمد یعقوب کا جلسۂ مشاورت ہوا۔ مجھ کو بھی مدعو کیا گیا کیونکہ اکرام عالم صاحب سے میرے خصوصی تعلقات رہتے اور مولوی سر محمد یعقوب صاحب سے بھی کافی واقفیت تھی۔

رسمی ملاقات کے بعد مولوی سر محمد یعقوب صاحب نے میری بہت تعریف کی اور فرمایا کہ "بھئی ایک زمانہ سے تمہارے مضامین پڑھ رہا ہوں اور حیات حافظ رحمت خاں تو تم نے خوب ہی لکھی ہے" اس کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب کے اعترافِ خدمات میں پرجوش تقاریر ہوئیں۔ مجھ سے بھی تقریر کی فرمائش ہوئی تو میں نے کھڑے ہو کر صاف صاف عرض کر دیا کہ چونکہ مولوی صاحب کا مقابلہ مولانا شوکت علی صاحب سے اس لئے میں انکا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اس جلسہ کے چند روز بعد ریاست رامپور سے میری فوری طلبی کا تار آیا جس میں مرقوم تھا کہ اپنی کتاب حیات حافظ رحمت خاں ساتھ لے کر آجاؤ۔" رامپور پہونچا تو محکمۂ اطلاعات کے افسر اعلیٰ اور میرے علی گڑھ کے ساتھی سید معقول احمد مراد آبادی سواری لئے اسٹیشن پر موجود تھے پہلے اپنی کوٹھی پر لے گئے دوپہر کا پر تکلف کھانا کھلایا اسکے بعد فرمایا کہ "ریاست کی جانب سے آپ کی کتاب پر انعام دیئے جانے کا فیصلہ ہوا ہے" میری طرف سے ایک درخواست بھی پہلے سے ٹائپ کی ہوئی رکھی تھی جس پر آنریبل وزیر تعلیم سید بشیر حسین زیدی صاحب کی سفارش ثبت تھی صرف آنریبل چیف منسٹر مولوی مسعود الحسن صاحب مراد آبادی کا حکم ہونا باقی تھا۔ میں نے اس غیر معمولی نوازش و مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور درخواست پر دستخط کئے۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے کے بعد معقول احمد صاحب نے فرمایا: "اچھا بھئی یہ بتاؤ الکشن میں کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا "میری تائید و حمایت تو مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ ہے"۔ اس جواب پر سخت اظہار تعجب ہوا۔ دیر تک گرماگرم بحث رہی بالآخر بولے "اب دو بج گئے ہیں چیف منسٹر صاحب کے دفتر چلیے تاکہ آپ کی درخواست کی کارروائی مکمل کرا دی جائے"۔ موٹر میں ہم دونوں خاص باغ آئے۔ معقول صاحب نے مجھے دفتر کے برآمدہ میں بٹھایا اور درخواست لے کر خود چیف صاحب سے ملنے چلے گئے۔ مجھے بیٹھے بیٹھے ڈھائی گھنٹے گزر گئے مگر معقول احمد صاحب لوٹ کر نہ آئے۔

متزلزل ہونے کا بھی وقت آگیا سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ سوچتے سوچتے اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یہ سب کھیل مولوی سر محمد یعقوب صاحب کی تائید حاصل کرنے کے لئے کھیلا گیا تھا اور چونکہ اس خصوص میں میں صاف و صریح انکار کر چکا ہوں اس لئے اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ یاد آیا کہ بریلی واپس جانے کی گاڑی کا وقت قریب ہے لہٰذا فوراً اٹھا تیز تیز قدموں سے احاطۂ خاص باغ سے نکل کر سڑک پر آیا اور ایک صبا رفتار تانگہ کرایہ کر کے سیدھا اسٹیشن رامپور پہونچا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی دوڑ کر اس میں بیٹھا اور اسی روز رات گئے بخیریت گھر واپس آگیا۔

اس وقت تک الیکشن میں میری دلچسپی کچھ یوں ہی سی تھی لیکن رامپور کے واقعے نے تازیانہ کا کام کیا اور میں نے دوسرے ہی دن مولوی عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ کی خدمت میں جو مولانا شوکت علی کے کام کی قیادت کر رہے تھے حاضر ہو کر اپنی ناچیز خدمات پیش کر دیں۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اخباری و اشتہاری پروپیگنڈا کا کام میرے سپرد کر دیا۔ تیسرے دن میرا ایک زور دار پمفلٹ شائع ہوا جس میں میں نے اسمبلی کی روداد سے مولوی سر محمد یعقوب صاحب کی انگریز دوستی اور وطن دشمنی کے واقعات جمع کئے تھے۔ یہ پمفلٹ مقبول ہوا اور بریلی کے علاوہ حلقہ کے بقیہ چھ شہروں سے بھی اس کی بہت مانگ ہوئی۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا پمفلٹ اور اشتہار شائع ہوتا رہا اور الیکشن جو اب تک کم سردی میں چل رہا تھا اس میں کافی گرماگرمی پیدا ہونے لگی بلکہ عین انہیں ایام میں مولوی سر محمد یعقوب صاحب مولانا شوکت علی صاحب کے مقابلے سے دست بردار ہو کر بریلی [illegible] کمایوں کے حلقہ سے کھڑے ہو گئے اور مولانا کے نئے حریف ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں اور خان بہادر حاجی وجیہ الدین صاحب بن گئے

چونکہ مجھے الیکشن بازی کا کوئی خاص شوق نہ تھا اسلئے اس منزل پر میں نے اپنے قائد مولوی عزیز احمد خاں صاحب سے درخواست کی کہ مجھے اب چھٹی دیدیں لیکن وہ نہ مانے۔ اس وقت مولانا شوکت علی صاحب کے کام میں دقت یہ تھی کہ مولانا محمد علی صاحب کے انتقال کے باعث ان کی شخصیت بے اثر ہو گئی تھی نیز . . . . الیکشن لڑانے کیلئے روپیہ نہ تھا اور نہ کوئی دوسرا شخص ان کی طرف سے خرچ کرنے کو تیار تھا۔ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابتدائے کار میں اپنے دورۂ الیکشن کے سلسلے میں مولانا شوکت علی صاحب بریلی تشریف لائے تو اسٹیشن پر مولوی عزیز احمد خاں صاحب اور میرے سوا کوئی تیسرا شخص استقبال کیلئے موجود نہ تھا اور ہم لوگ ان کو ایک تانگہ پر بٹھا کر ان کی قیام گاہ پر لائے۔ اسی طرح دوسرے روز بعد نماز مغرب مسجد نو محلہ میں جلسۂ عام میں صرف گیارہ آدمی شریک ہوئے۔ اسی مسجد نو محلہ اور ٹاؤن ہال پارک میں میں نے اس سے پہلے یہ مناظر بھی دیکھے تھے کہ بیس بیس اور پچیس پچیس ہزار کا مجمع علی برادران اور بی اماں مرحومہ کی زیارت کرنے اور تقریریں سننے کے لئے جمع ہوتا تھا اور اگر سوء اتفاق سے جلسہ کے وقت بارش آجاتی تو گھنٹوں موسلادھار پانی میں لوگ جمے بیٹھے رہتے تھے ——— اس کے برعکس اس وقت یہ بے کسی تھی۔ ——— سچ ہے سیاسی رہنماؤں کی شہرت و ہر دلعزیزی کا حال بھی

حسن شباب کے مانند ہے جو زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال چلتا ہے اور پھر اس کے زوال کے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں میں مشکل سے ایک دو ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں جو محتاط زندگی گزارنے کے باعث سر سید رضا علی صاحب مرحوم کی طرح حسین بوڑھوں کی تعریف میں آتے ہیں۔

مولانا شوکت علی صاحب اس زمانہ میں ہر طرف سے مارے ہوئے تھے۔ الیکشن میں ان کا کھڑا ہونا ہی ان کے سابقہ اصولوں اور روش کے خلاف تھا یہی وہ وجوہ تھے جن کی بنا پر پہلے مولوی سر محمد یعقوب کو اور ان کے بعد سر شفاعت احمد خاں اور خان بہادر حاجی وجیہ الدین صاحب کو ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آخر الذکر امیدواروں کی تیاری کافی منظم ہو گئی۔ شہر کے تمام رؤسا اور عکام سر شفاعت احمد خاں کے مددگار تھے اور دہلوی پنجابیوں کی زمین دار وخوشحال جماعت حاجی صاحب کے لئے پرزور کوشش کر رہی تھی لیکن اصلی مقابلہ . . . . . .

. . . .

. . . . شفاعت احمد خاں صاحب سے تھا اور میرے اشتہارات زیادہ تر ... کے خلاف نکل رہے تھے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ میں نے نہایت جوشیلی سرخیاں دے کر ایک اشتہار کچھ اس مضمون کا لکھا کہ "بریلی میں پیشہ ور الیکشن بازوں کا ایک گروہ ہے جو زرکشی کی خاطر باہر سے مالدار امیدوار کو لا کر مستحق امیدواروں کے خلاف کھڑا کرتا ہے اور مراد آباد کا مردہ چاہے جنت میں جائے یا دوزخ میں اُسے اپنے حلوے مانڈے سے کام رہتا ہے۔" اس گروہ کے لیڈروں کو نام بنام بھی گن دیا گیا جن کی مذکرہ حقیقت سے اہل شہر بخوبی واقف تھے۔

کسی سے مشورہ کئے بغیر میں نے یہ اشتہار چھپنے کو دیا اور ساتھ ہی پریس کو ہدایت کر دی کہ جیسے جیسے وہ چھپتا جائے اُس کو شہر میں چسپاں کرا دیا جائے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں سینما دیکھنے چلا گیا اتفاق سے تصویر خراب تھی تفریح کے بجائے طبیعت کافی کند اور مکدر ہوئی۔ قریب دس بجے رات کو سینما ہاؤس سے نکلا تو عجیب اضمحلالی کیفیت طاری تھی اسی میں سہ پہر کو لکھے ہوئے اشتہار کا خیال آیا اور جوں جوں اُس کے مضمون پر غور کیا دل کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آنے لگے اور قدم اٹھانا دشوار ہو گیا۔ ہیجان اس بات کا ہوا کہ اشتہار میں ذاتی حملے شدید ہیں جس وقت اصحاب متعلقہ اُس کو پڑھیں گے تو ان کو حد اشتعال ... ... فوجداری کی نوبت آ جائے۔ عزت ہتک کی نالشیں ہوں اور مولانا شوکت علی صاحب کی الیکشن ... متوقع کامیابی "پٹیشن" کی زد میں آ جائے۔ اگر نوبت یہاں تک پہونچی تو مولوی عزیز احمد خاں کیا مجھے آٹھ آٹھ آنسو نہ رلائیں گے کہ اشتہار کا مضمون تک اُن کو دکھایا اور سب سے زیادہ یہ (میرے والد) کی پریشانی کا خیال دامنگیر ہوا کہ وہ پہلے سے گو مالی مشکلات اور دوسرے تفکرات میں مبتلا ہیں، میری یہ حرکت اُن کو مزید مصیبت میں ڈال دے گی۔ ان خوش خیالات سے مغلوب ہو کر میں گھر جانے کے بجائے سیدھا پریس گیا اشتہار ... چھپ رہا تھا میں نے گھبرا کر کہا "اس کی چھپائی روک ... مشین مین نے مشین روک دی۔ تو میں نے پوچھا "چھپے ہوئے اشتہار کہاں ہیں"، اُس نے جواب دیا "صاحب آدھے چسپاں ہونے جا چکے۔ ایک چوتھائی موجود ہیں اور بقیہ چھپنے باقی ہیں۔" میں نے کہا "میں تمہیں معقول انعام د

اس کام کے بجائے اب تم لوگ یہ کرو کہ چھاپاں کرنیوالے آدمیوں کو جاکر روک دو۔ سب اشتہار واپس لے آؤ اور جو دیواروں پر لگ گئے ہوں اُن کو بھی چھڑالاؤ۔ ابھی بھی گیلی ہوگی اشتہاروں کا چھڑانا دشوار نہ ہوگا۔" وہ اللہ کے نیک بندے فوراً روانہ ہو گئے اور میں پریس میں اُن کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ ایک ایک لمحہ اس طرح گذر رہا تھا جس طرح قتل کے مجرم کا سزائے موت سنائے جانے سے پہلے گذرتا ہے۔ کسی پہلو قرار نہ تھا اور دل کی وحشت تھی کہ منٹ منٹ پر بڑھ رہی تھی۔

قریب بارہ بجے رات کو پریس کے آدمی واپس آئے اور اُنہوں نے یہ رپورٹ دی کہ "صاحب اشتہار تو دور دور تک چپکے ہیں اور چھاپاں کرنیوالوں کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ ہم نے اشتہاروں کو چھڑانے کی بھی کوشش کی لیکن اول تو وہ سب چھوٹ نہیں پائے دوسرے کئی جگہ یہ ہوا کہ لوگ ہمیں مخالف پارٹی کا سمجھکر مارنے کو تیار ہو گئے۔"

مجھ پر اس اطلاع سے بجلی سی گرگئی اور سناٹے میں آگیا۔ بہرحال تھوڑی دیر میں کچھ سنبھلا۔ پریس کے آدمیوں کو پانچ روپئے اُن کے حق المحنت کے دیئے اور کہا کہ "اب چھپائی روکنے سے کیا فائدہ سب چھاپ دو اور چھاپاں کرنیوالے لوٹ کر آئیں تو اُن کو حوالہ کرکے تاکید کردو کہ صبح تک اپنا کام ختم کردیں۔"

اس کے بعد اشتہار کی چند کاپیاں میں نے اپنی جیب میں رکھیں اور گھر کی طرف چلدیا۔ نہایت خاموشی سے مکان میں داخل ہوا اور چونکہ میرا اور بھائی جان کا پلنگ ایک ہی کمرہ میں برابر برابر بچھا کرتا تھا اس لئے چپ چاپ بغیر کپڑے اُتارے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ چونکہ جسم اور دماغ بہت زیادہ تھک گیا تھا اس لئے تھوڑی دیر میں نیند آگئی۔ شاید سولی پر بھی نیند آتا اسی کو کہتے ہیں۔

مجھے سوتے ہوئے نہ معلوم کتنی دیر ہوئی تھی کہ بھائی جان کی آنکھ کھلی اور اُنہوں نے جو مجھکو اس عجیب حال میں پڑے دیکھا تو صبر نہ کرسکے آہستہ آہستہ میری ٹوپی اُتاری۔ جوتے کھولے اور اسکے بعد شروانی کے بٹن کھول رہے تھے کہ میں بیدار ہوگیا اور اُٹھکر بیٹھ گیا۔ بڑے اضطراب سے بولے "خیریت تو کیا بات ہے؟" میں نے کہا کیا عرض کروں ایک سخت غلطی ہوگئی ہے" فرمایا "کیسی غلطی؟ مجھے بتاؤ۔" میں نے جیب سے اشتہار نکال کر ہاتھ میں دیدیا جسکو اُنہوں نے لالٹین کی روشنی تیز کرکے جلد جلدی پڑھا اور پوچھا کہ "اچھا تو پھر۔ . . ."

میں نے کہا "یہ بہت سخت ہوگیا۔" بولے "ہاں ہاں سخت تو ہے لیکن اس قدر فکر کس بات کی ہے؟" میں نے جواب دیا "یہی کہ نہ معلوم صبح کو اس کی وجہ سے فوجداری ہوجائے۔ عزت ہتک کی نالش ہو اور آئندہ ایجیٹیشن کی بنیاد بن جائے۔ علاوہ بریں مجھے سب سے زیادہ اس کا خیال ہے کہ آپ بے وجہ نئی پریشانیوں میں پڑ جائیں گے۔"

بھائی جان نے میری یہ باتیں سُنکر فوراً اپنی پُررعب آنکھیں میرے چہرے پر جماکر کڑک کر فرمایا: "بس یہی بات ہے؟ اچھا تو اُٹھو۔ منہ ہاتھ دھوؤ۔ کھانا کھاؤ اور بے فکری سے سوجاؤ۔ کوئی فوجداری کرے گا تو اُس سے فوجداری کرلیں گے۔ مقدمہ دائر کرے گا تو مقدمہ لڑالیں گے اور اطمینان رکھو ایجیٹیشن کی نوبت نہ آئے گی۔" اس کے بعد بھائی جان خود اُٹھے باورچی خانہ سے کھانا لاکر میرے آگے رکھا۔ لوٹے میں پانی اور گلاس لائے۔ بارہ گھنٹے کا بھوکا تھا۔ روٹی کھائی اور پانی پیا تو جان میں جان آئی پھر اُس پر بھائی جان کی سکون بخش تقریر۔ لہٰذا اب جو سویا ہوں تو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

صبح کو آٹھ بجے تازہ دم ہو کر اٹھا ضروریات اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ہر جگہ رات کا اشتہار لگا ہوا دیکھا۔ اور ایک ایک اشتہار کو بیک وقت دس دس اور بیس بیس آدمی پڑھ رہے تھے۔ ادھر اُدھر چل پھر کر اور لوگوں کا ردِ عمل معلوم کرکے اندازہ ہوا کہ سارے شہر میں اشتہار کی دھوم ہے اور مولانا شوکت علی صاحب کے حق میں ایک دم رائے عامہ بدل گئی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ اشتہار چھاپے گئے ہیں ہر شخص کی زبان پر بس اسی کا ذکر تھا قبل دوپہر تک ایک ایک کرکے اُن اصحاب سے بھی مڈبھیڑ ہو گئی جن کے مشتعل ہونے کا گذشتہ شب مجھ پر خوف طاری تھا رائے عامہ کا دباؤ کہیئے یا بھائی جان کی شخصیت کی دھمک کہ ان میں سے ہر ایک حسب معمول رسمی اخلاق سے پیش آیا اور ذرا سی بھی تلخی مزاج کا اظہار نہ کیا۔

اس روح پرور اشتہاری جائزہ سے فارغ ہو کر میں مولوی عزیز احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ کے دولت خانہ پر گیا۔ اتوار کی تعطیل کا دن تھا۔ بڑا بھاری دربار جما ہوا تھا۔ یہ دیکھکر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرا دلچسپ اشتہار اور مخالفین کے خلاف اس میں مندرج پھبتیاں ہی نقلِ محفل بنی ہوئی تھیں۔ میرے حاضر ہوتے ہی خانصاحب موصوف نے مجھے جی کھول کر اشتہار کی داد دی۔ یہ بھی فرمایا "ارے بھئی اور سنو کچھ بدمعاش! رات تمہارے اشتہار چھپاتے پھر رہے تھے مجھے خبر ہوئی تو میں نے آدمی بھیج کر انہیں بھگوا دیا۔" اس پر میں نے اپنی رات کی داستان سنائی تو ساری محفل ہنستے ہنستے زعفران زار بن گئی۔

قصہ کوتاہ دس بارہ دن بعد الیکشن ہوا اور مولانا شوکت علی صاحب بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ بریلی میں ان کے صرف ڈیڑھ سو روپئے خرچ ہوئے۔ ووٹروں نے ہر ایک پولنگ پر پیدل جا کر ووٹ ڈالے اور دونوں مخالف امیدواروں کی بکثرت موٹریں سارا دن بیکار ماری ماری پھرتی رہیں۔

الیکشن کے کچھ عرصہ بعد ایک کانفرنس میں لکھنؤ جانا ہوا جس میں مولانا شوکت علی صاحب بھی تشریف لائے تھے جو ممتاز دارالیتامیٰ سے ملحق مسٹر سراج حسن ایڈوکیٹ کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے ان کا قیام تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح ملنے گیا تو ناشتہ کر رہے تھے۔ ایک لمبی میز پر انواع و اقسام کی کھانے کی چیزیں جن میں فروٹ اور مٹھائیاں بھی بہتات سے تھیں چُنی ہوئی تھیں۔ اور مولانا آستینیں چڑھائے خوب جی لگا کر کھانے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھکر بولے، "ارے۔ ارے تو کہاں سے آگیا" میں نے کہا "آپ کے الیکشن میں میرے کچھ دام اُٹھ گئے ہیں وہ دید یجیئے" فرمایا کیا بکتا ہے؟ کیا بکتا ہے؟ ادھر آ میرے پاس آ، لا تیری جیب میں کیا ہے؟ میں نے عرض کیا "جی کچھ بھی نہیں ہے دہلی واپس جانے کے لئے کرایہ کے دام تک نہیں ہیں" بولے "جھوٹ۔ جھوٹ"۔ اور یہ کہکر میری جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں پہلے سے تیار ہو کر گیا تھا لہذا میری جیب سے صرف ایک اٹھنی برآمد ہوئی۔ کہنے لگے "ہا کمبخت! ایک اٹھنی لے کر میرے پاس اس قدر مال کھانے کو آگیا خیر! کوئی بات نہیں۔ ارے کوئی ہے؟" کوٹھی کا ایک ملازم آگے بڑھا اُس کے ہاتھ پر میری اٹھنی رکھ کر بولے: "جا دوڑ کر جا! بالائی لے آ!"

حضرت عزیز صفی پوری کی چند غزلیں

(از مولوی خصلت حسین صابری بی۔ اے۔ علیگ)

قطعہ

بجرمِ گوشش بنہ گر ظرف داری۔ کہ حال ساقی و میخانہ گویم
زمن بشنو اگر غافل نہ گردی۔ کہ راز بادہ و پیمانہ گویم

ولایت تا بہ سنجے زندہ باشم
غزل از شوق مستانہ گویم

حضرت عزیز صفی پوری کے فارسی کلام کا انتخاب "تحفۂ شفاعت" کے نام سے ابراہیم پریس لکھنؤ اور اردو کلام کا انتخاب "عرفان عزیز" کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکے ہیں۔

"العلم" سہ ماہی رسالہ کراچی کے گزشتہ شمارہ جنوری ۱۹۷۵ء میں میر مشتیاق اور جناب منشی حمایت علی عزیز صفی پوری کے سوانح حیات اور حالات اور شمارہ جولائی ۱۹۷۵ء میں منشی امیر احمد مینائی لکھنوی کے چند مکتوبات حضرت عزیز صفی پوری کے نام لکھے جا چکے ہیں۔ مدیر العلم جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی بی اے (علیگ) میرے دیرینہ کرم فرما جو کہ نہ صرف ادیب ہیں بلکہ کلام فارسی کا بھی ذوق سلیم رکھتے ہیں حضرت عزیز صفی پوری کی پرکیف اور پرترنم غزلوں کو سن کر بہت متاثر ہوتے رہے ہیں چنانچہ حسب فرمائش مدیر موصوف یہ چند غزلیں ارباب ذوق کے لئے پیش ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرات ناظرین کو حضرت عزیز صفی پوری کی استغنا و صدوشناسی کرنے کی غرض سے میرے مخدوم و محترم جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے جو ضمنی لطیفہ "تحفۂ شفاعت" پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی صاحب کے "تحفۂ شفاعت" کے تعارف و مقدمہ کے تبصرہ کے ضمن میں لکھا ہے۔ درج ذیل ہے۔

"کلام کل ۵۰ صفحوں میں آگیا ہے باقی لطافت کے عنوان سے ایک بڑا ضخیم مقدمہ مرتب کلام اور عقیدت کیش محمد خصلت حسین صابری بی اے کے قلم سے ہے اس سے بھی پہلے تین مکتوب درج ہیں نواب صدیار جنگ شیروانی علامہ مناظر احسن گیلانی اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے قلم سے علامہ گیلانی کی جاندار تحریر ہر جگہ اپنا ایک رنگ امتیازی پیدا ہی کر لیتی ہے وہی صورت یہاں بھی ہے۔۔۔۔ یہ ضمنی لطیفہ بھی اپنی جگہ قابل ذکر ہے کہ مولانا کو لکھنؤ کے "اعزّ خانہ" کی ملاقات و تعلقات میں کسی قدر غلط انقباض ہو گیا یعنی شاہ عزیز اللہ صفی پوری اور خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی اور مرزا محمد ہادی رسوا صاحب گلدستہ "عزیز اللغات" کے درمیان اور کشتے سے باہر والوں کے لئے یہ اشتباہ بالکل قدرتی ہے۔"

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے تبصرہ کا مختصر اقتباس بھی یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو قابل قدر ہے۔

تاہم حمیدؔ ہی عنایتوں کے اس سارے سلسلہ میں ایک بات کام کی بھی ہو گئی۔ ایک قدیم مغالطہ کا ازالہ ہوا: عزیز لکھنوی مشہور شاعر ہی کو میں سمجھتا رہا کہ۔

لغتیہ کلام جو عزیزؔ کی طرف سے منسوب ہے یہ انھیں کا کلام ہے آپ کے مقدمہ سے پہلی دفعہ یہ راز واضح ہوا دیر تک اپنے جہل پر عبرت ہوئی۔ خاک کو عالم پاک کے کانٹ کا مرادف برسوں سمجھتا رہا۔ عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر مد ظلہ العالی کے حلقہ میں کبھی حضرت عزیزؔ کا ذکر آتا رہتا تھا لیکن میرے جہل نے ہمیشہ اس لفظ کا مصداق لکھنوی عزیزؔ ہی کو سمجھا۔ جناب نے میرے جہل کا ازالہ فرما کر ایک صاحب دل صاحب نسبت صاحب حال ہستی کے کلام سے شرف اندوز ہونے کا موقعہ عطا فرمایا۔ جزاکم اللہ عنا خیر الجزاء"

"حضرت عزیزؒ کے جن حالات کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے کیا ان سے واقف ہو جانے کے بعد مجھ جیسے سیہ کاروں کے لئے اس کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ ان کے قدسی المقام کلام کے متعلق کسی قسم کی رائے کے اظہار کی جسارت کروں۔ خاکی پیکر میں تقریباً ایک صدی جن کو تڑپنے اور سسکنے کا موقعہ عطا کیا گیا ہو قالب نورانی میں پہنچ کر آج وہ کہاں پہنچے ہونگے۔"

بے ساختہ آنسوؤں کی قطاریں پلک پر صف آرا ہو گئیں جب دیکھا کہ امیر الشاہؒ کے نور نظر نے اسی سال (۸۰) سے اوپر کی زندگی صرف ماہر (ساڑھے سات روپیہ) ماہوار پنشن پر گزار دی عشق کے سوا یہ کمال کس میں ہے باہر سے لیا گیا تو اندر کتنا سبھر دیا گیا شاید پچھلا حال پہلے حال سے انجام کے لحاظ سے بہتر ہی نظر آئے گا۔ کم ترک الاول للہ آخرہ

فارسی اور اردو کا کلام ترانا کا عام ہے وہ عالم بالکل الگ کی غزل کس نے نہ سنی ہوگی۔ کتنے کے سر اس غزل پر نہ سپٹے ہوں گے۔ کتنوں نے کپڑے نہ پھاڑے ہوں گے۔ بار بار دہرائی جانے والی اس غزل کا یہ عجیب کمال ہے کہ لذت اور شورش کے پیدا کرنے میں اب بھی تازہ بتازہ اور نوبنو کی کیفیت سے بھرپور ہے۔"

مناظر احسن گیلانی

تو اریجا معة لعثمانیہ حول المسجد الاقصیٰ حیدرآباد دکن

۲۳/مارچ ۱۹۴۹ء

عزیز اللہ شاہ صاحب عزیزؔ صفی پوری اور خواجہ عزیز لکھنوی ہمعصر تھے۔ آپس میں ایک دوسرے سے خط و کتابت رہتی خواجہ صاحب عزیزؔ صفی پوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

زلفیتے کہ ترا با علی ولی خداست

عیاں ز نظم شریعت کمال صدق صفات

"سبحان اللہ الحمدللہ کہ ہنوز قلمرو ہندوستان
خالی از ارباب کمال و اصحاب قال و حال نیست
اگرچہ این برگ و نوا ہم خوشہ چین این روضہ
این ریاض است اماں از چند سال مبتلا کے
امراض است سرے کہ با پا سودا او
تنگے کہ باین تماشا داشت اکنون نہ دارد
در مجبوری دوامی بمی گذارد کہ چیزے نگارد۔

- بادب بالاحترام عزیز الدین عزیزؔ عفا عنہ
از لکھنو محلہ سبزی منڈی

لہ زائر مرحوم حمید لکھنوی نعت گو شاعر شاگرد رشید حضرت جگر مراد آبادی (مرحوم)۔

لہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (رحمۃ اللہ علیہ) مرحوم صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ جن کا تبصرہ ۱۹۴۹ء میں کیا گیا (اقتباس)

میرے عزیز مکرم ڈاکٹر ابو توفیق صاحب صدیقی ایم اے
پی ایچ ڈی ولیگ، پروفیسر شعبۂ اردو اسلامیہ کالج لاہور نے عزیز
عزیز کے پہلے ایڈیشن پر میری فرمائش سے پیش لفظ لکھا۔ اُس
نے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے ان کے لیے مقالہ کا عنوان
"دبستان لکھنو کا ادبستان شاعری" تھا۔ اور حضرت عزیز صفی پوری بھی
اودھ کے شعراء میں سے گزرے ہیں گو یہ مزید ہے کہ فقرو فاقہ کے
باعث بمصداق۔ قلب از جا نمی جنبد، حضرت عزیز نے گوشہ
گمنامی پسند فرمایا مگر ملک آشنت کر دیو یا سانحہ اس وقت
کے حضرت عزیز صفی پوری سے ناواقف نہ تھے چنانچہ حضرت
عزیز اپنے دیوان نظم دلفریب میں لکھتے ہیں ۔

ممنون میں نہیں ہوں کسی کے کمال کا
شاگرد اس زباں میں ہوں اُس ذوالجلال کا
ہاں نظم پارسی میں ہوں غالب سے مستفید
منت گذار لطف ہوں دو تین سال کا
جب بعد غدر سیر کو گیا لکھنؤ کو میں
دیکھا کچھ اور رنگ خدا کے جلال کا
مجھ سے سنا تھا میری غزل کو اسیرؔ[1] نے
تھا ان کو سارا علم میرے گھر کے حال کا
ہر چند اُن دنوں میں شروع شعور تھا
اس پہ کیا تھا وصف زبان و خیال کا
ہادی علی اشکؔ بھی شکر ہو گئے تھے خوش
احساں بھی انھوں نے کیا بذل مال کا
جاتا میں ان کے پاس تو آتے وہ میرے پاس
وہ ثانی ہر ایک صفت ہے ان کے خصال کا
غالبؔ نہیں رہے تھے تو خالی نہ تھا جہان
باقی ہے فیض حشر تک ان دونوں کا
خادم صفیؔ[2] ولی نے جو تجویز کیا مجھے
اردو زبان میں ذکر کیا دل کے حال کا
لذت نہیں سخن میں جو ترک سخن میں ہے
کس سے کروں میں تذکرہ اس انفعال کا
اہل ہنر چھپائیں خطائے عزیزؔ کو
رکھیں خیال زشتی رد سوال کا

ڈاکٹر موصوف اپنے پیش لفظ[3] مذکورہ بالا میں لکھتے ہیں ۔

"حضرت کو تصنع اور نمود سے نفرت تھی، اور
یہ لازمۂ فقیری ہے چنانچہ اس عہد کے لکھنؤ
میں رہ کر جو واجد علی شاہ کا رنگیلا عہد کہلاتا ہے
اور جو برقؔ اور بحرؔ کے معاصرین کا دور تھا
حضرت عزیزؔ نے خاص لکھنوی رنگ کو قبول
نہیں کیا۔ رعایت لفظی کا شوق جو اس عہد میں
دیوانگی کی حد تک پہونچ گیا تھا ان کے یہاں
بالکل نہیں ہے، نہ محاورہ بندی تشبیہ
استعارہ اور کنایہ پر زور بیان صرف ہوا
ہے بلکہ صاف صاف دل کی کیفیات ہیں جن
کو شعر کے پیرے میں ظاہر فرمایا ہے ہاں لکھنوی
زبان بیشک کو ثر و تسنیم میں دھلی ہوئی
ملتی ہے بحر زبان شگفتہ، زبان آسان اور جذبات

[1] جناب مظفر علی صاحب اسیرؔ لکھنوی [2] حضرت عزیزؔ کے پیر طریقت مخدوم شاہ خادم صفی محمدی صفی پوری
[3] پیش لفظ میں نمونہ کلام بھی دیا ہے اور اس شعر کو بہت سراہا ہے فرماتے آپ عزیزؔ ۔ دلکش ہے ۔ ہر گز ...

تصوف میں مسرت ہے بالخصوص ان کی شاعری میں جابجا
وہ تیر و نشتر ملتے ہیں جن کی تلاش ارباب بصیرت کو
استادوں کے کلام میں ہوتی ہے۔"

میرے محترم بزرگ جناب مولوی نظام الدین نظامی بدایونی
مرحوم و مغفور مالک نظامی پریس بدایوں عرفان عزیز کے لفظ آخر میں
یوں رقمطراز ہیں:-

"عرفان عزیز گلہائے معرفت و محبت کی وہ خوشنما
لڑی ہے جس کے گوندھنے کا فخر میرے مکرم عزیز
محمد خصلت حسین صابری (نظامی) کو حاصل ہوا
سبب انتخاب ان کے تذکرہ عقیدت سے ظاہر ہے
اس کے دیباچہ یا پیش لفظ کا لکھنا میرے نوجوان
ہم وطن اور مسلم یونیورسٹی کے ایک ہونہار ادیب کا
حصہ تھا ان تعارف ناموں کی موجودگی میں
لفظ آخر سے یہ توقع کرو کہ تتمہ آخرین کر
شیرینی کا کام دے گا شاید صحیح نہیں، میں ان چند سطور
میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس انتخاب کے علاوہ
میں نے حضرت عزیز کے مکمل دیوانوں کو بھی دیکھا
ہے جس سے یہ اندازہ ہوا کہ اس انتخاب پر یہ حکم نہیں
لگ سکتا کہ یہ چند غزلیں روح کلام عزیز ہیں اور
بقیہ کلام جسم بے روح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تصوف
اور معرفت کے وسیع سمندر سے یہ چند جواہر ریزے
پیش کر کے اس انتخاب کے مرتب نے عوام کو حضرت
عزیز کے مکمل کلام کے مطالعہ کا مشتاق بنا دیا ہے
اور انتخاب صرف اس نقطہ نظر سے کیا گیا ہے
کہ پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت عزیز
کی شاعری کوئی رسمی شاعری نہیں بلکہ وہ ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

کی مکمل تفسیر ہے اور اس کے مطالعہ سے اس کا
پڑھنے والا اگر توفیق الٰہی مدد کرے تو اسی رنگ
میں ڈوب سکتا ہے۔

خاکسار

نظامی بدایونی ۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء

یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ نظامی صاحب مرحوم
بدایونی نے مجھ سے فرمایا جب میں عرفان عزیز
کا "لفظ آخر" لکھنے بیٹھا تو خیال گذرا کہ اسی
عرفان عزیز سے فال نکالنا چاہیئے فال کھولی
تو وہ یہ شعر تھا ؎

لبریز ہے دل جوش انا اللہ سے لیکن
اس کوزہ کو دریا سے ابلنے نہیں دیتے

غرض حضرت عزیز کی شاعری آپ کا حال تھا جیسے فوائد الفواد
میں لکھا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ نے یا این
فرمایا ہے[1] ؎

شعر در وصف حال لب بستہ است
چون بہ خواہش رسید مسخرہ است

یعنی "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" ایسا کلام کیف و سرور سے
بھرپور ہوتا ہے اور سننے والے کے دل پر اثر کرتا ہے۔ حضرت عزیز
نے اپنے کلام قدسی المقام میں انہیں معارف و معانی کا اظہار کیا
اس طرح سلوک کے مدارج طے کر کے عارف باللہ کا مقام
حاصل کیا ؎

[1] ملفوظات حضرت نظام الدین اولیا از خواجہ امیر حسن سجزیؒ بندۂ حسن خلیفہ حضرت نظام الدینؒ اولیا

سلوک عشق را حاجت بجز نسبت عزیزی

بپائے خود وی طے می کنم ہر لحظہ منزلہا

زیر بیان بحر رو شگفتہ ہونے کے علاوہ پر از ترنم ہیں جس نے

م عزیز کو اور بھی پر تاثیر بنا دیا۔ حضرت عزیز کے ان تاثرات کا

ازہ ارباب ذوق حضرت عزیز کے ان مندرجہ ذیل چند غزلوں

ے مطالعہ سے خود لگائیں اور معرفت حاصل کریں۔

خادم عزیز

محمد خصلت حسین صابری

حمد

ے رنگ تو از بہار خوشتر — نقش تو ز ہر نگار خوشتر

روئے تو شگفتہ تر ز صد گل — لحن تو ز صد ہزار خوشتر

چشمت بہ نگاہ سحر خوانان — از نرگس پر خمار خوشتر

زلفت بخیال موشگافان — از سنبل تابدار خوشتر

بویت بمشام پاک بازان — از غالیۂ تتار خوشتر

ہر ناز و ادا کہ از تو بینند — گویند ز ہر کنار خوشتر

جز یار مگو عزیز ہر بار

چیزے نبود ز یار خوشتر

نعت

دو عالم را بکاکل گر نثار داری — بہر موئے ہزاران مسئے کافری

سراپا رحمتی یا محمد — نظر جانب ہر گنہگار داری

لب بخشند برق تجلیٰ — لبی تو ما را بے خبر داری

کہ تعبیر نغم دغن نامر — کہ آمیرہ عشاق بیدار داری

عزیز اللہ کرا از کفر خشتش

پنہان در خرقہ خرقہ زنار داری

از کعبہ بروں رفتم احرام ہوس را را

مستانہ دعا گفتم پیران کلیسا را

از قلقل ہر شیشہ صد مردہ سخن گوید

در میکدہ ہا دیدم اعجاز مسیحا را

ما بندۂ مستانیم از بادہ پرستانیم

جز رندی و میخواری کارے نبود ما را

چوں بادہ بجوش آید دیگر بہ ہوش آید

آواز خروش آید ہم صاحب تقویٰ را

یارم کہ قدم اندوز در دل بہ مغاں سوزد

تا ناز بیا موزد مستانہ نہد پا را

برخیز کہ یار آمد ہنگام بہار آمد

ساقی چو بہار آمد گلزار رعنا را

ہر چند و آیت را سر مست کند صہبا

با پیر مغاں گوید کز خود بستاں ما را

بانگ تکبیر بلند است ز میخانہ ما

رحمت اللہ لبے مشرب رندانۂ ما

بس کہ باشد نمک آمیز بیاد لب او

شور در دل فگند نغمۂ مستانۂ ما

خرقہ سوزیم بپوشیم شراب گلگوں

محتسب کرد طواف در کاشانۂ ما

می شود زنگ اگر سرمہ کند دیدۂ شب

دیدۂ شیخ زخاکستر پروانۂ ما
بادۂ ناب ببر کنج عشق سے
ساقیا روز ازل پر شدہ پیمانۂ ما
سر بہ یک بود ونشگ ذرا د باشد
گر نہ بینید بتان جلوۂ جانانۂ ما
آب بر خاک دریز چو سحاب کرمش
کے شود سبز ولایت بہ زمین مانۂ ما

ساقی مئے بدہ کہ فراموشی آورد
از خویشتن رباید و بے ہوشی آورد
ہوشم فزود درد سرائے پیر میکدہ
رشحے بہ کام ریز کہ مدہوشی آورد
آشفتہ شد ز پند تو مغز سبوکشان
واعظ پیالہ گیر کہ خاموشی آورد
یارب بہ زاہدان غم عشق مغان ببخش
تا خون دخت رزلب پوشی آورد
تا دم ولایت آن نگہہ ناز ستہا
کو شیخ کعبہ را بہ قدح نوشی آورد

ز کشتگان محبت وفا دریغ مدار
وفا اگر نتوانی جفا دریغ مدار
ترا کہ لطف بہ بیگانہ آشنا سازد
بیا و یک نظر از آشنا دریغ مدار
بیا کہ خستہ تو بر لبش ہلاک پاشی است
تبسم از دل مجروح ما دریغ مدار

بیاد کہ سوئے من آید جنون بہرا ید
نسیم زلف ز باد صبا دریغ مدار
کلام تو شکند قدر بہ قم باذن اللہ
تکلم از لب معجز نما دریغ مدار
مریض عشق توام یاد دا چہ کار مرا
ترحمے ز من بے نوا دریغ مدار
محال است نشاط و طرب بتقدم تو
بیا بہ خیمہ ولایت ثنا دریغ مدار

بے تو رنگ پریدہ را مانم | صید صیاد دیدہ را مانم
ہم نفس یاس آرزو در دل | جان برلب رسیدہ را مانم
بے رفیقم ز سایہ می ترسم | رہ نورد جریدہ را مانم
نالہ من دو کون برہم زد | دم صور دمیدہ را مانم
اے ولایت ز خود پشیمانم
دل الفت گزیدہ را مانم

موجودم و معدومم چون موج بہ آب اندر
بینایم و نابینا چون دیدہ بخواب اندر
من روح شدم بیک ز جسم شدم تنگ
فانی شدہ ام ایک چون گل بگلاب اندر
با سوز تو با نوسم از وصل تو نا یوسم
چون شمع بہ فانوسم رکشن بحجاب اندر
پیدایم و پنہانم با جلوہ تو پرافشانم
چون برق درخشانم دایم بسحاب اندر
آزردہ ز ہر غربب آشفتہ ز ہر مطلب

رفتم ہمہ بر مرکب پا ہیم بہ رکاب اندر
شوریست از و بر سو آفاق از و مملو
دیں طرفہ کہ رو دیکھا دیکھی بہ نقاب اندر
گردید عزیز اکنوں زعشق دلم پُرخوں
غرق است دو چشم من زاشک کباب اندر

غرقم ہمہ در خویش چو آب تہہ دریا
پاک ست حیاتم چو حباب تہہ دریا
چو شد زدروں گر تو بیائی بہ کنارش
آید پئے پابوس تو آب تہہ دریا
آہنگ شنا کن کہ دہم بر سر خود جائے
ایں است بسوئے تو خطاب تہہ دریا
اشکم ہمہ دریا و تماشائے شگفت است
چشمان سپیدم چو حباب تہہ دریا
عکس خط سبز تو بہ فتاد زساحل
تا سبز شدے آب ست خضاب تہہ دریا
ہر سر بکفے غرق بجوں می شود ایں جا
گویت بصد آب ست جواب تہہ دریا
از آب حیات است چو دریا دہن او
نوش شخش لب لباب تہہ دریا
خوں ریختہ و سوختہ افگند در آتش
از کشتۂ او پرس عذاب تہہ دریا
ہر بحر بہ ہر لفظ پُر از گوہر معنی است
دیوان عزیز است کتاب تہہ دریا

چہ شدی اگر بر جست نقاب از رخ کشودے
بہ تجلی و تجمل دل عاشقاں ربودے
زکرم شفاعتم کن کہ بیاید ست از من
نہ قیام نے قعودے نہ رکوع نے سجودے
ہمہ ممکنات بیکسر ز ظہور نشت در نہ
بوجود لایزالی کہ بجز عدم نبودے
زازل بجان داؤد اگر الفتت نمی بود
نہ لحن مست بودے نہ بصوت جان فزودے
زملائکہ رمیدی بفلک بنا رمیدی
اگر از لب تو عیسیٰ سخنے ہمی شنودے
دل دردمند دارم ہمہ محو ایں تمنا
کہ کمال بے نیازی بغم تو رو نمودے
چہ نشستہ و لاتیت بصبا بگو خدا را
کہ بجاک پاک حمد بربان من رودے

نہ لاکے بات بھی کی اور مسکرا بھی دیا
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی
گیا جو نامہ بر آیا بہت سراسیمہ
کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی
سنبھلتے حضرت موسیٰ مگر ستم یہ ہوا
دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ سنا بھی
میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغ ہستی نے
قریب صبح کیا روشن اور بجھا بھی
عزیز اس کے کرم پر فدا ہوں کیونکر
کہ عشق دے کے مجھے عشق کا مزا بھی دیا

سکھائی ناز نے قاتل کو بیدردی کی خو برسوں
رہی بیتاب سینہ میں ہماری آرزو برسوں

گرا سجدے میں مجھکو دیکھتے ہی وائے رسوائی
کیا تھا جس ولی نے آبِ زم زم سے وضو برسوں

عجب حالت میں ہو جاتا ہے اس کا دیکھنے والا
خدائے آپ ہرگز کرے گر جستجو برسوں

نہ پوچھو بے نیازی آہ طرزِ امتحان دیکھو
ملائی خاک میں انہی ہنس کے میری آبرو برسوں

خرابی ہو گئی زاہد بنایا پیر ساقی نے
عزیز افسوس اک تباہی ہے غم سے سبو برسوں

دل کو کچھ غم نہ ہو سر کو کچھ سودا نہ رہے
انتہا عشق کی یہ ہے کہ تمنا نہ رہے

اتنے صدمے ہوں الٰہی کہ جگر خوں ہو جائے
فکر دنیا نہ ہو اندیشۂ عقبیٰ نہ رہے

آنکھیں اس درد سے بہتی ہوں کہ طوفاں کہیں
پھر یہ پھر خشک ہوں یوں دریا کہ قطرہ نہ رہے

کبھی نالہ ہو کبھی آہ کبھی خاموشی
سارے غم ہوں مگر آخر میں کچھ اصلا نہ رہے

آہ لیلیٰ پہ ہوا قیس کا انجام عزیز
وہی عاشق ہے کہ جسکو کوئی پروا نہ رہے

دلِ ہر پارسا اس بت پہ جیا نہ آتا ہے
تڑپ کر لوٹے جیسے شمع پر پروانہ آتا ہے

نگاہِ مست کر دیتی ہے جو دیگر تر ساغر
تمہی کہہ دے جو آتا ہے کیا مستانہ آتا ہے

پہنا دیتا ہے زنار مسکرا کے جو بت زاہد
یہاں کس کام کی ہے سبحۂ صد دانہ آتا ہے

در و دیوار روشن تھے ہجوم خرقہ پوشاں ہے
وہ کافر آج شاید جانبِ میخانہ آتا ہے

تمہاری آشنائی سے ہوا بے فرقہ مذہب
یگانہ دیکھے جاتا ہے اگر بیگانہ آتا ہے

کسی چشمِ سیہ کا غمزۂ افسون بے خوابی
نہ پوچھو ہم سے کچھ ہم کو کبھی افسانہ آتا ہے

عزیز اس پارسائی پر بھی ہم مے پرستی میں
تکلف دور ہو جاتا ہے جب پیمانہ آتا ہے

اشکوں کی جناب دی گئی ہے　　سب چشم پُر آب دی گئی ہے
یہ عمر رواں حباب آسا　　اک نقش بر آب دی گئی ہے
ہر پردۂ دل میں ایک آواز　　بے چنگ و رباب دی گئی ہے
بریاں ہے جو دل تو داغ دل کو　　خوشبوئے کباب دی گئی ہے
کرتے ہیں جمال کی تلاوت　　ہم کو یہ کتاب دی گئی ہے
ہر بات کو اُن کی پی گئے ہم　　کیا لب لباب دی گئی ہے
قالب ہے بلاؤں میں گرفتار　　یہ جان عذاب دی گئی ہے
کر شکر عزیز شکر پر شکر　　گر چشم پُر آب دی گئی ہے

دھوکا ہے جہان عزیز اسی سے
تشبیہ سراب سے دی گئی ہے

★

جامعہ تعلیمِ ملّی اور تعمیرِ کردار

مشیرِ تعلیمات پاکستان کے ارشاداتِ گرامی

درج ذیل قیمتی خیالات کا اظہار جامعہ تعلیم ملی کراچی کے تیسرے یوم تاسیس کے موقع پر ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی" کے نمونہ پر جناب ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب سابق وزیر تعلیم حکومتِ پاکستان نے قایم کیا ہے جو اپنے بانی کی گرانمایہ شخصیت کی بدولت یوماً فیوماً ترقی کر رہا ہے۔ جامعہ کے مقاصد و نصب العین سے ہمیں ہمیشہ اتفاق رہا ہے اور قیام پاکستان سے قبل اُس کی تائید میں ہم بہت کچھ لکھ بھی چکے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی عملی فوائد کے اعتبار سے اس امر کا ہمیں برابر احساس رہا کہ جامعہ کی تیس سالہ خدمتِ ملی کے باوجود نہ معلوم کیوں! اُس کے فارغ التحصیل لوگ میدانِ صحافت ہو یا وزارت۔ اسلامی و ملکی تحریکات کے سلسلہ میں جیل جانا ہو یا جیل بھیجنا۔ غرض کاروبار حیات اور قومیات کے کسی بھی شعبہ میں ——— نمایاں نہ ہوئے۔ ممکن ہے آپ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور پروفیسر مجیب صاحب وغیرہ کے نام لیں ——— مگر وہ جامعہ کی "پیداوار" نہیں ہیں۔

ندوہ دیوبند اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ آپ کو ہر جگہ اپنے اپنے طرز فکر اور طریق تعلیم کے مطابق ممتاز اور فعال دکھائی دیں گے ——— جامعی حضرات کہاں ہیں؟ ڈھونڈھے سے نہیں ملتے۔

یہ تکلیف دہ بات عرض کرنے کی جسارت ہم نے اس لئے کی ہے کہ "جامعہ تعلیم ملی" کراچی کے ارباب حل وعقد اس ہونہار قومی ادارہ کے دوام و استحکام کی جہد کے ساتھ ہی ساتھ اس نقص کا بھی کھوج لگائیں جس کی طرف ہم نے دردمندانہ اشارہ کیا ہے۔ انگریزی پھولوں کی طرح صرف خوشنما ہونا کافی نہیں ہے۔ گلاب کے پھول کے مانند خوبصورت اور خوشبودار ہونا بھی ضروری ہے

محترم ایس۔ ایم شریف صاحب کے ارشادات گرامی کے سلسلے میں ایک مودبانہ گذارش یہ کرنی ہے کہ اُن کے اچھے تعلیمی نظریات تعمیر کردار کو جب عملی جامہ پہنایا جائے تو اُن کی تجربہ گاہیں صرف

ہمارے "پبلک اور ماڈل اسکول" ہی نہ ہوں بلکہ ابتدائی و ثانوی تعلیم کے وہ عام سرکاری و نیم سرکاری اسکول بھی ہوں جن میں سے اکثر میں طالب علموں کے بیٹھنے کے لئے چٹائی کا فرش بھی نہیں ہے اور جن کے اساتذہ ع

چہ خورد بام داد فرزندم

کے بھنور میں پھنسے ہونے کے باعث تعلیم و تعلم کے پیشہ سے ایک قسم کی تھکاوٹ محسوس کرنے لگے ہیں (ایڈیٹر)

کردار کی تشکیل ہر تعلیمی نظام کا سنگ بنیاد ہے۔ پرانے طریقہ تعلیم میں تو اسے از حد اہمیت دی جاتی تھی لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا اس کے نصاب میں ایک قسم کا جمود پیدا ہوتا گیا۔ کیونکہ وقت کے ساتھ انسان کا علم ترقی کرتا جاتا تھا۔ اور اگر تعلیمی نصاب میں علمی ترقی کے مطابق تبدیلی نہ کی جائے تو وہ ناقص ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سماج کے تعلیم یافتہ میں بعض انسانی خوبیاں تو ضرور پیدا ہو جاتی تھیں لیکن وہ علم اور عمل کی کئی برکتوں سے محروم رہ جاتا تھا۔ یورپ میں اٹھارھویں صدی میں اس نصاب کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ اس وجہ سے تعلیم کا مرکز تعمیر کردار کے بجائے تہذیب عقل قرار پایا انسان دماغ کو سنوارنے میں اتنا مصروف ہو گیا کہ اپنی روح کو بھول سا گیا۔ ہمارے زمانہ میں صنعتی تہذیب کا اثر لامحالہ تعلیم پر بھی پڑا اور تعلیمی اداروں میں بھی غیر شخصی ماحول پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے شخصی کردار کی قدریں پس پشت چلی گئیں۔ چنانچہ تعلیمی ادارہ میں طالب علم کی شخصیت بھی پسپا ہونے لگتی ہے اور وہ جماعت کا ایک ایسا رکن بن جاتا ہے جس کی فطرت اور صلاحیت کی طرف کوئی دھیان نہیں ہوتا۔ استاد اور شاگرد کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اور ان کا رشتہ محض وہ رقم ہے جو ایک فیس کی شکل میں دیتا اور دوسرا تنخواہ کی شکل میں وصول کرتا ہے۔ اس فضا میں کردار کی خاطر خواہ تشکیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اور اگر کوئی نظام تعلیم یہ فرض ادا نہ کر سکے تو اس میں خامی رہ جاتی ہے لہٰذا ہمارے دور میں مغربی ملکوں میں بھی یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ تعمیر کردار اور روحانی قدروں کے بغیر انسان کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے۔

تعمیر کردار کا کام ہمارے دور اور ماحول میں زیادہ مشکل بھی ہے اور زیادہ اہم بھی۔ پاکستان ایک نوزائیدہ اور پسماندہ ملک ہے اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی نئی نسل ہے اس کے کردار پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے۔ نئی نسل کا پس منظر تقسیم کی صعوبت اور گذشتہ جنگ کی ہولناکی ہے۔ اس پُر آشوب زمانہ میں تہذیب اور تعلیم کی پیدا کی ہوئی بہت سی روایتیں اور قدریں ختم ہو گئی ہیں۔ انکی تجدید کے لئے سازگار ماحول اب تک انسانیت کو میسر نہ آیا یہ تو ساری دُنیا کا حال ہے۔ ایک نئے ملک میں جو پچھلے آٹھ سال سے اپنی بقا کے لئے برابر جد و جہد کر رہا ہو یہ منظر زیادہ تاریک معلوم ہوتا ہے۔

ان حالات میں تعلیمی اصلاح کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل کی ضرورت ہے ہمیں محض تعلیم گاہوں کی تعداد ہی نہیں بڑھانا ہے بلکہ اصل کام تو یہ ہے کہ ان میں

۔ید طریقوں سے عمدہ تعلیم کا انتظام کریں۔ یہ تب ممکن ہے جب استادوں کی ٹریننگ بہتر طریقہ سے ہو۔ اسکولوں میں مدرس اور طلبا کی تعداد میں تناسب ہو۔ ہر اسکول کے ساتھ کھیل کا میدان ہو لائبریری اور معمل ہو والدین بچوں کی تربیت میں استاد سے تعاون کریں۔ شعور کی عمر پہ پہنچنے کے بعد طلبا کی ایسی رہنمائی کی جاسکے کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق تعلیم حاصل کریں اور موزوں پیشے کا انتخاب کرسکیں۔ ایسے تعلیمی نظام میں طلبا کے کردار کی تعمیر بہتر طریقہ سے ہوسکے گی۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کام صرف تقریروں اور دعاؤں سے انجام نہیں پاسکتا طلبا کو جتنا زیادہ وقت ساتھ رہنے اور کھیلنے کا ملے گا اتنی ہی ان میں یگانگت بڑھے گی۔ دُنیا میں رہنے کا یہی راز ہے کہ انسان کو دوسروں کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا صحیح ڈھنگ آجائے۔ اس تربیت کے لئے اقامتی درسگاہ خاص طور پر ضروری ہے۔

جامعہ تعلیم ملی کراچی کے پروگرام کو میں اس لحاظ سے قابل قدر سمجھتا ہوں کہ وہ قومی ضرورت اور مقامی حول کے مطابق نئی نسل کے کردار کو سنوارنا چاہتا ہے وہ اپنے نصاب میں علم و عمل میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایک عام درسگاہ اور اقامتی درسگاہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عام اسکول کا طالب علم گھر اسکول اور باہر کی دنیا کی کشمکش سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور اگر ان عناصر میں ہم آہنگی نہ ہو تو ان کی شخصیت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اقامتی درسگاہ میں طالب علم ایسی دنیا میں رہتا ہے جس پر خارجی فضا کا زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا ہمیں ایسی اقامتی درسگاہوں کی ضرورت ہے جن میں ایک طرف تو جسمانی اور ذہنی ترقی کے جدید وسائل ہوں۔ جہاں پڑھنے اور رہنے کے لئے صاف ستھری عمارتیں ہوں اور دوسری طرف زندگی میں بیکار تکلف نہ ہو۔ بلند ارادہ اور سادہ زندگی ہو۔ جامعہ تعلیم ملی اس مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ وزارت تعلیم نے اس کی حتی الامکان مالی مدد کی ہے۔ یہ امر بھی حوصلہ افزا ہے کہ کئی مخیّر اصحاب نے جامعہ کی مالی مدد کی ہے۔ یہ کہنے کی بات نہیں کہ کوئی جمہوری تعلیمی نظام محض حکومت کے وسائل پر نہیں پنپ سکتا۔ ہماری حکومت کے وسائل تو بہت محدود ہیں۔ وہ حکومتیں جو نسبتاً بہت زیادہ امیر ہیں تعلیم کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری نہیں لے سکتیں وہ بھی تعلیمی ٹیکس اور غیر سرکاری عطیات کی مدد سے تعلیم کا کام چلاتی ہیں۔

جامعہ نے اپنی توسیع کا جو منصوبہ بنایا ہے۔ اس کے لئے کافی وسائل کی ضرورت ہے تین سال کی قلیل مدت میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے میری ناچیز رائے میں جامعہ کو ابھی کچھ وقت اپنے اسکولوں کے استحکام پر صرف کرنا چاہیئے۔ بذات خود یہ بڑا کام ہے اور کراچی میں کوئی اقامتی درسگاہ صحیح رفتار پر چل جائے تو یہ بڑی خدمت ہے۔"

"خلوص سدا بہار ہے"

↓

(نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم)

آغا محمد اشرف

ایک تعارف

از مسز سلمیٰ زمن ایم۔ اے پرنسپل سر سید گرلس کالج

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سر سید گرلس کالج میں اوسطاً مہینہ میں ایکبار کسی نہ کسی فاضل ہستی کو مدعو کیا جاتا ہے اور طالبات کی وسعت معلومات کے لئے کسی موضوع خاص پر لکچر کرایا جاتا ہے۔ لکچر سے قبل کالج کی پرنسپل صاحبہ مہمان کا تعارف کراتی ہیں چنانچہ حال ہی میں مذکورہ سلسلہ کا ایک لکچر آغا محمد اشرف صاحب کا ہوا۔ اس موقع پر اُن کے حالات زندگی پر جو روشنی ڈالی گئی درج ذیل کی جاتی ہے مسز زمن ہمارے مخدوم جناب فیاض علی صاحب ایڈوکیٹ جنرل پاکستان کی لائق صاحبزادی ہیں۔ (ایڈیٹر)

آغا محمد اشرف کو جو پہلے دہلوی تھے پھر پاکستانی ہوئے اور اب بین الاقوامی ہوگئے ہیں، علم و ادب کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ اس ضمن میں شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کا جن کے وہ پوتے ہیں نام لینا ہی کافی ہے آغا صاحب دہلی کے حربک کالج سے بی اے۔ اور سنٹ اسٹیفن کالج سے ایم۔ اے کے امتحانات میں اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور اس دوران میں علمی و ادبی انجمنوں کے صدر یا ناظم اور کالج میگزین کے مدیر رہے۔ جب ۱۹۳۶ء میں جب آل انڈیا ریڈیو قائم ہوا تو یہ اس کے اولین عملے میں منتخب ہوگئے۔ شعبۂ تعارفیہ کے انچارج ہونے کے علاوہ انہوں نے کبھی کبھی شوقیہ نشریات میں بھی حصہ لیا اور ان کی آواز لوگوں کو اتنی مرغوب ہوئی کہ اکثر ان سے سننے کا مطالبہ ہونے لگا۔ کومنٹری نشر کرنے میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے چنانچہ اب بھی جبکہ وہ ریڈیو کی دُنیا میں براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے اعزازی طور پر یہ خدمت ان کے سپرد کردی جاتی ہے۔ مثلاً جب پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں شہید ہوئے تو ماتمی جلوس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کے لئے نظر انتخاب انہی پر پڑی۔ آل انڈیا ریڈیو کو خیرباد کہنے کے بعد یہ ڈون اسکول میں لکچرار کے عہدے پر مامور ہوگئے۔

دوسری جنگ عظیم چھڑنے سے کچھ ہی عرصے پہلے سیر دنیا کی نیت کے حکم پر عمل کرنے کیلئے انہوں نے وطن مالوف سے باہر قدم نکالا اور حالات و یحیٰ انگریزوں کی سرزمین کی طرف چل پڑے۔ ان سے کچھ سیکھنے کیلئے بلکہ انہیں سکھانے کیلئے یعنی یہ لندن یونیورسٹی میں اُردو زبان کے پروفیسر مقرر ہوگئے لڑائی چھڑ کر کالج بند ہوئے تو بی۔ بی۔ سی کے ارباب حل و عقد نے انکو غنیمت سمجھ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ اس نشرگاہ سے اُردو پروگرام مرتب کرکے نشر کرنے لگے۔ یہی دوران

میں جنوب مشرقی ایشیا کمان نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ لندن کی بجائے کولمبو میں رہنے لگے۔ لڑائی ختم ہو گئی۔ تو برصغیر پاک و ہند کے محکمہ تعلیم نے ان کو نائب مشیر تعلیمات کا عہدہ پیش کیا چونکہ انہیں وطن سے باہر رہتے کئی سال گزر گئے تھے اسلئے انہوں نے بیرونی دُنیا کو ترک کیا اور پھر دہلی میں آنا دنزل میں رہنے لگے۔ پاکستان بنا تو اسی منصب پر مامور رہے لیکن مہاجرین کے مسئلے نے ایک تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ بحیثیت مہاجرین کو جو وزیر منشریات بھی تھے ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو تحریر و تقریر کی اعلیٰ استعداد رکھتا ہو۔ چنانچہ یہ اُن کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے اور اس منصب کے علاوہ ہر ہفتے ریڈیو پاکستان سے مہاجرین کا پروگرام نشر کرنے لگے جو اتنا دلچسپ اور معلومات افزا ہوتا تھا کہ اکثر لوگ کرکٹ کی کومنٹری کی طرح اسے بھی سننے کیلئے سڑکوں پر جمع ہو جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے" کے مصداق انہوں نے قومی سے بین الاقوامی ہو جانا پسند کیا۔ اقوام متحدہ کو پاکستان میں اپنا مرکز اطلاعات قایم کرنے کے لئے ایسے افسر کی تلاش تھی جو علمی ادبی اور سیاسی اعتبار سے بالغ نظر ہو۔ اس عالمگیر انجمن کو آغا صاحب سے بہتر آدمی نہ مل سکا۔ اور یہ اُس وقت سے اب تک ڈائرکٹر مرکز اطلاعات اقوام متحدہ کی حیثیت سے بین الاقوامی فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں ان پچھلے ۳۰ سال کے عرصے میں آغا صاحب جن موضوعات پر اپنے ماحول سے متعلق خیالات قلمبند کرتے رہے۔ یہ خیالات متعدد رسائل میں سرکیف اشاعت ہونے کے بعد کتابی صورت میں جمع ہیں۔ ان کی تصانیف کے چند نام یہ ہیں:-

"لندن سے آداب عرض"

"دیس سے باہر"

"بچوں کا لندن"

"بچوں کا چڑیا گھر" اور

"مہاجرین کا مسئلہ"

ان مضامین کو پڑھکر ہی آغا صاحب کے ذوق شوق اور شغل و انہماک کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

اقوام متحدہ سے متعلق انہوں نے بہت سے مضامین لکھے اور تقریریں کیں لیکن کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ اس کا صحیح وقت ابھی نہیں آیا ہے۔"

باقیات

حکیم شریف الزماں صاحب شریف اکبرآبادی مرحوم

(جو انتقال سے چند روز پہلے سپرد قلم ہوئیں)

جھکائے سر ہیں گناہوں سے شرمسار آئے
تری جناب میں با چشم اشکبار آئے
گزر خزاں کا چمن میں ہو یا بہار آئے
کوئی بھی شکل ہو سب میں وہ حسن بار آئے
کسی کی شانِ کریمی پہ ناز رکھتے ہیں
کبھی کے رحم و کرم کے اُمیدوار آئے
پر رحمتوں کا ہوا حکم شعاب لیں اُس کو
وہ بے گناہ ہے جو بھی گناہگار آئے

نقد و نظر

عبدالقدوس ہاشمی ندوی
محمد ایوب قادری
انعام علیم برنی

مشاہیر اسلام کوئی بیس بائیس سال پہلے اس نام کی ایک ضخیم کتاب صوفی بکڈپو پنڈی بہاؤالدین سے شائع ہوئی تھی جو علامہ ابن خلکان کی مشہور کتاب "وفیات الاعیان" سے ماخوذ تھی اسکے بعد ایک دوسری کتاب اسی نام کی بنگلور سے طبع ہو کر نکلی جو انگریزی کتاب "بلوصمداش ایمینٹ مسلمان" کا ترجمہ ہے اب اس وقت ایک تیسری کتاب اسی نام کی ہمارے سامنے ہے یہ جامعہ فواد الاول قاہرہ کے پروفیسر تاریخ جناب ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی کتاب اعلام الاسلام کا ترجمہ ہے مولوی محمد ذکریا مائل صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ اور فاضل پروفیسر ڈاکٹر سید معین الحق صاحب سکرٹیری پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی نے بعض ضروری تحشیہ کے ساتھ نہایت عمدہ کتابت وطباعت سے مجلی کر کے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر سید معین الحق صاحب فن تاریخ کے دل دادگان میں صف اول کے آدمی ہیں۔ وسیع مطالعہ اور بالغ نظر کے علاوہ اپنی دھن کے پکے اور اس علم کے دل سے شیدائی ہیں۔ یہ ان ہی کی کوششیں ہیں کہ کراچی کی علم کش فضا میں ایک پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی بھی قائم ہے اور کام کر رہی ہے۔ اس کتاب کو اشاعت کے لئے کیوں انتخاب کیا گیا اس کا قصہ سید صاحب نے اپنے مقدمہ میں یوں لکھا ہے۔

"پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کے موجودہ صدر مسٹر فضل الرحمن اپنی وزارت تعلیم کے زمانہ میں حکومت مصر کی دعوت پر فواد اول یونیورسٹی کی صدسالہ سالگرہ میں شرکت کے لئے قاہرہ گئے تھے، اس موقع پر اور محققین کے علاوہ ان کی ملاقات ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن سے بھی ہوئی جو اس وقت فواد اول یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے فضل الرحمن صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ آیا وہ چند مشاہیر اسلام پر ایک ایسی کتاب لکھنے کے لئے تیار ہیں جو مسلمان نوجوانوں اور خاص کر اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے مفید ہو اور ساتھ ہی معتبر بھی ہو۔ ڈاکٹر حسن نے اس پر سرگرمی سے آمادگی ظاہر کی اور کچھ مدت بعد "اعلام الاسلام" کے نام سے چند مقالات کا مجموعہ مرتب کر کے حکومت پاکستان کو بھیجدیا حکومت نے یہ مسودہ سوسائٹی کو دیا اور خواہش کی کہ سوسائٹی اس کا اردو میں ترجمہ کرائے اور شائع کرے"۔

گویا اشاعت کے لئے اس کتاب کا انتخاب ہسٹوریکل سوسائٹی کا انتخاب نہیں بلکہ حکومت کا انتخاب ہے۔ اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کچھ اچھا انتخاب نہیں۔ نہ یہ کتاب

اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے مفید ہے اور نہ اسے معتبر تاریخی کتاب کہا جا سکتا ہے۔

کتاب کیا ہے؟ کتاب کے ۳۵۳ صفحات میں جلد (۲۹) مشاہیر اسلام کا انتخاب کرکے ان کے حالات بالاختصار لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ۴ صحابہ کرام۔ تین تابعین اور دو تبع تابعین ہیں یہ انتخاب کس اصول پر مبنی ہے معلوم نہیں، نہ ترتیب تاریخی ہے۔ نہ ترتیب فنی۔ نہ اہتمام موضوع کا اصول ملحوظ خاطر ہے، اور نہ شہرت کمال کو اصل قرار دیا گیا ہے۔ نہ حروف تہجی پر ترتیب ہے اور نہ سنین پیدائش ووفات پر حضرت اسامہ بن زیدؓ متوفی ۵۴ھ کا تذکرہ چھٹے نمبر پر ہے اور حضرت سعد بن عبادہؓ متوفی ۱۵ھ کا حال دسویں نمبر پر لکھا گیا ہے۔ اسامہؓ کے بعد حضرت عمار بن یاسر کا ذکر ہے اور حضرت امام حسین کا تیسویں نمبر پر لکھا گیا ہے۔

کتاب میں عبدالرحمٰن الداخل متوفی ۱۷۲ھ کا ذکر ہے لیکن مسلم بن قتیبہ کا مستقل کوئی تذکرہ موجود نہیں طارق بن زیاد کا ذکر کیا گیا ہے لیکن موسیٰ بن نصیر اور محمد بن قاسم کا ذکر ضمناً ولید کے تذکرے میں آ گیا ہے۔ اس طرح کتاب دیکھنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ فاضل مصنف نے انتخاب کا اصول کیا رکھا ہے۔ تذکرہ صرف دس مشاہیر کا بھی اگر لکھا جائے تو کوئی نہ کوئی اصول تو ان دس ناموں کے انتخاب میں بھی کارفرما ہونا چاہیئے۔

مصنف کتاب ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن مصر کے نامور مورخ ہیں، اور یورپین یونیورسٹیوں کی اعلیٰ سندیں حاصل ہونے کی وجہ سے اس امتیاز فاخری سے بہرہ اندوز ہیں جو ہم مشرقیوں پر یورپ کی سیاسی برتری اور ہماری مرعوبیت کی بدولت ہر ایسے شخص کو حاصل ہو جاتی ہے۔ میں نے ان کی کئی کتابیں پڑھی ہیں جن میں سے تاریخ الاسلام السیاسی اور تاریخ النظم المملکۃ الاسلامیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں میں نے ایک زمانہ میں تاریخ الاسلام السیاسی کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا لیکن تقریباً دو سو صفحات تک ترجمہ کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر صاحب قابل تعریف مطالعہ کے آدمی ہیں وہ کافی مواد جمع کرتے ہیں۔ لیکن جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی طرح ہر روایت کو بغیر تنقیح درج کتاب کر دیتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر وہ قصہ کہانیوں کو تاریخی روایت سمجھ لیتے ہیں۔ روایات میں تضاد سے کبھی اپنا وقت صرف نہیں کرتے۔ اور متضاد روایات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

ان سب سے زیادہ ان کی کتابوں میں جو عجیب تر چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخی شواہد کی عدم موجودگی میں وہ بے تکلف اپنے قیاس سے واقعات کی تکمیل کر دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتاب بنی اسرائیل کے افسانوں کی طرح کی ایک چیز بن جاتی ہے۔

تاریخی واقعات کے لئے دنیا میں عام طور پر دو ہی قسم کی شہادتیں قبول کی جاتی ہیں۔

(اول) روایات۔ ان کی تنقیح وتحقیق کے بعد تسلسل سند، درایت، اور امکان عقلی وعادی پر غور کرنے کے بعد انہیں قبول کیا جاتا ہے۔ اور انہیں اولین مقام حاصل ہے۔

دوم۔ آثار۔ دوسرے درجے میں حفریات، تاریخی آثار اور غیر منطوق شہادتیں جن پر محققانہ نظر اسے بھی معلوم ہو جاتا ہے

سکے بعد انہیں ثانوی درجہ پر تاریخی حیثیت عطا کی جاتی ہے۔

اگر کوئی مورخ ان شہادتوں پر تنقیح و تحقیق کی زحمت گوارا نہ کرے، بلکہ امکان عقلی وعادی کو بھی خاطر میں نہ لائے تو اس کی تحریر کو باوجود سلاست و روانی کے افسانہ ہی کہا جائے گا۔ تاریخ کا مقام دینا شاید ممکن نہ ہوگا۔

ڈاکٹر حسن ابراہیم کی یہ کتاب بھی اسی طرح کی ہے، ادارۂ ہسٹوریکل سوسائٹی کو کئی مقام پر فٹ نوٹ میں اصل مصنف سے اختلاف ظاہر کرنا پڑا ہے۔ مثلاً

صفحہ ۱۲ پر مصنف نے حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت غلط لکھدی، اور ادارہ نے اس کی حاشیہ میں تصحیح کی ہے

صفحہ ۲۰ پر موتیوں کی مالا جو ابو رافع نے اپنی لڑکی کو پہنایا تھا، مصنف نے اسے حضرت علیؓ کی صاحبزادی کو پہنا دیا۔ اس کی حاشیہ پر ادارہ نے تصحیح کی ہے۔

صفحہ ۹۹ پر مسجد قبا کی تعمیر عمار بن یاسر کی طرف منسوب کردی، ادارہ نے اس کی تصحیح کردی کہ اس کی بنیاد خود رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔

صفحہ ۷۰ پر عمارؓ و عثمانؓ کا پورا قصہ نہ معلوم کہاں سے نقل کردیا۔ ادارہ کو حاشیہ پر اس کی تغلیط کرنی پڑی۔

صفحہ ۱۰۰ پر اسکندریہ سے دارالحکومت کی منتقلی کی وجہ یہ بتا دی کہ عرب ایک بحری قوم نہ تھے، اس سے حاشیہ پر ادارہ نے بجا طور پر اختلاف کیا ہے۔ اس وجہ یہ نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ حضرت عمرو بن العاص کے نزدیک جبل مقطم کا دامن فوجی نقطۂ نظر سے محفوظ تر مقام تھا۔

صفحہ ۲۵۳ پر حضرت حسن کو حضرت حسین سے ایک سال دس ماہ بڑا قرار دیدیا، اسے ادارہ کو حاشیہ پر تصحیح کرنی پڑی کہ وہ گیارہ ماہ بڑے تھے۔ اور یہی صحیح ہے۔

صفحہ ۲۷۰ میں مہلب بن ابی صفرہ کو ۸۰ اور تک پہنچایا اور ادارہ کو اس سے بجا طور پر اختلاف کرنا پڑا کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے۔

اسی طرح بیسیوں خرافات کو فاضل مصنف نے بے تکلف تاریخ بنا کر پیش کردیا ہے۔ جس کی کہیں کہیں ادارہ نے حاشیہ پر تصحیح کردی ہے لیکن ان کے علاوہ مصنف نے معمولی طور پر متضاد روایتوں کے معاملہ میں بے اعتنائی سے کام لیا ہے ان کی ایک دو مثالوں کو دیکھ لیجئے۔

صفحہ ۲۷۹ (تذکرہ عبداللہ بن زبیر)

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانب مدینہ ہجرت فرمائی تو حضرت اسماء بھی جو حاملہ تھیں مہاجرین کے ساتھ یثرب روانہ ہوئیں۔ یثرب کے قریب قبا میں پہنچیں تو عبداللہ بن زبیر کی ولادت ہوئی۔"

صفحہ ۴۴۔ "جب عبداللہ بن زبیر نے عمر کے سترھویں سال میں قدم رکھا تو ان کے باپ انہیں آنحضرتؐ کی خدمت میں لے گئے تاکہ یہ حضور سے بیعت ہوں حضور نے انہیں آتے دیکھکر تبسم فرمایا اور ان سے بیعت لی۔"

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صرف دس سال زندہ رہے اور گیارھویں سال ربیع الاول میں وفات پا گئے تھے تو سلسلہ میں پیدا ہونے والے عبداللہ بن زبیر

اپنے تیرھویں سال میں رسول اللہ کی خدمت میں کیسے پہونچ گئے کیونکہ عالم شہادت کی تو یہ بات ہو نہیں سکتی، اور عالم برزخ سے مورخ کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

صفحہ ۲۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولادت واقعہ فیل کے چھ سال بعد ہوئی ایک روایت میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ کی ولادت کے پانچویں سال پیدا ہوئے

صفحہ ۲۴ جس وقت حضرت عثمان نے حضرت ابو بکر کی تبلیغ سے نزولِ وحی کے بعد ایمان قبول کیا اس وقت ان کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر تو چالیس سال سے کسی قدر زائد ہو تو ان سے پانچ سال بعد پیدا ہونے والے حضرت عثمانؓ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہونے پائے۔ یہ پندرہ سولہ سال بیچ کے کہاں گم ہو گئے؟

صفحہ ۳۔ "حضرت علی کی ولادت حضور کی بعثت سے دس سال پہلے ہوئی"

صفحہ ۳۔ "جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے پاس اپنا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ لوگوں کو جنت کی بشارت دیں۔ ان کی رہبری فرمائیں اور نافرمانی کی صورت میں عذاب سے ڈرائیں تو حضرت علی ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس نورِ الٰہی سے فیض پایا، ان کا سینہ اس دعوتِ کریمہ کی بدولت روشن ہو گیا حالانکہ اس وقت ان کی عمر کا صرف تیرھواں سال تھا۔

ذرا ان دونوں عبارتوں میں تطابق تو پیدا کیجئے،
بعثتِ نبوی سے دس سال پہلے حضرت علی پیدا ہوئے
بعثت کے بعد سب سے پہلے شخص حضرت علیؓ ہی ایمان لائے
حضرت علی کی عمر کا اس وقت تیرھواں سال تھا، گویا
نزولِ وحی کے بعد سے تین سال ایسے گذرے کہ جس
میں حضرت علی مسلمان ہوئے اور نہ کوئی دوسرا آدمی، نہ
حضرت خدیجہؓ نہ حضرت ابو بکر اور نہ زید۔

کیا اس طرح کی باتیں تاریخ کی کسی کتاب میں آپنے پڑھی ہیں!

یہ صرف چند مثالیں ہیں، ساری کتاب اسی طرح کے متضاد بیانات اور افسانوں سے بھری پڑی ہے۔ اور نہ صرف یہ کتاب بلکہ فاضل مصنف کی دوسری کتابیں بھی اسی "شان یکتائی" کی حامل ہیں۔

ترجمہ اچھا خاصا ہے۔ کتابت و طباعت کا کیا کہنا ادارے نے ذیلی حواشی بھی کافی محنت سے لگائے ہیں، لیکن بقول سعدی شیرازی:

هیچ صیقل نمی تواند کرد
آہنے را کہ بد گہر باشد

ہمارا مشورہ ہے کہ پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کسی اصرار اور کسی خاطرداری کی وجہ سے کوئی ایسی چیز کبھی شائع کرے جو اس کے نام و مقام سے گری ہوئی چیز ہو، ادارہ کی شہرت کو اس سے بڑا نقصان پہونچتا ہے، اور عام لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بڑے بڑے قدیم اداروں کے لئے ایسی کتابیں بدنامی کا سبب بن چکی ہیں، مثال کے طور پر اردو زبان کی قدیم انجمن انجمن ترقی اردو کو لیجئے، ڈاکٹر

ہی کی شہرۂ آفاق کتاب مختصر تاریخ عرب کا ترجمہ انجمن کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر ہٹی کی کتاب اعلیٰ درجہ کی تاریخی کتاب ہے لیکن چونکہ معیار تحقیق بہت پست ہے یہاں تک ہٹی صاحب نے الاغانی کی کہانیوں کو تاریخی روایات قرار دے کر درج کر دیا ہے اس لئے اہل علم نے اس کتاب کی اشاعت کو انجمن کا کوئی اچھا کارنامہ قرار نہیں دیا۔

پاکستانی ہسٹوریکل سوسائٹی ایک بہت ہی مفید ادارہ ہے، اور خوش قسمتی سے بہت ہی اچھے صاحب ذوق سکریٹری کے ہاتھوں میں ہے، اس سے ہم صرف اعلیٰ درجہ کی مطبوعات کی امید رکھتے ہیں۔

کتاب کی قیمت پانچ روپیہ ہے جو کسی طرح زائد نہیں پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی ۳۰ نیو کراچی کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی سے مل سکتی ہے۔

(سید عبد القدوس ہاشمی ندوی)

تاریخ ملت عربی جلد اول

مصنفہ پروفیسر فلپ ہٹی مترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ حجم ۵۰۴ صفحات۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے۔

"ہسٹری آف دی عربز" کا نامور مصنف پروفیسر فلپ ہٹی زمانہ حاضرہ کا مشہور مستشرق ہے اور لبنان (شام) کے مسیحی خاندان کا فرد ہے امریکہ میں توطن اختیار کر لیا ہے اور آج کل پرنسٹن یونیورسٹی (PRINCITON UNIVERSITY) امریکہ میں اسلامک اسٹڈیز کا پروفیسر ہے ۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان کے دورہ پر آیا تھا اور کراچی یونیورسٹی میں چند لیکچر بھی ہوئے تھے۔ اس نے عربوں سے متعلق ایک مفصل تاریخ انگریزی میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع کی جو بہت مقبول ہوئی اور چودہ سال کے عرصہ میں یعنی ۱۹۵۱ء تک پانچ مرتبہ ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر یورپ اور اسلامی ممالک میں شائع ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے عربی میں خود مصنف کی نگرانی میں ترجمہ ہوا۔ اردو میں سب سے اول ندوۃ المصنفین (دہلی) نے اس کتاب کا خلاصہ پیش کیا۔ اب انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے اس تاریخی سرمایہ کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ کل کتاب دو جلدوں میں ترجمہ ہوگی۔ پہلی جلد پیش نظر ہے جس کے فاضل مترجم سید ہاشمی فرید آبادی ایم۔ اے ہیں۔

مصنف نے اپنی کتاب کی تیاری میں خاص طور سے عربی ماخذات اور انگریزی مواد کو پیش نظر رکھا ہے۔ پہلی جلد (۲۶) ابواب پر مشتمل ہے کتاب کے اول سات ابواب میں اسلام کے قبل کی عرب کی حالت دکھائی ہے جس میں عربی نسل، عرب کی جغرافیائی حالت۔ بدوی زندگی، عربوں کے قدیم بین الاقوامی تعلقات، شمالی جنوبی اور وسطی عرب کی ریاستوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ۹ ابواب میں زمانہ رسالت اور خلافت راشدہ کا مفصل ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں ۶ ابواب میں اموی خلافت اور ۴ ابواب میں خلافت عباسیہ کا بیان ہے۔

مصنف نے بڑی مناسبت اور چابکدستی سے واقعات ترتیب دیئے ہیں کہیں کہیں عربوں کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرتی و سماجی زندگی کا نقشہ بڑی وضاحت سے کھینچا ہے اور عباسی سلطنت کے ذیل میں علوم و فنون کی ترقی، تعمیرات مصوری و موسیقی، غیر اقوام سے تعلقات تنظیم عدالت صنعت و حرفت نیز اور بہت سے شعبوں سے متعلق بڑی کارآمد معلومات

پیش کی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کے متعلق بڑی تفصیل اور دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ ان کی مثالی حکمرانی تھی اور وہ تدبر و تنظیم، ضبط و نظم، تحمل و بردباری، اصابت رائے و سیاست کے اعلیٰ صفات سے متصف تھے۔ اور کتاب کا یہ حصہ نہایت خاص ہے غالباً یہی سبب ہے کہ عربی ممالک میں اس کتاب کو داخل نصاب کیا گیا۔

مذکرہ بالا خوبیوں کے ساتھ ساتھ افسوس کی بات یہ کہ مصنف کی متعصبانہ ذہنیت ہر جگہ کارفرما رہی ہے۔ چنانچہ اکثر واقعات مسخ شدہ اور غلط صورت میں پیش کیے گئے ہیں جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ مصنف نے عربی ترجمہ میں ان چیزوں کو حذف کر دیا ہے (مقدمہ کتاب ہذا) پروفیسر فلپ ہٹی نے دوسرے مغربی مصنفین کی طرح قرآن کریم کو بشری تصنیف قرار دیا ہے۔ بعض آیات قرآنی کی توریت و انجیل کی آیات سے مطابقت کر کے یہ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے کہ ان خیالات کی اصل توریت و انجیل میں ہے اور یہی قرآن کریم کے ماخذات رہے ہیں۔ اس طرح عقائد کے باب میں وہ اسلام کے معتقدات کو عیسائیوں یا یہودیوں کے عقائد کی ایک مسخ شدہ صورت بتاتا ہے مثال کے طور پر اس نے واقعہ معراج کو بھی اسرائیلیات کے عقائد سے وابستہ کر کے اپنی متعصبانہ ذہنیت کا اظہار کیا ہے۔

مصنف نے بنو عباسی حکمرانوں کے سلسلے میں بڑی زیادتی سے کام لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ سب ہر وقت شراب کے نشے میں مست، عیش کوشی میں مدہوش اور ناچ و دوسری لہو لعب میں مبتلا رہتے تھے۔ اور اس طرح اسلام کے مثالی زہد و تقویٰ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے مصنف نے سکینہ بنت حسین رض کے متعلق بڑی بیہودہ اور بدنما [illegible] اور خیانت سے کام لیا ہے [illegible] ان کو نہ صرف ناچ گانے کی شوقین اور عیش پرست دکھایا ہے بلکہ ثابت کیا ہے کہ ان کے اردگرد بھانڈ، نقال، گویّے، ناچ و گانے کے استاد ہر وقت جمع رہتے تھے، اور اس طرح سکینہ بنت حسین رض کو بیسویں صدی کی ایک فیشن ایبل کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔

بڑی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ کتاب الاغانی پر بھروسہ کر کے مصنف نے اپنی کتاب کو دروغ، بے بنیاد اور فرضی واقعات سے رونق دی ہے اور بعض جگہ تو مصنف نے "الف لیلہ" سے بھی سند لینے کی کوشش کی ہے اور اس طرح دلائل و براہین کی عمارت کو کمزور کیا ہے نیز کتاب کی وقعت کم کر دی ہے۔ دراصل مغربی مصنفین و مورخین جب اسلامی تاریخ یا مسلمانوں سے متعلق کوئی تصنیف و تالیف کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر ایک "خاص منصوبہ و تعصب" ہوتا ہے چنانچہ اس مقصد کے تحت واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ کہ اس کلیہ سے پروفیسر ہٹی کی یہ کتاب بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ عجیب بات ہے کہ پروفیسر ہٹی نے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو فرقہ مرجیہ کا نامی گرامی نمائندہ قرار دیا ہے۔ اس تحقیق و جستجو کی جتنی قدر و داد دی جائے وہ کم ہے۔

فاضل مترجم سید ہاشمی فرید آبادی ایم اے کی مساعی جمیلہ قابل صد ستائش ہیں کہ انہوں نے نہ صرف کتاب کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہے بلکہ اکثر غلط و مسخ شدہ واقعات و الزامات کی حاشیہ میں وضاحت کر دی ہے اور مصنف کی اکثر تاریخی کوتاہیوں اور بدنیتی کو آشکارا کیا ہے اور اس طرح کتاب کی افادیت بڑھا دی ہے۔ مصنف نے زمانہ جاہلیت وغیرہ کے جن عربی اشعار کا حوالہ یا ترجمہ دیا ہے فاضل مترجم نے

[illegible] شامل کر دیا دوسرے مصنفات کی مدد سے تلاش کر کے
[illegible] میں شامل کر دیا ہے۔ ان اشعار کی تلاش میں مترجم کو قاضی
[illegible] میاں اختر جونا گڑھی مرحوم سے خصوصی مدد ملی ہے جس کا
[illegible] اعتراف کیا ہے۔ غرض اس کتاب سے تاریخ اسلام کے
طلبا کو خاص طور سے مدد ملے گی اُمید کہ انجمن ترقی اُردو پاکستان
[illegible] دوم جلد سے جلد شائع کرے گی۔

یادِ رفتگاں | از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم حجم ۵۲۰ صفحات۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

شائع کردہ مکتبۃ الشرق۔ نزد مسجد باب الاسلام آرام باغ
[illegible] یادِ رفتگاں اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو علامہ سید
سلیمان ندوی مرحوم نے پچھلے پچیس سال مختلف شخصیتوں کے سانحۂ
ارتحال سے متاثر ہو کر سپردِ قلم کئے اور "معارف" میں وقتاً فوقتاً
شائع ہوئے۔ کتاب ۱۳۵ حضرات کے ذکر پر مشتمل ہے جنہیں
مختلف مذاہب۔ مسالک، گروہ اور خیالات کے نمائندے
موجود ہیں۔ اپنے بھی ہیں اور غیر بھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
علامہ مرحوم کا دل محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ مرحوم
کی وسعتِ قلب کی داد دینی پڑے گی کہ ان لوگوں کے لئے
بھی اظہارِ تاسف و ہمدردی کیا جو تحریکِ ندوہ کے سخت مخالف
رہے خصوصاً علمائے بدایوں و بریلی اس سلسلے میں پیش پیش
تھے مگر علامہ مرحوم نے مولوی عبدالماجد بدایونی کی وفات پر
جن تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ان کی وسعت نظر فراخدلی
اور اخلاقِ عالیہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ مرحوم جس شخصیت
اور اس کے کارناموں سے جس حد تک متاثر ہوئے ہیں ان تاثرات
کو اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا ہے یہ قلم سلیمانی کا اعجاز ہے
کہ [illegible] موت کا مرثیہ، حسرت و یاس کے تاثرات، غم و اندوہ
کا اظہار اور ماتم و تاسف کا اظہار بار بار کیا گیا ہے مگر کیا مجال
کہ تکرار و توارد کی کیفیت پیدا ہو۔ زبان و طرزِ تحریر سلیس دلی
اور متاثر کن ہے بلکہ مستغنی عن التوصیف۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جس شخصیت (علامہ شبیر احمد عثمانی)
کے قریب علامہ مرحوم کی آخری آرام گاہ ہے اسی کے حالات
سب سے زیادہ ضخیم ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کتاب سے برصغیر
پاک و ہند کی بعض سیاسی، مذہبی علمی اور تعلیمی اداروں اور
شخصیتوں کے متعلق بعض بالکل نئی معلومات ہوتی ہیں خصوصاً
تحریکِ ندوہ کا اس میں پورا تاریخی خاکہ موجود ہے۔

اُردو ادب میں شخصیت نویسی بالکل ابتدائی منازل
میں ہے علامہ مرحوم کی اس کتاب کے ذریعہ ادب شخصیت نویسی
میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔

کتاب کی ان صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ
مکتبۃ الشرق سے یہ شکایت ضرور ہے کہ اس میں کتابت کی
غیر معمولی غلطیاں ہیں جو "ندوہ" سے منسوب ادارہ کے شایانِ
شان نہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پروف پڑھنے تک کی
زحمت گوارا نہیں کی گئی ہے۔ جلی سرخیوں کے ساتھ ساتھ خفی
قلم کی بھی گلکاریاں ہیں۔ نقطوں، علامات، دائروں اور نشانات
کی مطلق تصحیح نہیں ہوئی ہے۔ نہ صرف بعض بعض صفحے میں کئی
کئی غلطیاں بلکہ بعض بعض سطر میں کئی کئی غلطیاں ہیں۔ کسی
کسی سطر میں بعض الفاظ بھی رہ گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳
سطر ۱۷، صفحہ ۲۲۶ سطر ۹، صفحہ ۳۴۰ سطر ۸) مولانا معین الدین
اجمیری کے مفصل حالات صفحہ ۲۲۶ کے بعد ہونے چاہئے تھے کہ
بالکل آخر میں اضل بے جوڑ اضافہ کیا گیا ہے بعض جگہ فٹ نوٹ
کی ضرورت تھی مثلاً علامہ مرحوم نے مولانا شاہ ولی اللہ امرتسری

کی صحیح تاریخ وفات اصروں کے نہ معلوم ہونے کا افسوس کیا ہے ضرورت تھی کہ مولانا امرتسری کی صحیح تاریخ وفات ۱۵ر مارچ ۱۹۴۸ء وزدو شنبہ بوقت ۱۰ بجے حاشیہ میں درج کی جاتی ہے۔

کتابت کی غلطیوں کی ایک مختصر ترین فہرست صحت درج کی جاتی ہے:-

غلط	صفحہ	صحیح
۶ر جولائی ۱۳۴۱ء	صفحہ ۶	(۶ر جولائی ۱۹۳۱ء)
جون ۱۹۵ء	۱۳۶ "	(۱۹۰۵ء)
معترقانہ	۱۳۶ "	(معترفانہ)
سرائے امیر	۱۲۸ "	(سرائے میر)
دارالکلیل	۱۴۱ "	(دارالتکمیل)
غیر معلوی	۱۹۲ "	(غیر معمولی)
جُبّ	۱۹۳ "	(جبہ)
گلے	۱۹۳ "	(گلے)
تذکرہ کاملین رامپور	۱۷۵ "	(تذکرہ کاملانِ رامپور)
عمارت	۱۷۷ "	(امارت)
اللور	۱۸۳ "	(النور)
یولی	۲۱۲ "	(یو۔پی)
کوشالے	۲۲۵ "	(کوٹ)
رجمتہ اللہ لعل ہند	۲۲۶ "	(جمعیتہ العلماء ہند)
یونیوکمشنر	۲۸۷ "	(ریونیو کمشنر)
کونسل	۴۳۲ "	(قونصل)
عبدالحلیم صدیقی	۴۴۱ "	(عبدالعلیم صدیقی)
داستانشد	۵۱۴ "	(درستانشد)

مگر ناموں کی فہرست حروف ابجد کے اعتبار سے مرتب کی جاتی تو مناسب تھا۔ امید کہ آئندہ اڈیشن میں کتابت کی صحت کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائے گا۔

(محمد ایوب قادری)

تذکرۂ شعرا | مصنفہ ابن امین اللہ طوفان مرتبہ قاضی عبدالودود مطبوعہ آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ ۴ قیمت درج نہیں ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مجہول الاسم اور مجہول المصنف قلمی تذکرہ کو مرتب کرکے اپنے حواشی اور ملحقاتِ حواشی کے ہمراہ شائع کیا ہے۔ مرتب کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۴۳ھ اور ۱۲۵۱ھ کے درمیان لکھا گیا اور بقول مرتب "تذکرہ جس کا کوئی نام مصنف نے نہیں رکھا، کسی کتاب کا ضمیمہ معلوم ہوتا ہے"

تذکرہ اہم شعرا کے متعلق مختصر معلومات اور مختصر نمونہ کلام مجموعہ ہے۔ نمونہ کلام دواوین یا بیاضوں سے منتخب نہیں کیا گیا ہے بلکہ جو اشعار مصنف کے حافظہ میں محفوظ تھے ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ حالات بہت مختصر ہیں تاہم بعض ایسے امور بھی قلمبند ہو گئے ہیں جو قارئین کے لئے دلچسپ اور اضافہ معلومات کا باعث ہوسکتے ہیں۔ مثلاً شیخ امام بخش ناسخ کو حضرت شیخ امام بخش عبداللہ ناسخ لکھا گیا ہے۔ شیخ صاحب کے نام کے ساتھ عبداللہ کا اضافہ ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اضافہ کو ہم کسی سہو پر مبنی نہیں کہہ سکتے کیونکہ مصنف نے متعدد جگہ اس اضافہ کو استعمال کیا ہے اور اگر مرتب کا خیال صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں ہے کہ یہ تذکرہ ابن امین اللہ طوفان کے لڑکے یعنی رحمی صاحب کے کسی بھائی کا لکھا ہوا ہے تو لفظ عبداللہ کے اضافہ کو بھی بہو

ل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ رمزی صاحب کے والد
ین الدطرفان) کے شیخ صاحب سے تعلقات خصوصی تھے جیسا
ابتدائیات میں رمزی صاحب کے بیان سے ظاہر ہے۔ اسی طرح
مصنف نے اپنے استاد مولوی غلام یٰسین خاں المتخلص بہ
ان کا حال مع انتخاب کلام درج کیا ہے جو بقول مرتب
کسی اور تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔"

مرتب نے تذکرہ سے قبل شعرا کی ایک فہرست ترتیب
دی ہے اور ہر شاعر کے ساتھ ان صفحات کتاب کو ظاہر کیا ہے
جہاں جہاں کسی سلسلہ میں اس شاعر کا نام آیا ہے۔ قارئین کے
لئے یہ سہولت ابھی اردو کی کتب میں بہت کم دیکھنے میں آئی
ہے۔ فہرست کے بعد مخففات کی ایک فہرست دی گئی ہے
جو مرتب نے حواشی اور ملحقات حواشی میں استعمال کئے ہیں
اس کے بعد ایک مقدمہ ہے جس میں مصنف کے اور تذکرے
کی تاریخ تحریر اور افادیت کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ آخر میں
حواشی، ملحقات حواشی، ملحقات متن کے عنوان سے تین باب
ہیں جن کو کتاب کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے۔ ان میں مرتب نے ہر
شاعر کے متعلق ان معلومات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو
مختلف تذکروں اور تاریخ سوانحات اودھ اور تاریخ محتشم خانی
کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔ ان حواشی میں فراہم شدہ
معلومات دلچسپ اور اہم ہیں مگر مرتب نے ان معلومات
کو یکجا کرنے میں قارئین کی سہولت کا خیال نہیں کیا ہے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف ورق
سے جو یادداشتیں لکھی ہیں جوں کی توں حواشی کی صورت میں شائع
کر دی ہیں اور ان حواشی پر نمبر ڈال دیئے ہیں۔ ملحقات حواشی میں
جو نمبر دیئے گئے ہیں وہ حواشی سے متعلق ہیں۔ ان الجھنوں کو سمجھے

دو بار بار متن تذکرہ کی طرف رجوع کرنے کے لئے تذکرہ نگار ق
گل اٹھے پلٹنے سے قاری کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور
ان پر بہت بار پڑتا ہے۔ بعض جگہ اظہار خیال کے لئے محض اشارہ
سے کام لیا گیا ہے جس کی وجہ سے عبارت بے ربط ہو گئی ہے
ایک باب مفردات وطرق استعمال کے عنوان سے بھی بطور ضمیمہ دیا
گیا ہے جس میں تذکرہ کے اشعار میں مستعمل محاورہ اور مفرد الفاظ
درج کئے گئے ہیں۔ "طرق استعمال" کے لئے شعر کی طرف رجوع کرنا
پڑتا ہے۔

سب سے آخر میں ایک غلط نامہ دیا گیا ہے۔
بحیثیت مجموعی مرتب کی کاوش اور تحقیق قابل داد ہے

پیام ساوتری

مصنف جگر بریلوی
ناشر دانش محل امین آباد لکھنؤ قیمت عہ/

زیر نظر کتاب میں ہندو علم الاصنام کے ایک مشہور قصہ
کو اردو مثنوی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ قصہ کا موضوع ہندو
عورت کے علو اخلاق کا اظہار ہے جس سے عورت کے کردار کا وہ
مخصوص پہلو نمایاں ہوتا ہے جو تخلیق عالم کا مقصد ہے۔

کتاب کا انتساب مصنف نے اپنی اہلیہ شریمتی جیودیوی
کے نام سے کیا ہے۔ حالات مصنف خود نوشت ہیں۔ ایک
باب میں ساوتری کے پیام کی وضاحت کی گئی ہے اور مثنوی
زیر نظر کی "شان نزول" کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب پر مقدمہ مصنف
کی صاحبزادی شریمتی کماری دیوی ورما نے لکھا ہے کیونکہ انہیں
کے الفاظ میں "یہ موضوع عورتوں سے مناسبت رکھتا ہے
اس لئے اس کی اچھائی یا برائی کے متعلق ایک عورت زیادہ
صحت کے ساتھ رائے قائم کر سکتی ہے"

مقدمہ نگار کے قول کے مطابق مثنوی کا موضوع پیام

ایک افسانہ ہے جس کا انجام موت پرستی دھرم کی فتح ہے یہ افسانہ بجائے خود نہایت بلند معاشرتی پہلو لئے ہوئے ہے لیکن اس کے پردے میں محترم مصنف نے جو پریم بھگتی، کرم (عمل) دشواش اور شردھا کا سبق دیا ہے وہ عجیب و غریب چیز ہے اور بقول مصنف یہ فسانہ ؎

مانا کہ مجاز کی ہے روداد
لیکن ہے حقیقت اس کی بنیاد

مثنوی میں حسن فطرت کے دلکش مناظر جابجا ہیں اور بہی مواقع ایسے ہیں جہاں شاعر کا زور بیان خاص طور پر نمایاں ہوا۔

تڑکے کا سماں وہ عالم نور — بکھرا ہوا دور تک وہ کافور
موتی بکھرے ہوئے پڑے ہیں — ہیرے ابھرے ہوئے جڑے ہیں
شاداب ہیں کیا پہاڑ کیا بن — پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں دامن
اشجار ہیں کونپلیں نئی ہیں — دھانی عنابی، کتھئی ہیں
پھولوں سے لدی ہوئی ہر ڈالی — جیسے گہنوں سے حسن والی
پھولی ہے شفق کھلا ہے ٹیسو — کیا آگ سی لگ رہی ہے ہر سو
چھائی ہے کریل کی طرح لالہ — چنری اوڑھے ہے یا کوئی نار

جھیلوں میں کنول ہیں جلوہ افگن — پانی میں ہے بہار گلشن
رنگین کنول ہیں خال جیسے — کالے بھونرے ہیں خال جیسے
کرنوں سے جھلک رہا ہے پانی — چاندی سا دمک رہا ہے پانی
رنگین بطیں کر رہی ہیں کلیاں — دھل دھل کے چمکتے ہیں پر و بال
جھیلوں کی فضا میں وہ اثر ہے — ٹھنڈا ہے جگر دماغ تر ہے

کلیوں کا چٹک چٹک کے کھلنا — شاخوں کا لچک لچک کے ہلنا
سبزہ کا لہکنا لہلہانا — چڑیوں کا چہکنا چہچہانا
جو پھول ہے عطر میں بسا ہے — مہکی ہوئی دور تک ہوا ہے
کیا یہ سماں ہے پیارا پیارا — کیف آور و دلکشا دل آرا
یہ جوش یہ اضطرار کیا ہے — کوئی خُم سے چھلک رہا ہے
تاثیر شراب ہے ہوا میں — تائید شباب ہے ہوا میں

ساوتری اپنا بر انتخاب کرنے کے لئے سفر کرتی ہے اور ایک رشی کے لڑکے ستیہ وان سے عہد الفت استوار کر کے باپ کے پاس واپس آتی ہے مگر نارد منی جی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ

اک سال کے بعد آج کے دن — مر جائے گا ستیہ وان کمسن

ضعیف العمر باپ مایوسی کے عالم میں اپنی لخت جگر ساوتری کو دوسرے انتخاب کا مشورہ دیتا ہے یہ مرحلہ ایسا سخت تھا کہ

بحث آ پڑی غیرت وفا میں — اور باپ کے حکم ناروا میں

ساوتری اس موقع پر

گویا ہوئی یوں نہ ہو کے مجبور — ارشاد یہ راستی سے ہے دور
مذہب ہے رواج و رسم سے دور — زنہار نہیں یہ مجھ کو منظور
وہ زر ہو کہ قول ہو کہ دختر — واپس لیتا ہے کوئی دیگر
دیکھا جب انہیں سمجھ کے شوہر — رشتہ مرا ہو چکا مقرر
رشتہ ہے یہ میری جان کے ساتھ — میں بک چکی ستیہ وان کے ساتھ
یہ عہد ہے دل لگی نہیں ہے — آئین وفا ہنسی نہیں ہے
ہے دین قدیم کا یہ حاصل — ہم رنگ رہے زبان، عمل، دل
ایماں ہے مرا وفا پرستی — منظور نہیں ہوا پرستی
ممکن نہیں اب یہ عہد ٹوٹے — ممکن نہیں ان سے رشتہ چھوٹے
ممکن نہیں اور کا خیال آئے — ممکن نہیں رنگ دل بدل جائے
کیا غم ہے نصیب اگر برا ہے — ایمان کے آگے جان کیا ہے
بیاہوں گی کسی کو تو انہیں کو — عمران کی زیادہ ہو کہ کم ہو

سب بول اٹھے حسن کے فریں ہے   "سچ ہے کوئی اس میں شک نہیں ہے"

ساوتری کی جیت ہو گئی اور وفا پرستی سے ضعیف العمر باپ کا متاثر ہونا قدرتی تھا۔ اس لئے

نا جانے کہا کہ حق ہے گفتار   انکار ہے کس کو اس سے انکار
شوہر ترا ستیہ وان ہو گا   معبود نگاہبان ہو گا

ضعیف العمر باپ کے روبرو ساوتری کا زورِ بیان قابل ملاحظہ ہے۔

ساوتری کے باپ راجہ اشوپت لڑکی کی شادی کا پیغام لے کر ستیہ وان کے باپ کے پاس جاتے ہیں ستیہ وان کا باپ یہ خوشخبری پا کر

سجدے میں گرا نکل پڑے اشک   چشمے کی طرح ابل پڑے اشک
معبود سے محو التجا تھا   دل ہی دل میں یہ کہہ رہا تھا
مجھ پر یہ ترا کرم خدایا   اُستاد کو شادماں بنایا
ایک جنس تھا میں فضول و بیکار   کب تیرے کرم کا تھا سزاوار
کیا کیا نہ کئے گناہ میں نے   کی فردِ عمل سیاہ میں نے
مردودِ جہاں بھر میں تھا میں   دُنیا ہی کا تھا نہ دین کا میں
گذری ہے تمام عمر برباد   دل سے نہ کیا کبھی تجھے یاد
داغِ دلِ کائنات تھا میں   کب قابلِ التفات تھا میں
ہوتی یہ سزا مرے لئے کم   دیتا تو اگر مجھے جہنم
مجھ پر یہ کرم! یہ مہربانی   سچ ہے نہیں کوئی تیرا ثانی

اس کے بعد وہ اپنی بے بضاعتی کا ذکر زبان پر لاتا ہے۔

ذی جاہ ہیں ذی وقار ہیں آپ   سلطان ہیں شہریار ہیں آپ
مجھ سے نہ بن آئیگی کوئی بات   کیا نذر نیاز کیا مدارات

ان الفاظ کو سن کر راجہ اشوپت آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور کہہ کر ستیہ وان کے باپ کی تسلی کرتے ہیں کہ۔

کیوں کرتے ہیں آپ مجھ کو محجوب   ہے دولت و مال کس کو مطلوب
ہے مال و منال چند روزہ   ہے جاہ و جلال چند روزہ
دُنیا کا یہ امتیاز کب تک   سامان غرور و ناز کب تک
تا چند نشاط و شادمانی   تا چند حیات و کامرانی
مقبولِ خدا وہ زندگی ہے   جو صرفِ نیاز و بندگی ہے
دولت وہ جو باعثِ بقا ہو   دولت وہ جو نقد دیرپا ہو

مثنوی میں ایسے مقامات بھی جا بجا ملتے ہیں جن کو "ہمہ انگشتہا یکدست نیست" کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے

طفلی کا تھا کائنات کا دَور   جو طور تھا سادگی کا تھا طور

تھا مثلِ پدر شفیق راجا   بچوں کی بمنزلہ رعایا

کیا پھول ہیں سرخ رنگ گلنار   توتے کی نکیلی جیسے منقار

نقارہ سا ہر طرف بجایا   شادی کا جلوس اک سجایا

اس آزاد شاعری کے دور میں عروض اور قواعد کی جکڑ بندیوں کا ذکر شاید بے محل ہو۔ ذیل کے اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے بعض اشعار میں کاتبوں کی لا واپی اصلاح کو بھی دخل ہو۔

عالم تھا وہ عالمِ پُر اسرار   مرعوب فضا خموش سنسار

پھولوں کی مثال رہتے تھے لوگ   سو سو کر جان کھوتے تھے لوگ

بھیگا تا کہ اشکبار کیوں ہو   مضطر کیوں ؟ بے قرار کیوں ہو؟

کھاتے ہیں کچھ تو جنگلی پھل   پیتے ہیں کچھ تو چشمے کا جل

جب یوں ہوئی انکے دلکو تسکین   دیوی دُنیا کے سمت چل دیں

لڑکی تھی کوئی وہ مہ پارہ   یا ٹوٹ گرا تھا اک ستارہ

کلیوں کے چٹکنے میں بھی ہو گیان   چڑیوں کے چہکنے میں بھی ہو گیان
سبزے کے لہکنے میں بھی ہو گیان   پھولوں کے جھکنے میں بھی ہو گیان

اچھا نہیں کرو فر دکھانا   اچھا نہیں اس کا دل دُکھانا

مثنوی میں دو تین مقامات پر غزلوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے گو اس رسم کو بدعت شمار نہ کیا جاسکے تاہم مقطع غزل پر پہنچکر ناو منی جی کے زبان سے

چھوٹے گا جگو نہ تیرا دامن
درماندوں کا آسرا تو ہی ہے

قاری کے ذہن کو ضرور دھچکا لگتا ہے۔ قید زمان و مکان سے اتنی آزادی نہ مستحسن ہے نہ برمحل

(انعام عظیم برنی)

(بسلسلہ صفحہ ۲۳) "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی میں اصلاحات۔ اداروں کا پاکستان میں اجراء" مجھکو یہ مقالہ پڑھنا بھی ہے اور پھر یہ تمام مقالات کیساتھ شائع بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جتنا مواد اور جتنی معلومات آپ فراہم کر سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا کیونکہ آپنے ہی اس کمیٹی کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اس سلسلے میں جو کتابیں اور رسالے اور دیگر پمفلٹ آپ مجھکو بھیج سکیں بھیجدیں۔ جو آپ کو مل جائینگے میں واپس کر دونگا۔ اسکے علاوہ آپ کانفرنس کے تمام اجلاسوں کی (قیام سے اب تک) کارروائیاں اور سوونیر بھی بھیجیں تا کہ مضمون میرا مکمل ہو سکے اور اگر کسی دوسرے صاحب نے اس کانفرنس کے کام پر کوئی کتاب یا مضمون لکھا ہو تو وہ بھی ارسال فرمائیں۔ گو کہ آپکی گوناگوں مصروفیات کو دیکھتے ہوئے یہ بہت زبردست تکلیف آپ کو دے رہا ہوں تاہم امید ہے کہ آپ ہر ممکن کوشش سے میرے اس مقالہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کرینگے۔

مسٹر حمید الدین نظامی ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں اب علامہ صاحب کے جانشینوں میں صرف چند ہستیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک آپ بھی ہیں آپ ہی لوگوں کو دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی ہے اور ہمیں آپکی یاد آتی رہے گی کیونکہ تعلقات کچھ اس قسم کے رہے ہیں جو عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی کہیں زیادہ تھے۔ ذوالقرنین کو چلائے جا رہا ہوں گو کہ اس سے نہ مالی فائدہ ہے اور نہ اب اسکی ضرورت ہے۔ مگر والد مرحوم کی یادگار ہے جب تک اللہ ہمت دیگا اسکو جاری رکھنا ہے اگر وہ پسند آتا ہے یہ میری خوش قسمتی ہے۔ یہاں کوئی مددگار ہے اور نہ معاون جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں مگر اللہ کا کرم شامل حال ہے جو پرچہ اور اخبار بے قید حیات ہے۔ لمعات نظامی کی جلد میں نے سب سے پہلے آپکو بھیجی ہے آپ اس پہ ریویو کر دیں [illegible] کی ہدایت والی نظم کیلئے کہا تھا یا العلم میں شائع ہوئی ہے [illegible] تو صبر ہی مجھے شکایت ہے کہ العلم مسلسل نہیں آتا معلوم نہیں کیا وجہ ہے اسکا انتظام فرمادیں۔

پرنسپل عبدالشکور صاحب [illegible] کالج [illegible] بہار العلم کا پرچہ پہونچا آپ کی یاد فرمائی کا بہت ممنون ہوں۔ آپ کا کرم ہے کہ آپ اپنے خدام کو یاد فرما لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ کے ادبی اور تعلیمی کام سرسبز ہو رہے ہیں۔

بزمِ کانفرنس

آنریبل مولوی فضل الحق صاحب وزیر تعلیم حکومتِ پاکستان۔ کراچی

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تعلیمی خدمت آپ انجام دے رہے تھے اسمیں آپ ہی شرکت و شمولیت مجھے بخوبی یاد ہے۔ اب کہ ہمارے سامنے قومی و اسلامی کام کا ایک متعین منصوبہ ہے مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے اسلام کے پُرانے سپاہی قدم آگے بڑھائینگے اور پاکستان میں تعلیمی ترقی کا پروگرام تیار کرینگے آپکو اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ اُن وجوہ کی بنا پر جنکا تذکرہ بالفعل ضروری نہیں ہے میں خود اس سلسلہ میں ابھی تک کچھ نہیں کرسکا لیکن یہ معلوم کرکے میرا دل مسرت سے لبریز ہے کہ آپ اپنی کوشش اُس مقصد کے حصول میں بروئے کار لانے کیلئے تیار ہیں جو مجھے دل سے عزیز ہے اور جسکی کامیابی کا میں تہ دل سے خواہاں ہوں تا کہ پاکستان میں اسلامی اقدار فروغ پاسکیں۔

مسٹر حاتم اے علوی کراچی

سو روپے کا چیک العلم کیلئے ارسال ہے۔ اسکا قصہ پس مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ میں کچھ شاندار رسالہ کو پابندی سے پڑھتا ہوں اور میری رائے میں فیلم تبہ پاکستان کی تعمیر سی ثقافتی اور تعلیمی لائحہ عمل سے ہوگی جو آپنے اختیار کیا ہے۔

سید شوکت علی صاحب کنسلٹنگ انجینئر آدم جی جوٹ مل نرائن گنج مشرقی پاکستان

بانی و مدیر حسن علی صاحب! آپکو یہ سُنکر مسرت ہوگی کہ سید الطاف علی بریلوی ایڈیٹر العلم کی علمی و تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ایک ہزار روپے کی پیشکش میں نے انکی ذاتِ خاص کیلئے کی ہے۔

مرزا حسن حبیب صاحب سابق چیف سکریٹری خیرپور حال ڈپٹی سکریٹری ایجوکیشن مغربی پاکستان گورنمنٹ لاہور

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کیجانب سے آپنے میرے جدید تقرر پر جو مبارکباد دی ہے اسکا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں آپکی محبت و اظہار امتنان کی صمیم قلب سے قدر کرتا ہوں بالخصوص اسلئے کہ آپنے اپنی پوری زندگی اس برصغیر کی تعلیمی ترقی کے کام میں صرف کی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ آپ مجھے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے مفید کاموں میں جو وہ انجام دے رہی ہے ہمیشہ ایک مخلص مددگار پائینگے۔

مسٹر نصرت حسین کلکٹر حیدرآباد سندھ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی رپورٹ کارگزاری اور سہ ماہی رسالہ العلم موصول ہوا۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ کانفرنس جو کام کررہی ہے اُس کو میں بہت زیادہ پسند کرتا ہوں اور اُس اعلیٰ مقصد کے حصول میں جو اس کے پیشِ نظر ہے ہر طرح کی امداد دینے سے مجھے بڑی مسرت ہوگی میں اپنا عطیہ بھی جلد از جلد روانہ کردونگا۔

جناب مجید ملک صاحب پرنسپل انفارمیشن آفیسر گورنمنٹ آف پاکستان

میں نے العلم کو کبھی کبھی پڑھا ہے اور میں اس کو بہت مفید رسالہ خیال کرتا ہوں — میں آپکی کوششوں کی مسلسل کامیابی کا خواہشمند ہوں۔

مسٹر ضیاء الاسلام ڈائرکٹر معلوماتِ عامہ وزارتِ کشمیر

مجھے یاد ہے کہ چند ماہ پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کیلئے میں اپنا عطیہ ارسال کرچکا ہوں آپکے حسب خواہش پچیس روپے کا چیک مزید ارسال ہے۔ آپنے اب تک جو بہترین ترقی حاصل کی ہے اُس کی مجھے مسرت ہے اور میں آپکی کامیابی کا دل سے خواہاں ہوں۔ علمی، تعلیمی اور ثقافتی خدمت کا میدان بے انتہا وسیع ہے اور وہ لوگ قابل مبارکباد ہیں جو رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود ان خصوص میں جد و جہد کررہے ہیں۔ اُردو کا نیا ٹائپ پائٹر بہت ہی نفیس ہے۔ ایک آپکو بھی اپنے دفتر میں رکھنا چاہیئے تاکہ زیادہ تر دفاتری کام اُردو میں ہوسکے اُردو کی ترقی کیلئے یہ بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر حامد حسین بلگرامی ڈپٹی چیف ایجوکیشن آفیسر پلاننگ بورڈ

گزشتہ دو ماہ کا العلم پہونچا جس کیلئے آپ کا شکرگزار ہوں۔ میری رائے ہے کہ یہ رسالہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کے سمجھانے میں اہم پارٹ ادا کررہا ہے مجھے اسکا مزید مطالعہ سے بڑی خوشی ہوگی۔

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ ادریس اللہ زکانہ سندھ

مجھے دلی مسرت ہے کہ آپنے مجھے یاد رکھا۔ تقریباً دس ماہ برطانیہ اور یورپ میں قیام کرنے کے بعد میں پاکستان واپس آگیا ہوں

میں نے اس زمانہ میں اپنے ایک منصوبے کو کام آمد بنایا۔ عنقریب کراچی آؤں گا تو آپ سے یقیناً ملوں گا اور سفر یورپ کی تفصیلات سناؤں گا۔ فیس ممبری کانفرنس کا چیک ملفوف ہے۔

حکیم محمد احسن صاحب سابق میئر کراچی و سکریٹری اُردو کالج

رسالہ العلم اور آپ کی دیگر مطبوعات مجھے بھیج گئیں۔ ان مطبوعات میں سے چند ایک میں نے پڑھ لی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سے پہلی ملاقات نہایت سرسری ہوئی آپ علمی خدمت کر رہے ہیں اور میں عاجز ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مشن میں کامیاب کرے۔ آپ کی تصانیف پڑھ کر آپ کی ذات سے اور زیادہ واقفیت حاصل ہوئی جب بھی فرصت ہو آپ میرے ہاں ضرور تشریف لائیں۔

مولانا سید ہاشمی فرید آبادی لاہور

آج انگریزی علاوہ مطبوعہ رسائل کا بنڈل سات آٹھ دن مجھے مل گیا تھا۔ ان سب کو پڑھنے اور رسید دینے کی فرصت دیر میں ملی۔ تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ کی یادفرمائی کا دل سے معترف ہوں مطبوعات رسالہ میں سرسید کلیہ نات کا حال پڑھکر بہت خوشی ہوئی کہ اس طرح جیٹ پٹ آپ نے اسے قائم کر لیا۔ خدا آپ کی سعی کو مشکور فرمائے اور مدرسہ کو استقامت ترقی دے۔

تالیف و تراجم کے کام سے طبعاً مجھے دلچسپی ہے مگر آپ کا یہ شعبہ کچھ گرم رفتار نہ معلوم ہوا انجمن ترقی اُردو کے تین رسائل بند ہو گئے اور سالانہ کیفیت پڑھی مطبوعات جدیدہ کی تعداد بھی گھٹتی معلوم ہوئی جس کا دلی افسوس ہے۔ کوشش کر کے آپ کی کانفرنس ہی اس کمی کو پورا کرنے میں کچھ زیادہ کد و کاوش سے کام کرے۔ ماشاء اللہ آپ کے رفیقوں میں بہت سے لائق و حالات زمانہ شناس حضرات موجود ہیں۔ ہمت سے کام کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اگر میرے کرنے کے لائق کوئی ایسی خدمت ہو تو بقدر صحت استطاعت کوشش کرنے کیلئے حاضر ہوں۔ احتشام الحق صاحب تھانوی سے ملتے ہونگے میری طرف سے سلام فرما دیجئے گا۔

مسٹر بشیر الدین پنڈت ایم اے سلامیہ کالج شاہجہانپور بھارت

رسالہ العلم شاہجہانپور میں تلاش کرتا تھا ایک تحفہ علم کے پاس خود بخود پہنچ گیا شکریہ۔ آپ کے اداریے نے حظ اُٹھایا خوب ہے۔ آپ کی بوڑھی نابغہ شگفتگی قلم کا ہمیشہ سے قائل ہوں سٹیلنی سلمان، گنگا جمنی طول الطویل نوہی اور حب پسند حقیقت کا مرقع ہیں۔ اور یہ ایک کسانی جہاں ... الخ کا جو استعمال آپ نے کیا ہے بہتر شاید ہی کوئی کر سکتا ہو۔

ہر سنی ۱۹۸۵ء کے صدقِ جدید میں میں شدید بیزاری کا اظہار نظر سے گذرا ہوگا۔ مدیر محترم نے مراسلے کے آخری پیرے حذف کر دیئے جو کانفرنس میں ملک کے حسام الدین راشدی کے اعتراض سے متعلق تھے اور جس سے شریک بزم کی اس جماعت کی تردید ہوتی تھی کہ اعتراض بیتوری طلب کر لیا تھا۔

'العلم' کے مضامین ماشاء اللہ معیاری ہیں۔ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے مصنف بلند معیار رکھے جاتے ہیں یا یوں صاحب قاری کو ریا یونی ہیں تو مجھے یقیناً اُن سے غائبانہ طور پر واقف ہونا چاہیے۔ ماہ و مشتی محروم کا مضمون محنت سے لکھا ہے مبارکباد پیش کیجئے۔ دیگر مضامین بھی اپنی نوعیت کے بہت خوب ہیں۔

ارادہ تھا کہ ان تعطیلات میں کراچی کی سیر کروں لیکن گرمی کی شدت اور بعض خانگی امور کی وجہ سے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ خیر پھر سہی۔ دعا فرمائیں یاد رکھیں ۱۸۵۷ء کے شہیدان وطن کی یاد قائم کی جارہی ہے لیکن فضل حق خیرآبادی مولوی احمد اللہ شاہ رسوا بدایونی رحمہ اللہ وغیرہم کی بے لوث خدمات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ دل روتا ہے لیکن مجبوری کا نام شکریہ سوچتا ہوں کہ شہیدانِ وطن کے عنوان سے کئی قسطوں میں ایک مقالہ لکھوں۔ والسلام۔ آپ اسے شائع کر دیں تاکہ بے انصافی کا جواب ہو جائے لیکن بہر صورت اس مضمون کیلئے آپ کا حق مرجع ہے۔ کاش کہ آپ ۱۸۵۷ء کے ہیرو نامی کتاب کو تفصیلی حواشی کے ساتھ دوبارہ شائع کر دیں۔

پروفیسر آغا صادق صاحب کوئٹہ

جدید موقر 'العلم' کا تازہ شمارہ ملا یہ شمارہ بھی قابل قدر مضامین پر مشتمل ہے لیکن حصہ نظم قدرے تشنہ ہے۔ امید ہے کہ آپ معیاری کلام منظوم کی اشاعت کی طرف بھی بیش از بیش توجہ دیجئے۔ اگلے شمارہ کیلئے ایک غزل ارسال خدمت ہے۔

مولوی سید ظفر حسین مسلم صاحب ایم اے علیگ وائس پریسیڈنٹ کانفرنس

میں کافی عرصہ سے صحت اور غیر و ایسی خلشوں میں گھرا ہوں کہ دیگر کاروفرائض نظرانداز ہے۔ جلد از جلد انشاء اللہ تعمیل کروں گا چند روز اور توقف کر کے ممنون کریں۔ آپ کے کالج کے نشوونما کی مبارکباد۔ اقبال کے تعلیمی پیغام پر مقالہ انشاء اللہ لکھوں گا۔ دل میں سب کچھ ہے مگر سب کچھ منتشر اور پراگندہ

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنند ، کاین نواہائے پریشاں می زنم

پروفیسر امیر الدین قدوائی کالج لاہور

آئندہ و رونسے باالتزام آپ کی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے اور میرے متعلق آپ کی مخلصانہ توجہات کی خبر بھی ملتی رہتی ہے

گرچہ دوریم از بساطِ قرب ہمت دور نیست

آخر آپکو خود بھی لکھتا ہوں لیکن بر خلاف غالب میرے گھر سے جو سامان کسی قوت نکلے محاسین میرے لکھے ہوئے یہ خطوط ہونگے اور بعض ایسے مضامین جو کسی طرح تصویر بنا کے قایم مقام نہیں ہوسکتے اور صرف ع شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد بدن ، قسم کی تاویلات کی عدم اشاعت کی بابت ممکن ہوگی کیونکہ جس ماحول میں مجھے یا پسند کیئے جاسکتے ہیں وہ ابھی مہیا نہیں ہے ع نوائے طوطی بہ نقار خانہ بے محل است — ایک خط شاید اس سے پہلے آپکو لکھا تھا اور تقریب اسکی یہ ہوئی کہ میری تمام کتابیں ہندوستان میں تلف ہوگئیں بعض جنہیں بہت عزیز اور نادر تھیں۔ البتہ چند خشک کتابوں کے ساتھ مقالات شیروانی کی وہ جلد آگئی جو آپکے دستخطوں سے مجھے پہنچی تھی اور جس پر آپنے بالتفصیل مجھ سے ریویو لکھوایا تھا اور حضرت مصنف کے اصرار پر بجراست خود ان کی خدمت میں صحیح کی جا رہی تھی لگئے تھے جہاں وہ ریویو رسالہ معنوت سے نکالکر اپنی خاص فائل میں لگایا ہوا انہوں نے دکھایا تھا۔

اب جو اس قریب ہی جرکتاب (مقالات شیروانی) کی رسم جلد بندی یہاں بطور "پھولنبا وُ" ادا ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ وہ ریویو بھی اگر آخر میں نقل ہو سکے تو خوب ہو۔ نیز "اسلامی طریقہ جنگ" اور "اسلامی نظریہ تعلیم" پر آپکی کانفرنس کی شائع کردہ دونوں کتابیں دیکھنے کی عرصے سے آرزو تھی۔ اور ہر چند کہ رسالہ "العلم" کی بابت تقدیر تحریرات سعدی کہ رقعہ منت آتش را ہمچو کاغذ زر می برند" میرے لیے موجب افتخار ہو لیکن اس قبولیت کے باعث خود بے جلد ہونا وجہ سقم بھی ہے۔ "العلم" معنوت کی طرح آئندہ کے مورخ کیلئے بہت اہم حیثیت رکھے گا۔

ریورنڈ کیپٹن بشیر احمد ٹمک ملتان میرے پیارے بھائی خط ملا تھا لیکن جواب نہ دے پایا شرمندہ ہوں۔ آج "العلم" کیلئے / روپے بھیج رہا ہوں منظور فرمائیں۔ بیحد کام ہے عمر و جسم تھک کر سو جاتا ہے لیکن کام ہی تو زندگی ہے اور زندگی تو بس کام ہی سے تکمیل کو پہنچتی ہے۔ بار ہا چاہا کہ حضور کی محبت کے قرض ادا کروں لیکن ہر وقت دست پکٹ اور یہ کتاب بہانا ہوتا ہے۔ اور میں خطوط کے ہم اب وقت پر نہیں دے پڑتے امید معاف فرمائینگے۔ آپ ملک اور قوم کی خدمت فرما رہے ہیں خداوند سے دعا ہے کہ وہ آپکو زیادہ ہمت اور استقامت کی توفیق بخشے۔

نواب سید شمس الحسن صاحب میونسپل کارپوریشن کراچی الحمد اکرئی آپکا یہ علمی رسالہ روز افزوں ترقی کرے۔

سید عبدالحفیظ صاحب ٹیونگ ایڈیٹر یوپی — کراچی خدا کا آنا نصف ملاقات کے مساوی ہوتا ہے اسلئے مسرت ہوئی کہ آپنے مراسلہ تحریر فرمایا۔ نیا "العلم" کو ہم تک تو پہنچنے نہیں دیتے۔ اسلیئے ہم سب لا علم رہتے ہیں۔ اپنی بیگم صاحبہ سے البتہ اکثر آپکی خیریت دریافت ہو جاتی ہے۔

پروفیسر سید ظہیر الدین علوی رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ بھائی آپکا خط پاکر بیحد مسرت ہوئی جسکا پہلی تندرستی کا جامعہ کی خاطر تھی ۱۶ اپریل کو شدید دورہ اختلاج کا پڑا خدا کو ابھی مجھسے اور خدمت لینی تھی کہ بچ گیا ورنہ دو تین دن تک یہاں کسی کو میری زندگی کی امید نہ تھی۔ ۹ مہینے ہوچکے ہیں لیکن ابھی تک زیادہ چلنے پھرنے کی اجازت ہے اور نہ زیادہ کام کرنے کی۔ جامعہ کے کام کا یہ حال ہے دن دونا اور رات چوگنا بڑھتا جا رہا ہے۔ بفضل خدا اکبر کے چار ملک کالج میں تھا۔ آپکو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ اس سال پچھتر ہزار امیدوار شریک ہوئے ہوا اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایکسو بیس سنٹروں پر امتحان ہوا۔ کوئی صوبہ خالی نہیں ہے جہاں جامعہ کا مرکز نہ ہو گا۔ ۱۹۴۲ء میں جب پروفیسر طاہر فاروقی صاحب چھوڑ کر (پاکستان) گئے تھے اور جامعہ چھوڑ گئے تھے اس سال صرف ۶۰ امیدوار شریک ہوئے تھے وہ صرف اُنیس سنٹر تھے آج یہ حال ہے مختلف یونیورسٹی اور بورڈوں نے ہمارے امتحانات کو تسلیم کر لیا ہے اسلئے اور بھی کام بڑھ گیا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ بعض حضرات تو اس کام کیلئے اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں سر سید نے مسلمانوں کو بچایا اور ۱۹۴۷ء سے علوی اُردو کو بچا رہا ہے۔ میں کام اور خاموش کام کا قائل ہوں کسی قسم کا پروپیگنڈا نہیں کرتا ورنہ اپنی جگہ سے ہلتا ہوں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس اُردو کشتی کی آندھی میں اردو کی لو کو اب تک روشن رکھے ہوئے ہوں۔ پاکستان نے بھی ابھی امتحانات کو اپنا لیا اور دل لگی یہ ہے کہ بجز نصاب تو اعد کی بندی کا ہو بہو نقل کر لیا البتہ جہاں امتحان کی فیس ہم چھ سات اور نو روپے لیتے ہیں انکی فیس یہاں پندرہ بیس اور چالیس ہے اور کہیں جہاں ہم گیارہ یا بارہ روپے تک لیتا ہوں وہاں ایسی فیس ۲۵ تک ہے تیس بہرحال خدا کا شکر ہے کہ کام روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اُردو ہندوستان میں ابھی زندہ ہے انشاء اللہ رہیگی جانا ہے کہ آپنے یاد کر لیا مجھے آپکے زمانہ کی صحبتیں اب تک یاد آتی ہیں۔

مسٹر سید امین الدین علوی پرنسپل تعلیم ملیگڑھ اسکول شنڈوآدم سندھ سندھ یونیورسٹی نے مجھسے کہا ہے کہ میں ایک مقالہ انگریزی میں تیار کروں جس کا موضوع سندھ ذیل ہے۔

کانفرنس کے محسن

(جولائی تا دسمبر ۱۹۵۵ء)

سالانہ گرانٹ حکومت پاکستان	پانچہزار روپے
جناب محمد علی حکیم صاحب پروپرائٹر کریسنٹ سوپ اینڈ آئل کمپنی کراچی	ایک ہزار روپے

سیٹھ ضمیر الدین صاحب (احمد حلوہ مرچنٹ کراچی)		Rs 125/-
مسرز الائیڈ بک کارپوریشن	"	Rs 125/-
جناب محمد بشیر الدین صاحب	"	Rs 125/-
نواب صدیق علی خاں صاحب	"	Rs 125/-
جناب نصیر الدین صاحب	"	Rs 125/-
از دنگل فنڈ معرفت ڈپٹی کمشنر صاحب سکھر		Rs 98/12/-
مسرز آرگ لمیٹڈ میرپور خاص	(سندھ)	Rs 75/-
جناب روشن علی بھیم جی صاحب	کراچی	Rs 75/-
جناب انفارمیشن آفیسر صاحب خیرپور (برائے العلم)		Rs 72/-
مسٹر رستم ایف کاؤس جی	کراچی	Rs 50/-
مسٹر کاؤس جی آر۔ ایف کاؤس جی	کراچی	Rs 50/-
جناب آغا ایم جعفر صاحب	"	Rs 50/-
جناب محمد عثمان صاحب میرپور خاص	(سندھ)	Rs 50/-
مسرز غلام محمد علی محمد میرپور خاص	"	Rs 50/-
جناب سید مبارک علی شاہ صاحب حیدرآباد	(سندھ)	Rs 50/-
جناب ضیاء الاسلام صاحب	راولپنڈی	Rs 50/-
جناب مولانا فیض اللہ ہمدانی صاحب	سورت	Rs 40/-

جناب حاجی عبداللطیف صاحب انصاری کراچی		Rs 125/-
جناب قاضی حبیب الحسن صاحب حیدرآباد (سندھ)		Rs 125/-
مسرز آدم لمیٹڈ میرپور خاص	(سندھ)	Rs 125/-
جناب حبیب عثمان صاحب	"	Rs 125/-
جناب حاتم علوی صاحب	کراچی	Rs 100/-
مسٹر ڈبلیو ایف جیفرے	کراچی	Rs 25/-
مسٹر جی۔ ڈی گریگوری	"	Rs 25/-
جناب حاجی رجب علی جان محمد صاحب	"	Rs 25/-
مسز ڈبلیو ایف جیوفرے	"	Rs 25/-
سید محمد عاصم صاحب	"	Rs 25/-
جناب حاجی محمد عمر صاحب سرمہ والے	"	Rs 25/-
جناب خان بہادر محی الدین صاحب	"	Rs 25/-
جناب حسن حبیب صاحب	لاہور	Rs 25/-
جناب سید فدا حسین صاحب	کراچی	Rs 25/-
جناب ملک عبدالقیوم صاحب	حیدرآباد سندھ	Rs 25/-
صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالواحد خان صاحب	کراچی	Rs 24/-
جناب مقصود الرحمٰن صاحب	لاہور	Rs 20/-
محترمہ بیگم زاہد حسین صاحبہ	کراچی	Rs 20/-

ڈاکٹر عبدالغفور صاحب و بیگم ڈاکٹر عبدالغفور صاحب لاڑکانہ	Rs 20/-
جناب محمد غلام حسین طوالعانی صاحب کراچی	Rs 20
جناب عبادت یار خاں صاحب ایڈووکیٹ کراچی	Rs 20/-
جناب نظیر حسین زیدی صاحب کراچی	Rs 20/-
ڈاکٹر مقصود علی صاحب میرپور	Rs 20/-
محترمہ سعیدہ بیگم صاحبہ میرپور خاص	Rs 20/-

جناب منصور علی صاحب نقوی خیرپور	Rs 15/-

جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ اسکول کوئٹہ (برائے العلم)	Rs 12/-

جناب شیخ محب احمد صاحب	کراچی	Rs 10/-
جناب نواب سید شمس الحسن صاحب	"	Rs 10/-
" مولوی عبدالصمد خانصاحب	سکھر	Rs 10/-
" مسز حسین صاحب زبیری	پشاور	Rs 10/-
محترمہ مسز زہرہ محسن شیرازی	کراچی	Rs 10/-
جناب وجاہت اللہ خانصاحب	"	Rs 10/-
" محمد سلیمان ابوبیت صاحب	"	Rs 10/-
" الیس۔ اے حسنین صاحب	"	Rs 10/-
میجر قمیر حسین صاحب بختیاری	"	Rs 10/-
محترمہ اصلی بیگم شروانی صاحبہ	"	Rs 10/-

جناب مولوی علیم الدین خانصاحب	کراچی	Rs 10/-
" خان بہادر مولوی شاہ عالم صاحب	پشاور	Rs 10/-
" پروفیسر آغا صادق صاحب	کوئٹہ	Rs 10/-
" انور حسین صاحب ایڈووکیٹ	کراچی	Rs 10/-
محترمہ بیگم فنی صاحبہ	"	Rs 10/-
محترمہ مس عمر بانو صاحبہ	"	Rs 10/-
آنریبل زیڈ ایچ لاری صاحب	"	Rs 10/-
جناب وصی الحسن صاحب	"	Rs 10/-
محترمہ مہر النساء اقبال صاحبہ	"	Rs 10/-
محترمہ مسز عنایت مسیح ورا لائی		Rs 10/-
جناب شفیق حسین صاحب زبیری	کراچی	Rs 10/-
جناب ری عظمت اللہ صاحب ایڈووکیٹ	"	Rs 10/-
" عبدالقدوس صاحب (علیگ)	"	Rs 10/-
جناب حسن معین الدین صاحب خیرپور		Rs 10/-
" پروفیسر ڈاکٹر زبید احمد صاحب کراچی		Rs 10/-
" " عبدالمجید صاحب قریشی سرگودھا		Rs 10/-
ڈاکٹر محمد ادریس صاحب لاڑکانہ		Rs 10/-
جناب سلطان محمد صاحب خیرپور میرس		Rs 10/-
جناب سید انتظار حسین صاحب کراچی		Rs 10/-
ڈاکٹر عبدالمجید صاحب	حیدرآباد	Rs 10/-
جناب مرزا اسحاق بیگ صاحب	حیدرآباد	Rs 10/-
" محمد سلیمان مین صاحب	میرپور خاص	Rs 10/-
" عبدالرزاق خانصاحب	"	Rs 10/-
" حسن احمد صاحب	حیدرآباد	Rs 10/-
" شریف الحسن صاحب	"	Rs 10/-

ریٹائرڈ کیپٹن ملک بشیر محمد صاحب	ملتان	Rs 6/-
جناب سید مقصود علی صاحب	کراچی	Rs 6/-
" سید تعلیم علی "	لاہور	Rs 6/-
" ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ سیکنڈری اسکول کیماڑی		Rs 6/-
" پروفیسر آغا سروش صاحب	کراچی	Rs 6/-
" پرنسپل صاحب جناح کالج	"	Rs 6/-
" ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول	چمن	Rs 6/-
" " " " " "	کیمبل	Rs 6/-
جناب اے۔ کے۔ ایم ادریس صاحب	کراچی	Rs 5/-
" مولوی خصلت حسین صاحب صابری	"	Rs 5/-
" مرزا اصغر بیگ صاحب	میرپور خاص	Rs 5/-
" مرزا افتخار احمد صاحب عثمانی	"	Rs 5/-
" عبدالستار صاحب	حیدرآباد	Rs 5/-

عطیات برائے سندھ گرلس کالج کراچی

عالیجناب سیٹھ محمد بشیر صاحب	کراچی	Rs دو ہزار روپے
عالیجناب سیٹھ میاں محمد بشیر صاحب	کراچی	ایک ہزار روپے
جناب حسن علی عبدالرحمن صاحب بیرسٹر ایٹ لا	کراچی	Rs 500/-
جناب شوکت علی خاں صاحب	کراچی	Rs 200/-
محترمہ بیگم یوسف صاحبہ	کراچی	Rs 200/-
محترمہ بیگم سید عبدالحفیظ صاحبہ	کراچی	Rs 100/-
مولوی محمد عظمت اللہ صاحب دہلوی ایڈووکیٹ	کراچی	Rs 100/-

اکیڈیمی اف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ منعقدہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء کا ایک اور منظر
جو کل پاکستان انجمن ترقی اردو میں زیر صدارت جناب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب منعقد ہوا



بائیں سے-(۱) ڈاکٹر معیز الحق صاحب (۲) سید الطاف علی بریلوی (۳) بابائے اردو مولوی عبدالحق (۴) جناب گلزار صاحب (۵) سید عین الدین

سید الطاف علی بریلوی بی۔اے(علیگ) پبلشر و ایڈیٹر العلم نے ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس پاکستان چوک میں چھپوا کر صدر دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سندھ مدرسہ کراچی سے شائع کیا۔

العلم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر: سید الطاف علی بریلوی

قیمت
سالانہ ۶ روپئے
فی پرچہ ۲ روپیہ

سہ ماہی

العلم

کراچی

فون نمبر
مکان 37/01/69
سرسید گرلس کالج 3000/364
دفتر 32798

جلد نمبر ۵ — جنوری تا مارچ ۱۹۵۶ء — شمارہ ۲ نمبر ۱

وزارت تعلیم کی معارف پروری

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف

سالانہ امداد پانچ ہزار سے پچیس ہزار روپے کر دی گئی

عالی مرتبت عبدالستار صاحب مرکزی وزیر تعلیم کی فاضلانہ تقریر

آپ نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ستاونویں (تیسرے پاکستانی) سالانہ اجلاس کا افتتاح کرنے کے لئے مجھ کو منتخب کرکے جو میری عزت افزائی فرمائی ہے اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کی کانفرنس پاکستان میں اس آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی جانشین ہے جو سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے ۱۸۸۶ء میں قائم کی تھی۔ آل انڈیا کانفرنس نے مسلم ثقافت کی بقاء اور مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کیلئے جو قابل قدر خدمات انجام دیں ان سے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی بیداری میں بہت مدد ملی اور جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس لئے واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے مبارک موقعہ پر ہم ان تمام مسلم رہنمایان تعلیم اور رہبران ملک کے بیحد شکر گزار ہیں جنہوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ مسلمانوں کی بہبودی کے لئے سرگرم خدمات انجام دیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جنوری ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں قائم کی گئی اور اس کے ذریعہ قدیم جماعت کی تعلیمی خدمات کی روایت کو عمل میں لایا جا رہا ہے مگر چونکہ ملک کے تبدیل شدہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کانفرنس کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کی گئی ہے مجھے یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ کانفرنس اپنی گوناگوں سرگرمیوں کے ذریعہ تعلیمی مسائل میں عوام کی دلچسپی کو بیدار رکھتی ہے جو ہمیں پاکستان میں درپیش ہیں۔ اس کانفرنس جیسی غیر سرکاری جماعت کے اہم فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تعلیم کے متعلق تعمیری منصوبوں کو زیر عمل لائے۔ ہمارے ملک میں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ سرکاری محکمے اور یونیورسٹیوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ رضاکارانہ غیر سرکاری کوشش بھی شامل ہو خصوصاً علمی تحقیقات اور اشاعت کتب کے سلسلے میں تو بہت ضروری ہے۔ اس لئے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے نہایت موزوں ہے کہ اس نے علمی تحقیقات اور کتب کی اشاعت کے کام کی توسیع کے لئے ایک شعبہ بنایا [illegible] ہے کہ اس شعبہ کے تحت کانفرنس [illegible]

کتب خانہ اور مطالعہ گاہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور تعلیم کے متعلق قدیم اور جدید کتب کا اردو ترجمہ کرنا چاہتی ہے یقیناً یہ منصوبے بہت کارآمد ہیں اور ان کے ذریعہ ہمارے معلمین کے مطالعہ کے لئے عمدہ مواد فراہم کرنے کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ ان معیاری تصانیف کا ترجمہ ایسی بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس پر ملک میں تعلیمی تصورات کی تعمیر صحیح طور پر ہو سکتی ہے مجھے مسرت ہے کہ اس خاص منصوبہ کی قدردانی کے طور پر ہماری حکومت نے سالانہ امداد پانچ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲۰ ہزار روپیہ کر دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسری علمی جماعتیں اردو اور بنگالی میں تراجم کا کام ہاتھ میں لیں گی اور اس کام کو صرف مغرب کی معیاری تعلیمی کتب کے ترجمہ تک محدود نہ رکھا جائے گا بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں کی اور پاکستانی زبانوں کی علمی تصانیف کے ترجمہ کا کام بھی کیا جائے گا۔ اس قسم کے تراجم سے ہم کو دوسری ثقافتوں کے ذہنی خزانوں سے متمتع ہونے کا موقع ملے گا اور اس طرح ہمارے مصنفین کی تخلیقی قوتوں میں ترقی ہوگی۔

کانفرنس نے کراچی میں ایک سیدہ گرلس کالج قائم کرکے ملکی تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے۔ یہ کالج کراچی یونیورسٹی نے ملحق قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی اہم ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کانفرنس اپنے دائرہ کار کو وسیع تر کرسکے گی اور پاکستان کے دوسرے حصوں تک بھی اس کا دائرہ عمل پھیل سکے گا۔

جمہوریت کے نفاذ کی وجہ سے قومی تعمیر کے لئے تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ ہم صرف تعلیم کے ذریعہ ہی ایسے قابل مرد اور عورتیں پیدا کرسکتے ہیں جو کہ انتظام مملکت، صنعت و تجارت اور دیگر پیشوں میں اہم خدمات سرانجام دے سکیں۔ اور تعلیم ہی کے ذریعے ہم اپنے عوام میں سماجی اور شہری ذمہ داری کا احساس پیدا کرسکتے ہیں۔ اس لئے تعلیم سے تعلق رکھنے والے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو پاکستان کے مستقبل کی اہم ذمہ داری پوری کرنے میں حصہ لینا ناگزیر ہے۔

جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے تعلیم ایسا مشغلہ نہیں ہے جو صرف مدارس اور کالجوں تک محدود ہو۔ بچے کی تعلیم کے متعلق ابتدائی قدم گھر میں اٹھایا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سرپرستوں کو اس امر کا پورا احساس نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے متعلق تمام ذمہ داری مدارس کی رسمی تعلیم پر ڈال دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں تعلیمی حکام اور سرپرستوں کے درمیان باہمی تعلق برائے نام ہے حالانکہ دوسرے ممالک میں اسی تعلق کے ذریعہ طلباء کے انفرادی مسائل کا حل کیا جاتا ہے اور طالب علم کے رجحان کے مطابق کسی مفید پیشے کے لئے اس کو ٹریننگ دینے میں مدد ملتی ہے۔

آخر میں کانفرنس کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کانفرنس ملک کے تعلیمی مسائل کے متعلق عوام میں دلچسپی پیدا کرسکے گی اور ایسے منصوبے زیر عمل لاسکے گی جو تعمیری اور تخلیقی ہوں۔

خطبۂ خیر مقدم

ازڈاکٹر زینب عبداللہ صدر مجلس استقبالیہ

عالی مرتبت عبدالستار صاحب وزیر تعلیم حکومت پاکستان جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب صدر کانفرنس معزز خواتین و حضرات!

آج کا دن میرے لئے انتہائی فخر و مسرت کا دن ہے کہ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی بنا کردہ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ڈاکٹر ضیاء الدین، سر خواجہ سلیم اللہ بہادر، جسٹس شاہ دین، سر سلطان محمد شاہ آغا خان، سردار محمد حیات خاں، ہز ہائی نس سر آغا خان اور علیا حضرت ہز ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم وغیرہم کی پروان چڑھائی ہوئی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اس عظیم الشان اجلاس میں بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ آپ جیسے معارف پرور اصحاب علم بزرگوں کے خیر مقدم کا شرف حاصل کر رہی ہوں۔

کانفرنس کی ستر سالہ تاریخ میں یہ دوسرا موقع ہے کہ ایک عورت کو یہ اہم اور ذمہ داری کی خدمت سپرد کی گئی ہے۔ اس سے قبل انچاسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۵ء میں جس کی صدارت مولوی فضل الحق صاحب سابق گورنر مشرقی پاکستان نے فرمائی تھی، اس کی صدارت استقبالیہ کے فرائض لیڈی عبدالسلام صاحبہ نے انجام دیئے تھے یا اس کے بعد کانفرنس کے مخلص کارکنوں اور خاموش کارگزاروں کی جانب سے آج یہ خدمت مجھ ناچیز کو تفویض کی گئی ہے۔ حالانکہ کانفرنس کے شعبۂ نسواں اور سرسید گرلس کالج کی خواتین کارکنوں میں متعدد بہنیں مجھ سے بہتر طریقہ پر اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتی تھیں۔ بہرحال ذمہ داری اور اعزاز سے قطع نظر اصل چیز وہ مقصد ہے جس کی خاطر ہم اور آپ مختلف حیثیتوں سے اس وقت یہاں جمع ہوئے ہیں۔

آج سے ستر سال پہلے ۱۸۸۶ء میں جب سرسید علیہ الرحمۃ نے ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تھی تو کسے خبر تھی کہ مسلمانانِ برِصغیر پاک و ہند کی نشاۃ الثانیہ اور ان کے استقلال تامہ کا ذریعہ بن کر رہے گی اور ان کی اور ان کے ساتھیوں اور جانشینوں کی بے لوث خدمت اور انتھک محنت کی بدولت شجرِ ملت کی آبیاری کے ایسے چشمے پھوٹیں گے اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی فلاح و ترقی کے ایسے راستے کھلیں گے کہ دنیا اُن پر حیرت کرے گی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سرسید علیہ الرحمۃ اور ان کے رفقاء و جانشین حضرات کے فکر و عمل کی ساری سرگرمیاں

[illegible] اول تا آخر یہی ایجوکیشنل کانفرنس تھی اسی نے ایم اے او کالج علی گڑھ کو شہرۂ آفاق مسلم یونیورسٹی بنایا اور ملک کے طول و عرض میں لاتعداد تعلیم گاہوں اور دوسری دانش گاہوں کی بنیاد رکھی۔ علاوہ بریں اسلامی لٹریچر اور تاریخ کے تحفظ، اردو کی ترویج و اشاعت اور اسلامی انجمنوں کی تاسیس و حوصلہ افزائی کر کے تعلیمی اور تمدنی ترقی کی راہیں دکھائیں۔

سیاسی پس منظر میں ملی حقوق کے معاملے پر نظر کیجئے تو وہاں بھی آپ اسی جماعت کو قافلہ سالار پائیں گے اور اسی کی مرکزیت سے تحریک و تجدید اور تیاری کی وہ تمام لہریں اٹھتی نظر آئیں گی جنہوں نے غفلت و بے حسی اور کم ہمتی کو دور کر کے راہ و منزل کے تعین میں مدد دی اور اپنے سالانہ اجلاس ۱۹۰۶ء بمقام ڈھاکہ میں مسلم لیگ کو وجود میں لا کر جداگانہ قومیت کی بنیاد پر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت اسلامی پاکستان کا قیام ممکن بنایا۔

اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی آرزوئیں پوری ہوئیں اور آج ہم اپنے عزیز وطن پاکستان میں آزاد پاکستانی کی حیثیت سے عزت و سربلندی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر جس طرح تقسیم وطن کے اثرات سے افراد کو رستگاری نہیں ملی ہے اسی طرح اس کانفرنس کے راستہ میں بھی اس نے گوناگوں مشکلات حائل کر دیں۔

ہندوستان میں کانفرنس کے پاس تقریباً دو لاکھ روپیہ سرمایہ محفوظ تھا، لاکھوں روپے کی شاندار عمارتیں، سات ہزار قیمتی کتابوں کی لائبریری اور دفتری و انتظامی سہولتوں کی فراوانی تھی۔ تقریباً چالیس پینتالیس ہزار روپے سالانہ کا میزانیہ آمد و خرچ ہوتا تھا لیکن تقسیم کے بعد جب [illegible] کی کشمکش، [illegible] دینی حکومت کی تہدید، آفرینیوں اور [illegible] سازیوں نے کام کا دائرہ انتہائی محدود کر دیا اور کانفرنس کے مخلص کارکنوں نے جنوری ۱۹۵۱ء سے از سر نو کام کی بساط پھیلائی تو اگرچہ وسائل کی قلت کی وجہ سے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم ادارہ کی ستر سالہ خدمات کے شاندار ریکارڈ کی وجہ سے پاکستان کی مرکزی، صوبائی و ریاستی حکومتوں اور ملک کے طول و عرض میں ہر طبقہ کے لوگوں نے فراخدلی کے ساتھ اس کا خیرمقدم کیا۔ ہر قسم کی مالی و اخلاقی امداد و سرپرستی سے نوازا اور نہایت قلیل مدت میں اس کو پاکستان کی صف اول کی ثقافتی جماعت بنا دیا۔

ہمارے اس ادارہ کے حلقۂ رکنیت میں باقاعدہ فیس ممبری دینے والے لوگوں کی جتنی بڑی تعداد ہے شاید ہی کسی دوسرے ادارہ میں ہو اور خاص بات یہ ہے کہ ہم لوگوں میں مثالی اتحاد و عمل ہے، پانچ سال ہونے کو آئے کانفرنس کے مرکزی نظام اس کے مختلف شعبوں اور [illegible] کانگریس کمیٹی کے ارباب کار میں کسی قسم کا تعیّن اور اختلاف رائے نہیں ہے۔ یہ خصوصیت ایسی ہے کہ اس پر ہمیں سب سے زیادہ فخر ہے اور باہمی تعاون و اتحاد کی اس نعمت عظمیٰ کی ہم دستوری و تاریخی روایتوں سے بالاتر ہو کر حفاظت کرتے ہیں کیونکہ [illegible] دستوری دلچسپیاں ہیں اور روایات ہماری [illegible] اور تعمیری کام پر [illegible]

ایسی قانونی جکڑبندیوں کی ہم پرواہ نہیں کرتے
جن سے قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹے۔
مذکورۂ بالا طریقۂ کار کی بدولت آل پاکستان
ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر دفتر و کتب خانہ شعبۂ
تعلیمی، شعبۂ تصنیف و تالیف اور شعبۂ نسواں کے کام
یوماً فیوماً ترقی پذیر ہیں جن کی کیفیت و روداد آپ
ہمارے سہ ماہی آرگن "العلم" میں ملاحظہ فرماتے
رہتے ہیں خصوصیت سے ادارۂ تصنیف و تالیف
کی جانب سے اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کا
قیام جس کا کام اسی ماہ اپریل ۱۹۵۶ء سے نئے ولولے
سے شروع ہونے والا ہے تعلیمی اور تصنیفی
میدان کا ایک انقلاب آفرین کام ہے جس
کے نہایت مفید و دوررس نتائج برآمد ہونگے۔
شعبۂ تعلیم نسواں کے تحت سر سید گرلس
کالج کا قیام بھی ایک عظیم الشان کارنامہ ہے نہ
صرف اس لئے کہ ایک اعلےٰ درجے کے زنانہ
کالج کی ضرورت تھی اور وہ پوری ہوگئی بلکہ اس لئے
بھی کہ اس کے عالم وجود میں آنے سے تعلیم نسواں
کی ترقی کی تحریک کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔
چنانچہ چند ہفتہ بعد ہی بیگم چودھری محمد علی صاحبہ
کی اولوالعزمی کی بدولت ہمارے ملک کی مشہور
و معروف جماعت اپوا کراچی برانچ نے ایک زنانہ
کالج ابھی حال میں حضرت بابائے اُردو ڈاکٹر
مولوی عبدالحق صاحب نے لڑکیوں کا اُردو کالج
قائم کرنے کے بعد اپنی انجمن ترقی اُردو کے
زیر انتظام ایک خواتین کالج بھی قائم فرمادیا جس
کے لئے ہم ان کی بیٹیاں حد درجہ احسان مند
ہیں۔

حضرات و خواتین!

مقام مسرت ہے کہ اعلےٰ تعلیم کے
میدان میں نہ صرف زنانہ تعلیم کے حصول کی رکاوٹیں
دور ہوگئیں اور پرانے مقامی کالجوں کی واحد اجارہ داری
کا خاتمہ ہوا بلکہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے بھی گزشتہ
دو سال کے عرصہ میں جناح کالج، سر رضا علی
کالج اور جامعہ ملیہ کالج کا اضافہ ہوگیا۔ توقع
ہے کہ جولائی ۱۹۵۶ء سے کم از کم تین اور نئے
کالج کھل جائیں گے۔ ان کالجوں کے قیام کے سلسلے
میں نہ صرف وہ جماعتیں قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے
ان کو قائم کیا بلکہ کراچی یونیورسٹی اور وزارت
تعلیمات بھی مستحق سپاس گذاری ہیں جنھوں نے
رسمی موانع سے قطع نظر کرکے اصل تحریک توسیع تعلیم
کو تقویت پہنچائی۔
فی الوقت آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
کے سامنے سب سے بڑا کام سر سید گرلس کالج کی
ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ کالج خدا کے فضل سے
آنرس کے لئے ڈگری کالج ہوگیا ہے اور جولائی
۱۹۵۶ء سے اس میں سائنس کی تعلیم کا بھی
انتظام ہو جائے گا۔ منسٹری آف ہیلتھ اینڈ ورکس
نے تین ایکڑ زمین کالج کی موجودہ عمارت کے قریب

ہی ناظم آباد چورنگی نمبر ۱ پر الاٹ کردی ہے جس کا تقریباً ساٹھ ہزار روپیہ ہمیں گورنمنٹ کو ادا کرنا ہے ساتھ ہی کالج کی عمارت اور بورڈنگ ہاؤس وغیرہ کے لئے کم از کم پانچ لاکھ روپیہ درکار ہے۔

سائنس کلاسس کے اجرا کے واسطے بھی فی الحال پچہتر ہزار روپے کی فوری ضرورت ہے۔

بزرگانِ ملت سے پُر زور اپیل ہے کہ ان ضروریات کے سلسلے میں وہ بیش از بیش مالی امداد فرمائیں تاکہ یہ کالج سرسید علیہ الرحمۃ کے نام کے شایانِ شان ہو سکے۔

خواتین و حضرات!

اپنے اس مختصر خطبۂ استقبالیہ میں میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں ترقی و توسیع تعلیم کے تمام کاموں یا منصوبوں پر کوئی سیر حاصل گفتگو کروں اور نہ تقسیم کار کے اصول پر میرا یہ منصب ہے۔

میری تقریر ختم ہونے کے بعد عالی جناب عبد الستار صاحب وزیر معارف پاکستان کے حکیمانہ ارشادات اور بزرگ و محترم پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی و صدر کانفرنس کے فاضلانہ خطبہ میں یہ تمام چیزیں بہتر و افضل طریقہ پر آپ کے سامنے آجائیں گی۔

مجھ ناچیز کا آخر میں صرف یہ کام ہے کہ میں مجلس استقبالیہ کی جانب سے آپ سب بزرگوں اور بھائیوں، نیز بہنوں کا پُرخلوص خیر مقدم کروں اور آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کروں، دعا ہے کہ ہمارے اور آپ کے اتحادِ عمل سے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ تاریخی اجلاس کامیاب ہو۔ اور اس کی کامیابی سے ملک و ملت کو بیش از بیش فوائد حاصل ہوں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

العلم کا اگلا شمارہ باتصویر اجلاس نمبر ہوگا

جسمیں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے شاندار (پاکستان میں تیسرے) سالانہ اجلاس [illegible] تا [illegible] اپریل ۱۹۵۸ء بمقام سرسید گرلس کالج کراچی کی مفصل روئداد، خطبات صدارت۔ مقالات اور تجاویز درج کی جائیں گی۔

سید الطاف علی بریلوی

تاریخ اسلام کے از سر نو لکھنے کی ضرورت

از ڈاکٹر سید معین الحق پی۔ایچ۔ڈی ڈائرکٹر ریسرچ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

تاریخ کا شمار ان علوم میں ہے جن کا مطالعہ تہذیب و تمدن کے ارتقا میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ چونکہ تہذیبیں انقلابات سے متاثر ہوتی رہتی ہیں اس لئے تاریخ کو ہر دور میں زندگی کے نئے تقاضوں اور نئی قدروں کی روشنی میں مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے یا یوں کہئے کہ تاریخ کا تصور اور اس کا دائرہ ہر زمانے میں بدلتا رہا ہے۔ جہاں تک تاریخ اسلام کا تعلق ہے اس کو صدیوں سے نئے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع نہیں ملا ہے اور جہاں کہیں یہ کوشش کی بھی گئی ہے تو یہ کام انہیں حضرات کے ہاتھوں سر انجام کو پہونچا ہے جو مذہبی، نسلی، وطنی یا اسی قسم کے دوسرے تعصبات کا شکار رہے۔

اس وقت تاریخ کی اہمیت سے بحث کرنا میرے پیش نظر نہیں لیکن مختصراً ان مدارج کا تذکرہ ضرور مقصود ہے جن سے گزر کر تاریخ کا تصور ہم تک پہنچا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو جب سے انسان نے اپنے پیش روؤں کے کارناموں کی روایات، محفوظ رکھنے کی کوشش [illegible] لیکن ان [illegible]

تحقیقی نظر رکھنے والے اور آثار قدیمہ کے ماہرین آئے دن اپنی تحقیقات کے ذریعہ ہماری معلومات میں بیش از بیش اضافہ کرتے رہتے ہیں لیکن وہ مدت جس کا ہمیں کچھ علم ہے بنی نوع انسان کی عمر کے مقابلہ میں دریا کے سامنے قطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ماقبل تاریخی دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں انسانوں کے ساتھ دیوتاؤں اور جنوں بھوتوں کو بھی شریک کیا جاتا تھا اور ان کے کارنامے انسانی زندگی کے واقعات سے ملے جلے دکھائے جاتے تھے۔ اس دور میں زمانہ کا کوئی تصور موجود نہ تھا اور واقعات کی نسبت صرف اسی قدر کہا جاتا تھا کہ یہ بہت قدیم بلکہ عہد کہن کے واقعات ہیں۔ اس دور کے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات بیان نہیں کی جا سکتیں البتہ [illegible] کے صنمیاتی تصور کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد عبرانی دور آتا ہے۔ اس کی قابل غور خصوصیت موضوعیت کے تصور میں انقلابی تبدیلی ہے یعنی اس دور میں [illegible] کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے اور مذہبی روایات اور حقائق کا مرکز [illegible]

پانچویں صدی قبل مسیح میں یونانی مورخ ہیروڈوٹس [illegible] تاریخ کے تصور میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے تاریخ کو دیومالائی روایات سے علیحدہ کیا [illegible]

[illegible] تاریخ میں ایک

عنصر کو بہت بڑھایا۔ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کو سائنس کا درجہ دینے کا سہرا یونانیوں کے سر ہے اور اسی بنا پر ہیروڈوٹس کو باوا تاریخ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ عقیدہ صرف اسی حد تک درست ہے کہ تاریخ کی ابتدا ہیروڈوٹس کی رہین منت ہے ورنہ تاریخ کو صحت و راستی کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر کے اس کو مستقل سائنس کی حیثیت دینا درحقیقت مسلمانوں کا کارنامہ ہے جس کی طرف آئندہ اشارہ کیا جائے گا۔

ہیروڈوٹس کے علاوہ دوسرا یونانی مورخ تھیوسی ڈائڈس تھا جو اسی صدی سے تعلق رکھتا ہے ہیروڈوٹس کی طرح اس نے بھی شہادات جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی توجہ خود واقعات سے زیادہ ان کی نفسیاتی نوعیت پر ہے۔ ہیروڈوٹس کو واقعات سے دلچسپی ہے اور تھیوسی ڈائڈس ان نفسیاتی قوتوں سے دلچسپی رکھتا ہے جن کا تعلق واقعات سے ہے۔ تھیوسی ڈائڈس نے خود کہا ہے کہ اس نے دوسروں کی تقریروں کو اس طرح پیش کیا ہے جس طرح اس کی رائے میں خود انہوں نے وہ تقریریں کی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ حقیقت بیان کرنے کا یہ طریقہ کس قدر ناقابل اطمینان بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کس درجہ خطرناک ہے۔ [illegible] اگرچہ یونانیوں کو عام طور پر تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی نہ تھی تاہم [illegible] ہیروڈوٹس جیسی شخصیت کا پیدا

امتیازی مقام دلوانے کا ضامن بن گیا تھا۔

جہاں تک روم کا تعلق ہے ہمارے لئے لیوی کی تاریخ روما پر ایک تذکرہ کافی ہوگا۔ اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے روم سے متعلق روایات اور دیگر مواد کو یکجا کر کے ایک مسلسل تاریخ مرتب کرلی ہے۔ یہ تاریخ ہے تو صرف روم ہی کی لیکن چونکہ یہ قوم اپنے آپ کو دوسری اقوام کے مقابلہ میں نہایت ارفع و اعلیٰ سمجھتی تھی اس لئے اس کی نظر میں اس تاریخ کو ایک عالمگیر تاریخ ہی کی حیثیت حاصل تھی۔ لاوی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ پڑھنے والے واقعات سے سبق حاصل کریں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ لوگوں کو ماضی قدیم سے زیادہ دلچسپی ہے اس لئے ابتدائی دور کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہے کیونکہ اس زمانے میں اہل روما کی زندگی صاف اور سادہ تھی۔ ساتھ ہی وہ مافوق البشر عنصر کو کم کرنا چاہتا ہے چنانچہ کہتا ہے کہ "اگرچہ ہمارا نفس اس تخیل سے کافی موٹا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اصل کو [illegible] تک پہنچا دیں لیکن مورخ کا فرض ہے کہ وہ حقیقت کو پڑھنے والے کی اس خواہش کا خیال کئے بغیر پیش کرے لاوی کے بعد روما میں کوئی مورخ اس مرتبے کا پیدا نہیں ہوا جو اس کے کام کو آگے بڑھا سکے۔ [illegible]

مشرق [illegible] اسلامی علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔
یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ یورپ کی تاریخ کے سلسلے میں مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہیں کیا جائیگا اس لئے کہ اس سے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جہاں تک اسلامی تاریخ نویسی کا تعلق ہے وہ یورپ کے خیالات اور نظریات سے قطعاً اثر پذیر نہیں ہوئی بلکہ اس کا ارتقا ایک مختلف اور علیحدہ ماحول میں ہوا۔

بہرحال قرون وسطیٰ کا یورپ اگرچہ خود اہل یورپ کو تاریک اور جہل کے پردوں میں ملفوف نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی نسلوں نے بھی کچھ نہ کچھ آنے والی علمی کوششوں کے ضرور چھوڑے ہیں چاہے ان کا اثر موجودہ تہذیب اور ثقافت پر برائے نام ہی ہو۔ اس دور میں یورپ کی زندگی پر مذہب اور پاپائیت کا بے حد اثر تھا۔ اس کا اثر تصور تاریخ پر بھی پڑا۔ کلی نظر سے بھی اس کے نشانات صاف نظر آتے ہیں۔ مثال کے لئے تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرنے کا طریقہ لیجیے۔ بارھویں صدی کے مصنف جوکم آف فلورس نے تاریخ کے تین دور قائم کئے ہیں اور ان کو ان ناموں سے موسوم کیا ہے:

(۱) باپ یعنی غیر مجسم خدا کی حکومت اس سے قبل کا زمانہ مراد ہے۔

(۲) بیٹے کی حکومت یعنی مسیح کا عہد اور

(۳) روح القدس کی حکومت یعنی زمانہ مستقبل [illegible]

[illegible]

سے علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوا اسی سبب اس تحریک کو علوم و فنون کی تحریک احیاء سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ اس دور میں انسان اور اس کے کارناموں کو تاریخ نویسی میں بھی مرکزیت کا درجہ حاصل ہونے لگا لیکن اس دور میں اس فن نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی اور سترھویں صدی سے سائنس کی افادیت کے مقابلہ میں تاریخ کی اہمیت بہت کم ہونے لگی۔ ڈکارتے کے نزدیک تاریخ کتنی ہی دلچسپ اور سبق انگیز کیوں نہ ہو اور اگرچہ عملی زندگی میں بہت مفید ہو سکتی ہے تاہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ "حقیقت" ہے۔ اس لئے کہ جو واقعات وہ بیان کرتی ہے وہ اس طرح واقع نہیں ہوئے جس طرح بیان کی گئی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ وہ قدیم مورخوں کی کافی کتابیں مطالعہ کر چکا ہے، لکھتا ہے "اپنے زمانے سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ رہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی غیر ملک میں سفر کرنا۔ یہ ایک مفید بات ہے کہ دوسری قوموں کے اطوار سے متعلق معلومات حاصل کی جائیں تاکہ اپنی نسبت زیادہ صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ لیکن جو لوگ بہت زیادہ طویل سفر کرتے ہیں ان کا حشر یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے دیس میں اجنبی ہو جاتے ہیں اور جو لوگ قدیم زمانے کے کارناموں کا بہت زیادہ مطالعہ کرتے ہیں وہ خود اپنے عہد کے کارناموں سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔"

گو ان نظریات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا لیکن ان سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے بعض [illegible] مفکر تاریخ کے تصورات کا انکار کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ

غلط نہ ہوگا کہ تاریخ کی طرف سے بے توجہی عام تھی۔ اس
صدی میں دوسرے علوم نے تاریخ کی تصویر کو وسعت بخشی
گیا ہے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کے دائرہ کو بڑھایا
فرانس کے انقلاب کے بعد جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی
اور حقوق انسان کے نظریے عام ہو گئے اسی طرح تاریخی
تصورات میں بھی وسعت آئی اور قدرتی طور پر اس کی اہمیت
بھی بڑھتی گئی۔ دور جدید کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی
قوموں کی بیداری اور ان کی ترقی ہے۔ انیسویں اور بیسویں
صدی میں یورپ کے مختلف ممالک نے کئی عظیم المرتبہ
مورخ پیدا کئے۔

ایک اور تبدیلی جو اس دور کے مورخوں میں نظر
آتی ہے یہ ہے کہ ان کو یورپ کے باہر بھی مشرقی اقوام کی تاریخ
سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس کا ایک بڑا سبب یورپ
کی سیاسی فتوحات اور مغربی استعماریت کے محرکات تھے
جب یورپ کی اقوام بالخصوص انگریزوں اور فرانسیسیوں
نے مشرقی ممالک میں اپنی حکومتیں قائم کیں تو ان ممالک
کی تاریخ سے دلچسپی ہوئی اور اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس
مطالعہ کے نتائج جہاں تک زیر بحث ہیں اس پر آگے
چل کر اظہار خیال کروں گا۔

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے پہلو کی طرف
آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں یعنی اسلام میں
تاریخ نویسی نے کن منازل ترقی کی اور بعد میں اس کے
انحطاط کے کیا اسباب تھے۔ اس ضمن میں بیان کیا
[illegible] ہیں؟
اسلام [illegible] سب سے [illegible]

ہے شاید بعض حضرات کو یہ بات تعجب خیز معلوم ہو
کیونکہ ہم لوگ یہ سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ تاریخ
کا عظیم ترین انقلاب اٹھارھویں صدی میں برپا ہوا لیکن
اگر دونوں تحریکوں کا مقابلہ ان کے نتائج پیش نظر رکھ کر کیا جائے
تو ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ وسعت، ہمہ گیری اور نتائج
کی دوررسی اور انسانی تہذیب کو نئی راہ پر چلانے کی بناء
پر دیکھا جائے تو اسلام اور فرانسیسی انقلاب میں کوئی
مقابلہ نہیں۔ موخر الذکر تحریک نے متمدن اور ترقی یافتہ
دنیا کے ایک حصہ کو آگے بڑھایا لیکن اسلام جس حالت
پر اثر انداز ہوا وہ تمدن کی نیم وحشیانہ ہیئت سے آگے نہ
بڑھی تھی۔ اسلام نے انسانی حیات کے ہر شعبے میں حیرت انگیز
تبدیلی کی۔ اس کی ہر قدر کو ایک نئی یا بدلی ہوئی بنیاد
پر قائم کیا۔ اخوت، مساوات اور آزادی کے تین نظریے
جو انقلاب فرانس کے بنیادی اصول متصور ہوتے ہیں اسلام
کے ذریعے اہل فرانس کو دستیاب ہو چکے تھے۔ صرف مساوات
ہی کو لیجئے۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد یورپ (کیا آج بھی)
کسی سفید رنگ کے انسان کو یقین نہیں ہو سکتا کہ انسانیت
کا تقاضا یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے غیر متمدن قوموں
میں سے کسی ایک فرد کو کوئی فرق نہیں۔ [illegible]
کے اسلام نے مساوات کا جو تصور پیش کیا ہے [illegible]
آپ حضرات خوب واقف ہیں۔ اس سلسلے میں [illegible]
ایک بنیادی اصول بنا دیا گیا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اس ضمن میں ایک اور مسئلہ قابل غور ہے۔ اسلام کی پیدائش اور اس کا ابتدائی نشو و نما دنیا کے اس خطے میں ہوا ہے جو اپنی جغرافیائی حیثیت کی بدولت قدیم تمدنی اثرات سے بڑی حد تک علیحدہ تھا اور عظمتوں کے علاوہ اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اس تحریک کا آغاز کسی ایسے علاقے میں ہوتا جو اس زمانے میں معیار کے لحاظ سے ترقی یافتہ سمجھا جاتا تو غالباً اسلام کے اصول قدیم تمدنی اصولوں سے کافی حد تک اثر پذیر ہوتے لیکن تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اسلام اپنے مخصوص اور مکمل انقلابی اصولوں کے ساتھ انسان تک پہنچا۔ ان حالات کا اسلامی تہذیب پر بہت گہرا اثر پڑا اور اس کے واسطے سے مغرب کی موجودہ تہذیب پر بھی اثر ہوا۔ لیکن ہم اس وقت اپنی توجہ فلسفہ تاریخ نویسی ہی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اسلام سے قبل عبرانی اور یونانی تاریخ نویسی کی بنیاد قائم ہو چکی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ ان روایات کو دوسری قوموں نے اپنی روایات کے لئے بنیادی حیثیت دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ ہم اس طرح لگا سکتے ہیں کہ مغرب کی تمام قوموں نے اس فن کا وہی نام لکھا جو یونانیوں نے تجویز کیا تھا یعنی (ہسٹریا) اس کی شکل تو ضرور بدلتی رہی لیکن اصل وہی رہی اور ساتھ ہی تصور بھی نہ بدلا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے یہ نام نہیں لیا [illegible] رکھا۔ اس نام کو اختیار کرنے [illegible] معلوم ہوتی ہے حقیقت اس [illegible] (باقی)

کا لفظ کم و بیش اٹھائیس جگہ آیا ہے اور ان قصوں کیلئے استعمال ہوا ہے جو بے اصل ہوتے ہیں اور جن کی صداقت میں شبہ کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ یہ لفظ وہ ہے جو کفار نے قرآنی احکام اور روایات کو سن کر ان کا مذاق اڑانے کے لئے استعمال کیا ہے اور بطور حکایت قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اس سے ہم دو نتیجے نکال سکتے ہیں کہ اساطیر میں بے اصل اور بے بنیاد قصے شامل ہوتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی تاریخ کو صرف ان قصوں سے پاک ہی رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ تاریخی واقعات کی بنیاد صداقت اور تعین زمانہ پر رکھی جائے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اس فن کے لئے لفظ تاریخ کو منتخب کیا جس کے معنی ہیں "واقعے کا مہینہ متعین کرنا" واقعات کے لئے تعین زمانہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ یورپ کے مورخین کے نزدیک ہیروڈوٹس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زمانے کے تعین کو ضروری عنصر سمجھا۔ لیکن مسلمانوں نے اس طریقے کو اپنے انتہائی مقام پر پہنچا دیا۔ وہ کسی واقعے کے دن اور تاریخ ہی نہیں بلکہ اس کے وقت اور ساعت پر بھی اصرار کرتے ہیں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ چند جستہ جستہ اہم واقعات کی تاریخیں اور دن محفوظ کریں بلکہ واقعات کو سنین کی بنیاد پر مرتب کرنے کا طریقہ بھی اختیار کیا چنانچہ طبری نے جس کا شمار اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم مورخوں کے مورخ کی حیثیت سے ہوتا ہے اسی طریقے پر اپنی عظیم تاریخ مرتب کی ہے۔ اٹھارویں صدی کے بعض یورپی مفکر عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کی تاریخ کو ناقابل اعتبار [illegible] کے قول کے مطابق "چند [illegible]

مولوی محمد سلیمان صاحب بھاوری	"	برائے اعظم	۱۲/-	"
ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول فسٹ سندھیں		" "	۱۲/-	"
ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی اسکول گھگھر		" "	۱۲/-	"
بیگم یوسف جہاں صاحبہ زبیری	کراچی		۱۰/-	"
محترمہ بیگم آباد احمد خاں صاحبہ لاہور		" "	۱۰/-	"
ڈاکٹر محمد یاسین صاحب زبیری	کراچی		۱۰/-	"
سید معظم حسن صاحب	"		۱۰/-	"
جناب عبدالوحید صاحب سوداگر	"		۱۰/-	"
جناب عبید اللہ صاحب قدسی	"		۱۰/-	"
مولوی مہدی حسن صاحب	"		۱۰/-	"
سید ناصر حسین صاحب	"		۱۰/-	"
سیٹھا شاہ اینڈ کمپنی	"		۱۰/-	"
جناب جہانگیر صاحب	"		۱۰/-	"
جناب ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب	"		۱۰/-	"
منشی عزیز احمد خاں صاحب راولپنڈی			۱۰/-	"
منظر الدین صاحب پبلک ٹنو کمپنی	کراچی		۱۰/-	"
مسٹر شریف الحسن	"		۱۰/-	"
ڈاکٹر عبد الغفور صاحب لاڑکانہ			۱۰/-	"
بیگم " " "			۱۰/-	"
جناب محمد سلطان صاحب شیخ	کراچی		۱۰/-	"
سید عبد الغفور صاحب	"		۶/-	"
ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ سکنڈری ہائی اسکول جہانگیر روڈ ٹملہ کراچی			۶/-	"
" " " " "			۶/-	"
جناب خلیل احمد صاحب راولپنڈی			۶/-	"
مسٹر محمد ابراہیم باٹا والا	کراچی		۶/-	"
حافظ محمد رحیم صاحب دہلوی	"		۵/-	"
جناب عبد الکریم صاحب کراچی	"		۵/-	"
جناب سید شفیق علی صاحب	"		۵/-	"
نعیم الدین صاحب نوبل ٹریڈنگ کمپنی	"		۵/-	"
[illegible] صاحب [illegible] کمپنی	"		۵/-	"

خدمت کو انجام دیا اس کی مثال اہم کو تاریخ عالم میں کہیں
نہیں ملتی ان کے اس بے مثال کارنامے کے جو نتائج مترتب
ہوئے وہ علمی دنیا میں تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ قائم رہینگے
اس مسئلے کے دو پہلوؤں پر خاص طور سے ایک نظر ڈالنے
کی ضرورت ہے۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں تاریخی
مواد اور خواہش کے سلسلے میں سند کی اہمیت کو بروئے کار
لانا ایک انقلابی کارنامہ تھا۔ اس سلسلے میں بعض نئے
علوم کی بنیاد پڑی اور اسی ضمن میں بعض ایسی مفید کتابیں
تصنیف ہوئیں جو اب تک معلومات کا بیش بہا خزانہ
سمجھی جاتی ہیں۔ یاقوت کی معجم البلدان اور سمعانی کی
انساب کے حقیقی مقاصد اسی اہمیت سے متعلق ہیں۔
اس کی قدر و قیمت کا احساس مغرب کے ان مورخوں کو
بھی ہوا ہے جو اسلام کے مخالفین کی صف اول میں
جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ مرگولیتھ کے الفاظ ملاحظہ
کیجئے:۔

> "اگرچہ ہر راوی کی صداقت کے متعلق
> مکمل تحقیقات کرنے کی وجہ سے نظریہ
> اسناد میں بے حد دشواریاں پیدا
> ہوگئی تھیں اور اس زمانہ میں احادیث
> گھڑنا ایک عام بات تھی جس کو بعض
> اوقات آسانی کے ساتھ گوارا کر لیا
> جاتا تھا تاہم صحت کی تکمیل کے لئے
> اس طریقۂ تحقیق کے کارآمد ہونے میں
> کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور مسلمان
> علم منطق کو ٹھیک طریقے پر منظم
> کرنے کے لئے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔"

یورپ اور دوسری اقوام کی قرون وسطی کی تاریخیں
پڑھتے وقت آپ کتاب کے مصنف کے رحم و کرم پر ہیں
جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے اس کو صحیح ماننا پڑتا ہے یا پھر اس کے
ذرائع معلومات پر ریسرچ کیجئے اور معلوم کیجئے کہ اس نے کس
کی سند پر یہ واقعہ بیان کیا ہے بہت کم ایسے مصنف ہونگے
جن کے ذرائع معلومات آپ حاصل کر سکیں گے اور اس پر
جو وقت اور توانائی صرف ہوگی اس کے مقابلہ میں نتیجہ بہت
کم نکلے گا۔ برخلاف اس کے طبری یا بلاذری کی ضخیم کتابیں
پڑھیئے۔ وہ آپ کو یہ زحمت نہ دیں گے اپنے اسناد ساتھ
ساتھ بتلاتے جائینگے اور اگر آپ اسناد سے دلچسپی نہیں رکھتے
تو ان کو چھوڑ کر صرف واقعات کا مطالعہ کیجئے۔ مسلمان مورخ
آپ کو خود واقعہ کی جائے وقوع تک پہنچانے کی کوشش
کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلاتے جاتے ہیں کہ جس
راستے سے آپ جا رہے ہیں وہ غلط ہے یا صحیح۔ شواہد
کی تنقید کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ ان میں آج سات سو
برس کے بعد بھی دوسرے مورخ اس مقام تک نہیں
پہنچے جہاں حدیث کی بدولت مسلمان مورخ پہنچ چکا تھا
آج ہم کسی کی سند کے قابل اعتبار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ
یہ رکھتے ہیں کہ سند الیہ واقعہ سے کس قدر قریب یا دور تھا
معاصر شہادت ہمارے نزدیک بہت وقیع ہے اور اگر
ہم معاصر شاہد کے متعلق یہ رائے بھی قائم کرنے کا موقع مل جائے
کہ وہ قابل اعتبار ہے یا نہیں تو اور اچھا ہے۔ لیکن ایسا
شاذ و نادر ہوتا ہے اور اس کا خاص اہتمام عام طور پر نہیں
کیا جاتا۔

ایک کے متعلق ہم ابوالفضل. نظام الدین احمد اور
بدایونی کے بیانات بطور شہادت کے طور پر استعمال کرتے
ہیں لیکن اس کی کوشش کون کرتا ہے کہ خود ان کے ذرائع
معلومات پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ اگر ابوالفضل خود ہی
بعض لغو بیان دے کر اپنے وقار کو نہ گرا لیتا تو شاید اس کی
ہر بات آج کا مورخ صحیح مان لیتا۔ اور اس سے بیاز پرس
نہ کی جاتی کہ اس کا ذریعہ معلومات کسی بیان کے متعلق کیا ہے
اور کہاں تک قابل اعتبار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آجکل
سکوں اور کتبوں کی شہادت پر بہت زور دیا جاتا ہے اور
ان کی شہادت بڑی حد تک قابل اعتبار بھی ہوتی ہے۔
لیکن کتبہ لکھنے اور کھودنے والے کی شخصیت اور سکوں کی
دستیابی راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ ابن بطوطہ نے کہا ہے
کہ ملتان کی جامع مسجد میں اس نے ایک کتبہ دیکھا جس میں
تحریر تھا کہ تغلق نے مغلوں کے خلاف ۲۹ لڑائیاں لڑیں۔
اگر ابن بطوطہ کا بیان صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ سوال پیدا
ہوتا ہے کہ وہ کس حیثیت کی لڑائیاں تھیں جو تغلق نے
لڑیں کیونکہ مغلوں کے خلاف ۲۹ فتوحات حاصل کرنیوالا
جرنیل ہمارے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا درخشاں ترین ستارہ
ہونا چاہیئے۔ ان واقعات کو سامنے رکھ کر ہم اس کا
کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان مورخوں اور محدثوں نے
اسناد کے طریقے میں جو کاوشیں کیں وہ کس حد تک قابل
قدر تھیں۔

اسناد کے سلسلے میں جن علوم نے ترقی کی انہیں
سوانح نگاری کا فن بھی تھا۔ غالباً دنیا کی کسی قوم نے افراد
کے سوانح اس قدر تعداد میں جمع نہیں کیے جیسے مسلمانوں نے
کئے۔ انہوں نے اسماء الرجال کو فن قرار دے کر لاکھوں
انسانوں کی زندگی کے حالات محفوظ کر لیے اور بعد میں اس
فن سے اس قدر دلچسپی پیدا ہوگئی کہ متعدد کتابیں افراد کے
حالات پر لکھی گئیں۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ مشائخ
اولیاء، حکماء، ادباء، قضات اور شعراء، غرضیکہ ہر
قابل لحاظ طبقہ کے لوگوں کے سوانح حیات محفوظ کیے گئے
اور ان کے مجموعے تیار ہوئے۔ کس قوم کے متعلق اتنی
کثیر التعداد مجموعے ہیں جتنی ہمارے پاس ہیں؟

مسلمان مورخوں میں صرف ایک کا ذکر میں اور
کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس کا کارنامہ ایک مخصوص نوعیت
رکھتا ہے۔ ابن خلدون کے انداز فکر اور تاریخ و اجتماعیات
کے ان تصورات پر جو اس نے پیش کیے ہیں ایک علٰحدہ
مقالہ بلکہ علٰحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ اس نے اتنے مسائل
پر روشنی ڈالی اور ان کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ چند
سطروں میں اس کے خیالات کو پیش کرنا درحقیقت اس پر ظلم
ہے لیکن ہماری بحث کے تسلسل اور ہماری دلائل کی مضبوطی
کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ میں یہ مناسب
سمجھتا ہوں کہ اس بیان کے چند فقروں میں اسی کے الفاظ کا
ترجمہ پیش کرنے پر اکتفا کروں۔ اس کے نزدیک "تاریخ ظاہر
میں تو زمانوں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی
حقیقت نہیں رکھتی لیکن باطن میں وہ نام ہے نظر و تحقیق کا
مخلوقات اور اس کے اصول کی باریک تعلیل کا، اور گہرے
علم کا جس کا تعلق واقعات کی کیفیات اور اسباب سے ہے
اس حیثیت سے اس کے رگ و ریشے میں حکمت سے
وابستہ ہیں اور وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کا شمار علوم حکمیہ

میں کیا جائے گا (مقدمہ ابن خلدون از ڈاکٹر طٰہٰ حسین ترجمہ۔ مولانا عبدالسلام ندوی ص۳)

ان چند جملوں سے ہم اس مہتم بالشان تخیل کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس مفکر اعظم نے تاریخ سے متعلق پیش کیا ہے۔ یورپ کے مفکر اٹھارہویں صدی تک اسی کشمکش میں رہے کہ تاریخ سائنس کا درجہ حاصل کر سکتی ہے یا نہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان سے چار سو سال پہلے مشرق کا یہ مفکر اس شبہ کا جواب اس قدر مفصل اور مدلل طریقہ سے دے چکا ہے کہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے وہ شمع راہ کا کام دے سکتا ہے۔

مسلمانوں کا ایک احسان تاریخ پر اور بھی ہے اس کی اشاعت اور ترویج کی جو خدمت انہوں نے ام دی وہ قابل غور ہے۔ اس سلسلہ میں خود ہند پاکستان ثال پیش کی جا سکتی ہے۔

اس برصغیر میں تاریخ نویسی کا رواج بالکل نہ تھا۔ تت یہ ہے کہ ہندوؤں نے تاریخ کو علٰحدہ فن کی حیثیت نہیں دی۔ یہی سبب ہے کہ زمانہ ما قبل اسلام میں لو ایسے متعدد اور طویل دور ملتے ہیں جو قطعاً تاریک ہیں ن کے متعلق کچھ بھی علم نہیں چنانچہ یہاں کی تاریخی کہانی ب کرنے کے لئے اکثر ان ذرائع معلومات پر اکتفا کرنا ا ہے جو عام طور پر ضمنی یا تائیدی شہادت کا کام دیتے ۔ غیر معروف شخصیتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ہم دو مشہور ن بادشاہوں کی مثال لے سکتے ہیں اشوک کی وسعت نت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ جہاں جہاں کے کتبے پائے جاتے ہیں وہاں اس کی حکومت ضرور نافذ ہوگی۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہ طریقہ قطعی قابل اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ اشوک کے چالیس سالہ دورِ حکومت کی تاریخ تقریباً تمام تر اس کے کتبوں ہی کی بنیاد پر مرتب کی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس سے کس قدر معلومات دستیاب ہو سکتی ہیں۔ دوسری مثال سمدر گپت کی ہے۔ اس کی جنوبی فتوحات کا بہت شہرہ ہے لیکن ذرا اس کی حقیقت پر غور کیجئے۔ الہ آباد میں اس کا ایک کتبہ ہے جس میں فتوحات کا ذکر ہے جن مقاما کا اس میں ذکر ہے ان کی جگہ کا تعین کر کے ایک مکمل نقشہ تیار کر لیا گیا اور برسوں سے تاریخی اٹلسوں میں وہ موجود ہے لیکن نئی تحقیق سے معلوم ہوا کہ تعین مقامات میں ایک بنیادی غلطی کی بنا پر اس کی فتوحات کا سارا نقشہ بدل گیا۔ غرضکہ اس برصغیر میں تاریخ کی طرف سے یہ بے توجہی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ رنگ بالکل بدل گیا۔ سندھ کی تاریخ پر چچنامہ آج تک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ غزنوی فتوحات کے بعد تو البیرونی سے جو سلسلہ تاریخ نویسی کا شروع ہوتا ہے اس کی کڑیاں مولوی ذکاء اللہ تک پہنچتی ہیں۔ آٹھ نو سو سال کی اس طویل مدت میں کوئی دور بھی ایسا نہ ملے گا جس کے لئے ہمعصر یا تقریباً ہمعصر تاریخی کتابیں موجود نہ ہوں۔ یہی حال دوسرے ممالک کا ہے۔ جہاں اسلام کی روایات تاریخ نویسی پہنچیں انہوں نے مقامی لوگوں میں تاریخ کا ذوق پیدا کر دیا۔

اب آخر میں میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ تاریخ اسلام کو از سر نو لکھنے کی ضرورت صرف اسی لئے نہیں ہے کہ تاریخ کا تصور بدلتا رہا ہے اور بدل رہا ہے۔ اس حیثیت

سے تو ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ کو ہمدردانہ انداز سے لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور متمدن اقوام جہاں تک ان کی اپنی تاریخ کا تعلق ہے یہ خدمت احسن طریقہ سے انجام دیتی رہی ہیں اور دے رہی ہیں۔ مسلمانوں نے جب سے ان کا دور انحطاط شروع ہوا ہے اس طرف سے قطعی بے توجہی برتی ہے چنانچہ اس کا ایک تو خطرناک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ذوق بہت محدود ہو گیا اور گر بھی گیا لیکن برا اثر اس صورت حال کا یہ ہوا کہ ہم اپنی ہی تاریخ ان لوگوں سے سیکھتے ہیں جنہوں نے اس کو بے حد مسخ کر دیا ہے اور ایسے رنگ میں پیش کیا ہے کہ اس کا رد عمل ہمارے نوجوانوں کی طبیعتوں پر بے حد مضر ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ ہمارے اجداد نے اپنے بنیادی اصولوں پر کس طرح عمل کیا اور اس ذریعہ سے وہ کس طرح اوج ترقی پر پہنچے ان کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ہماری تاریخ قتل و غارت اور لڑائی اور خونریزی کے قصوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں حقیقت یہ ہے کہ مغربی مورخوں نے اسلامی تاریخ کو یورپ میں اتنا بگاڑ کر پیش کیا ہے کہ ہم لوگ اس کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مذہبی اور نسلی تعصب کی بنا پر عمداً غلط اور بیہودہ باتیں کہی جاتی تھیں اور ان کو تاریخی رنگ دے کر بالکل غلط اور بے بنیاد تصورات کی ترویج کی جاتی تھی۔ میں چند مثالیں دے کر اس کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یورپ کے مصنفین کی چند لغو اور بیہودہ روایتوں پر ذرا غور کیجیے

ان لوگوں کا خیال تھا کہ آنحضرت کو مسلمان خدا سمجھ کر پوجتے تھے اور یہی نہیں بلکہ آپ کا بت بناتے تھے۔ چنانچہ محمد ہی سے لفظ میمٹری اختراع کیا جس کے معنی بت پرستی ہیں۔ چوسر اپنے کلام میں ایک بت کا ذکر کرتا ہے جس کا نام وہ ٹرمیگنٹ بتلاتا ہے اور لکھتا ہے کہ مسلمان اس کی پرستش کرتے تھے۔ اسلام کی ابتدا کے متعلق یورپ میں روایت مشہور تھی کہ محمد ایک کارڈینل کا نام تھا اور چونکہ پوپ کے انتخاب میں وہ کامیاب نہیں ہوا اس لئے اس نے انتقام لینے کی خاطر یہ مذہب ایجاد کیا۔ صدیوں تک یورپ کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ آنحضرت کا کفن لوہے کا ہے اور کعبہ میں معلق ہے اٹھارھویں صدی میں یورپ کا تعلق اسلامی ممالک اور مسلم اقوام سے زیادہ بڑھا اور اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہتر ہونے لگیں لیکن پچھلی صدیوں میں تعصب اور تنگ نظری کی جو روایات قائم ہو چکی تھیں ان کا اثر انیسویں اور بیسویں صدی کے مورخوں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ گبن نے اپنی مشہور کتاب اٹھارھویں صدی کے وسط میں لکھی ہے اور عام طور پر اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مذہبی تعصب نہ تھا لیکن کلمہ طیبہ کے متعلق اس کی رائے سنئے وہ کہتا ہے کہ

"اسلام ابدی حقیقت اور لازمی من گھڑت کا مجموعہ ہے"

اصل الفاظ یہ ہیں:

"compounded of an eternal truth and a necessary fiction"

وہ آنحضرتؐ کو نعوذ باللہ من ذالک ایک خود فریب شخص تصور کرتا ہے۔ گبن کے مقابلہ میں بہت حقیر لیکن اس سے کہیں زیادہ بدزبان ولیم میور ہے۔ وہ رسول اللہ اور قرآن کو تہذیب آزادی اور صداقت کے اُن دشمنوں میں جو کبھی عالمِ وجود میں آئے "بدترین دشمن" کہتا ہے۔ آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ اور تعلیمات کو پیش کرنے میں جس قدر تعصب برتا گیا ہے اور جس طریقے سے ان کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اُس کا حال علامہ شبلی کی سیرت النبی کے صفحات میں موجود ہے یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کا وہ تمام مواد جو سیرۃ اور حدیث پر جمع کیا گیا ہے اس کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے ہر حصہ کے متعلق بہت بڑی تعداد میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ہند و پاکستان کی تاریخ میں بھی واقعات کو غلط رنگ میں پیش کرنے اور ہمعصر مورخوں کے بیانات کے غلط ترجمے کرنے اور ان سے غلط نتائج مرتب کرنے کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن طوالت کے خیال سے میں صرف ایک مورّخ اور ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ جادو ناتھ سرکار نے مغلوں کی تاریخ پر ہزارہا صفحے لکھے ہیں اور ہر کالج اور یونیورسٹی میں یہ کتابیں درسیات میں داخل ہیں۔ اس کی تاریخ اورنگ زیب کا ذرا وہ باب پڑھئے جس میں اس نے چرچ اور اسٹیٹ اِن اسلام پر گل افشانی فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

"غیر مسلموں کی نشو و نما اور ترقی بلکہ
ان کی بقا کا تسلسل ہی اسلامی ریاست
کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے"

اب ان الفاظ پر کیا تنقید کی جائے سوائے اس کے کہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مصنف ایک ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس کی ذات میں تعصب، تنگ نظری اور جہل کے اوصاف ایک ہی وقت میں جمع ہو گئے ہوں۔ کیا اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ یہ یا اسی قسم کی اور بہت سی باتیں لکھتے وقت سرکار کو یہ بھی خیال نہیں رہا کہ وہ قوم جس کا وہ خود ایک فرد ہے کم و بیش آٹھ سو برس مسلمانوں کے زیر حکومت رہی اور باوجود اس کے اسی قوم کی تعداد اکثریت میں رہی۔ کیا یہ چیز ایسی حکومت میں ممکن تھی جہاں غیر مسلموں کے وجود کا تسلسل ممکن نہیں۔ سرکار کی یہ بھی عادت ہے کہ حسب ضرورت غلط ترجمہ پیش کر کے اپنی دلیل کے لئے شہادت مہیا کرے۔ ایک دلچسپ مثال غور فرمایئے۔ انہیں اورنگ زیب کے خط کا غلط ترجمہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاہجہاں نے اپنے بھائی خسرو کو قتل کرایا اور یہ کہ اورنگ زیب نے اپنے خط میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ گویا شاہجہاں کو خسرو کا قاتل ثابت کرنے کے لئے خود اس کے بیٹے کی شہادت پیش کی ہے۔ کس قدر پختہ شہادت ہے؟

شاہجہاں نے اورنگ زیب کے بعض ان الفاظ پر اعتراض کیا تھا جو اس نے اپنے بھائی دارا کے متعلق استعمال کئے تھے۔ جواب میں اورنگ زیب اپنے بھائیوں کی دشمنی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ تو اپنے بھائیوں کا ذکر اس سے زیادہ قابلِ اعتراض الفاظ میں کرتے ہیں

حالانکہ وہ آپ کی تخت نشینی سے پہلے ہی مرچکے تھے اور آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور نہ تخت کا دعوے کر سکتے تھے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ان حضرت خسرو پرویز را کہ پیش از
ایام خلافت ان حضرت بوادی فنا
شتافتہ بودند و ہیچ گونہ آسیبے بذریعہ
ایشاں متوقع نہ بود، تا حال چہ قسم
یاد می فرمایند"

ذرا سر جادو ناتھ سرکار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"How do you still regard the memory of your brothers Khusraw and Parviz, whom you did to death before your accession and who had threatened no injury to you"

(Vol. III, P-153):

کیا حق کے ساتھ اس سے زیادہ ظلم ہو سکتا ہے۔ یہ اس "جادو نگار" مورخ کا حال ہے جس کے کمالات کا اعتراف ہر حلقہ میں کیا جاتا ہے۔ سرکار نے اس حربہ میں دو مظلوموں کو زخمی کیا شاہجہاں قاتل تھا اور اورنگ زیب گستاخ۔ سرکار کی سند پر دوسرے مورخوں نے اس کو مان لیا اور برابر یہ حوالہ دے کر شاہجہاں کا قاتل ہونا ثابت کر رہے ہیں۔ ہمارے کالجوں اور اسکولوں کے طلباء یہی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ اس کے کیا خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں سلطان خسرو کی وفات کے سلسلے میں جو بحث بیدا

ہوگئی ہے اس پر میں ایک مقالہ [illegible] انڈین ہسٹری میں شائع کر چکا ہوں۔ ان [illegible] اور مثالوں کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ تیقناً یہ نظریہ کہ تاریخ اسلام کو از سر نو مرتب کرنے کی سخت ضرورت ہے قابل غور ہے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کے صحیح پس منظر اور صحیح رنگ میں مرتب نہ ہونے کی وجہ سے دنیا ایک بیش بہا خزانہ سے محروم رہے گی۔ اپنی مشہور کتاب انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس میں سارٹن نے مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"بنی نوع انسان کی اہم خدمت مسلمانوں
نے انجام دی عظیم ترین فلاسفر الفارابی
مسلمان تھا۔ عظیم ترین ریاضی داں
ابوکامل اور ابراہیم بھی مسلمان تھے۔
عظیم ترین جغرافیہ داں اور صاحب
معجم المسعودی مسلمان تھا اور عظیم المرتبت
مورخ الطبری بھی مسلمان ہی تھا۔"

(جلد ا صفحہ ۶۲۲)

آسمان علم و حکمت کے ان درخشاں ستاروں کے کارنامے دنیا کے سامنے ضرور آنے چاہئیں اور اپنی پوری شان اور عظمت کے ساتھ آنے چاہئیں۔ اس کام کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ اگر ہم نے اس کو انجام نہ دیا تو ہم ایک گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے۔

ناسخ اور تذکرہ نویس

(از انعام عظیم برنی ایم اے)

شیخ امام بخش ناسخ کے سوانح حیات تسلسل اور تفصیل کے ساتھ کسی تذکرے میں نہیں پائے جاتے اور جو مختصر حالات مختلف تذکروں کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر ان شواہد کے خلاف ہیں جو خود ناسخ کے کلام میں پائے جاتے ہیں یا دیگر مورخین نے صفحات تاریخ میں قلمبند کئے ہیں۔ سطور ذیل میں کوشش کی گئی ہے کہ ناسخ کے متعلق مختلف اور متضاد تحریروں کو تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

اس امر پر تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ شیخ ناسخ کے والد نے لاہور سے آکر فیض آباد میں اقامت اختیار کی غالباً یہی ایک امر ایسا ہے جس کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی خاندانی وجاہت، جائے ولادت۔ ولدیت وغیرہ ہر امر میں تذکرہ نویس باہم اختلاف رکھتے ہیں۔

جائے ولادت مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ مولانا نارخمی جن کو شیخ صاحب کی صحبت اور شاگردی کا شرف حاصل تھا فرماتے ہیں۔

"ان کے والد لاہور سے گئے تھے بغرض اسباب عفران وغیرہ اشیائے قیمتی کابل وکشمیر کی تجارت کرتے تھے۔ شیخ مرحوم بعالم خوردسالی ہمراہ تھے"۔[1]

مصحفی ریاض الفصحا میں فرماتے ہیں :-

"شیخ امام بخش ناسخ تخلص خلف الصدق شیخ خدابخش مرحوم وطن بزرگانش دارالسلطنت لاہور و خودش در فیض آباد تولد شدہ بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ"۔[2]

تذکرہ آب بقا میں خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھتے ہیں :-

"ناصر خاں ناصر دہلوی لکھنؤ میں محلہ خیالی گنج میں آکر ساکن ہوئے ایک تذکرہ لکھا۔ وہ لکھتے ہیں شیخ امام بخش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کریم بخش نباطی نے فیض آباد میں پرورش کیا۔۔۔[3]"

مولانا نارخمی کے بیان مذکورہ بالا کے باوجود مولانا محمد حسین آزاد کی رائے یہ ہے کہ

---

[1] آب حیات۔ بیان ناسخ [2] ریاض الفصحا اشاعت ناسخ

[3] تذکرہ آب بقا

فالدایام غربت میں مغرب سے مشرق
کو گئے۔ فیض آباد میں ان کی قسمت سے
یہ ستارہ چمکا کہ فلکِ نظم کا آفتاب ہوا[۱]۔

مذکورہ بالا بیانوں کو دیکھتے ہوئے اجماع اسی پر ہے کہ شیخ صاحب کی ولادت باسعادت کا شرف فیض آباد ہی کا حصہ ہے۔ اس بارے میں مصحفی کا بیان خاص وقعت رکھتا ہے کیونکہ وہ ناسخ کے ہمعصر تھے اور ناسخ کو ان سے ارادت بھی تھی۔ مصحفی خود لکھتے ہیں :۔

وے شیخ امام بخش ناسخ کہ در معنی بندی
تازہ علم استادی برافراشتہ وبفقیر ہم
از تہ دل دوستی دارند[۲]۔

ولدیت تذکرہ نویسوں کا اجماع ہے کہ شیخ صاحب کے پدر بزرگوار کا نام خدا بخش تھا مگر شیخ صاحب کی حیات ہی میں بعض اشخاص نے ان کو خدا بخش کا غلام یا متبنیٰ مشہور کر دیا تھا۔ تذکرہ آب بقا کی عبارت سے جاوپر مذکور ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ ناصر خاں ناصر تذکرہ نویس کے قول کے مطابق ان کی پرورش کریم بخش بساطی کے زیر سایہ ہوئی۔ خود شیخ صاحب نے بھی اپنی دو رباعیوں میں اس قصہ کی جانب اشارہ کیا ہے[۳]۔

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
حاصل ہونا دلیل فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

ایضاً

کہتے رہے اعمام[۴] عداوت سے غلام
میراث پدری مگر ملی نے تمام
اس دعوئے باطل سے ستمگاروں کو
حاصل یہ ہوا کہ کر گئے مجھ کو بدنام

کہا جاتا ہے کہ خدا بخش ایک دولتمند تاجر تھا۔ اس نے شیخ ناسخ کو متبنیٰ (یا بقول بعض غلام) کے طور پر پرورش کیا۔ خدا بخش کی وفات کے بعد اس کے بھائیوں اور دیگر اعزا نے میراث کا دعویٰ کیا۔ نوبت عدالت تک پہنچی اور فیصلہ ناسخ کے حق میں ہوا۔ مذکورہ رباعیاں اسی کامیابی کی یادگار ہیں۔

مولوی عبدالحی نے گل رعنا میں اور رام بابو سکسینہ[۵] نے تاریخ ادب اُردو میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے ان بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے رفیق حسین (ڈاکٹر رفیق لکچرار الہ آباد یونیورسٹی) اپنی تصنیف "اُردو غزل اور اس کی نشو و نما" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

اگر لڑکے تھے تو وراثت کے لئے مقدمہ
دائر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ دولت اور ذاتی عداوت تھی یا یہ
بھی ممکن ہے کہ خدا بخش نے خاندان سے
باہر شادی کی ہو لیکن مقدمہ کا ناسخ کے
حق میں فیصل ہونا اور ان کی رباعیاں
جن میں انہوں نے صاف طور سے اپنے کو

۱؎ آب حیات بیان ناسخ ۲؎ ریاض الفصحاء ص۳۲ ۳؎ کلیات ناسخ مطبوعہ مطبع نولکشور ۴؎ تذکرہ مرزا حسین علی خاں اثر ص۲۴۳ ... اس لفظ سے واضح ہے کہ اس افسانہ کی تہ میں ان کے چچاؤں کا اعتراض تھا ... ۵؎ ہسٹری آف اُردو لٹریچر (تاریخ ادب اُردو) ص۲۴۳

بیٹا لکھا ہے اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ
بیٹے تھے متبنیٰ نہ تھے۔ قانون اسلام متبنیٰ
کو وارث بھی قرار نہیں دیتا۔ خدا بخش
لاہور سے فیض آباد بسلسلہ تجارت آئے
تھے۔ یہ ممکن ہے کہ شروع میں خیمہ دوزی
بھی کی ہو لیکن بعد کو وہ بڑے تاجر کی حیثیت
رکھتے تھے۔"[۱]

کلیاتِ ناسخ میں ایک قطعہ[۲] ہے جس میں ناسخ نے اپنے والد کی تاریخ وفات کا مادہ "یارسول اللہ اشمی محشور باد" نکالا ہے اور صاحب تذکرہ آبِ بقا لکھتے ہیں[۳]

گو گھاٹ پر ایک قبر ہے جس پر مصرعہ لکھا
ہے "گورِ پدرِ جلیل ناسخ"

دونوں مصرعے مادہ تاریخ ہیں اور ہر دو سے ۱۲۱۶ تاریخ وفات نکلتی ہے مصحفی نے ریاض الفصحا ۱۲۲۱ھ میں لکھنا شروع کیا تھا ظاہر ہے کہ ناسخ کے والد مصحفی کے زمانہ میں بقید حیات تھے اور چچا نے جو مقدمہ وراثت کی بابت دائر کیا تھا وہ بھی مصحفی کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اگر خدا بخش ناسخ کے والد نہ ہوتے تو مصحفی ریاض الفصحا میں ان کو "خلف الصدق خدا بخش" نہ لکھتے اور اس سلسلے میں وراثت کے جھگڑے کی طرف بھی اشارہ کرتے۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے چچا نے دعوے سے قبل ان کو زہر دے کر بھی راستہ صاف کرنا چاہا تھا[۴]۔ ناصر خاں ناصر نے اپنے تذکرہ میں جو لکھا ہے کہ کریم بخش بساطی نے فیض آباد میں پرورش کیا ممکن ہے یہ اس عذر کی بنا پر ہو جو مدعیان کی جانب سے عدالت میں پیش کیا گیا ہو۔

سن ولادت اور عمر | شیخ ناسخ کا سن ولادت ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا۔ حبیب اللہ غضنفر مثنوی ناسخ کے دیباچہ میں ان کی پیدائش سنہ ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء کے لگ بھگ قرار دیتے ہیں۔ اس کے مطابق ناسخ کی عمر وفات کے وقت (۱۲۵۴ھ میں) ۶۸ سال ہوتی ہے[۵]

مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :-

"لوگ کہتے ہیں ۶۴، ۶۵ برس کی عمر تھی
مگر رگینی سلمہٗ لکھتے ہیں کہ تقریباً سو برس
کی ہوگی۔ اکثر عہدِ سلف کے معرکے اور
نواب شجاع الدولہ کی باتیں آنکھوں سے
دیکھی بیان کرتے تھے۔"[۶]

ڈاکٹر رفیق حسین رفیق "اردو غزل اور اس کی نشو و نما" میں فرماتے ہیں :-

"ناسخ نے جو قطعات تاریخ کہے ہیں ان
سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۶۴، ۶۵
برس کے نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ
معمر تھے۔ انہوں نے ایک قطعہ کنور
جسونت سنگھ پروانہ پسر راجہ بینی
بہادر کی وفات پر کہا تھا جس سے سنِ
وفات ۱۱۸۹ھ نکلتا ہے۔ ناسخ کا انتقال
۱۲۵۴ میں ہوا۔ ۶۵ برس کی مدت تو

[۱] اردو غزل اور اس کی نشو و نما مصنفہ رفیق حسین رفیق ص ۲۲ [۲] کلیات ناسخ مطبوعہ مطبع ... ص ... [۳] تذکرہ آب بقا ص ۱۲۶
[۴] آب حیات بیان ناسخ [۵] مثنوی ناسخ شائع کردہ کتابستان الہ آباد [۶] آب حیات بیان ناسخ

یہی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ انہوں نے تاریخ
اُس وقت کہی ہوگی جب فن شاعری
سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر چکے
ہونگے اگر پچیس برس کے بھی رہے ہونگے
تو بھی نوے سال کی عمر ہوتی ہے لہذا
رغمی صاحب کا بیان قرین قیاس ہے
تاریخ ملاحظہ ہو:-

ازمرون پروانہ جاں سوختہ
شمع بزم اہل سخن ہائے مرد
تاریخ رقم نمودم ناسخ!
پروانہ بمرد شمع ہم وائے بمرد[1]
۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء

مصحفی ریاض الفصحا میں رقمطراز ہیں:-
"عمرش سی وہفت سالہ است از سن
بست سالگی بمقتضائے موزونی طبع فکر
شعر ہندی میکند"[2]

مذکورہ بیانات میں سے حبیب اللہ غضنفر کے بیان کی
بنیاد تو ظاہری طور سے مولانا آزاد کے بیان پر ہے جس میں
۹۳ یا ۹۵ برس عمر بتائی گئی ہے کیونکہ سن وفات سے یہ
عمر منہا کرنے کے بعد سنِ ولادت "۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ"
نکل آتا ہے۔

مولانا رغمی کا بیان کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی پہلی
ہی نظر میں غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بیان کے مطابق
ناسخ کی تاریخ ولادت ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ ہوتی ہے،
اور اس حساب سے ان کی پیدائش عہد صفدر جنگ میں
جا پڑتی ہے۔ صفدر جنگ ۱۱۵۲ھ میں مسندنشین وزارت
ہوئے اور ۱۱۶۷ھ میں راہی عالم جاودانی ہوئے مولانا
رغمی کے حساب کے مطابق صفدر جنگ کی وفات کے
وقت ان کی عمر کم و بیش ۱۳ سال کی ہوتی ہے اس لئے
شجاع الدولہ کیا صفدر جنگ کے زمانہ کی باتیں بھی انکو
بچشم خود دیکھی بیان کرنی چاہیئے تھیں۔ اس لئے مولانا
رغمی کا یہ بیان قرین صحت نہیں ہے۔

زین حسین رفیق نے نوے سال کی عمر کا حساب لگایا
ہے مگر ان سے حساب لگانے میں سہو ہوا ہے مصرعہ تاریخ
سے پروانہ کی وفات کا سنہ ۱۱۸۹ھ برآمد نہیں ہوتا بلکہ ۱۲۲۸ھ
نکلتا ہے جو دوسرے تذکرہ نویسوں کے بیان سے مطابقت
رکھتا ہے۔ گنج تواریخ میں پروانہ کی وفات کا مادہ تاریخ
یہ ہے:-

مرد پروانہ وپے تاریخ
شد رقم جان فضل پروانہ
۱۲۲۸ھ

سخن شعرا میں بھی یہی سن وفات درج ہے البتہ
لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں پروانہ کی تاریخ وفات
۱۸۵۱ء درج کی ہے اور خواجہ عشرت لکھنوی نے تذکرہ
ہند و شعرا میں ۱۸۳۵ء لکھی ہے مگر یہ دونوں تاریخیں غلط
ہیں سنہ عیسوی کے مطابق پروانہ کی وفات کا سنہ (یعنی

[1] رفیق حسین نے مصرعہ سوم اسی طرح لکھا ہے جو دیوان ناسخ کے مروجہ نسخہ مطبوعہ نول کشور پریس کے مطابق ہے۔ مگر کلیات کے نسخہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب میں یہ مصرع اس طرح ہے "تاریخ چنیں رقم نمودم ناسخ" [2] اُردو غزل اور اس کی نشو و نما [3] ریاض الفصحا ص تاریخ

۱۲۲۸ھ) ۱۸۱۳ء کے مطابق ہوتا ہے۔ ناسخ کی وفات تقویم شمسی کے مطابق ۱۸۳۸ء میں ہوئی اس لئے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۱ء پروانہ کی وفات کے سن نہیں ہوسکتے۔

کلیاتِ ناسخ میں دیئے ہوئے تاریخی واقعات میں سب سے پُرانی تاریخ مرزا محمد رفیع سودا کی وفات کے متعلق ہے وہ قطعہ تاریخ یہ ہے :-

از وحشت آباد دنیا رفت بخلد رفیع سودا
گفتم سالِ وفاتش ناسخ شاعر ہندوستان واویلا

اس مادہ کے اعداد ۱۱۹۵ ہوتے ہیں۔ اس تاریخ کی صحت پر تذکرہ نویسوں کا اجماع ہے۔

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ تاریخ کہنے کے وقت شیخ کی عمر ۲۵ سال کے قریب تھی جیسا کہ ڈاکٹر رفیق حسین نے مان لیا ہے تو شیخ کی پیدائش ۱۱۷۰ھ کے قریب ہوتی ہے یہ تاریخ دوسری متذکرۃ الصدر تاریخوں سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سے رغمی صاحب کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ شجاع الدولہ کی وفات ۱۱۸۸ھ میں ہوئی اس وقت ناسخ کی عمر ۱۸ سال کے قریب ہوتی ہے۔ انہوں نے شجاع الدولہ کے آخری دس سال کے اکثر واقعات بچشم خود دیکھے ہوں گے اور مولانا رغمی نے ان کی زبانی ان واقعات کو یقیناً سُنا ہوگا۔ اس تاریخ کے مطابق ناسخ کی عمر لکھنؤ آنے کے وقت تقریباً ۲۱ سال ہوتی ہے۔ تذکرۂ آبِ بقا میں لکھا ہے کہ ناسخ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ اور اس سے قبل وہ آتش کے ہمراہ نواب محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں ملازم تھے۔

تذکرۂ ریاض الفصحا میں دی ہوئی عمر کیونکہ ظنی ہے اور یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ سے ۱۲۳۶ھ تک یعنی ۱۵ سال کی طویل مدت میں لکھا گیا ہے اس لئے اس سے صحیح یا تقریباً صحیح تاریخ پیدائش اخذ نہیں کی جاسکتی البتہ ہماری اخذ کردہ تاریخ پیدائش ۱۱۷۰ھ سے مصحفی کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ "از بیست سالگی . . . فکر شعر می کند" کیونکہ سودا کے قطعہ وفات (۱۱۹۵ھ) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل شیخ کی شاعری کی نہ صرف ابتدا ہوچکی تھی بلکہ کچھ زمانہ بھی گزر چکا تھا۔ اس لئے ناسخ کی شاعری کی ابتدا ۱۱۹۰ھ کے قریب قرار دیا جانا قرین صحت ہے اور اس حساب سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کم و بیش ۸۴ سال گلشن ہستی کا لطف اُٹھایا۔

فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونا

ناسخ نواب مرزا محمد تقی خان بہادر ترقی کے توسل سے لکھنؤ آئے۔ تذکرہ آبِ بقا کے مولف لکھتے ہیں :-

"عہد آصف الدولہ میں مرزا محمد تقی رئیس
فیض آباد کے ہمراہ لکھنؤ آئے۔ جاڑوں
میں شب کو مرزا صاحب کے پٹی پڑے
اوڑھ لیتے تھے اور دن کو باریک کپڑے
پہنے ہوئے اکڑتے پھرتے تھے۔"[1]

اسی تذکرہ میں لکھا ہے کہ ناسخ آصف الدولہ کے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنانے کے باعث ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔[2] مولف گلِ رعنا نے بھی تذکرہ آبِ بقا کے الفاظ بالکل اعادہ کیا ہے[3] اس پر رفیق حسین رفیق "اردو غزل اور اس کی نشوونما"

[1] تذکرہ آبِ بقا صفحہ ۱۲۶ [2] ایضاً [3] گلِ رعنا صفحہ ۲۴۳

میں حسب ذیل تبصرہ کرتے ہیں:۔

"گل رعنا میں مولوی عبدالحی نے اپنے ماخذ کا پتہ نہیں بتایا لیکن لکھا ہے کہ نواب محمد تقی کے بانکے ترچھوں میں نوکر تھے وہی ناسخ کو لکھنؤ لائے۔ یہ شب کو جاڑوں میں نواب کے بنئی پردے اوڑھتے اور دن کو باریک کپڑوں میں اکڑتے پھرتے۔ ناسخ ایک خوددار شخص تھے پہلوانی اور جسمانی ورزش سے ان کو شوق تھا لیکن پیشہ ور پہلوان نہ تھے۔ بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خاصی توجہ تھی۔ خدا بخش ایک امیر تاجر تھے اور اپنے مرنے کے بعد اتنی کافی دولت چھوڑی تھی کہ پسماندگان میں عدالتی چارہ جوئی کی نوبت آئی۔ پھر جو شخص اتنا فارغ البال ہو وہ ہزار آٹھ سو روپے ماہانہ آمدنی کے رئیس کے یہاں بانکے ترچھے جوان کی حیثیت سے کیسے ملازمت کرسکتا ہے۔ طرز رہائش کو بھی ملاحظہ فرمائیے کہ رات کو نواب صاحب کے بنئی پردے اوڑھنے کو ملتے ہوں دن کو ململ کے کپڑے پہننا تو اس زمانہ میں معمولی بات تھی اب بھی لکھنؤ کی گلیوں میں ایسے وضعدار ملیں گے جو چلے کے جاڑے میں معمولی چکن پہنتے ہوں۔ اس کے علاوہ نواب محمد تقی فیض آباد سے بنارس گئے تھے اور وہیں رحلت کی۔

(آب حیات ص ۳۴۵)"۱؎

جناب رفیق کے تبصرے کے عام مفہوم سے ہمیں اتفاق ہے مگر اس میں چند امور ایسے ہیں جن کو واضح کرنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ نواب محمد تقی ترقی معمولی رئیس نہ تھے وہ نواب مرزا محمد امین نیشاپوری کے صاحبزادے تھے ۲؎ مصحفی نے ان کو اسدالدولہ، رستم الملک مرزا محمد تقی خاں بہادر ترقی عرف آغا صاحب لکھا ہے۔ نواب شجاع الدولہ کی دختر لطف النساء بیگم ان کی محل خاص تھیں۔ نواب محمد تقی ترقی کو دس ہزار روپیہ ماہوار وثیقہ ملتا تھا ۳؎ صاحب علم تھے اور عالموں کی قدر کرتے تھے لکھنؤ و فیض آباد میں مشاعرہ کی محفلیں انہیں کے دم سے گرم تھیں۔ نہ صرف ناسخ بلکہ آتش بھی اُن سے وابستہ تھے۔ خوش خلق، متواضع، صابر، عزم، صاحب جود تھے۔ دوم یہ کہ نواب محمد تقی جن کا حوالہ آب حیات میں ہے اور جن کی بود و باش بنارس میں تھی نواب محمد تقی ترقی سے مختلف ہیں۔ سوم یہ کہ نواب محمد تقی ترقی سے جو وابستگی شیخ صاحب کو تھی وہ اوائل عمر میں تھی۔ اپنے والد کی وفات کے وقت ان کی عمر کم و بیش ۲۴ سال کی ہوگی۔ اس لئے ترکہ کے تنازعہ کا کوئی تعلق اس وقت سے نہیں ہے جبکہ وہ نواب محمد ترقی کی سرکار سے

۱؎ اردو غزل اور اس کی نشو و نما ص ۲۲۵   ۲؎ ریاض الفصحا ص ۲۴۵   ۳؎ تذکرہ کتب بقا ذکر آتش

وابستہ تھے۔ مصحفی شیخ ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں:-

"اجدادش تجارت پیشہ بودند و خودش نیز بہ
ہمیں وتیرہ بسری بردے[1]"

آغاز شاعری اور شیخ کا منظر عام پر آنا

بقول مصحفی ناسخ نے زمانۂ نوجوانی طبع ۲۰ سال کی عمر میں "فکر شعر" کرنا شروع کیا[2] یعنی ناسخ کی شاعری کی ابتدا ۱۱۹۰ھ کے قریب ہوئی۔ ریاض الفصحا ۱۲۲۱ھ میں مرتب ہونا شروع ہوا۔ تذکرہ گلشن ہند ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہو چکا تھا۔ اس میں اور اس سے قبل کے تذکروں میں شیخ ناسخ کا تذکرہ نہیں ہے۔ غالباً ریاض الفصحا ہی وہ تذکرہ ہے جس میں ناسخ کا ذکر اوّل مرتبہ تحریر ہوا۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ناسخ ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۲۱ھ کے درمیان منظر عام پر آئے۔ اور اگر مولانا رغمی کا یہ قول کہ

"وہ مرزا حاجی کے مکان پر مشاعروں
میں شرکت کرتے تھے مگر صرف سننے
کے لئے کہنا اس وقت شروع کیا جب
انشا اور مصحفی کے معرکے اور جرأت اور نوا
کے ہنگامے ختم ہو چکے۔"[3]

صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا کہ ناسخ ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۲۴ھ کے درمیان منظر عام پر آئے کیونکہ انشا ۱۲۲۵ھ میں نواب سعادت علی کے دربار سے معتوب ہوئے اور اسی سال جرأت نے انتقال کیا۔ لیکن اس امر کی عینی شہادت موجود ہے کہ ۱۲۲۹ھ میں شیخ ناسخ شہرت عام حاصل کر چکے تھے۔ مولوی عبدالقادر برلاس اپنے سفر بنگال و اودھ کے حالات میں تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲۲۹ھ میں

"ایک دن مشاعرہ کی مجلس میں جو ان
دنوں مرزا جعفر کے مکان پر ہوتی تھی میں
بھی چلا گیا۔ مرزا محمد حسین قتیل، مصحفی
میر نصیر دہلوی اس زمرہ میں سرگروہ شعرا
ہو رہے تھے۔ اور شیخ امام بخش ناسخ کو ان
دنوں اس کام میں دن دونی شہرت
حاصل ہوتی تھی[4]"

تلمذ

بعض تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ مصحفی سے شیخ کو تلمذ تھا اور مولف تذکرہ آب بقا کا بیان ہے کہ

"مصحفی نے ایک مرتبہ ان کی غزل اپنے
شاگرد بیتاب کو اصلاح کے لئے دی۔
شیخ ناسخ اسی دن سے ناراض ہو گئے
اور اصلاح لینی ترک دی۔"

لیکن یہ بیان خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ناسخ کو اپنا شاگرد نہیں لکھا۔ دوسرے تمام شاعروں کے حال میں اپنے شاگرد کی تصریح کر دی ہے۔ مصحفی کے الفاظ ہے کہ "حصہ الوان این خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از

دوستان محب خلیلے تنہا ست و بفقیر ہم
رسوخے از تہ دل دارد مقسوم گشت"[5]

استادی و شاگردی کا تعلق استناد کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا

---

[1] ریاض الفصحا ذکر ناسخ [2] ایضاً [3] آب حیات صفحہ ۳۲۳ [4] رسالہ العلم کراچی جنوری ۱۹۵۳ء صفحہ ۳
[5] گل رعنا صفحہ ۲۳۳ (بحوالہ رسالہ اردوئے معلیٰ و دیباچہ دیوان مصحفی جلد ششم)

البتہ مصحفی اور تنہا سے مشورہ کرنا بعید از قیاس نہیں ہے
تذکرہ خمر امصنفہ ابن امین اللہ طوفان میں تحریر ہے

حضرت شیخ امام بخش عبداللہ، ناسخ مولد بر عرش
شہر مینو سواد فیض آباد ست واز طفولیت
بہ تحصیل علوم و تکمیل فنون اوقات منیعت
بسر فرمودہ در شعر گوئی شاگردی نمودہ
معہٰذا فی زماننا علم استادی افراختہ[۱]

یہ تذکرہ شیخ ناسخ کی حیات میں لکھا گیا سن تصنیف ۱۲۴۷ھ تا ۱۲۵۱ھ مولانا رحمی کا بیان ہے کہ شیخ صاحب نے ابتدا میں میر صاحب سے بغرض اصلاح رجوع کیا۔ انہوں نے اصلاح نہ دی اس لئے ناسخ دل شکستہ ہو کر چلے آئے اس کے بعد کسی کی شاگردی اختیار نہ کی۔

ناسخ کا خارج البلد ہونا کیونکہ شیخ کو اوائل عمر ہی سے سیاسی ماحول میں رہنے کا موقع ملا اس لئے اُمرا و وزرا کی صحبت میں رہ کر انہوں نے خاصی سیاسی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اول میر محمد تقی ترقی سے وابستگی، اس کے بعد مرزا جعفر اور مرزا حاجی کی شاعرانہ محفلوں میں شرکت اور پھر معتمد الدولہ آغا میر کی اُستادی کا فخر، اُنکی صحبتوں کا گُھٹا گُھٹا سیاسی ماحول، یہ سب امور مل ملا کر شیخ کو بھی درباری سازشوں میں گھسیٹ لائے۔ جس کی وجہ سے شیخ کو جلا وطنی کی کلفتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ بعض تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق تین مرتبہ اور بعض کے بیان کے مطابق دو مرتبہ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق پہلی جلا وطنی غازی الدین حیدر کے زمانے میں اور دوسری جلا وطنی حکیم مہدی علی خان کی بحالی پر عمل میں آئی[۲]

رفیق حسین رفیق لکھتے ہیں کہ ناسخ کو تین مرتبہ لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ پہلی مرتبہ غازی الدین حیدر کے ناراض ہونے کی وجہ سے نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی پر پھر لکھنؤ پہونچے مگر آغا میر کی معزولی پر دوبارہ لکھنؤ چھوڑ کر بھاگے۔ تیسری مرتبہ محمد علی شاہ کے زمانہ میں حکیم مہدی علی خاں کی بحالی پر[۳]

مثنوی ناسخ کے دیباچہ میں حبیب اللہ غضنفر لکھتے ہیں:-

۱۲۴۳ھ میں... آغا میر موقوف ہوئے
ان کے ساتھ شیخ کو بھی جلا وطن ہونا پڑا
..... ۱۲۴۸ھ میں جب حکیم مہدی دوبارہ
معزول ہوئے تو شیخ لکھنؤ تشریف لائے
۱۲۵۳ھ میں محمد علی شاہ نے عنانِ
حکومت ہاتھ میں لی تو قلمدانِ وزارت
حکیم مہدی کو سپرد کیا اس وقت شیخ
نے پھر پیارے وطن کو خیرباد کہا[۴]

تذکرہ نویسوں کے مذکورہ بالا بیانات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شیخ کو تین مرتبہ لکھنؤ چھوڑنا پڑ

---

[۱] تذکرہ شعر امصنفہ ابن امین اللہ طوفان مرتبہ قاضی عبدالودود۔ بیان ناسخ ص۵ [۲] آب حیات ص۳۲۷ تاریخ ادب اُردو مصنفہ رام بابو سکسینہ ص۲۶۲
[۳] اُردو غزل اور اس کی نشو و نما ص۲۲۵ [۴] مثنوی ناسخ شائع کردہ کتابستان الہ آباد۔ دیباچہ

اول ۱۲۳۳ھ کے قریب اس کی وجہ جیسا کہ آب حیات اور تذکرہ آب بقا میں لکھا ہے یہ تھی کہ ناسخ نے اپنی تنک مزاجی کے سبب بادشاہ غازی الدین حیدر کی دعوت حاضری دربار کو قبول نہیں کیا۔ دوسری مرتبہ ۱۲۴۳ھ میں آغامیر کی معزولی کے وقت اس کی وجہ آغامیر کی مصاحبت تھی۔ تیسری مرتبہ ۱۲۵۸ ہجری میں جبکہ حکیم مہدی علیخاں نے دوبارہ کار وزارت سنبھالا۔[۱]

ہماری رائے میں پہلی جلا وطنی مشکوک دوسری حقیقت اور تیسری بے بنیاد ہے آب حیات اور تذکرہ آب بقا میں پہلی جلا وطنی غازی الدین حیدر کے زمانے سے متعلق بتائی گئی ہے اور موخرالذکر تذکرے میں اس کا سن ۱۲۳۴ھ درج ہے۔ اس جلا وطنی کی صحت تحقیق طلب ہے اور جیسا کہ ہم آگے ثابت کرینگے یہ جلا وطنی محض افسانہ ہے۔ آب حیات کے بیان میں جس کو مصنف تاریخ اُردو نے بھی نقل کیا ہے صریح تاریخی غلطی ہے۔ آزاد کے بیان کے مطابق اس جلا وطنی سے غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد واپس آئے[۲]۔ غازی الدین حیدر کا زمانہ حکومت ۱۲۲۹ھ سے ۱۲۴۳ھ تک رہا ہے۔ اور آغامیر کو کار نیابت اول مرتبہ ۱۲۳۰ھ میں تفویض ہوا۔ نو ماہ کام کرنے کے بعد معزول ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے بعد ۱۲۳۲ھ میں پھر بحال ہوئے۔ اس کے بعد غازی الدین حیدر کے زمانہ حکومت میں آغامیر کا دور دورہ رہا اور ان کے خلاف کسی کو کان ہلانے کی جرأت نہ تھی۔

اگر آب حیات کے بیان کو صحیح مانا جائے تو ناسخ کا زمانہ جلا وطنی ۱۲۳۴ھ سے ۱۲۴۳ھ تک ہوتا ہے یہ صریح تاریخی غلطی ہے کلیات ناسخ میں تین قطعات تاریخ ہیں جن میں سے دو قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ۱۲۳۵ھ میں بیماری سے شفایاب ہوئے انہیں سے کسی قطعہ میں غربت کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

معاذ اللہ ز داء تپ لرزہ حارہ
بروئے بستر افتادم یکایک
چنیں سال شفا گفتم الٰہی
شود صحت ہمایون و مبارک
۱۲۳۵

چوں شفا شافی مطلق بخشید
میشود دور کنوں ضعف بدن
سال تاریخ شفایش ناسخ
زد رقم رفت تپ از پیکر من
۱۲ ۔ ۳۵

تیسرے قطعہ میں قید و قتل سے محفوظ رہنے بارگاہ ایزدی میں ادائے شکریہ کیلئے یوں گویا ہیں :-

الحمد للہ کہ ماندم محفوظ
سر ز تیغ و قدم از بند بلا

[۱] ان تذکروں کے علاوہ ناسخ کی جلا وطنی کو تذکرہ آب بقا، تاریخ اودھ، قیصر التواریخ، گل رعنا وغیرہ میں بھی مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے جس میں صریح تاریخی غلطیاں ہیں۔ [۲] آب حیات ص ۳۲۹

سال ایں رد بلائے ناسخ
گشت مرقوم بکنم شکر خدا
۱۲۳۵ھ

ان کے علاوہ دیگر تاریخی شواہد اس امر پر دال ہیں کہ ناسخ اس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود رہے۔ نواب محسن الدولہ کی شادی نصیر الدولہ محمد علی خاں کی بیٹی سے طے کرانے میں شیخ ناسخ کا ہاتھ تھا[۵۱]۔ یہ واقعہ ۱۲۳۸ھ کا ہے۔ سید محمد میر زائر نے قیصر التواریخ میں لکھا ہے کہ

"شیخ صاحب اول مرزا حاجی کی ندمتیں حاضر رہتے تھے پھر نواب (معتمد الدولہ آغا میر) کے خوف سے گھر میں بیٹھ رہے۔ چوبدار سلطانی طلب کو آیا۔ انہوں نے کہا پگڑی باندھ لوں۔ چوبدار سواری لینے چلا گیا شیخ جی چادر اوڑھ کر آغا توکل کے پاس گئے۔۔۔۔ آغا توکل نے پناہ دینے سے انکار کر دیا ۔۔۔۔ شیخ ناسخ میر اسد کے دروازے پر پہونچے۔ میر اسد ان کو احترام سے گھر میں لے گئے۔ نواب سے کہا۔ انہوں نے کہا دوسرے دن روبکاری ہوگی۔ روبکاری کے بعد گھر سلامت آئے۔ سو روپیہ ماہ نواب نے مقرر کیا جو مقصد جل فریب کا پیش آنا ناسخ رو براہ کر دیتے[۵۲]"

سید محمد میر زائر کی تحریر بالا سے صاف ظاہر ہے کہ آغا میر کے زمانہ میں ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا نہیں پڑا۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا حاجی کے شریک صحبت ہونے کے سبب ابتدا میں ان پر بھی عتاب سلطانی (یا عتاب وزیر) نازل ہوا مگر میر اسد کی سفارش سے جلاوطنی کی نوبت نہیں آئی۔ مذکورہ بالا تیسرے قطعہ میں اسی "سر زتیغ و قدم از بند بلا محفوظ رہنے" کا اشارہ ہے۔

آغا میر کی معزولی پر البتہ شیخ کو جلاوطن ہونا پڑا۔ اس زمانہ میں دربار شاہی کی یہ عام رسم تھی کہ جب امرائے سلطنت میں سے کوئی معتوب شاہی ہوتا تو اس کے اہل و عیال، اعزا، مقربین، متوسلین سب گرفتار بلا ہوتے املاک ضبط کر لی جاتیں مال و متاع داخل خزانہ شاہی ہوتا۔ اس صورت حال کا اقتضا تھا کہ اپنے محسن معتمد الدولہ کے ساتھ ناسخ بھی گرفتار محن ہوں۔ چنانچہ ان کو اول نظر بند کیا گیا جیسا کہ قطعہ تاریخ سے ظاہر ہے[۵۳]۔

امروز دلا ظلم نمایاں گردید　　　برمن ستم بعید و پایاں گردید
گشتم چو بخانہ قید گفتم تاریخ　　　ہے ہے افسوس خانہ زنداں گردید
۱۲۴۳ھ

مگر کسی خضر کی دستگیری سے یہ راہ محن طویل ثابت نہ ہوئی۔ چند روز کے بعد دوسرا قطعہ تاریخ کہہ کر اپنے محسن کی خدمت میں بطور اظہار تشکر پیش کیا[۵۴]

شدم محبوس چوں در خانۂ خویش　　　خلاصم داد یک مرد بزرگے
چنیں تاریخ خواندم در حضورش　　　رہا نیکی مرا از دست گرگے
۱۲۴۳ھ

---

[۵۱] تاریخ اودھ ص ۱۷۱　[۵۲] قیصر التواریخ حصہ دوم ص ۶۵　[۵۳] کلیات ناسخ ص ۲۵۳　[۵۴] ایضاً ص ۲۵۳

مگر معلوم ہوتا ہے کہ رہائی کے بعد بھی ان کو اطمینان نصیب نہیں ہوا اس لئے اسی سال وہ الہ آباد چلے گئے وہاں بیٹے کی شفا پانے کی اطلاع ملی تو قطعہ تاریخ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

نور چشم شفا ز چیچک یافت
دلم ایں مژدہ مبارک یافت
گفت ہر ساکن الہ آباد
اے مسافر ترا مبارکباد
سال مسعود گفت پیر خرد
صحت نور چشم سعد بود
۱۲ ھ ۴۳

سنہ ۱۲۴۴ھ میں آغا میر معزول ہوئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۴۵ھ کے آخر میں ناسخ نے وطن کو مراجعت کی مگر چند روز چین سے نہ بیٹھنے پائے تھے کہ میر فضل علی کی علالت کی وجہ سے بادشاہ نے حکیم مہدی علی خاں (منتظم الدولہ) کو کار وزارت سپرد کرنے کے لئے طلب کیا۔ حکیم صاحب ۳۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۵ھ کو داخل لکھنؤ ہوئے شیخ صاحب نے اس ورود کی تاریخ بھی کہی:۔

شد داخل شہر باز مردود دخیل
واویلا ہائے بستم ذی حجہ
تاریخ ورود آں لئیم بدخو
دل گفت کہ وائے بستم ذی حجہ
۱۲ ھ ۴۵

حکیم مہدی علی خاں شیخ صاحب کو بھولے نہیں:۔

"منتظم الدولہ نے ان کو بلوایا۔ چوبدار کو رشوت دی اور گھر سے نکل کر فقیر محمد خاں کے یہاں پہنچے اس نے بطریق زنانی سواری کول بار بھیج دیا وہاں سے کانپور ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے۔۔۔ [۱]"

حکیم مہدی علی خاں نے سنہ ۱۲۴۸ھ میں مسند وزارت خالی کی تو شیخ صاحب کو پھر لکھنؤ دیکھنا نصیب ہوا۔

سنہ ۱۲۵۳ھ میں تیسری بار جلا وطن ہونے کا واقعہ بے بنیاد ہے۔

یہ ضرور ہے کہ حکیم مہدی علی خاں نے سنہ ۱۲۵۲ھ میں دوبارہ مسند وزارت کو رونق بخشی مگر اس مرتبہ غازی الدین حیدر جیسے عیش پرست یا نصیر الدین حیدر جیسے متلون مزاج بادشاہ سے سابقہ نہ تھا۔ نصیر الدولہ محمد علی شاہ تجربہ کار، جہان دیدہ، متقی، ۷۰ سالہ پیر کہن سال تھے۔ ان کے عہد حکومت میں حکیم صاحب کو سنبھل کر رہنے کی ضرورت ہوئی۔ علاوہ ازیں حکیم صاحب کو فرصت بھی نہ ملی۔ چھ سات مہینے بھی نہ گذرے تھے کہ ملک الموت پیغام اجل لے کر آ پہونچا۔

تاریخی شواہد موجود ہیں کہ اس زمانہ میں ناسخ کو غریب الوطنی کے رنج نہیں سہنے پڑے۔ سید میر نائر لکھتے ہیں:۔

"فردوس منزل (محمد علی شاہ) بادشاہ ہوئے شیخ جی کو سو روپے ملنے لگے اور ہر سال قطعہ

۱؎ غیر مطبوعہ از نسخہ قلمی دفتر پریشاں مملوکہ محمد اسلم صاحب الہ آباد

۲؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۶۰

جلوس پر خلعت بھی عنایت ہوتا تھا"۔[۱]

کلیات تاریخ میں محمد علی شاہ کے جشن تخت نشینی کا قطعہ تاریخ موجود ہے ۱۲۵۳ھ میں شیخ صاحب کو خلعت عطا ہوا اس کا قطعہ تاریخ بھی دیوان میں ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مصنف گل رعنا کے مندرجہ ذیل بیان کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔

"محمد علی شاہ نے سو روپیہ ماہوار گھر بیٹھے مقرر کر دیئے تھے اور ہر سال قطعہ جلوس پر خلعت بھی عطا ہوتا تھا۔ امجد علی شاہ مذہبی آدمی تھے وہ علماء مجتہدین کی خدمت کرتے تھے شاعری کو دنیا شاید گناہ سمجھتے ہوں انہوں نے ان کی تنخواہ بند کر دی"۔[۲]

ناسخ کی وفات ۱۲۵۴ھ میں واقع ہوئی۔ امجد علی شاہ کا عہد حکومت ۱۲۵۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ شیخ کو امجد علی شاہ کا زمانہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

اولاد مولانا آزاد فرماتے ہیں:۔

"مکان مردانہ تھا۔ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا[۳] صاحب تذکرہ آب بقا لکھتے ہیں "زندگی بھر شادی نہ کی"[۴]

میرزا قیصر التواریخ میں رقمطراز ہیں:۔

"جس قدر محسن الدولہ سے کمایا بیجا صرف نہیں کیا بیٹوں کی تعلیم میں قصور نہیں کیا۔ ایک بیٹا حکیم زین العابدین شاگرد حکیم محمد علی طبابت کرکے علمن سے چلتا ہے"[۵]

گزشتہ صفحات میں ہم نے ایک قطعہ تاریخ درج کیا ہے جس میں شیخ نے اپنے "نور چشم" کے شفایاب ہونے پر مسرت اور تشکر کا اظہار کیا ہے۔ کلیات میں ایک دوسرا قطعہ تاریخ بھی ہے جس سے بیٹے یا پوتے کے متعلق آتش زدگی سے بچنے کی تاریخ معلوم ہوتی ہے[۶]

نامہ ام از وطن رسید امروز
کامدر انست این خبر جانسوز
یعنی این نونہال گل رخسار
داد سر چون انار آتشبار
خالق ناز لطف کرد برا د
آتش شعلہ در نشست فرد
سال تاریخ طبع کامل ما
زور قم ~~حیف~~ سوختہ دل ما
۱۲ ۵ ۴۴

ان کے علاوہ دو تاریخی رباعیاں بھی مرزا محمد کی صحت یابی کی تہنیت میں ہیں جن میں سے ایک رباعی میں مرزا محمد کو "عزیز القدر من" اور دوسری میں "نور چشم" کہا گیا ہے۔

ان شواہد کی موجودگی میں نہ مولانا آزاد کا بیان قابل وقعت ہے نہ "تذکرہ آب بقا" کی تحریر!

---

[۱] قیصر التواریخ حصہ دوم ص۱۵۷ [۲] گل رعنا ص۳۴۳ [۳] آب حیات بیان ناسخ [۴] تذکرہ آب بقا ص۱۲۶

[۵] قیصر التواریخ حصہ دوم ص۱۶۰ [۶] کلیات ناسخ ص۳۹۷

سرسیّد کے عقائد و اعمالِ مذہب

از مولوی محمد حسین زبیری ایم اے

سرسید علیہ الرحمۃ کے تذکرہ نگاروں نے عموماً ان کے عقائد و اعمال مذہب پر بھی بحث کی ہے ان میں ان کے مخالف بھی ہیں اور موافق بھی۔ اس سلسلے میں سرسید کا ایک خط جو انہوں نے اب سے کوئی ستر سال قبل ۱۲۹۰ھ میں مولانا مولوی محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیِ دارالعلوم دیوبند کے پاس پیرجی محمد عارف صاحب کے ذریعہ سے بھیجا تھا بہت اہم ہے۔ یہ خط مجموعہ خطوط سرسید میں شائع نہیں ہوا۔ البتہ سرسید نے ایک مضمون تہذیب الاخلاق میں "دافع البہتان" کے نام سے شائع کیا تھا جس میں ان تمام بہتانوں کی تردید کی گئی ہے جو ان پر لگائے گئے تھے۔ پیرجی محمد عارف صاحب سرسید کے دوست تھے اور مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ بہرحال وہ خط حسب ذیل ہے اور اس سے سرسید کے اصلی عقائد کا اندازہ ہوتا ہے:-

جناب پیرجی صاحب مخدوم و مکرم سلامت!

بعد سلام مسنون کے عرض یہ ہے کہ بزرگان سہارنپور نے جو نوازش دلسوزی میرے حالِ زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لائیں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا اس وقت مرزا غالب کا ایک شعر مجھے یاد آیا ہے وہ ہو ہذا ؎

حضرت ناصح جو آویں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

جناب من میری تمام تحریریں جن کے سبب میں کافر و مرتد ٹھہرا ہوں اور وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے جو میرے نزدیک محالات سے ہے چند اصول پر مبنی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان اصولوں کو بزرگان سہارنپور کی خدمت میں بھیجدیں اگر ان میں کچھ غلطی ہے تو بلاشبہ نصیحت ناصح کارگر ہوگی ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھ سے ہو جاویں اور وہ اصول یہ ہیں:

اوّل خدا ایک ہے واحد ذوالجلال ازلی و ابدی خالق و صانع تمام کائنات کا ہو

دوم۔ اس کا کلام اور جس کو کہ اس نے رسالت پر مبعوث کیا اس کا کلام ہرگز خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ نہیں ہوسکتا۔

سوم۔ قرآن مجید بلاشبہ کلام الٰہی ہے کوئی حرف اس کا نہ خلاف حقیقت ہے اور نہ خلاف واقعہ۔

چہارم۔ قرآن مجید کی جس قدر آیات کہ ہم کو بظاہر خلاف حقیقت یا خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہیں دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ان آیات کا مطلب سمجھنے میں ہم سے غلطی ہوئی ہے یا جس کو ہم نے حقیقت اور واقعہ سمجھا ہے اس میں غلطی کی ہے اس کے برخلاف کسی محدث یا مفسر کا قول قابل تسلیم نہیں ہے۔

پنجم۔ جس قدر کلام الٰہی جناب پیغمبر خدا صلعم پر نازل ہوا وہ سب بین الدفتین موجود ہے ایک حرف بھی اس سے خارج نہیں ہے اگر ہو تو کوئی آیت قرآن مجید کی بطور یقین حل نہیں ہے کیونکہ ممکن ہو کہ کوئی ایسی آیت خارج رہ گئی ہو جو آیات موجودہ بین الدفتین کے برخلاف ہو فقط نہ ملنا کسی آیت کا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں ہوسکتا۔

ششم۔ کوئی انسان سوائے رسول خدا صلعم کے ایسا نہیں ہے جس کا قول و فعل بلاسند قول و فعل رسول کے دینیات میں قابل تسلیم ہو یا جس کی عدم تسلیم سے کفر لازم آتا ہو پس اس کے برخلاف اعتقاد رکھنا شرک فی النبوۃ ہے۔

مقصود یہ ہے کہ جس طرح عام انسانوں اور پیغمبر میں تفاوت ہے اسی طرح ان کے قول و فعل میں بھی تفاوت ہے۔

ہفتم۔ دینیات میں سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت میں ہم مجبور ہیں اور دنیاوی امور میں مجاز۔ اس مقام پر سنت کے لفظ سے میری مراد احکام دین ہیں فقط

ہشتم۔ احکام منصوصہ احکام دین بالیقین ہیں اور باقی مسائل اجتہادی و قیاسی سب ظنی ہیں۔

نہم۔ انسان خارج از طاقت انسانی مکلف نہیں ہوسکتا پس اگر وہ ایمان پر مکلف ہے تو ضرور ہے کہ ایمان اور اس کے وہ احکام جن پر نجات منحصر ہے عقل انسانی سے خارج نہ ہوں مثلاً ہم خدا کے ہونے پر ایمان لانے کے مکلف ہیں مگر اس کی ماہیت ذات کے جاننے پر مکلف نہیں۔

دہم۔ افعال مامورہ فی نفسہ حسن ہیں اور افعال ممنوعہ فی نفسہ قبیح ہیں اور پیغمبر ان کے خواص حسن یا قبح کے بتلانے والے ہیں۔

جیسے کہ طبیب جو ادویہ کے ضرر و نفع سے
مطلع کردے اس مقام پر لفظ افعال
کو ایسا عام تصور کرنا چاہیئے جو افعال
جوارح اور افعال قلب وغیرہ سب پر
شامل ہو۔

یازدہم۔ تمام احکام مذہب اسلام کے
فطرت کے مطابق ہیں اگر یہ نہ ہو تو اس
کے حق میں نہ دیکھنا اور سوچنا کے حق میں
دیکھنا گناہ ٹھہر سکے گا فقط

دوازدہم۔ وہ قوا جو خدا تعالےٰ نے انسان
میں پیدا کئے ہیں ان میں وہ قوی بھی
ہیں جو انسان کو کسی فعل کے ارتکاب
کے محرک ہوتے ہیں اور وہ قوت بھی ہے
جو اس فعل کے ارتکاب سے روکتی ہے
ان تمام قوا کے استعمال پر انسان مختار
ہے۔ مگر ازل سے خدا کے علم میں ہے
کہ فلاں انسان کن کن قوی کو اور کس
کس طور پر کام میں لائے گا۔ اس کے
علم کے برخلاف ہرگز نہ ہوگا مگر اس
سے انسان ان قوی کے استعمال یا
ترک استعمال پر جب تک کہ وہ قوی
قابل استعمال کے اس میں ہیں مجبور
نہیں متصور ہو سکتا فقط

سیزدہم۔ دین احکام ان مجموعہ احکام
کا نام ہے جو یقینی من اللہ ہیں فقط

چہاردہم۔ احکام دین اسلام دو قسم کے
ہیں ایک وہ جو اصلی احکام دین کے
ہیں اور وہ بالکل فطرت کے مطابق
دوسرے وہ جن سے ان اصلی احکام
کی حفاظت مقصود ہے مگر اطاعت
اور عمل میں ان دونوں کا رتبہ برابر ہے

پانزدہم۔ تمام افعال و اقوال رسول
خدا صلعم کے سچائی تھے بمصلحت وقت
کی نسبت رسول کی طرف کرنی سخت
بے ادبی ہے جس میں خوف کفر ہے
مصلحت وقت سے میری مراد وہ
ہے جو عام لوگوں نے مصلحت وقت
کے معنی سمجھے ہیں یعنی ایسے قول فعل
کو کام میں لانا جو درحقیقت بے جا تھا
مگر مصلحت وقت کا لحاظ کر کر اس کو
کہہ دیا یا کر لیا۔

اگرچہ ان کے سوا اور چند اصول
بھی ہیں مگر آج تک جو کچھ تحریر ہوئی
ہے وہ اکثر یا قریب کل کے سوائے
ایک آدھ مسئلے کے ان ہی اصول پر
مبنی ہے۔ پس اگر بزرگان سہارنپور
ان اصول کی غلطی سے مجھے مطلع فرماویں گے
میں دل و جان سے شکر ادا کروں گا۔

والسلام سید احمد

سرسید کے اعمال مذہب کے متعلق جہاں تک کتابی

مذہب کا تعلق ہے یعنی نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ جہاد۔ ان میں سے نماز کے متعلق دو بیانات ملتے ہیں ایک مولانا شبلی نعمانی کا ہے جو انہوں نے خط میں اپنے والد کو لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مغرب کی نماز سبحان اللہ کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب شریک نماز ہوتے ہیں اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں آمین زور سے کہتے ہیں ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے"

دوسرا خط خود سرسید کا ہے جو انہوں نے شمس العلما مولوی سید شرف الدین ملجی (گیا) صوبہ بہار کے نام لکھا تھا اس میں لکھا ہے :-

"آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے۔ اگر بعوض اس کے آپ مجھ ہی سے مندرجہ ذیل سوال فرماتے تو میں نہایت خوشی سے اس کا جواب دیتا :-

(۱) نماز پنجگانہ فرض ہے یا نہیں ؟

(۲) ہر مسلمان عالم یا جاہل درویش ہو یا دنیا دار نماز پنجگانہ اس کو فرض سمجھ کر ادا کرنا فرض ہے یا نہیں :

(۳) جو مسلمان اس کو فرض نہ سمجھے وہ کافر ہے یا نہیں؟

(۴) نماز نہ پڑھنے یا قضا کر دینے سے مسلمان گنہگار ہوتا ہے اور گنہگار کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے یا نہیں ؟

(۵) نماز قضا ہونے یا قضا کرنے پر اگر کوئی شخص نادم ہو اور اپنے تئیں گنہگار سمجھتا ہو اور سخت گناہ کا مرتکب تسلیم کرتا ہو وہ کافر ہوتا ہے یا مسلمان رہتا ہے ؟

(۶) اس کے ساتھ یہ بھی سوال کرو کہ جو لوگ مسجدوں میں جاتے ہیں اور اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ لوگ ان کو نمازی اور نہایت پاک سمجھیں ان کا کیا حال ہے"

میرے نزدیک جمع بین الصلوٰتین جائز ہے۔ میں ایک گنہگار آدمی ہوں نماز پڑھتا بھی ہوں قضا بھی ہو جاتی ہے جب قضا ہو جاتی ہے شامت اعمال سے اس کی ندامت ہوتی ہے۔ اپنے آپکو گنہگار سمجھتا ہوں۔ خدا سے معافی چاہتا ہوں۔

جس شخص نے آپ سے کہا کہ میں نماز مغرب میں جو مسجد مدرسہ میں ہوتی ہے شریک نہیں ہوا سچ کہا ہے کیونکہ جب تک میں کارخانہ سے واپس نہ آتا الا کپڑے نہ تبدیل کروں وہ کپڑے نمازی نہیں ہوتے۔

بہرحال میری اندرونی تفتیش محض بیجا ہے۔ نہ میں مقدس ہوں نہ مقدس ہونے کا دعویٰ ہے نہ کسی کا ہادی بننا چاہتا ہوں۔ ایک گنہگار آدمی کے حالات کی تفتیش کیا۔ البتہ مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے اس میں کوشش کرتا ہوں۔ والسلام

خاکسار سید احمد۔ ۲ اگست ۱۸۹۲ء

روزہ کی جب تک طاقت رہی سرسید نے روزے رکھے اس کے بعد مجبوراً بعذر شرعی معذور رہے ہوں گے۔ ۱۸۸۶ء میں شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کو لکھتے ہیں کہ:۔

"بعد رمضان انشاء اللہ تعالےٰ ایک مضمون طویل اس باب (نیچرل شاعری) پر میں لکھوں گا، ان دنوں بسبب صوم کچھ کام نہیں ہو سکتا۔"

اسی خط میں قرآن مجید کی نسبت بھی عقیدہ کا اظہار ہے لکھتے ہیں:۔

اس بات کے کہنے سے مجھے معاف کیجئے کہ یہ خیال آپ کا کہ قرآن میں کوئی مضمون علمی نہیں بلکہ فصاحت اس کا معجزہ ہے درست نہیں۔ قرآن علم و نیچر اور فصاحت سب سے مرکب ہے اور مجموعہ من حیث المجموع معجزہ ہے۔"

سرسید کو حج اور زکوٰۃ کی استطاعت کبھی نہیں ہوئی کیونکہ جس شخص کے پاس پورا لباس بھی نہ ہو اور مرتے وقت کفن کے لئے دس روپیہ بھی نہ نکلیں اس پر زکوٰۃ اور حج واجب و فرض ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ حیرتناک ہے کہ سرسید کا گور و کفن ان کے دوست نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں نے کیا اور حج بدل ان کے دوسرے دوست نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے ۱۹۰۲ء میں جب وہ خود حج کو گئے کرایا جو شریف مکہ نے ادا کیا۔

رہا جہاد بالسیف تو اس کا موقع ہی نہ آیا لیکن تمام عمر جہاد بالقلم میں گذری۔ انتقال سے سولہ دن پہلے انہوں نے جو خط شمس العلما سید میر حسن (استاد علامہ اقبال) کو لکھا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح وہ آخر وقت تک جہاد بالقلم میں مصروف رہے اور اس میں بھی ان کو کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس خط کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"تفسیر قرآن مجید کا تمام ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس کے چھاپے میں اس قدر خرچ پڑتا ہے کہ مجھ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اور یہ بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ مسودہ لکھ کر چھوڑ جاؤں اس امید پر کہ کبھی چھپ رہے گی۔ مگر میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ مقامات مشکلہ قرآن مجید کے اور جو مشکلات بعض معترضین کی طرف سے مذہب اسلام پر وارد ہوتے ہیں ان کے جواب میں چھوٹے چھوٹے رسالے

کہ ڈانون اگر خدانے اس کام کو انجام
کرادیا تو تمام مشکلات حل ہو جائیں گی
اور صرف قرآن مجید کا ترجمہ باقی رہ جائیگا
جس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ان دنوں
ایک بہت نازک اور بڑے امر پر ایک
رسالہ یعنی ازواج مطہرات رسول خدا
صلے اللہ علیہ سلم پر لکھ رہا ہوں یہ رسالہ
بھی چھپے گا تو مجھے اُمید ہے کہ کسی کے
دل میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے کا
نیز تہذیب الاخلاق میں جو میں نے مختلف
مضامین بطور آرٹکل کے لکھے ہیں ان
کے چھپنے کی بابت بھی بعض دوست
کچھ بندوبست کر رہے ہیں شائد کچھ
انجام ہو جاوے ایک رسالہ تفسیر السماوات
کا میں نے لکھا تھا جو پرانے تہذیب الاخلاق
کے متعدد پرچوں میں چھپ گیا تھا اب
اس کو بھی بطور ایک مستقل رسالہ کے
علحدہ چھپوالیا ہے۔ والسلام

سید احمد ۱۱ مارچ ۱۸۹۵ء

ے افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ اس عہد میں بھی
ں کہیں ایسے حضرات مل جاتے ہیں جو تعلیم جدیدے
ستہ ہونے کے باوجود سرسید کی مخالفت میں رطب اللسان
تے ہیں اور بزعم خود مذہب کے دلدادہ ہیں یہی بنا
سرسید کے مذہبی عقائد کے سلسلے میں موشگافیاں کرتے
۔ اسی قسم کے ایک تعلیم یافتہ بزرگ سے واسطہ پڑا
اور یہی واقعہ ان چند سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ ہمیں
توقع ہے کہ سرسید کے معترضین کی اس سے تشفی ہو
جائے گی اور ان کے مداحین کے معلومات میں اضافہ
ہوگا۔

طلبا اور جنسی ادب

(از کرشن چندر)

نیا جنسی ادب سکول کے لڑکے اور لڑکیوں کیلئے برا سمجھا جا رہا
ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں ان موضوعات پر نہیں لکھنا چاہئے کیونکہ سکول کے
لڑکے اور لڑکیوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن نئے ادیبوں نے کبھی
یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ اسکول کے لڑکے اور لڑکیوں کے
لئے لکھتے ہیں۔

ہر ملک میں نابالغ اذہان کے لئے الگ ادب
ہوتا ہے اور اگر اسکول کے نصاب میں شیکسپیئر اور
شیلے ایسے مستند ادیب بھی شامل کئے جاتے ہیں تو ان کے
کلام کا سختی سے انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر آپ یہی سلوک
جوش، منٹو اور عصمت سے کیوں روا نہیں رکھتے؟ آپ کو
کون روکتا ہے؟ بالخصوص جب ان لوگوں نے خود کبھی یہ دعوی
نہیں کیا کہ وہ بچوں یا اُن لڑکے لڑکیوں کیلئے لکھتے ہیں۔
جو ابھی دماغی اعتبار سے خام کار ہیں اور آسانی سے
مشتعل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے نابالغوں کے مطلب کے
حصول کیلئے آپ دارالاشاعت لاہور یا جامعہ ملیہ دہلی
سے رجوع فرمائیے جنکی کاوشیں اس سلسلے میں لائق تحسین ہیں۔"

("نئے زاویئے" ۔ صفحہ ۱۱)

مولانا علی احمد خاں اسیر

(از محمد ایوب قادری)

ملا عبدالقادر بدایونی (المتوفی ۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء) دور اکبری کا مشہور مورخ و وقائع نگار گذرا ہے۔ اس کی تاریخ "منتخب التواریخ" وقائع نگاری کا بے مثل نمونہ ہے۔ دوست و دشمن ہر ایک اس کا مداح ہے۔ بدایوں اس کا وطن تھا اور وہی اس کی آخری آرامگاہ ہے۔ اہالیان بدایوں نے اس کو ایسا بھلا دیا کہ اس کے حالات زندگی تک علیحدہ کتابی صورت میں مرتب نہ ہو سکے۔ تقریباً ساڑھے تین سو برس کے بعد اس نامور مورخ کے حالات زندگی جس شخص نے ترتیب دیئے وہ مولانا علی احمد خاں اسیر بدایونی تھے۔ آج قریب چوتھائی صدی گزر گئی کہ مولانا اسیر کے حالات بھی مثل ملا عبدالقادر کے پردہ اخفا میں ہیں۔ اس مضمون میں مولانا علی احمد خاں اسیر بدایونی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خاندان و پیدائش

روہیل کھنڈ میں شہر بریلی خصوصاً حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے زمانے سے خاص شہرت و اہمیت کا مالک ہوا۔ آبادی میں کثیر اضافہ ہوا علماء و مشائخ نے سکونت اختیار کی۔ قبائلی علاقہ جو زدہ کے افغانوں نے آکر توطن اختیار کیا اسی زمانہ میں مولانا اسیر کے آباؤ اجداد بھی بریلی میں آکر مقیم ہوئے اور محلہ ملوک پور (گھیر نصیر خاں واقع بازداران) میں بود و باش اختیار کی۔ اس محلہ کو رائے ملک ملوک چند نے آباد کیا تھا جو کہ مکرند رائے ناظم بریلی کا بھائی تھا عہد افغانان سے قبل اس محلہ میں زیادہ برہمن اور کسگر آباد تھے پھر مسلمانوں کی آبادی کا کثیر اضافہ ہوا[1]۔

مولانا کے والد کا نام جنگ باز خاں تھا۔ بڑے بہادر اور جری آدمی تھے عام طور سے ٹھیکہ داری ذریعہ معاش تھی وضع قطع سادہ تھی۔ نوشت و خواند سے واقف تھے۔

۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء میں بریلی میں علی احمد خاں اسیر پیدا ہوئے۔ والد نے بڑے ناز و نعم سے پرورش کی۔ رسم تسمیہ خوانی و ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی بریلی ہی ہوا۔

توطن بدایوں

بدایوں سے ۱۷ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کچھلا ہے وہاں دریائے گنگا کا پل ہے مولانا کی اوائل عمری میں ان کے والد نے کچھلا گھاٹ پر کسی کام کا ٹھیکہ لیا، بدایوں آمد و رفت زیادہ رہی۔ دوسرے بدایوں میں مولانا کے بڑے بھائی نیاز احمد خاں کی سسرال تھی اور وہ بھی بدایوں ہی میں

---

[1] تواریخ ضلع بریلی مولفہ گنگا سہائے (قلمی) ملکہ سید الطاف علی بریلوی۔

رہتے تھے۔ لہٰذا مولانا اسیر کے والد نے بھی بدایوں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اور مولانا نے بھی ہوش و خرد کی آنکھیں بدایوں ہی میں کھولیں۔ اور یہی ان کا وطن مالوف قرار پایا۔

تعلیم و تربیت

مولانا اسیر نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی کی تکمیل مولوی ہدایت علی[1] بریلوی سے بریلی میں کی۔ اور علم منقول کی تحصیل مولوی عبدالقادر[2] بدایونی (المتوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) سے بدایوں ہی کی۔ علم حدیث میں مولوی محمد حسن[3] بنی اسرائیلی سنبھلی سے بھی استفاضہ حاصل کیا۔ اس کے بعد مولانا اسیر مدرسہ عالیہ رامپور پہونچے کیونکہ وہ اس وقت مشرقی علوم کی بہترین درسگاہ تھی۔ مولانا عبدالحق[4] خیرآبادی جیسے فاضل زمانہ و حکیم یگانہ اس کے صدر مدرس تھے اور مولانا

---

[1] مولوی ہدایت علی محلہ قرولان بریلی کے ساکن فاروقی النسل، مولانا فضل خیرآبادی کے شاگرد علوم منقول و معقول میں فاضل اجل تھے۔ ہمیشہ سلسلہ درس جاری رہا۔ نواب مشتاق علی خاں والی رام پور کے زمانہ میں ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء تا ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء مدرسہ عالیہ رام پور کے پرنسپل رہے جنرل اعظم الدین خاں ایک دن امتحان لینے مدرسہ پہونچے یہ چیز ان کو ناگوار ہوئی کہ جس جگہ بے علم اہل علم کا امتحان لیں، وہاں انہیں رہنا چاہیے چنانچہ استعفا دے دیا اور پھر بریلی آکر مسند درس کو سنبھالا آپ کے ایک بڑے بھائی مولوی سیت علی تھے۔ جن کے فرزند مولوی عنایت علی مصنف "مرقع فیض" (لال خانیوں کی تاریخ) تھے انہی کے پوتے منشی اعتماد الدین عرشؔ ولد منشی فرید الدین ایک لائق شاعر تھے جو ۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ۳۳ سال کی عمر میں جوان فوت ہوئے۔ عرشؔ کا مکمل دیوان سید الطاف علی بریلوی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ رباعیات عرشؔ سید صاحب نے طبع کرادی ہیں۔ اس کتاب میں جو شجرہ مرتب کرکے لگایا ہے اس میں سید الطاف علی بریلوی صاحب سے تسامح ہوگیا ہے نیز کہ مولوی ہدایت علی بریلوی کے خاندان سے اب کوئی نہیں۔ مولانا فضل حق رامپوری المتوفی ۱۹۳۰ء ان کے ارشد تلامذہ سے تھے۔

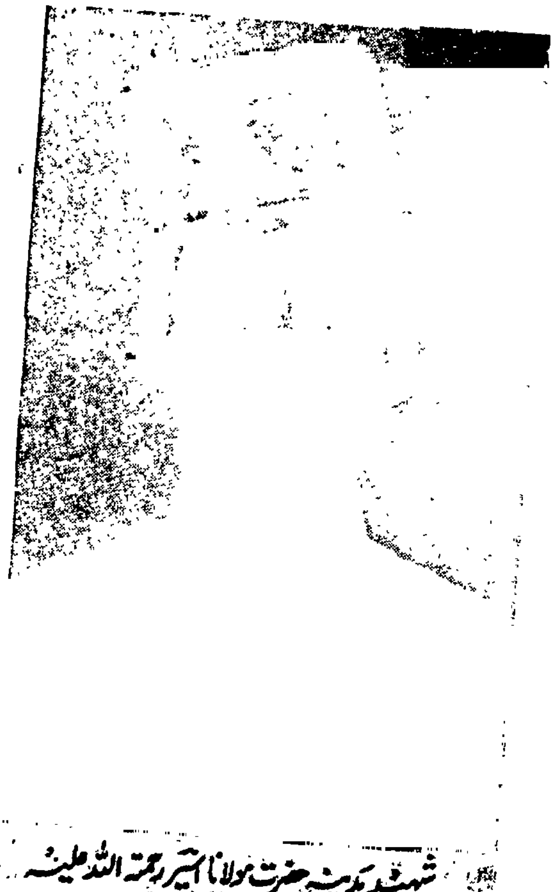
(تذکرہ کاملان رامپور، رباعیات عرش فاروقی، مرقع فیض)

[2] مولوی عبدالقادر بدایونی ولد مولوی فضل رسول بدایونی ردِ وہابیت میں بڑی شہرت حاصل ہے۔ ندوہ کی مخالفت اسلام کی خدمت سمجھ کر کی۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ علمائے ہند، اکمل التاریخ)

[3] مولانا محمد حسن بنی اسرائیلی سنبھلی ضلع مراد آباد وطن۔ حافظ۔ قاری، محدث، فقیہ مولوی عبدالسلام سنبھلی کے شاگرد تھے علم حدیث کی سند مولانا عبدالقادر بدایونی المتوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء سے حاصل کی کشف الغطاء شرح قصیدہ عزیزیہ، حاشیہ شرح وقایہ، حاشیہ ہدایہ، الکلام فی مسند الامام اعظم، تفسیر ... نظم الفرائد وغیرہ کتب کثیرہ کے مصنف ہیں۔ عقائد تفضیل رکھتے تھے۔ جوانی میں انتقال ہوا تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

[4] مولانا عبدالحق خیرآبادی ولد استاذ الحکما مجاہد جلیل علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مختلف ریاستوں میں رہے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ۱۲۸۰ھ کے بعد چند سال تک رہے آخر میں رامپور کے حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور رہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے اپنی تصنیفات میں مولانا عبدالحق کا قیام رامپور ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء تا ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء لکھا ہے جو درست نہیں ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔

(تذکرہ علمائے ہند۔ تذکرہ کاملان رامپور، باغی ہندوستان از عبدالشاہد خاں شروانی، مولانا فضل حق و ۱۸۵۷ء، مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی)



شہید مدینہ حضرت مولانا اسیر رحمۃ اللہ علیہ

اسیرؔ نے مولانا عبدالحق خیرآبادی سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔
مولانا اسیرؔ کا سلسلہ منقول و معقول صرف چھ واسطوں سے
استاذ الکل فی الکل بانی درس نظامی ملا نظام الدین سہالویؒ
المتوفی ($\frac{۱۱۶۱ھ}{۱۷۴۸ء}$) پر منتہی ہوتا ہے۔

علی احمد خاں اسیرؔ

معقول | منقول

مولانا عبدالحق خیرآبادی | مولانا عبدالقادر بدایونی

علامہ فضل حق خیرآبادی

مولانا فضل امام خیرآبادی

مولانا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی

ملا محمد اعلم سندیلوی

مولانا کمال الدین سہالوی

استاذ الکل فی الکل حضرت ملا نظام الدین سہالوی رح

مطبع نسیم سحر

مولانا اسیرؔ نے تقریباً ۱۸۷۸ء میں ایک مطبع "نسیم سحر" کے نام سے مولوی امتیاز احمد تاثیر کی شرکت میں بدایوں قائم کیا۔ اس مطبع سے ایک ہفتہ وار اخبار[1] "نسیم سحر" کے نام سے عرصہ تک شائع ہوتا رہا جسمیں بعض ادبی مباحث بھی مسلسل جاری رہے۔ خصوصاً "شحنۂ ہند" میرٹھ اور "نسیم سحر" بدایوں میں ایک بحث لفظ "طوطی" کی تذکیر و تانیث کے متعلق شوکت[2] میرٹھی اور مولوی علی احمد خاں اسیرؔ کے درمیان ایک مدت تک رہی۔ مولانا علی احمد خاں آسیرؔ کے ایک طویل مضمون "سراپائے یار بزبان ایران دیار" کی بہت دھوم و شہرت ہوئی۔ اس مضمون میں مولانا آسیرؔ نے فارسی شعرا کے کلام سے معشوق کے ایک ایک عضو کے متعلق اشعار منتخب کر کے ترتیب دیئے تھے۔ مطبع نسیم سحر مولوی محلہ میں متصل مسجد حیدر شاہ واقع تھا آجتک اس مکان پر "مطبع نسیم سحر" لکھا ہوا ہے۔ اس مطبع سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں جنمیں سے طہارت الکبریٰ مصنفہ منور حسین[3] دیوان گلزار نظم مولوی حامد بخش (خان بہادر)[4] محامد خمسہ (نعت خمسہ)

---

[1] نسیم سحر سے قبل کسی اخبار کا نام معلوم نہ ہوسکا

[2] احمد حسین نام شوکت تخلص رام پور منہاران ضلع سہارنپور وطن۔ میرٹھ میں تعلیم پائی استعداد کامل حاصل کی۔ بوجہ عسرت زمانۂ طالب علمی میں رؤسا کے بچوں کو پڑھایا۔ اکثر مطابع میں تصحیح کی۔ اخبار کوہ نور، اخبار خیر خواہ عالم اور اودھ اخبار کے اڈیٹر بھی رہے۔ میرٹھ سے اپنا اخبار شحنۂ ہند جاری کیا۔ شاعری میں مومن کے معتقد تھے۔

(تذکرہ ضیغم مولفہ عبداللہ خاں ضیغم مطبوعہ مطبع گلزار دکن حیدرآباد)

[3] منور حسین کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔

[4] خان بہادر مولوی حامد بخش ولد مولوی محمد بخش سب جج بدایوں محلہ سوتہ کے ساکن، حاجی، ذی علم، شاعر، آنریری مجسٹریٹ وائس چیرمین میونسپل بورڈ المتوفی سنہ ۱۹۰۶ء

منقبت خلفاء راشدین از شاہ دلدار علی مذاق بدایونی ؎
فضائل غوثیہ و محبوبیہ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء از شاہ دلدار علی مذاق بدایونی
باغ و بہار جیلاں (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) از مولوی ستار بخش،
صبر و شکیب کی لوٹ اور ہوش و خرد کی دوکان (مولوی
عبدالحی ؎ بیخود بدایونی) شرح گل کشتی مرتبہ مولوی امتیاز احمد
تاثیر اور مولوی امتیاز الدین غزنوی خاص طور سے قابل
ذکر ہیں۔ عبدالحی بیخود کی کتاب پر مولانا اسیر نے ایک جامع
مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ مولوی اسیر جب ۱۸۸۱ء میں صیغۂ
تعلیم میں ملازم ہوگئے تو مطبع کی ذمہ داری تمام تر مولوی
تاثیر سے متعلق رہی۔ اور پھر مولانا اسیر کا تعلق مطبع سے بالکل ختم
ہوگیا۔ جب مولوی امتیاز احمد تاثیر بھی صیغہ بندوبست میں ملازم
ہوگئے تو اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں یہ مطبع بالکل ختم ہوگیا۔ اب صرف
کبھی بدایوں کی کسی مطبوعہ کتاب پر مطبع ہذا کا نام مل جاتا ہے یا مطبع
کا مکان اس کی یاد میں نوحہ خوانی کر رہا ہے۔

ادبی نشست

مطبع نسیم سحر سے کتابیں شائع و طبع ہوتی تھیں، اخبار شائع ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ ایک قسم کا لٹریری کلب یا ادبی نشستگاہ بھی تھی۔ بدایوں کے مخصوص اہل علم و شاعر یہاں جمع ہوتے تھے۔ اور شاعری و ادب پر بحث و تحمیص ہوتی تھی۔ اس بزم میں بنیادی حیثیت مولانا اسیر و مولوی تاثیر ؎ اور مولوی امتیاز الدین ؎ غزنوی (داروغہ) کی تھی، اس کے ساتھ ساتھ درس بھی ہوتا تھا اور فارسی کے منتہی طلباء فارسی شاعری و ادب کے سلسلے میں مولانا اسیر و تاثیر اور امتیاز الدین غزنوی سے استفادہ کرتے تھے۔ جو لوگ اس ادبی محفل میں شریک ہوتے تھے ان میں قاضی غلام امیر ؎، مولوی مظہر الحق ؎، مولوی ستار بخش ؎، مولوی سیدالدین

؎ محمد دلدار علی مذاق ولد حافظ شیخ نثار علی صدیقی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ فضل غوث بریلوی اور شاہ جی عبدالرحیم شاہجہانپوری کے خلیفہ تھے۔ آپ سے بدایوں میں ناقہ سلسلہ شروع ہوا۔ بڑے کسیع اخلاق کے مالک تھے رشد و ہدایت سلک زندگی رہا۔ شاعری میں شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگرد تھے نعت میں بڑا بلند مقام ہے متکلمان ہیں ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں انتقال ہوا۔ آپ کے پر پوتے مکرمی محمد ابرار علی صدیقی صاحب مرتب کی ہمجوز زیر طبع (تذکرۃ الواصلین۔ خیر الکلام مولفہ عبدالحی صفا۔ حدیقہ تاریخ۔ حالات میاں مذاق۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری)

؎ مولوی عبدالحی بیخود ولد مولوی غلام رسول بدایونی ۱۰ محرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۷ ستمبر ۱۸۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ علوم درسیہ میں مہارت کلی حاصل کی۔ مذاق کے خصوصی شاگرد۔ وہ ہیں سے نئے وکالت کی۔ ریاست سروہی میں جوڈیشل افیسر رہے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں جودھپور پہونچے وہاں فوجداری ہے۔ ۱۳۱۲ھ میں انتقال ہوا (انتخاب ریں مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ خمخانۂ جاوید)

؎ مولوی امتیاز احمد تاثیر ولد مولوی احسان اللہ وکیل صیغۂ تعلیم دانشمندی بدایوں مولوی محلہ عربی و فارسی کے فاضل، شاعر بدایوں میں سلسلہ درس و تدریس جاری تھا میر محفوظ علی بدایونی کے شاگرد ۔۔۔ کی تحریک پر ریاست خیرپور (سندھ) میں مفتی مقرر ہوئے ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا ۔۔۔ (ماخذ حمید الدین دانشمندی)

؎ مولوی امتیاز الدین غزنوی ولد کبیر الدین بدایوں ۔۔۔ مذاق میاں کے شاگرد تھے ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ (تجلیات سخن از نظامی بدایونی)

؎ قاضی غلام امیر بدایوں ۔۔۔ کے کامیاب مختار ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا ؎ قاضی مظہر الحق وکیل بدایوں ۔۔۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

؎ مولوی ستار بخش ولد مولوی سید بخش بدایوں محلہ سوتہ۔ خانصاحب میونسپل کمشنر سکریٹری ۔۔۔ بدایوں ۔۔۔ ۱۹۰۵ء ۔۔۔ مولوی ۔۔۔ بخش قادری ۔۔۔ انتقال

شائق¹ اور مولوی غلام رسول شوق² وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ افسوس کہ آج اس محفل اساتذہ و شعرا کا محفل کی صرف یاد ہی یاد رہ گئی ہے ؎

خواب و خیال ہوگئیں ساری نمائشیں
کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

ملازمت

۱۹۰۵ء میں مولانا آسیر صیغۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے اور ان کا تعلق تحصیلی اسکول بدایوں کی مدرسی سے ہوگیا۔ مولانا آسیر اپنے دوران ملازمت میں آخر پنشن تک بدایوں ہی رہے اور نہایت نیک نام رہے طلبا کی تعلیم کا خاص لحاظ رکھتے تھے آج کل کی طرح صرف کلاس تک طلبا سے تعلق نہ تھا۔ اگرچہ آپ کی پالیسی طلبا کے حق میں سخت گیر تھی مگر اس کے نتائج بہت مفید ہوتے تھے۔ مولانا نے کبھی ٹیوشن کا سلسلہ نہ رکھا۔ اگرچہ اس زمانہ میں اس کی ضرورت تھی کیونکہ تنخواہیں قلیل تھیں مگر اس کے باوجود حسب موقع طلبا کی درخواست پر گھر پر درس ہوتا تھا بلکہ امتحانات کے زمانہ میں تو کبھی کبھی اسکول میں بھی مقررہ اوقات کے علاوہ پڑھاتے تھے۔ دوران ملازمت میں کئی دفعہ عارضی طور سے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس بھی مقرر ہوئے وہ بھی کیا زمانہ تھا جبکہ مولانا علی احمد خاں آسیر جیسے مدرس اور منشی دیبی پرشاد سحر³ بدایونی و مولوی نواب ذکریا خاں⁴ ذکی کی

---

¹ مولوی سید جلال الدین شائق ولد صبیح الدین عباسی بدایوں جاہ میر وکیل تھے کسی وجہ سے سند وکالت ضبط ہوگئی قانون پر کئی کتابیں لکھیں ۱۸۹۵ء میں بدایوں سے ایک اخبار انتخاب عالم جاری کیا۔ بڑے قابل اور ذہین تھے۔ شاعری میں فضل لکھنوی سے تلمذ تھا ۶۰ سال کی عمر میں ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا جلیل الدین نوشہ عباسی مشہور تاریخ گو آپ کے فرزند ہیں۔ (خمخانہ جاوید از لالہ سری رام ایم۔اے)

² مولوی غلام رسول ولد شیخ سکندر بدایوں سید باڑہ۔ المتوفی ۱۹۲۴ء مولوی امام الدین کے شاگرد۔ بدایوں کے فارسی کے بہترین استاد بدایوں کے اہل علم میں اکثر بیشتر مولوی صاحب کے تلامذہ کی ہے۔

³ منشی دیبی پرشاد سحر ولد منشی جنی لال آشفتہ بدایوں محلہ حسینی گلی۔ ان کے دادا منشی حکومت رائے نے عالمگیر سے علاقہ لکھنؤ سے آکر بدایوں توطن اختیار کیا محکمہ مال میں ملازم ہوئے۔ منشی دیبی پرشاد ۲۳ دسمبر ۱۸۳۸ء کو پیدا ہوئے ۱۴ سال کی عمر میں بہ توجہ مولوی طاہر الدین فرشوری علوم مروجہ اور درسی کتب منہ اللہ سے فراغت کلی حاصل کی۔ فاضل علوم عقلی و ریاضی و طبی وغیرہ اور فنون خوشنویسی و مصوری وغیرہ مختلف اساتذہ سے تحصیل کئے منشی صاحب ڈپٹی انسپکٹر سہسوان بدایوں تھے۔ فن میں مختلف رسالے لکھے خلاصہ منطق ۱۸۹۰ء مطبوعہ نولکشور پریس معیار البلاغت مصنفہ ۱۸۶۷ء تاریخ معیار الاطہار ۱۸۶۶ء دیوان سحر سامری ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء اندر سبھا چیپں ۱۸۵۳ء اور نظم پروین ۱۸۶۲ء وغیرہ وغیرہ مصنفہ آپ کی یادگار ہیں۔ (خمخانہ جاوید۔ تذکرہ ضیغم)

⁴ نواب سید محمد ذکریا خاں ذکی ولد نواب سید محمد خاں۔ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ تخلص سرور ناظم تھے باپ اور دادا دونوں صاحب دیوان شاعر سرور کا ایک تذکرہ ریختہ گو شعرا کا ہے تعلیم دہلی جا کر فارسی عربی پر عبور حاصل تھا فن طب، حدیث، فقہ، تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی و خوشنویسی میں باخبر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے۔ فن شعر میں غالب سے تلمذ تھا شعبہ تعلیم میں ملازم ہوئے ۱۸۷۰ء میں بدایوں سے بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشن پائی ۱۹۰۳ء میں بدایوں منتقل ہوا دیوان چھپ گیا ہے۔ (تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ)

جیسے ناس یگانہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا آسیر پنشن یاب ہوئے۔

سینٹ جانس کالج آگرہ کی پروفیسری

مولانا آسیر کی ۱۹۱۳ء میں پنشن ہوئی اسی سال ان کا تقرر سینٹ جانس کالج آگرہ میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا۔ بدایوں کے اکثر طلبا کالج مذکور میں زیر تعلیم تھے جنہیں سے مولوی رحمان بخش بدایونی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولوی عبدالمعبود سہسوانی بھی کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے ہر دو فضلائے بدایوں میں بڑا اتحاد و اتفاق تھا۔ مولانا آسیر کا ایک خاص علمی حلقہ تھا جس کے ارکان خصوصی میں مولوی انعام اللہ خاں رئیس آگرہ، مولوی سعادت اللہ بنی اسرائیلی صدر شعبۂ عربی ڈھاکہ یونیورسٹی، مولوی عبدالمعبود سہسوانی اور مفتی انتظام اللہ شہابی وغیرہ تھے۔

مولانا آسیر کے تعلقات مولانا سلیمان اشرف (پروفیسر دینیات مسلم یونیورسٹی المتوفی ۱۹۳۹ء) سے خصوصی طور سے تھے۔ مولانا محلہ چار سو دروازہ (آگرہ) رہتے تھے۔ طلبا کا درس گھر پر ہوتا تھا۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا جس کی تفصیل تصنیفات کے ذیل میں درج کی جائے گی۔

ایک خاص واقعہ

مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب[1] اس واقعہ کے راوی ہیں کہ ۱۹۱۳ء میں ایک دن صبح کو مفتی صاحب مولانا آسیر کے یہاں پہونچے۔ مولانا دلائل الخیرات پڑھ رہے تھے جب فارغ ہوئے، مفتی انتظام اللہ شہابی نے مولانا سے کہا کہ صبح کے وقت قرآن شریف پڑھنا چاہیئے آپ قرآن شریف کے بجائے دلائل الخیرات پڑھتے ہیں۔ مولانا آسیر نے بغیر کسی ناگوار تاثر کے کہا قرآن شریف بھی پڑھتا ہوں اس کے بعد دلائل الخیرات۔ اور وہ اس لئے کہ کہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے ان کی محبت پیدا ہو جائے اور مدینہ میں ٹھکانا بنجائے۔ چار سال بعد مولانا آسیر حج کے لئے تشریف لے لئے تو انہوں نے مفتی شہابی کو مدینہ سے خط لکھا کہ دلائل الخیرات کے پڑھنے سے یہاں تک آگیا ہوں خدا کرے کہ یہاں (مدینہ) ہی رہ جاؤں۔ کیا معلوم تھا کہ عالم قدس سے ان الفاظ کو مقبولیت کا شرف حاصل ہو۔ مفتی انتظام اللہ شہابی آج بھی اس واقعہ کو ایک خاص تاثر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

بیعت

مولانا آسیر سلسلہ نقشبندیہ میں شاہ عظیم الدین غزنوی عرف شاہ عاشق احمد بدایونی (المتوفی ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء اترولی ضلع علی گڑھ) سے بیعت تھے۔ اس پر خانوادہ قادریہ بدایوں کی تعلیم و تربیت اور عقیدت مستزاد

---

[1] مفتی انتظام اللہ شہابی۔ و۔ مفتی اکرام اللہ آپ کے دادا مفتی انعام اللہ خاں نے اکبرآباد بسلسلہ ملازمت وکیل سرکار توطن اختیار کیا تھا۔ یہ آپکا خاندان علمائے گوپامئو سے متعلق ہے۔ ملا حبیب الدین مولف فتاوی عالمگیری جیسے اکابر گزرے ہیں صدیقی النسب ہیں ۱۸۹۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد رمضان شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے عربی کی تحصیل متوسطات تک کی۔ کتب کثیرہ کے مصنف و مولف ہیں آجکل انجمن ترقی اردو میں شعبۂ تصنیف و تالیف سے متعلق ہیں۔

جس کے تحت مزارات پر حاضری ضروری نسبت قادری پرستیداو فریفتہ نسبت چشتیہ پر مدہوش مسلسل بارہ سال تک عرس خواجہ اجمیر میں شرکت کا التزام رہا۔ جذبہ اویسیت کا غلبہ محبت رسول میں سرشار و سرمست۔ نام رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سنتے ہی غلبۂ رقت غرض اسی حب نبیؐ جذبہ صادق اور تمنائے دلی کا اثر کہ مولانا آسیر نے مدینہ میں ابدی آرام فرمایا۔

سفر حج

مولانا اسیر نے رمضان ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء کے آخری ہفتہ میں حج کی تیاری کی۔ ۱۲ر شوال کی شب میں محفل نعت و منقبت منعقد کی صبح اولیائے کرام بدایوں کے مزارات پر گئے۔ ۱۳ر شوال شنبہ کو معہ صاحب خانہ بدایوں سے روانہ ہوئے ۱۴ر شوال کو اجمیر شریف پہونچے حاضری خواجہ سے فارغ ہوکر ۱۶ر شوال کو بمبئی پہونچے۔ مولوی محمد جمیل صاحب قادری کے یہاں قیام کیا۔ ۷ر ذی قعدہ (دوشنبہ) جہانگیر جہاز سے دیار محبوبؐ کو روانہ ہوئے بارہ دن میں یہ سفر ختم ہوا۔ ۱۸ر ذی قعدہ کو جدّہ پہونچے ۲۱ر ذی قعدہ کو مکہ معظمہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ ابھی ۱۷ دن حج میں باقی تھے۔ ۹ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ مطابق ۹ر جون ۱۹۲۷ء (پنجشنبہ) کو حج ادا فرمایا۔

حاضری مدینہ و وصال

مدحت رسول کریمؐ جس کا مدار حیات اور نعت نبیؐ جس کا مقصود زندگی ہو، جو ہر وقت یہ ورد زبان رکھے

وہ دن آئے کہ میں طیبہ کو دیکھوں
الٰہی! گنبد خضریٰ کو دیکھوں (اسیر)

اس کے شوق و تمنائے مدینہ کا کیا پوچھنا آخر مولانا آسیر ۲۳ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء مکہ سے مدینہ کو روانہ ہوئے مولانا بفضلہ تندرست و صحت مند تھے راہ مدینہ میں شوق و ولولہ کا عجیب عالم تھا ۱۲ر محرم ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء کو مدینہ شریف پہونچے۔ ایک مدّت کی آرزو پوری ہوئی نخل تمنّا بار آور ہوا۔ گنبد خضریٰ کا نظارہ ممد حیات ٹھہرا۔ مولانا آسیر فرماتے ہیں:۔

زریں کلس گنبد مینا نظر آیا		اے صل علیٰ آج مدینہ نظر آیا
اے صل علیٰ ہونے لگی بارش رحمت		در پہ جو یہ درویش کمینہ نظر آیا
کیوں قید علائق سے رہا ہو نہ آسیر آج
یعنی رخ سلطان مدینہ نظر آیا

مدینہ میں آٹھ روز قیام رہا۔ چالیس نمازیں پوری کیں اثنا راہ اور دوران قیام مدینہ مولانا کے ورد زبان برابر درج ذیل شعر رہا:۔

الجھ کر رہ گیا میں وادیٔ طیبہ کی خاروں میں
مجھے پہنچا دیا ان عشق نے منزل جاں تک

یہ شعر چند سال پہلے بطور پیشین گوئی مولانا آسیر کی زبان سے بےساختہ نکلا تھا۔ ۲۰ر محرم الحرام ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۰ر جولائی ۱۹۲۷ء بروز پنجشنبہ ادھر امام مسجد نبوی نے سلام پھیرا اور ادھر مولانا آسیر کی روح پاک نے علائق دنیا سے رہائی حاصل کرکے اعلےٰ علیین کی راہ لی۔ انا للہ

ـــــــ

لہ مولانا آسیر مرحوم کی شادی ضیاء النساء بنت شیخ کفایت حسین صاحب پودری سے ہوئی تھی۔ مولانا کے صرف ایک لڑکی ہوئی جو کم سنی ہی میں مرگئی۔ مولانا آسیر نے اپنی بیوی کے حقیقی بھانجے محمد یعقوب حسین ضیاء القادری کو پسر خواندہ قرار دیا۔ آپ کی بیوی ضیاء النساء کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔

تاریخ وصال از ضیاء القادری بدایونی[1]

ہوگیا جب وصل شہ کائنات — امر یقینی ہے کہ پائی نجات
بعد وصال اگر ہو گر دیکھنا — پردہ اسرار مکرر اٹھا
۲۷۶۷ = ۱۳۴۶ھ

دیگر

کہیئے ضیاء سال وصال جناب
خاتمہ بالخیر ہوا بے حجاب
۱۹۲۷ء

تاریخ گوئی مولانا اسیر کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ رنج و خوشی پیدائش و موت کے مواقع پر تاریخیں کہتے تھے۔ مکانات، مساجد، چاہ اور قبور پر اکثر تاریخیں نصب ہیں۔ بعض معاصرین و متعلقین کی تصانیف اور دواوین پر تاریخیں لکھی ہیں۔ اعزا کے تاریخی نام تجویز کئے[2]۔ مولانا اسیر کی جو تاریخیں دستیاب ہوئیں وہ درج کی جاتی ہیں۔

تاریخ انتقال مولانا فضل رسول بدایونی[3]

واحسرتا کہ مہر جلال و مہ کمال
زیر زمیں بکنج لحد آرمیدہ شد
فضل رسول رحمت حق لطف کردگار
از اہل دین بجذب الٰہی کشیدہ شد
رضواں بصد نیاز سلام علیک گفت
کوثر بشست و شو بر کابش دویدہ شد
زصرصر فراق برنگ شمیم گل
رنگ از رخ بہار دو عالم پریدہ شد
داماں صبر و جیب تسلی لباس ہوش
از پنجۂ الم ہمہ یک یک دریدہ شد
ظلمت بچشم اہل نظر گشت مستقیم
نور و ضیاء خانہ مردم رمیدہ شد
چوں در خیال سال وصال شریف او
در سجدہ یک بیک سر کلکم خمیدہ شد
ناگاہ در جبیں شب یلدائی درد و غم
آئینہ گفت ہیچ ندیدی چہ دیدہ شد
سر زد بچرخ ماہ درخشاں ز فرط غم
خورشید خوں گریست فروغ آمد بدیدہ شب
۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء

---

[1] مولانا ضیاء القادری نے ایک مختصر سی مثنوی "رویائے رنجاں" (مثنوی حسرت و اندوہ) کے نام سے مولانا اسیر مرحوم کے سفر حجاز اور وصال کے حالات میں لکھی ہے جس میں چند تاریخ وصال بھی شامل ہیں۔ یہ رسالہ منشی علیم الدین کی فرمائش سے ۱۳۴۶ھ انجمن پریس بدایوں میں طبع ہوا۔

[2] مولانا اسیر نے اپنے قریبی عزیز مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء قادری کا تاریخی نام "محمد فضل الرحمٰن" (۱۳۰۰ھ) رکھا اور ضیاء القادری صاحب کے فرزند خورشید کا تاریخی نام "محمد اظہر الحق" تجویز کیا۔

[3] مولوی فضل رسول ولد مولوی عبد المجید بدایونی۔ مولوی محلہ، مولانا انوار الحق فرنگی محلی، مولانا عابد سندھی اور حکیم بہر علی وغیرہ سے علوم مروجہ و فن طب تحصیل کئے۔ طب میں بڑا کمال حاصل تھا۔ کچھ دنوں سررشتہ دار عدالت بدایوں رہے۔ بہت تخلص فرماتے تھے۔ رد وہابیت میں خاص شہرت۔ کتب کثیرہ کے مصنف ہیں۔ ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔ (قاموس المشاہیر، تذکرہ علمائے ہند، تذکرۃ الواصلین، اکمل التاریخ)

دیگر

زہد عقل رنج و غم گذشتہ

۱۲۱۹
۱۰
―――
۱۲۸۹ھ

دیگر

غریب دار بقا از جہاں سر برگشت
ریاض دہر و بدل حیف ذرہ ذرہ بدست
فراگذشتہ بعقل خیال سال اسیر
طبیب من بغم جست گفتہ کہ بگذشت

۱۱۳ + ۲۰ ۱۳۲۲
۱۳۳
―――
۱۲۸۹ھ

اس رباعی سے دو تاریخیں برآمد ہوتی ہیں پہلی صنعت توشیح کے طریقہ پر چاروں مصرعوں کے سروں کے حروف کے مجموعہ سے ۱۲۸۹ھ برآمد ہوتے ہیں اور دوسری مصرعہ چہارم سے بطور تخرجہ لفظ "بگذشت" سے

مولوی عبدالقادر بدایونی المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء کے انتقال پر مولانا اسیر نے اکثر تاریخیں مختلف زبانوں میں کہی تھیں وہ سب "خلوت گاہ نور" کے تاریخی نام سے طبع ہو چکی ہیں۔

تاریخ انتقال مولوی عبدالمقتدر صاحب[1] بدایونی

وا دریغا آں سراپا آئینۂ قرآن حق
حجت الاسلام سیف اللہ آں برہان حق
وا دریغا ثانی و باقی بنات ذوالجلال
آفتاب اوج عرفاں بدر گردون کمال
والہ و دلدادۂ حسن ادائے مصطفیٰ
جاں نثار سید الابرار محبوب خدا
در صداقت پرتوے از مہر صدق یار غار
در غنا ابن غنی عثمان مہ اوج وقار
در جلالت ظل فاروق شہ گردوں رکاب
در تواضع لمعۂ انوار حسن بوتراب
بادہ نوش ساغر بزم حضور غوث پاک
شمع نور اولیا از عشق خواجہ سینہ چاک
صدر بزم قدس نور دیدہ اچھے میاں
سید السادات فخر خانداں فخر جہاں
نور عین عین حق جان و دل فضل رسول
جانشین مظہر حق درۃ التاج قبول
دلربائے عبد قادر مقتدر ذوالاقتدار
والیٔ ملک ولایت خضر اہل روزگار
کرد رحلت وا دریغا از جہاں سوئے جناں
الاماں از سوز و درد ہجر یارب الاماں
باد نور قرب حق یارب بروح او نثار
بر مزارش سائبان رحمت پروردگار
گفت بہر یادگار او اسیر خستہ حال!
"قطب الاقطاب صاحب سجادہ بغداد دل" ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء

مولوی عبدالمقتدر بدایونی کے انتقال پر اور بھی تاریخیں مولانا اسیر نے کہی تھیں جو کہ "ہدیہ" رسالہ مطبوعہ میں شامل ہیں۔

---

[1] عبدالمقتدر ولد مولانا عبدالقادر بدایونی ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے، عالم فاضل درویش، نہایت نیک سیرت ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں انتقال ہوا۔ (اکمل التاریخ، حدیقہ تاریخ از سید منظور علی) عہ تخرجہ سے تاریخ پیدا ہوتی ہے

تاریخ وفات داروغہ کاظم علیخاں بریلوی

مولانا اسیر کے چچا زاد بھائی

آں رخ کرم و معظم — اخلاق و فا کرم مجسم
کاظم علی خاں جناب والا — او کرد بقرب حق تعالیٰ
صد حیف ازیں جہاں بروں گشت — داروغہ روضہ جناں گشت
لخت جگرش سعید و مسعود — دانشور و ذی شعور و محمود
فیاض بر عزو جاہ و اجلال — یارب بر جہاں بود بہ اقبال
فکر ست اسیر بہر سالش — دارد غلطے بدل خیالش
اکتوبر و محترم محرم — ہجری نبوی و عیسوی ہم
گر نوزدہ و ہزار و نہ صد — سی ہشت د ہزار و سہ صد آمد
ہم معنوی انتقال با حق — در خلد بریں وصال با حق

۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء

تاریخ انتقال سید منشی منظور علی[1] بدایونی مصنف آثار اولیائے شہر بدایوں (شاگرد مولانا اسیر)

نالہ درد و غم

۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء

منظور علی کہ بود نخل آمال — صد حیف کہ بخلد رفت با درد و ملال
از فکر اسیر خستہ بند الم — (منظور دل علی) بود سال وصال

۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء

قطعہ تاریخ عقد سید مہدی حسین ایم اے بلگرامی[2] انسپکٹر مدارس

الٰہی شادی آں جاں رخاں مبارکباد
قران شمس القمر در جہاں مبارکباد
فلک تبارک نوشاہ گشت گوہر ریز
صبا بہ خسرو گل گل فشاں مبارکباد
بہ باغ حسن بود نونہال عشق مدام
عروس بخت بہ آغوش جاں مبارکباد
بگل زمین جلال ست نور مہر کمال
ہمیں زمین و ہمیں آسماں مبارکباد
بدیدہ نور و بدل شوق ہمچو رنگ بگل
سر و سینہ بہ آرام جاں مبارکباد
برنگ رنگ حنا بوسہ بوسہ لب برجہاں
بہ پائے او سر صد سروراں مبارکباد
اسیر دیدہ دل حلقہ در سال است
عروس دولت نوشاہ بزم اقبال است

۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء

تاریخ تصنیف عمدۃ التحقیق مصنفہ حافظ حمید الدین بدایونی[3]

مرحبا مجموعہ تحقیق انساب شیوخ — گنج اسرار معانی مشرق انوار راقم

---

[1] منظور علی ولد سید برکات علی محلہ بھاجی ٹولہ بدایوں المتوفی ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء مختلف رسائل کے مصنف۔ بدایوں کے اولیاء کے تذکرہ میں "کلام منظور اولیاء" ایک منظوم قصیدہ لکھا حاشیہ میں اولیاء کا مختصر ذکر ہے یہی کتاب دوبارہ اضافہ کے ساتھ آثار اولیائے شہر بدایوں (حدیقۂ تاریخ کے نام سے مولانا اسیر کے زیر اہتمام آگرہ سے طبع ہوئی ... بیناتاگ کے محکمہ سروے میں ڈرافٹسمین تھے۔ جوان موت ہوئی۔

[2] سید مہدی حسین ولد نواب عماد الملک ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے رواجی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی آکسفورڈ سے ایم اے کیا ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں صوبہ یوپی میں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے پانچ سال تک یہ خدمات انجام دیں، پھر حکومت حیدرآباد (دکن) نے طلب کر لیا۔ اول اسسٹنٹ پولیٹکل سکریٹری پھر مالیات میں، ڈپٹی سکریٹری : فینانس سب سے آخر میں وزیر تعلیم ہوئے سنہ ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔ (منظر الکلام از منظر علی (شہر حیدرآباد) مطبوعہ عمادیہ پریس حیدرآباد دکن)

[3] حافظ حمید الدین دانشمندی ولد مولوی سعید الدین وکیل بدایوں مولوی محلہ المتوفی ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء اپنے خاندان کی ایک تاریخ عمدۃ التحقیق فی آل سیدنا صدیق تالیف کی جو بہت سی غیر محقق کہانی پر ہیں اور سنوں کا مطلق خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ (عمدۃ التحقیق)

رآلی یاسفار رحمۃ اللعالمین ۔ مصنف آیات دست بہرا ہما نیانہ

سال تالیفش بعد صدق و صفا گفتم اسیر

بے مثال آئینۂ تحقیق آل پاکباز

$\frac{\text{۱۳ ۳۲ھ}}{\text{۱۹ ۱۴ء}}$

تاریخ تصنیف تاج مضامین از مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری[1] (دیوان نعت)

مرحبا گلگونہ روئے عروس نوبہار

بارشِ انوار از کلکِ ضیا رنگیں نگار

حمد و نعت و منقبت چشمہ بحرِ سخن

از فیوض مبدء و فیاض یکجا موجزن

بادیا رب پر اثر در کشش جاہت روزگار

ہیچو یک نقش منکشف بہر تسخیر ہزار

گر اسیر از بہر تاریخش بود بیہم خیال

بارک اللہ ہست نظم دلکش فرخندہ سال

$\frac{\text{۱۳ ۴۵ھ}}{\text{۱۹ ۲۶ء}}$

تاریخ طبع دیوان چودھری اصغر علی ضابط[2] رئیس کھیڑہ بزرگ بدایوں

مرحبا اے فکر ضابط مرحبا ۔ حبذا اے شاعر عالی تبار

گلشنِ پیدا طائر ذہن رسا ۔ خامۂ رنگیں رگ ابر بہار

حسن مطلع مطلع دیوان حسن ۔ مصرعہ موزوں قدر عنائے یار

عقد پروین گوہر سلک سخن ۔ ثابت و سیار لفظ آبدار

مصرعۂ تاریخ دیواں اے اسیر

جوہر تیغ زبان آبدار ۱۸۹۲ء

مولانا اسیر نے اپنے بیٹھک دروازہ مسجد (چاہ نوری) کو مرمت و تعمیر کرا کے مندرجہ ذیل تاریخ تعمیر کا پتھر نصب کرایا

(۱) باغِ نورانی $\frac{\text{۱۳ ۲۰ھ}}{\text{۱۹ ۰۲ء}}$

(۲) "خلوت گاہ انوار" ست سال $\frac{\text{۱۳ ۲۰ھ}}{\text{۱۹ ۰۲ء}}$

مولوی محلہ کی مسجد (چاہ ماہی) محمد شیخ قدرت اللہ سوختہ میں مولانا اسیر کی تاریخ درج ذیل نصب ہے۔

قدرت اللہ اکبر جلوہ گاہ نور ہے $\frac{\text{۱۳ ۳۴ھ}}{\text{۱۹ ۱۵ء}}$

---

[1] مولوی محمد یعقوب حسین ضیا ولد شیخ یا د حسین بدایونی حال ساکن کراچی ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام مظہر محمد فضل الرحمن ہیں۔ چار سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ مولانا اسیر نے بوجہ اپنی بیوی کے حقیقی بھانجے نیز اپنے لاولد ہونے کے مثل فرزند کے پرورش کیا اور تعلیم و تربیت فرمائی ۱۸۹۸ء میں مڈل پاس کیا ۱۸۹۸ء ـ ۱۹۰۱ء محکمہ پولیس میں ملازم رہے ۱۹۰۲ء پرائمری اسکول (میونسپل بورڈ) میں رہے پھر ۱۹۰۶ء صیغہ تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازم رہے ۱۹۱۲ء میں کلکٹری بدایوں میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو ہیڈ قانونگو کی حیثیت سے پنشن پائی۔ سلسلہ قادریہ میں مولوی عبدالمقتدر صاحب بدایونی سے بیعت ہیں۔ آپ کا شمار مشہور و مخصوص نعت گو شعراء میں شمار ہے "ضیاء القادری" کے نام سے معروف ہیں اکمل التاریخ دو حصے (سوانح عمری مولانا فضل رسول صاحب بدایونی) تذکرۂ طیبہ (سوانح مولوی عبدالماجد بدایونی) کرامات ہفت احمد، تاج مضامین (دیوان) تجلیات نعت، خطبۂ موثرہ منظوم (خطبہ آل انڈیا میلاد کانفرنس و آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ قصبہ نواب گنج ضلع بریلی ۱۹۴۴ء) مرقع شہادت، نغمہ ربانی، ستارۂ چشت، نغمہائے مبارک، سفرنامہ حجاز، جواہر غوث الورائی (سفرنامہ عراق) وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ مولوی صاحب کا اخلاق بہت وسیع ہے۔ ایک خاص اور قابل قدر بات یہ ہے کہ حق بات اپنے چھوٹے اور خورد کی بھی مان لیتے ہیں۔

[2] چودھری اصغر علی ضابط تخلص ابن چودھری فضل حسین رئیس کھیڑہ بزرگ (بدایوں) سال پیدائش تقریباً ۱۲۵۵ھ/۱۸۴۲ء ہے۔ نامی گرامی رئیس اور خوش فکر شاعر تھے دیوان ضخیم شائع ہو چکا ہے۔ بدایوں کے بڑے شاندار مشاعرے کرتے تھے جن میں نہ صرف شعرائے دہلی، لکھنؤ بلکہ لکھنؤ وغیرہ سے بھی شاعر شریک ہوتے تھے۔ (تذکرہ صنم خمخانۂ جاوید)

شاعری شاعری کے ذریعہ انسان اپنے واردات قلبی اور جذبات دلی کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا اسیر مداح رسولؐ اور ثنا خوان بزرگان دین تھے۔ اور ان کی شاعری نعت و منقبت سے عبارت ہے حسن و عشق مجازی کی دنیائے شاعری آزاد ہے لیکن نعت و منقبت کا میدان تنگ و دشوار گزار، یہ منزل بڑی کٹھن ہے یہاں شریعت کی پابندی سخت اور افراط و تفریط کا ہر لحظہ خطرہ، ممدوح کے آداب اور حفظ مراتب کا پورا خیال نہ ہو تو اصل مقصد کے فوت ہونے کا اندیشہ ہر وقت رہتا ہے۔ اردو کی بزم نعت و منقبت کے مسند نشینوں میں محسن کاکوروی، کرامت علی شہیدی، حسن بریلوی اور ضیا مانی بدایونی وغیرہ مشہور و سرآمد روزگار رہے ہیں لیکن مولانا اسیر مرحوم نے بھی نعت و منقبت میں رنگ تغزل پیدا کرکے امتیاز و اختصاص حاصل کیا ہے۔

مولانا اسیر نے مدحت رسولؐ کا جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ عقیدت و محبت کے انواع و اقسام کے پھولوں سے عبارت ہے عقیدت کا ایک بحر بیکراں موجزن ہے۔ الفاظ کے آئینہ میں واردات قلبی و کیفیات باطنی کی عکاسی ہو رہی ہے تصوف کی بنیاد تزکیۂ نفس و صفائی قلب سے عبارت ہے الفاظ تصنع و تعلی سے قطعاً پاک ہیں۔ بندش کی دلآویزی، زبان کی روانی اور تخیلات کی پاکیزگی اپنے اپنے مقام پر حد انتہا ت

---

۵۱ محمد محسن محسن ولد مولوی حسن بخش کاکوری وطن ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ علم کی تحصیل اپنے دادا، والد اور مولوی عبدالرحیم سے کی شاعری میں مولوی ہادی علی سے تلمذ تھا۔ آگرہ، مین پوری وکالت کے سلسلہ میں قیام رہا۔ اخلاق بڑا وسیع تھا۔ نعت میں خاص شہرت ہے۔ ان کی شاعری الفاظ کی شان و شکوہ، بندش کی چستی اور استعارات کی رنگینی سے عبارت ہے۔ ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔

(گل رعنا لکھنؤ کا دبستان شاعری)

۵۲ کرامت علی شہیدی ولد عبدالرسول بریلی (روہیل کھنڈ) وطن لکھنؤ پرورش پائی۔ مصحفی و شاہ نصیر کے شاگرد۔ بادہ کش، زندہ دل مرنجاں مرنج اور وارفتہ مزاج تھے۔ بکسریٹ میں ملازم تھے۔ عجیب طریقہ سے قطع تعلق ہوا۔ سیاحت اختیار کی ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں حج کیا۔ ۴ صفر ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء کو جب ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آرہا تھا تو ان کا مندرجہ ذیل شعر پورا ہوا۔ اور واصل بحق ہوئے ؎

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے — قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا (گلشن بیخار)

۵۳ حسن رضا خاں ولد مولوی نقی علی خاں ۴ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء کو بریلی پیدا ہوئے داغ کے مخصوص شاگردوں میں تھے نعت میں اپنے بڑے بھائی مولوی احمد رضا خاں مرحوم سے استفادہ کیا۔ ۲۲ رمضان ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء کو ۵۰ سال چھ ماہ کی عمر میں انتقال کیا۔ تزک مرتضوی (اثبات تفضیل شیخین رضی) نگارستان لطافت (میلاد) آئینہ قیامت (ذکر واقعات کربلا) دین حسن (حقانیت اسلام) ذوق نعت (نعتیہ کلام) قند پارسی (کلام فارسی) ثمر فصاحت (کلام مجاز) اور دو صمصام حسن (رد ندوہ) بے موقع زیاد کا جذب جواب (اثبات مسئلہ قربانی) وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ حسن بریلوی کی عاشقانہ اور نعتیہ شاعری سے متعلق دو گرانقدر مقالے سید لطیف حسین ادیب بریلوی نے العلم کراچی اپریل ۱۹۰۵ء و العلم جون ۱۹۰۵ء میں سپرد قلم کئے ہیں۔ (شعر الہند جلد اول، خمخانہ جاوید جلد دوم۔ العلم اپریل ۱۹۰۵ء العلم جون ۱۹۰۵ء)

ـت آفریں پیام اہلِ ذوق کو پہنچاتے ہیں اس پر صنائع و بدائع برمحل استعمال نے کلام کو اور بھی بلند کر دیا ہے۔ مولانا امیر کی ی ولادت رسول کریم (نظام الشہود) بالیں ہمہ اس قدر ـول ہوئی کہ آج تک لوگوں کو ورد زبان ہے۔ ذرا سلاست انی اور کیفیات ملاحظہ فرمایئے۔

ـے گھر آئے وہ پیارے — خادم جن کے ملائک سارے
ـروہ نکلا آج زمیں پر — نور ہے جس کا عرش بریں پر
فیع محشر رحمتِ عالم — فخرِ ملائک نازشِ آدم
ـر کا شعلہ عرش کا جلوہ — حسن مدینہ غازہ کعبہ
ـکا تبسم خندہ غنچہ — مردم دیدہ چشم تماشا
ـاں گلستاں شمع شبستاں — بلبل بطحیٰ طوطی کنعاں
ـہر نبوت ماہ رسالت — شانِ الٰہی آیۂ رحمت
ـج عرب کی قسمت جاگی — کفر کی ظلمت کوسوں بھاگی
ـبہ نہ کیوں ہو قبلہ و کعبہ — کعبہ میں آئے قبلۂ کعبہ
ـے جہاں میں فخر دو عالم — فرش زمیں ہے عرش اعظم
ـرفتنے ہیں روپوش شیاطیں — اوندھے ہو گئے تخت سلاطیں
ـرش جھکا سب تارے ٹوٹے — ساتوں فلک کے چھکے چھوٹے
ـیعواں طشت زمرد لایا — نور کے پانی سے نہلایا
حوریں کرتہ ٹوپی لائیں — شوق میں یوں مستانہ گائیں

مثنوی نظام المعراج سے چند مواقع درج کئے جاتے ہیں جن سے قدرت زبان تشبیہات و استعارات بلند خیالی نازک آفرینی اور جذبات دلی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شب معراج معراج شب و روز
تجلی و سیاہی دیدہ افروز
سیاہی و سپیدی دونوں محبوب
دوشالہ ہر عروس شب کا کیا خوب
سیاہی میں وہ انجم کا اُجالا
دوپٹہ چاندتاروں کا ہے کالا
سیاہی اس کی موسیٰ کی پلک ہے
روانی چشم آہو کی جھلک ہے
اندھیرا شب کا حسنِ دعا ہے
اجالا شمع راہِ ہر دعا ہے
سیاہی ماہ کی آنکھوں کا ہے نور
تجلی تو تیا ہے دیدۂ نور

ادھر شوق لقا میں کوئی بیتاب
ادھر کوئی ہے نقش بستر خواب
ادھر ملنے کا کوئی آرزومند
اُدھر ہیں آنکھیں خواب ناز سے بند
یکایک حضرتِ جبریل آئے
پیام دلربائے وصل لائے
مؤدب دست بستہ سر جھکا کر
جبیں کو پائے انور سے لگا کر
شب اسریٰ کے دولہ کو جگایا
زباں بن کر کسی کو یہ سنایا

براق برق دم مرغ سبکبال
ہر اک بڑھتی ہوئی دولت کا اقبال
سواری کے لئے حاضر ہے در پر
کہ پیر اس کے ہیں گویا نور کے پر

چلا جب لیکے اس جان جہاں کو
بنایا لامکاں دم میں جہاں کو
نہ شعلہ تھا نہ وہ برق و شرارہ
کسی کی آنکھ کا تھا اک اشارہ
براق برق وش کی سیر کا طور
صدائے گنبد گردوں کا تھا دور
خرام ناز نے جوہر دکھایا
نگہ کی مثل جاکر لوٹ آیا
عجب جانا تھا اس کا طرفہ آنا
کہ آنا اور جانا کچھ نہ جانا

ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سلسلہ چشت کے بانی اور اولیاء ہند کے سرتاج ہیں۔ ان کی مساعیِ جمیلہ سے کفرزار ہند میں اسلام پھیلا۔ خواجہ صاحب کا دریائے فیض ابھی تک موجزن ہے۔ مولانا آسیر کو خواجہ بزرگ سے ایک والہانہ عقیدت تھی جو منقبت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ مولانا نے خواجہ بزرگ کی شان میں ایک مختصر سا دیوان بعنوان "منقبت خواجہ ولی ہند" ترتیب دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

ما چہ دانیم کہ اجمیر کجا دارد
مرکز ما توئی اے اہل رجوع اجمیر

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

خوابگاہ تو بود منزل پاک اجمیر
بارک اللہ زہے قسمت خاک اجمیر
ہے شہنشاہ ولایت کا یہ دیوان گزماں

سب سے اعلیٰ ہے وہ عالی ہے جناب اجمیر
تیرے ہی دم سے ہے سب شان و شان اجمیر
جب نہ تھا تو بخدا کیا تھی بساط اجمیر
سنگِ رہ تیرا معراج کی پہلی سیڑھی
اہل دل سے کوئی پوچھے درجات اجمیر
اے شہ حسن بیا در دلِ ویرانۂ ما
از تو آباد دریں سینہ دیار اجمیر

خواجہ بزرگ کی نسبت سے اجمیر کی ہر چیز قابل مدح و تعظیم، اور لائق ستائش و محبوب، اجمیر کے جھرنے کا منظر باؤلی کا نظارہ اور وہاں کے قدرتی آبشار کا پانی کتنا محبوب اور مرغوب ہے مولانا آسیر فرماتے ہیں :-

اللہ اللہ تیرے جھرنے کا وہ آب شیریں
منبع و چشمہ صد قند و نبات اجمیر

باؤلی کے متعلق کس قدر بلند تخیل کا اظہار کیا ہے :-

باؤلی ہے تیرے دیوانوں کو دریائے بقا
چشمۂ خضر ہے ہر قطرۂ آبِ اجمیر
مردہ دل زندۂ جاوید ہوں پانی پی کر
غیرتِ آبِ لقا آبِ زلالِ اجمیر

ملیح سوز و گداز کا انداز ملاحظہ کیجئے :-

دل جلوں سے کوئی پوچھے تری محفل کا مزہ
نمک زخم جگر سوز کباب اجمیر
خوں بہانے دل دعاں چشم بتان ہندی
نمکِ زخمِ جگر حسن ملیح اجمیر

الفاظ کی دلکشی اور زبان کی سلاست کا اندازہ و اسلوب ملاحظہ فرمائیے کہ سخندان فارسی بھی داد دیں ۔

یک جہاں کشتۂ آں نیم نگاہِ نازے
عالم از حسن ادا گشت شہید اجمیر
دل ربودی است بیک نیم نگاہِ نازے
دلبرے عشوہ گرے شوخ و نگار اجمیر

یہ انداز سرمستی و سرجوشی ملاحظہ فرمائیے

اولیا تیرے غلاموں کی ثنا کرتے ہیں
سارے عالم کا ہے محمود ایاز اجمیر
موجزن عشق بھی ہے حسن بھی ہے جلوہ فروش
بے خزاں ہے چمن ناز و نیاز اجمیر
قلب اجمیر ہوا نام سے تیرے روشن
دیکھ لیں اہل نظر غور سے میم اجمیر

اس عنوان شاعری کو مولانا اسیر کی ایک مختصر سی فارسی غزل اور ایک اردو غزل پر ختم کیا جاتا ہے ۔

غزل فارسی

بیا اے ساقیِ میخانۂ ما — بیا اے بادۂ پیمانۂ ما
پری در شیشہ تصویر خیالت — بہ پہلوئے دلِ دیوانۂ ما
بہ وصلِ خویش مارا زندہ کن — بیا اے جانِ جاں جانانۂ ما
سراپا ئیم ہمی سوز و بہ دوری — بیا اے آب آتش خانۂ ما
بہ ہند دولت عشقت اسیریم — توئی گنجینۂ ویرانۂ ما

غزل اردو

تو آئینہ دار چشم ور ہے ہر آئینہ رو میں رو برو ہے
تو مصر خوبی میں کو بکو ہے دیار گیسو میں سو بسو ہے
تعینات شئون اعیان ہیں حسن ذاتی کے سب کرشمے
فنائے مطلق جو ماسوا ہے فضائے عالم مقام ہو ہے
کھنچا ہے عالم میں تیرا نقشہ ہے باغ و صحرا میں تو سراپا
تو غنچہ و گل میں رنگ بو ہے تو چشم آہو میں ہو بہو ہے
حسین تو ہے جمیل تو ہے حسن تیرا جمال تیرا
ہر ایک دل میں کھٹک ہے تیری ہر ایک کو تیری جستجو ہے
تو غمزۂ چشم دلبری عشوہ ہے تو ہی ناز و ادا سراپا
وہ جعد شکیں میں مشکبو ہے تو عنبریں مو میں مو بمو ہے
وہ سر نہ ہو جس میں تیرا سودا وہ دل نہ ہو جس میں تیرا جلوہ
وہ مثل سنگ سیاہِ ملامت یہ محض اک قطرۂ لہو ہے
حیا کہاں کی حجاب کیسا کرے کہاں تک کوئی تقاضا
اٹھا دے پردہ دکھا دے جلوہ نہ غیر ہیں ہم نہ اور تو ہے
اسیر اس مہ جبیں کے صدقے کہ شش جہت میں ہے اس کا جلوہ
وہ حسن اعجاز ہے یکسو وہ چشم جادو میں دو بدو ہے

تلمذ شاعری | مولانا اسیر شاعری میں مولوی علی امجد حسین امجد بدایونی[1] کے شاگرد تھے جو کہ میاں مذاق بدایونی کے ارشد تلامذہ

---

[1] علی امجد حسین ولد مولوی فضل حسن حمیدی بدایونی ۔ نسباً صدیقی مذہباً شیعہ علوم درسیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں اخبار ذوالقرنین بدایوں کے ایڈیٹر تھے ۔ میاں مذاق بدایونی سے تلمذ تھا کسی نے کلام چرا کر اپنے نام سے شائع کرا دیا ۔ نوبت عدالت تک پہونچی اور کامیاب ہوئے ۔ دیوان اول ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں ، دیوان دوم ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں وکٹوریہ پریس بدایوں اور دیوان سوم ۱۳۳۵ھ میں ریاض ہند پریس علی گڑھ سے طبع ہو چکے ہیں ۔ بدایوں کے بہت سے شعراء کو آپ سے تلمذ تھا ۔ دواوین کے علاوہ مذہبیات اور گلشن وغیرہ کتابیں بھی آپ سے یادگار ہیں ۱۳۴۲ھ میں انتقال ہوا ۔ (تاریخ بزم عید ذوق مذاق (تذکرۂ شعرائے بدایوں) تذکرہ ضیغم از ضیاء اللہ خاں ضیغم ، تجلیات سخن)

سمجھتے تھے چنانچہ "ذوق مذاق" (تذکرہ شعرائے بدایوں) مطبوعہ ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء مرتبہ حافظ فضل اکرم[عہ] بدایونی۔

اسیر۔ مولوی علی احمد خاں ساکن قدیم بریلی۔ عرصہ سے ان کے والد نے بدایوں سکونت اختیار کی۔ طبیعت نہایت ذہین، فارسی کی استعداد بہت عربی کی لیاقت عمدہ ہے۔ ابتدائے زمانۂ مشق مولوی علی امجد حسین شاگرد جناب مولانا دلدار علی مذاق صاحب کے سامنے طے کیا۔ اتفاق زمانہ سے جب امجد بہ تقریب روزگار تشریف فرما بیرونجات کے ہوئے تو بروقت تشریف آوری کے اصلاح لیتے رہے۔ ایک مرتبہ بہت عرصہ گزر گیا۔ تو اپنے استاد کے استاد میاں مذاق سے اصلاح طلب ہوئے فارسی کا کلام ان کا زیادہ ہوتا ہے اُردو کم لکھتے ہیں۔ غزلیات، قصائد اور مثنویات میں بہت عمدہ مہارت حسب محاورہ فارسیان پاستانیان نیز حال کے قلم فرسائی کی ہے۔ اور عمدہ مضامین و نکات و صنائع و بدائع اپنے استاد کے ڈھنگ اور رنگ میں تحریر کئے ہیں" (اس کے بعد نمونہ کلام درج ہے)

مولف خمخانۂ جاوید لالہ سری رام دہلوی ایم اے رقمطراز ہیں

"اسیر۔ مولوی علی احمد خاں نام۔ گو ان کا اصلی وطن بریلی ہے مگر بدایوں میں رہتے ہیں اور حضرت مذاق کے شاگردوں میں ہیں"

(اس کے بعد نمونۂ کلام درج ہے)

مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی[۵] (بانی نظامی پریس و اخبار ذوالقرنین بدایوں) کے اول مجموعہ کلام "تجلیات سخن" میں منشی قمر الحسن قمر حمیدی[۶] بدایونی نے شعرائے بدایوں کی ایک مکمل فہرست مع مختصر حالات شامل کی ہے اس میں بھی مولانا اسیر کو امجد بدایونی کا شاگرد تحریر کیا ہے لیکن ہمارے بزرگ مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

"خیر آباد شریف ہی میں حضرت مرزا غالب دہلوی سے استفاضۂ سخن حاصل کیا اور غزلیں مرزا صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیں حضرت مومن دہلوی کی تشریف آوری سہسوان کی خبر بدایوں میں جب عام ہوئی تو

عہ حافظ فضل اکرم کمیشن دار تیری مجسٹریٹ والد مولوی معین الدین فرشوری مصنف (مولف) آثار بدایوں المتوفی ۱۹۱۶ء

۵ نظام الدین حسین نظامی ولد فخر الدین متولی بدایونی ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے ۱۸۹۳ء میں انٹرنس پاس کیا کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی پھر اخبار ذوالقرنین بدایوں سے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا۔ نظامی پریس قائم کیا۔ اس طرح علم و ادب کی بہت خدمت کی۔ قاموس المشاہیر آپکی معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ مولوی طفیل احمد منگلوری مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" آپکے خاص ساتھی تھے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور سرسید تحریک سے خاص وابستگی تھی بہت سی قوموں کے بزرگ تھے جون ۱۹۴۰ء کو انتقال ہوا (نظامی بدایونی، ذوالقرنین نظامی نمبر)

۶ قمر الحسن قمر ولد حسن علی حمیدی بدایونی ۱۸ صفر ۱۲۹۵ھ مطابق یکم مارچ ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوئے۔ عبدالرحمٰن راسخ دہلوی سے شاعری میں تلمذ تھا ۱۹۰۸ء میں ذوالقرنین ہفتہ وار کی ادیٹری کے فرائض انجام دیئے ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۶۰ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۴۱ء کو انتقال کیا۔ دو دیوان آئینۂ جذبات اور مصور جذبات نظامی پریس بدایوں سے طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

"آپ نے سہسوان جاکر ایک غزل حصول تلمذ
کے خیال سے حضرت مومن کے سامنے
پیش کی اس طرح آپ کا رسمی سلسلہ تلمذ
ہر دو حضرات کے ساتھ قایم ہے"

مقدمہ منقبت خواجہ ولی ہند"

مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں جون ۱۹۳۶ء

ہم نے تعلیم و تربیت کے زیر عنوان صراحت کردی ہے کہ مولانا عبدالحق خیرآبادی سے مولانا آسیر نے رامپور میں علم حاصل کیا لہذا خیرآباد کے قیام اسیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور غالب بھی کبھی خیرآباد تشریف نہیں لے گئے جب غالب پنشن کے معاملات میں کلکتہ گئے تھے تو لکھنؤ ضرور ٹھیرے تھے اور خیرآباد کا کوئی ذکر نہیں ملتا اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ غالب خیرآباد گئے تھے تو یہ سفر لکھنؤ غالب کا ۱۸۲۶ء میں ہوا جبکہ مولانا آسیر کے استاد مولانا عبدالحق پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور مولانا آسیر تو اس سفر غالب کے ربع صدی کے بعد ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔

اب اگر تھوڑی دیر کو یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ موقع رامپور ملا ہوگا تو اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ غالب نے رامپور کے دو سفر کیے پہلا سفر نواب یوسف علی خاں کے عہد میں کیا۔ غالب ۲۷ر جنوری ۱۸۶۰ء کو رامپور پہونچے اور کچھ دن کم دو ماہ قیام کرکے آخر مارچ ۱۸۶۰ء کو دہلی چلے گئے۔ اس وقت آسیر کی عمر سات سال چھ ماہ کی تھی، لہذا رامپور کی طالب علمی اور غالب کے حضور میں دو غزلیں پیش کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالب نے دوسرا سفر نواب کلب علیخاں کے عہد میں کیا غالب ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رامپور پہونچے۔ اور قریب تین ماہ قیام کرکے ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی واپس چلے گئے۔ اس وقت مولانا آسیر کی عمر ۱۳ سال تھی اور وہ رام پور بغرض تحصیل علوم نہیں پہونچے تھے کیونکہ ان کے استاد مولانا عبدالحق خیرآبادی جن سے مولانا آسیر نے رامپور میں علم معقول کی تکمیل کی تھی ۱۸۷۱ء کے چند سال بعد رامپور پہونچے ہیں جیسا کہ حافظ احمد علی خاں رام پوری[۵۱] نے اپنی کتاب تذکرہ کاملان رام پور[۵۳] میں تحریر کیا ہے (۱۸۷۱ء میں مولانا عبدالحق مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں مسند درس سنبھالے ہوئے تھے[۵۲]) اب یہ بات واضح ہوگئی کہ رامپور میں بھی غالب سے استفاضہ حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا بلکہ وہ یقیناً غالب کی وفات (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء) کے بعد رام پور پہونچے۔ مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب رامپوری کے مقدمہ

---

۵۱ حافظ احمد علی خاں ولد اصغر علی خاں (علی برادران کے چچا زاد بھائی) رام پور وطن۔ ۱۰ر شعبان ۱۲۷۹ھ ہجری مطابق ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ علوم درسیہ کی تکمیل رام پور کی۔ کچھ دنوں ریاست اندور ملازم رہے اس کے بعد نواب حامد علی خاں کی سرکار سے متعلق مختلف خدمات انجام دیں۔ کتب خانہ ریاست کے منتظم رہے۔ تذکرہ کاملان رام پور ان کی تصنیف ہے۔ رمضان ۱۳۵۲ھ میں انتقال ہوا۔

(تذکرہ کاملان رام پور۔ یاد رفتگان از سید سلیمان ندوی)

۵۲ روئداد اسلامی مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ سال ہشتم بحوالہ تذکرہ کاملان رام پور

۵۳ تذکرہ کاملان رام پور

سے واضح ہے کہ مرزا غالب کے ہر دو سفر کے دوران کے شاگردوں کی فہرست صرف پانچ حضرات پر مشتمل ہے :۔

(۱) نواب یوسف علیخاں ناظم المتوفی ۱۸۶۵ء

(۲) نواب کلب علی خاں نواب المتوفی ۱۸۸۷ء

(۳) صاحبزادہ عباس علی خاں[1] بیتاب (نواب یوسف علیخاں کے حقیقی چچا زاد بھائی اور نواب کلب علی خاں کے حقیقی ماموں)

(۴) منشی سیتلچند[2] افسر دارالانشاء

(۵) نادر شاہ خاں شوخی ولد محمد ضامن خاں رسالدار۔

اس فہرست میں اول الذکر چار حضرات کی حیثیت و اہمیت تو مستغنی عن البیان ہے۔ آخر کے شوخی صاحب کے سلسلے میں سُنئے کہ یہ رسالدار کے صاحبزادے ہیں لہذا ظاہر ہے کہ رام پور کے کسی باحیثیت گھرانے کے فرد ہوں گے جب غالب کے حضور میں پہونچے اور اصلاح کے لئے اپنا کلام پیش کیا تو مرزا غالب نے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ

"تم جانتے ہو کہ میں نواب صاحب کا بلایا ہوا ہوں۔ انہوں نے اصلاح شعر کی خدمت میرے سپرد کی ہے بغیر ان کے علم و اجازت کے یہاں اور کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتا"

شوخی واپس چلے آئے مگر شوخی کی خوش قسمتی سے مرزا غالب کی شراب ختم ہو گئی انہوں نے فوراً غالب کی پسند کی شراب کی پانچ بوتلیں اپنے روپے سے مرادآباد سے لاکر نذر کر دیں، غالب خوش ہو گئے اور شرف تلمذ بخشا بعد کو شوخی دہلی جاکر باقاعدہ اصلاح لیتے رہے[3]۔ اس واقعے سے ظاہر ہے کہ کسی عام آدمی کا رامپور میں غالب سے شرف تلمذ حاصل کرنا کس قدر دشوار تھا۔

مولانا آسیر کی شاگردی کی تائید مرزا غالب کے کسی

---

[1] صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب ولد عبدالعلی خاں ولد نواب غلام محمد خاں تقریباً ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۷ء تک دہلی قیام رہا مومن کے شاگرد تھے ۱۸۶۶ء میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ ۲۹ رجب ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء کو وفات ہوئی۔ دیوان گلدستۂ باغ جناں کے نام سے ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء چھپ گیا ہے۔

(انتخاب یادگار۔ مکاتیب غالب۔ مرتبہ عرشی رام پوری)

[2] منشی سیتل چند تخلص منشی۔ راجہ کنور سین کی اولاد میں سے تھے کنور سین قوم کے کائستھ نواب علی محمد خاں فاتح روہیل کھنڈ کے معتمد سرداروں میں تھے۔ نواب فیض اللہ خاں کے ہمراہ رامپور آئے۔ منشی سیتلچند کا تقرر بعہدہ ناظر نظامت نواب احمد علی خاں کے عہد میں ہوا۔ پھر تحصیلدار مقرر ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے خبر رسانی و فراہمی رسد وغیرہ کا کام انجام دیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ۸۰ سال کی عمر میں رام پور انتقال کیا۔ منشی سیتلچند کو فارسی میں درستگاہ کامل تھی ملا غیاث الدین سے علوم رسمی حاصل کئے پھر شاعری میں غالب سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔

[3] مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی

خط یا مکتوب سے نہیں ہوتی۔ مومن دہلوی کی شاگردی کے سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ مومن اس وقت سہسوان تشریف لائے تھے جبکہ وہ ضلع کا صدر مقام تھا اور سہسوان ۱۸۲۴ء سے ۱۸۳۸ء تک ضلع رہا۔ محمد سعید خان ڈپٹی کلکٹر (جو بعد کو نواب رامپور ہوئے) (المتوفی ۱۸۵۵ء) سے ملاقات مقصود تھی[1] اور یہ زمانہ مولانا آسیر کی پیدائش سے کم سے کم ۱۴ سال پیشتر کا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مومن سے مولانا اسیر کو نہ صرف سہسوان بلکہ کہیں اس دنیا میں استفاضہ حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ مومن مولانا آسیر سے ایک سال قبل عالم بالا کو سدھار گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ میاں مذاق بدایونی اور ان کے شاگردوں نیز بدایوں کے مشہور قادری خانوادہ میں ایک عرصہ تک معاصرانہ چشمک رہی تھی کا یہ اثر معلوم ہوتا ہے مولوی محمد یعقوب حسین ضیا القادری صاحب کے بیان کی تائید اُردو شاعری کے کسی تذکرہ یا تاریخ سے نہیں ہوتی اور بدایوں کا حلقہ بھی خاموش ہے۔ اب آخر میں ہم اس تذکرہ بالا تینوں حوالوں[2] کے ثبوت میں مولانا اسیر کی ایک ایسی ناقابل تردید دستاویز پیش کرتے ہیں جس میں کسی ریب و شک کی گنجائش نہیں۔

مولانا آسیر کے ایک شاگرد منشی سید منظور علی بدایونی نے اپنی کتاب کلام منظور اولیا کا دوسرا ایڈیشن مع مزید اضافوں اور حواشی کے ساتھ آثار اولیائے شہر بدایوں (تاریخی نام حدیقۂ تاریخ) کے نام سے ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں مرتب کیا اور یہ کتاب مولانا آسیر کو طباعت کے لئے سپرد کی۔ ہنوز کتاب طباعت کی منزل ہی میں تھی کہ مصنف ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں راہی ملک بقا ہوئے اور یہ کتاب مصنف کے انتقال کے بعد مولانا اسیر کی زیر نگرانی ابو العلائی پریس آگرہ سے طبع ہوئی اس کتاب کے صفحہ ۵۶ پر میاں مذاق کی شان میں ایک شعر تحریر ہے اور حاشیہ میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے:۔

"مولانا دلدار علی صاحب مذاق بدایونی خلیفۂ
حضرت شاہ فضل غوث بریلوی و شاہ جی

---

[1] سید عبدالباقی مولف تذکرہ علمائے سہسوان کی روایت کے مطابق سہسوان کے ایک بزرگ تاج الدین صاحب کی خدمت میں بھی مومن حصول استفاضہ کے لئے حاضر ہوئے۔ ضمیرالدین احمد عرش گیاوی مولف "حیات مومن" نے لکھا ہے کہ مومن اپنے ہمراز حکیم مظہر علی رئیس سہسوان کے یہاں تشریف لے گئے اور حکیم مظہر علی کی تحریک پر شرح سدیدی و نفیسی لکھی۔ مومن کے سہسوان سے متعلق دو شعر ہیں ؎

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک — کہ غلام گریز پا ہوں میں

"یاد" اور "صاحب" کی تشریح سہسوان کے بعض حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ مومن سہسوان کی کسی حوروش و پری جمال مغنیہ کے مریض عشق ہو کر شربت وصال کے لئے آئے۔ مومن بدایوں اور کچھو بزرگ بھی تشریف فرما ہوئے مگر خاص بدایوں میں ان کی کوئی قابل قدر عزت نہ ہوئی بدایوں سے متعلق مومن کا شعر ہے ؎

بداؤں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے — یہ کیونکر جانئے پھر خود مذاق ہوش آیا

مومن کے اس شعر کے متعلق ان شاء اللہ آئندہ کسی مضمون میں مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔

[2] تینوں حوالوں سے مراد نوادر مذاق (تذکرہ شعرائے بدایوں) خمخانۂ جاوید اور تجلیات سخن ہیں۔

عبدالرحیم شاہجہانپوری کی ولادت ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء
میں ہوئی ذوقِ سخن خاصۂ طبیعت تھا آپ ان
مسلم الثبوت مشاہیر شعرا میں ہیں جن پر
فی الحقیقت اُردو شاعری ناز کرتی ہے اکثر
مشہور شعراء بدایوں آپ سے اصلاحِ سخن
لیتے تھے سلطان سخن ذوقؔ دہلوی کے ارشد
تلامذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ میرے اُستاد
حضرت اسیر مدظلہ بھی شاعری میں آپ ہی
سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہیں اگرچہ روشِ سخن
میں مرزا غالب کے پیرو ہیں۔"

اس کے خلاف تھا اگر کوئی واقعہ ہوتا تو مولانا اسیر خود اس کی تردید یا تصحیح فرما دیتے۔

تصنیفات مولانا اسیر نے نسیم سحر کے زمانہ میں بعض مستقل واہم مضامین لکھے جن میں سے "سراپائے یار بزبان ایران دیار" اور "تذکیر و تانیث طوطی" کا ذکر ہو چکا ہے یہ مضامین "نسیم سحر" کی مسلسل اشاعتوں میں نکلے بدایوں میں کچھ زیادہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ دی جا سکی چند کتابیں شائع ہوئیں۔ آگرہ کے دوران قیام میں تصنیف و تالیف کا کام یکسوئی کے ساتھ ہوا جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) **آئینہ حدودِ اقلیدس** نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے یہ کتاب درسی نصاب میں شامل رہی۔ تین بار طبع ہوئی آخری اڈیشن نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔

(۲) **قواعد اُردو** طلبا کی نصابی ضرورت کے تحت تیار کی گئی اور نصاب میں شامل رہی۔

(۳) **شجرہ خاندان نقشبندیہ** مولانا اسیر سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید تھے۔ اپنے سلسلہ کا ایک منظوم شجرہ مرتب کیا تھا جو کہ طبع ہو گیا تھا۔

(۴) **نظم جہاں افروز** ۱۳۴۳ھ میں دو نظموں کا مجموعہ "نظم جہاں افروز" تاریخی نام کے ساتھ مرتب ہوا۔ پہلی نظم ولادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور دوسری نظم معراج کے سلسلہ میں ہے یہ کتاب مولانا کی زندگی ہی میں ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء میں عثمانی پریس بدایوں سے طبع ہو گئی تھی۔

(۵) **نظم المعراج** یہ کتاب ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء میں آگرہ میں مرتب طبع ہوئی کتاب کا مضمون نام سے ظاہر ہے

(۶) **منقبت خواجہ ولی ہند** حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی منقبت میں ایک نظم ہے جو کہ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں مولانا نے مرتب کی مولانا کے انتقال کے بعد مولوی محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی نے ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء میں عثمانی پریس بدایوں سے شائع کی جس میں ضیاء القادری کا دیباچہ اور مولانا اسیر کے شاگرد آصف علی اکبرآبادی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی کی تقریظ شامل ہے۔

(۷) **مثنوی شیریں خسرو** مولانا اسیر نے مثنوی شیریں خسرو کو حالات خسرو کے ساتھ مرتب کیا۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کا قول ہے کہ یہ کتاب بھی طبع ہو گئی ہے۔

(۸) **سیرت سیدنا ابوالعلا اکبرآبادی** آگرہ کے مشہور بزرگ حضرت سیدنا ابوالعلا اکبرآبادی کے حالات آگرہ کے بعض احباب کی

برخواست و تحریک سے مرتب کئے یہ کتاب بالاقساط مفتی انتظام اللہ شہابی کے زیر اہتمام ہفت روزہ اخبار "دربار" آگرہ میں شائع ہوئی۔

(۹) **سیرت نعمان** سیدنا میر نعمان اکبر آبادی کے حالات میں یہ کتاب ترتیب دی مولانا کی زندگی میں یہ کتاب شائع نہ ہوسکی۔ مولانا کے ایک شاگرد حافظ انوار الحق صاحب اکبر آبادی سوداگر پارچہ نے اس کتاب کا مسودہ طباعت کے لئے لیا تھا معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔

(۱۰) **حیات شیخ** شیخ محی الدین ابن عربی کے حالات میں یہ کتاب ترتیب دی مسودہ مولانا ضیاء القادری کے پاس محفوظ ہے غالباً مولانا اس کی اشاعت کے لئے کوشاں ہیں۔

(۱۱) **حیات ملا عبدالقادر بدایونی** ملا عبدالقادر بدایونی مورخ دور اکبری کے حالات دو جلدوں میں اکمل التاریخ (۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۷ء) کے تاریخی نام سے مرتب کئے جس میں پہلی جلد ۲۰ صفحات کے مقدمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مولانا نے بتایا ہے کہ ملا کے سوانح حیات کی ترتیب سے اہل بدایوں نے کیوں اغماض کیا اور دوسرے مغربی مورخین اور روشن خیال ہندوستانی مثل محمد حسین آزاد (مولف دربار اکبری) کی نامناسب نکتہ چینیوں اور لایعنی اعتراضات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ دوسری جلد ملا عبدالقادر بدایونی کے حالات پر مشتمل ہے۔ سنوں کے اعتبار سے واقعات کو ترتیب دیا ہے۔ تمام و کمال حالات بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" سے ماخوذ ہیں۔ غرض کتاب نہایت محنت اور تحقیق سے لکھی ہے۔ افسوس کہ ابھی تک کتاب طبع نہ ہوسکی کاش مولانا ضیاء القادری صاحب اس کو طبع کرا دیتے۔

(۱۲) مولانا اسیر کا ایک مکمل دیوان غیر مطبوعہ ان کے ایک عزیز کے قبضہ میں تھا معلوم نہیں وہ دیوان اب فنا و بقا کی کس منزل میں ہے۔

(۱۳) **غیر مطبوعہ کلام** مولانا کا کچھ غیر مطبوعہ کلام (نظم، غزلیات اور قصائد وغیرہ) مولانا ضیاء القادری اور محمد حسین صاحب میلاد خواں (بدایوں) کے پاس محفوظ ہے۔

(۱۴) **اولیاء بدایوں** (مسودہ) بداوں کے تاریخی واقعات اور اولیاء بدایوں کے حالات میں مولانا اسیر نے کچھ نوٹ تیار کئے تھے ان حالات کا ناتمام مسودہ مولانا ضیاء القادری کے پاس محفوظ ہے۔

(۱۵) **خلوت گاہ ناز** ۱۳۱۹ھ مولانا عبدالقادر بدایونی کے وصال پر مولانا نے اکثر تواریخیں کہیں ان تواریخ کا مجموعہ ہے کتاب طبع ہوگئی ہے۔

(۱۶) **قصیدہ نور** مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی المتوفی ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء نے ایک نعتیہ قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے۔

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

(قصیدہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے دیوان "حدائق بخشش" حصہ دوم میں شامل ہے)

مولانا اسیر نے اسی طرز پر ایک قصیدہ نور ۶۷ اشعار پر مشتمل لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ اور مختلف مذہبی رسائل میں طبع ہو چکا ہے۔

(۱۷) **مشرقستان اقدس** ۱۳۱۹ھ میں مولانا

احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے شاہ ابوالحسین نوری میاں[1] مارہروی کی شان میں ایک قصیدہ بنام تاریخی مشرقستان قدس[2] لکھا جس پر مرآۃ الغیب نام کے رسالہ میں بدایوں سے فنی و عروضی اعتراض ہوئے۔ مولانا آسیر نے مرآۃ الغیب کے جواب اور فاضل بریلوی کے مشرقستان قدس کی تائید میں ایک ضخیم رسالہ مشرقستان اقدس ترتیب دیا جو مولانا احمد رضا خاں صاحب کے ایک شاگرد مولوی نواب سلطان احمد خاں بریلوی کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

۱؎ شاہ ابوالحسین ولد ظہور حسن مارہروی ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری مولوی نور احمد بدایونی، مولوی محمد سعید صاحب بدایونی، مولوی عبدالقادر بدایونی مولوی فضل رسول بدایونی اور مولوی احمد حسن صاحب صوفی مراد آبادی وغیرہ سے حاصل کئے۔ خاندانی پیرزادے تھے۔ ہزاروں مرید تھے۔ گیارہ رجب ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ سراج العوارف (فارسی) آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

(خاندان برکات از محمد میاں مارہروی، اکمل التاریخ)

۲؎ قصیدہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے دیوان حدائق بخشش حصہ سوم میں موجود ہے۔

پاکستان میں تعلیم

(مرتبہ شعبہ اطلاعات وزارت تعلیم حکومت پاکستان) و مترجمہ مسٹر انعام عظیم برنی ایم اے

تمہید سال زیر رپورٹ ۵۵-۱۹۵۴ء کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جمہوری تقاضوں کے زیر اثر ہر لحاظ سے تعلیمی سہولتوں میں توسیع کی گئی۔ اگرچہ گذشتہ سالوں میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے تعلیمی بجٹ میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے تاہم وہ تعلیم کی توسیع کے ضمن میں عوامی مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد عبوری زمانہ میں تعلیمی اداروں کو اسی قسم کے متعدد مسئلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مدارس میں طلباء کی نشست کے لئے گنجائش کم ہے اور تعداد طلبا میں اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے تعلیمی معیار گرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اسلئے محکمہ تعلیم کے با اختیار حکام کی کوشش اس امر پر مرکوز رہی ہے کہ تعلیم عام ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی معیار بھی بلند ہوتا رہے۔

سال زیر نظر میں علمی سوسائٹیوں، تحقیقی اداروں اور ثقافتی مجلسوں کی تنظیم اور بقا پر بھی توجہ دی گئی تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت میں مدد ہو سکیں۔

اسی طرح جا بجا نجی اور مادی ذرائع کو اس غرض سے کام میں لایا جا رہا ہے کہ موجودہ تعلیمی عمارتوں کو بہتر بنایا جائے۔ جدید عمارات تعمیر کی جائیں۔ تعلیمی اداروں میں جدید سائنس کی ضرورت کے مطابق سامان فراہم کیا جائے۔ تعلیم میں مدد ہونے والے آلات بہم پہونچائے جائیں اور معلمین کو مقامی طور پر ٹریننگ دینے کے علاوہ دوسرے ملکوں میں جا کر ٹریننگ حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہم کو مختلف صنعتی منصوبوں کے تحت ماہران فن کی مشاورتی خدمات کی صورت میں امداد ملی ہے اور ہم نے ٹریننگ کی ان سہولتوں اور سامان سے جو امدادی منصوبے کے تحت بہم کیا گیا پورا فائدہ حاصل کیا ہے۔ بیرونی امداد کے ساتھ ساتھ اپنے ملکی ذرائع سے کام لے کر بھی تعلیمی عملہ کی اہلیت کارکردگی میں اضافہ کیا گیا ہے اور تعلیمی اداروں میں سامان کی فراہمی بہتر کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صوبوں، ریاستوں اور مرکز کے ماتحت رقبوں میں توسیع تعلیم کا کام اپنے اپنے منصوبوں کے مطابق مستقل رفتار سے ہوتا رہا ہے۔

۲- انتظام مدرسہ (۱) نظم و نسق اور معائنہ سے متعلق نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ جہاں تعلیمی سہولتوں میں توسیع ہو جانے کے سبب ضرورت سمجھی گئی وہاں تعداد افسران میں اضافہ کیا گیا اور اہم مضامین مثلاً سائنس، فنون اور دستکاری کی نگرانی کے لئے بعض صوبوں میں اسپیشل انسپکٹرز (خصوصی معائنہ کنندگان) مقرر کئے گئے

ان مضامین کی تعلیم کا معیار بلند کرنے میں مدد مل سکے۔

(ب) صوبائی، ریاستی اور مرکزی تعلیمی بجٹ میں عام طور پر معتد بہا اضافہ ہوا ہے جیسا کہ ذیل میں دیئے ہوئے نقشے سے ظاہر ہوگا۔ قبائلی علاقہ بلحاظ تعلیم پسماندہ علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے تعلیمی بجٹ میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں ۴۱٫۶ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔

نمبر شمار	نام صوبہ، ریاست یا مرکزی علاقہ	تعلیمی بجٹ برائے سنہ ۱۹۵۳-۵۴ ہزار روپیہ کی بنا پر	تعلیمی بجٹ برائے سنہ ۱۹۵۴-۵۵ ہزار روپے کی بنا پر	اضافہ ہزار روپے کی بنا پر	فیصد
۱	پنجاب	۴,۰۲,۶۴	۴,۵۴,۴۸	۵۱,۸۴	۱۲٫۹
۲	مشرقی بنگال	۳۹۲,۰۰	۴,۷۰,۰۰	۷۸,۰۰	۱۹٫۹
۳	سندھ	۱۹۶,۴۲	۱,۹۴,۰۳	۴,۲۱	۲٫۲
۴	صوبہ سرحد	۹۹,۹۹	۱,۱۰,۳۴	۱۰,۳۱	۱۰٫۳
۵	قبائلی علاقہ (صوبہ سرحد)	۱۰,۱۲	۱۴,۳۰	۴,۱۸	۴۱٫۵
۶	بلوچستان	۱۶۰,۴۴	۱۸۲,۶۱	۲۲,۱۶	۱۳٫۲
۷	کراچی مرکزی رقبہ	۶۳,۹۴	۷۷,۵۵	۱۳,۶۱	۲۱٫۳
۸	بہاولپور ریاست	۴۰,۶۲	۴۲,۸۵	۲,۲۳	۵٫۴
۹	خیرپور ریاست	۱۱,۸۸	۲۰,۸۶	۸,۹۸	۷۵٫۵

ص۔ سال زیر نظر میں تعلیمی عمارتوں کی تعمیر اور قدیم عمارتوں کی ترمیم و تجدید کے منصوبہ میں بھی ترقی ہوئی تاہم تعلیمی اداروں کے لیے موزوں عمارات کے متعلق صورت حال تسلی بخش نہیں کہی جا سکتی مگر اس مسئلہ پر تمام ملک میں ترجیحی توجہ دی جا رہی ہے۔ مدارس اور کالجوں میں تعداد طلبا گنجائش کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے۔

مزید براں شہری آبادی میں بے پناہ اضافہ ہو جانے کے سبب تعلیمی اداروں کے اردگرد پناہ گزینوں کی عارضی بستیوں کا جنگل کھڑا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان اداروں کے ماحول پر مضر اثر پڑ رہا ہے عمارتی منصوبہ کو تیزی کے ساتھ مکمل کرنے میں پہلی رکاوٹ تو بلاشک مالی دشواری ہے مگر طلبا کی رہائش گاہوں سے آسان فاصلوں پر موزوں محلّی وقوع کا فقدان اور عمارتی سامان کی کمیابی بھی تعمیراتی منصوبوں کی راہ میں بڑی حد تک حائل ہے۔ دوسری طرف طلبا کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو جانے کے باعث عوامی دباؤ کی وجہ سے یونیورسٹیاں اس امر پر مجبور ہو گئی ہیں کہ نئے کالجوں کو مجاز کرتے وقت عمارات اور سامان کے متعلق قاعدوں کے استعمال میں نرمی برتیں۔ یہ ادارے بالعموم ایسی عمارتوں میں واقع ہیں جو ناکافی اور ناموزوں ہیں۔

مرکزی حکومت اس امر کو نہایت اہمیت دیتی ہے کہ ہر قسم کے تعلیمی اداروں کا ماحول اور معیار بہتر بنایا جائے اسلئے مرکزی حکومت نے سنہ ۱۹۵۴-۵۵ء ۲ کروڑ ۲۱ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کی امداد صوبوں، ریاستوں اور مرکزی حکومت کے ماتحت رقبوں میں صرف کرنے کیلئے دی تھی تاکہ وہ اس روپے کو اپنے تعلیمی منصوبوں پر صرف کرسکیں اس امداد کا خاص مدعا یہی تھا کہ عمارات کی تعمیر اور بہتری پر یہ روپیہ صرف کیا جائے۔ اسی طرح ۶۰ لاکھ روپیہ جو پشاور پنجاب سندھ ڈھاکہ اور راجشاہی کی یونیورسٹیوں کو دیا گیا اس کا معتد بہ حصہ بھی عمارتوں ہی کے لئے وقف تھا اس کے علاوہ کراچی یونیورسٹی کی عمارتوں کے لئے مرکز نے ۴۰ لاکھ روپیہ کا ایک فنڈ قائم کیا۔

۲۔ نظام مدارس

ا۔ سال زیر رپورٹ میں تعلیمی سہولتوں کی توسیع کے منصوبہ میں بھی ترقی کی رفتار مستقل

مشرقی پاکستان میں صوبائی سرکار نے مدارس کی تعلیم کا از سر نو تعلیم کا کام سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ میں لیا ایسے مدارس جو کمی تعداد کے سبب باعث اسراف سمجھے گئے بند کر دیئے گئے۔ مگر اس اقدام سے مدارس کی تعداد میں جو کمی ہوئی ہے اس کو مزید نئے عمدہ مدارس کھول کر پورا کر دیا جائے گا۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ابتدائی مدارس کی تعداد میں ۲۱۰ مدارس کا اضافہ ہوا ہے اور ان مدارس میں طالبات کی تعداد نے بھی سال زیر بحث میں نمایاں ترقی کی ہے۔ ذیل کے نقشے میں مختلف قسم کے مدارس کی تعداد اور تعداد طلبا کے متعلق اعداد و شمار درج کئے گئے ہیں اور سال ماسبق کے اعداد و شمار سے مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔

مغربی پاکستان:۔

قسم مدارس	۱۹۵۳ء میں مدارس کی تعداد			۱۹۵۴ء میں مدارس کی تعداد			زیادتی یا کمی		
	طفلان	نسواں	میزان	طفلان	نسواں	میزان	طفلان	نسواں	میزان
ابتدائی	۱۱,۵۰۰	۲,۳۳۳	۱۳,۸۳۳	۱۳,۷۴۸	۲,۴۹۹	۱۶,۲۴۷	+۲,۲۴۸	+۱۶۶	+۲,۴۱۴
ثانوی	۱,۸۳۰	۳۰۹	۲,۱۳۹	۱,۹۲۲	۳۲۴	۲,۲۴۶	+۹۲	+۱۵	+۱۰۷
صنعتی	۳	—	۳	۶	—	۶	+۳	—	+۳
کالج	۶۵	۱۶	۸۱	۶۹	۱۷	۸۶	+۴	+۱	+۵
کالج برائے حرفت	۱۸	۲	۲۰	۲۰	۳	۲۳	+۲	+۱	+۳

مشرقی پاکستان:۔

قسم مدارس	۱۹۵۳ء میں مدارس کی تعداد			۱۹۵۴ء میں مدارس کی تعداد			زیادتی یا کمی		
	طفلان	نسواں	میزان	طفلان	نسواں	میزان	طفلان	نسواں	میزان
ابتدائی	۲۴,۰۵۳	۲,۱۰۳	۲۶,۱۵۶	۲۳,۹۱۴	۲,۳۱۳	۲۶,۲۲۷	-۱۳۹	+۲۱۰	+۷۱
ثانوی	۲,۸۸۲	۲۷۷	۳,۱۵۹	۲,۶۷۶	۲۴۱	۲,۹۱۷	-۲۰۶	-۳۶	-۲۴۲
صنعتی	—	-	-	-	-	-	-	-	-
کالج	۶۰	۵	۶۵	۶۱	۵	۶۶	+۱	-	+۱
کالج برائے حرفت	۷	-	۷	۷	۱	۸	-	+۱	+۱

(۱) مغربی پاکستان

قسم مدارس	تعداد طلبا ۵۳ء			تعداد طلبا ۵۴ء			کمی یا بیشی		
	طلبا	طالبات	میزان	طلبا	طالبات	میزان	طلبا	طالبات	میزان
ابتدائی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ثانوی	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
صنعتی	۱۲۰۰	—	[illegible]	[illegible]	—	[illegible]	[illegible]	—	[illegible]
کالج	-	-	[illegible]	-	-	[illegible]	-	-	[illegible]
کالج برائے حرفت	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

مشرقی پاکستان

قسم مدارس	تعداد طلبا ۱۹۵۵ء			تعداد طلبا ۱۹۵۶ء			کمی یا زیادتی		
	طلبا	طالبات	میزان	طلبا	طالبات	میزان	طلبا	طالبات	میزان
ابتدائی	۲۵۹۹۸۶۹	۱۹۶۱۱۶	۲۷۹۱۲۸۵	۲۵۸۷۲۴۳	۲۰۰۷۱۱	۲۷۵۸۸۸۳	-۵۱۸۷۶	+۴۵۹۹	-۱۳۲۰۱۷
ثانوی	۳۱۳۹۴۲	۴۰۰۱۶	۳۵۴۰۸۵	۳۶۹۹۳۴	۴۰۵۰۰	۴۱۰۴۳۴	-۲۲۰۲۸	+۵۴۸۴	-۲۵۹۳۴
صنعتی	-	-	-	-	-	-	-	-	-
کالج	-	-	۲۱۸۴۵	-	-	۲۵۸۳۵	-	-	+۴۰۱۱
پیشہ ورانہ کالج	۱۸۴۵	۳۶	۱۸۸۲	۱۹۴۹	۵۰	۱۹۹۹	+۱۰۴	+۱۴	+۱۱۷

نوٹ۔ پیشہ ورانہ کالجوں میں انجینئرنگ اور پولی ٹیکنک میڈیکل، زراعتی، تجارتی اور گھریلو کفایت شعاری وغیرہ کی تعلیم کے ادارے شامل ہیں۔

(ب) کراچی میں ثانوی تعلیم کی مدت ۴ سال سے گھٹا کر ۲ سال کردی گئی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ابتدائی اور ثانوی درجات کی تعلیم کا کل زمانہ اب ۱۱ برس کی بجائے دس برس پر مشتمل ہوگا جیسا کہ پنجاب صوبہ سرحد اور مشرقی بنگال میں ہے۔ مگر اس فیصلہ کا نفاذ میٹرکولیشن کے امتحان ۱۹۵۶ء سے ہوگا۔

۴۔ تعلیمی منصوبہ، نصاب اور طریقۂ تعلیم

(۱) کالج برائے خواتین پشاور میں گھریلو اقتصادیات کے مضمون کی تعلیم شروع ہوگئی ہے۔ پشاور یونیورسٹی نے جنگلات کالج ایبٹ آباد کا الحاق کرنے کی منظوری دیدی ہے اور جنگلات کے متعلق ایک ٹیکنیکل سکول بھی قائم کرنا منظور کیا ہے۔

سندھ یونیورسٹی میں بی۔ اے اور ایم۔ اے۔ کی جماعتوں میں ریاضی اور علم نباتات کی تعلیم شروع کردی گئی ہے۔ علم حیوانات، علم کیمیا، علم طبقات الارض کی تعلیم کیلئے عملہ انتخاب کرلیا گیا ہے اور آئندہ تعلیمی سال سے ان مضامین کی تعلیم بھی شروع ہوجائے گی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی علم طبقات الارض کی تعلیم بی۔ ایس سی (آنرز) ایم۔ اے اور ایم ایس سی درجات میں شروع کردی گئی ہے۔

(ب) صوبہ سرحد کی گورنمنٹ نے ایک مشاورتی کمیٹی کا تقرر کیا تھا تاکہ ۱۹۵۲ء کے مجوزہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ ابتدائی تعلیم کے نصاب میں اسلامیات اردو، پشتو (صرف پشتو بولنے والے رقبہ جات کے لئے) حساب، سماجی مضامین، عملی فنون روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے سائنسی امور اور جسمانی تعلیم کا اضافہ کیا جائے۔ اس صوبہ میں دو لاکھ روپیہ کی کتب بھی طلباء میں تقسیم کی گئیں۔

اسی طرح کراچی کے محکمہ تعلیم نے بھی گذشتہ تین سال کے تجربہ کی روشنی میں ابتدائی تعلیم کے نصاب کا جائزہ لینا شروع کیا۔ موجودہ کتب کی بجائے بہتر کتب کے انتخاب کا سوال بھی زیر غور ہے۔

مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے چانسلر نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ موجودہ نصاب تعلیم اور کتب درسیہ پر نظر ثانی کی جائے۔ کمیٹی نے نصاب تعلیم میں خفیف سی ترمیم کی سفارش کی مگر کتابوں میں متعدد تبدیلیاں تجویز کیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی نے پولیٹیکل سائنس کے نصاب میں ایک جدید پرچہ کا اضافہ کیا جس کا موضوع مخصوص طور پر پاکستان کے سیاسی اصول اور اداروں سے متعلق ہوگا۔ مشرقی پاکستان کے محکمہ تعلیم نے ٹیکنیکل ہائی اسکولوں کے جدید نصاب کو عارضی طور پر منظور کرلیا ہے۔

(ا) صوبہ سرحد میں ابتدائی مدارس کے معلموں کیلئے ریفریشر کورس کرائے گئے تاکہ ان کے پیشہ ورانہ علم میں اضافہ ہو۔ کراچی میں ایسے مدرسوں کے لئے جو بلحاظ عمر ٹریننگ حاصل کرنے کے قابل تھے پرائمری اور لوئر سکنڈری ٹیچرز ٹریننگ اسکولز میں ٹریننگ کا انتظام کیا گیا۔

(ب) صوبہ سرحد کی گورنمنٹ نے مدرسین کی تنخواہ کے اسکیلوں میں حسب ذیل ترمیم کی :۔

عہدہ کا نام	تنخواہ کا موجودہ اسکیل	تنخواہ کا ترمیم شدہ اسکیل
سب آرڈینیٹ	۲۲۵-۱۵-۳۷۵-۲۰/۴۲۵-	۲۵۰-۲۰-۴۵۰/۲۵
ایجوکیشنل سروس	۲۰-۴۵۰	۵۰۰
کلاس اول		
لکچرار (ذکور/اناث)		
" (اسکول کا عملہ)	۱۶۰-۱۵-۳۵۰	۲۰۰-۱۵-۳۲۰/۲۰-۴۰۰
نائب مدرسین	۱۰۰-۱۰-۳۰۰	۱۵۰-۱۰-۳۵۰
بی اے بی ٹی		(ابتدائی تنخواہ ۱۲۰ روپے سے ۱۲۵ روپیہ تک امتحان بی اے میں حاصل کردہ ڈویژن کے مطابق)
مدرسین ابتدائی مدارس	۴۵-۵-۱۲۰	۶۵-۵-۱۵۰
انٹر ٹرینڈ	۷۵-۵-۱۲۰	۹۰-۵-۱۵۰
جونیئر ٹیچرز	۶۰-۴-۷۵	۶۰-۴-۱۰۰
(ورنیکیولر)		
جونیئر ورنیکیولر ٹیچر (مڈل پاس)	۴۰-۲-۸۰	۴۰-۲-۹۰
جونیئر ورنیکیولر ٹیچر (میٹرک)	۴۰-۲-۸۰	۵۰-۳-۸۰

ڈھاکہ یونیورسٹی نے بھی تنخواہوں کے اسکیل پر نظر ثانی کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

عہدہ کا نام	موجودہ اسکیل تنخواہ	ترمیم شدہ اسکیل تنخواہ
پروفیسرز	۸۰۰-۴۵-۱۱۶۰-	۸۰۰-۵۰-۱۲۰۰/
	۳۰-۱۲۰۰	ایفیشنسی بار ۵۰-۱۵۰۰
ریڈرز	۵۰۰-۲۵-۸۰۰	۵۰۰-۲۵-۸۰۰/
		ایفیشنسی بار ۵۰-۱۰۰۰
سینئر لکچرارز	۲۵۰-۱۵-۳۲۵-	۲۵۰-۲۵-۵۰۰/
	۲۵-۵۰۰	ایفیشنسی بار ۲۵-۶۵۰
جونیئر لکچرارز	—	۲۰۰-۲۵-۲۵۰-۱۵-
		۳۲۵

۲۔ امدادی اور ماوراء التعلیمی خدمات

طلبا کی صحت کی جانچ کے مسئلہ پر توجہ دی جا رہی ہے اور صوبہ سرحد میں سفری گاڑیاں ۵۰۰۰۰ روپیہ کے صرف سے خریدی گئی ہیں جن میں عکس ریز آلات نصب ہیں۔

کراچی میں اسکول ہیلتھ سروس کا آغاز کیا گیا ہے یہ سروس چار مجوزہ رقبوں میں واقع شدہ مدارس کی ضروریات کی نگرانی کرتی ہے۔ سینٹ جانس ایمبولینس کیڈٹ کورز اور یوتھ بریگیڈ کو جو نشانہ بازی کی مشق کراتا ہے طلباء میں بہت ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ تمام ملک میں جسمانی تعلیم طلبا کیلئے لازمی ہوتی جا رہی ہے۔ مقررہ اوقات پر طلبا کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے اور ان کی صحت کا ریکارڈ معقول طور پر رکھا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد میں تکیہ کے مقام پر محکمہ تعلیم کی سرپرستی میں ایک بڑے کیمپ کا انتظام کیا گیا جس میں طلبا کو سماجی خدمات انجام دینے کی ٹریننگ دی گئی تعلیمی و تفریحی

دلچسپیوں کے مرکزوں کی سیر، مجالس مباحثہ، اسکاؤٹنگ ریڈ کراس اور ڈرامہ مدرسوں اور کالجوں کے روزانہ نظام عمل میں رچ بس گئے ہیں

۷۔ وزارت تعلیم کی کارکردگی کے متعلق مختصر رپورٹ

بابت ۵۵-۱۹۵۴ء

مرکز کے ماتحت رقبہ جات میں تعلیمی حالت سال زیر نظر میں

مرکزی حکومت نے سات نئے مدرسوں کا اجرا کیا جنہیں ۶ مدارس برائے طفلان تھے اور ایک برائے طالبات۔ ٹرینڈ گریجویٹ معلموں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک ٹریننگ کالج بھی جاری کیا گیا ہے غیر سرکاری مدارس کو عمارتوں کی تعمیر اور دیگر ضروریات کے لئے حسب معمول امدادی رقوم منظور کی گئیں جن کی مجموعی تعداد ۱۱۳۵۰۰ روپیہ تک پہنچتی ہے۔ اس امر کے مدنظر کہ کراچی کے طلبا میں بہت بڑی تعداد تارکان وطن طلبا کی ہے سرکار کی جانب سے ثانوی مدارس کے غریب اور مستحق طلبا کو ۴۵۰۰ روپیہ کے وظائف بھی دیئے گئے۔

کراچی کے غیر سرکاری کالجوں کو امداد دینے پر ۲ لاکھ ۲۷ ہزار روپیہ صرف کیا گیا نیز ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ کی امداد عمارات اور سامان کو بہتر بنانے کے واسطے دی گئی۔

کراچی یونیورسٹی کی عمارات کی تعمیر کے لئے ایک فنڈ قائم کیا گیا۔ اس فنڈ کا سرمایہ ۴۹ لاکھ روپیہ ہوگا اور دوران سال میں صرف نہ ہونے کی صورت میں بھی آئندہ کے لئے بحال رہیگا۔ یہ عمارات فیڈرل رقبہ میں تعمیر ہونگی جہاں ۱۲۰۰ ایکڑ زمین اس مقصد کے لئے محفوظ کر دی گئی ہے۔ یونیورسٹی نے ان عمارات کی تعمیر کے لئے فرانسیسی ماہران تعمیرات کی خدمات حاصل کی ہیں اور انہوں نے نقشے تیار کر دیئے ہیں۔ امید ہے کہ تعمیر کا کام بھی جلد شروع ہو جائے گا۔

مرکزی حکومت کی جانب سے مندرجہ ذیل رقوم بھی بطور امداد دی گئی ہیں:۔

(۱) بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کو ۳۴۰۰۰ روپیہ
(۲) تاریخ تحریک آزادی کے بورڈ کو ۲۰۰۰۰ "
(۳) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کو ۱۵۰۰۰ "

فنون لطیفہ کی ترقی

فنون لطیفہ اور ثقافت کی ترقی کے لئے مرکزی حکومت نے جون ۵۴ء میں ایک لاکھ روپیہ کی امداد ڈھاکہ میں پاکستان آرٹ کونسل کے قیام کے لئے دی۔ کراچی میں بھی حال ہی میں پاکستان آرٹ کونسل قایم کی گئی ہے جس کو مرکزی حکومت نے ۹۵۰۰۰ روپیہ کی امداد دی ہے۔ لاہور میں پہلے ہی سے ایک آرٹ کونسل (فنون لطیفہ کا ادارہ) قایم ہے۔

پاکستان نے بچوں کی نمائشوں میں بھی حصہ لیا جو جاپان، بنڈونگ اور لندن میں منعقد ہوئی تھیں۔

ثقافتی تعلقات

حکومت پاکستان نے ۲۹ر جون ۱۹۵۳ء کو ٹرکی کے ساتھ ایک ثقافتی معاہدہ پر دستخط کئے تاکہ ان دونوں ملکوں کے درمیان تعلیمی، سائنسی، اور ثقافتی تعلقات استوار ہو جائیں۔ ٹرکی اور پاکستان کے درمیان اس ثقافتی معاہدہ کو بروئے کار لانے کے لئے ایک مشاورتی کمیشن قایم کیا گیا جو وزیر تعلیم اور وزارت تعلیم، وزارت خارجہ اور دولت مشترکہ کے سینیر عہدداروں پر مشتمل ہے۔

ایران کا ایک خیرسگالی وفد جو ۹ اصحاب پر مشتمل تھا ۳ ہفتہ تک پاکستان کا دورہ کرتا رہا۔ یہ وفد وزیر تعلیم کی قیادت میں آیا تھا۔ اس وفد نے مختلف یونیورسٹی مراکز کا معائنہ کیا۔ اس وفد کے اراکین نے فارسی ادب اور پاکستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات پر تقریریں بھی کیں۔

حکومت ایران کی دعوت پر حکومت پاکستان نے ۳ اصحاب کا ایک وفد حکیم بوعلی سینا کی یادگار کے جشن کے موقع پر ایران بھیجا۔

طہران اور ملایا یونیورسٹیوں کے لئے اردو کے پروفیسروں کا انتخاب عمل میں آچکا ہے اور دوسرے ملکوں کے تعلیمی اداروں میں پاکستان کے متعلق ادبی مواد فراہم کرنے پر ۷۰۰۰ روپیہ صرف کیا جا چکا ہے۔

ادارۂ ثقافت اسلامی ۱۹۵۲ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایک تجویز منظور کی۔ اس کو عمل میں لانے کے لئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ کراچی میں اسلام کے متعلق ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کیا جائے جو اسلامی ثقافت اور زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں تحقیقاتی کام کریگا۔

اس ادارہ کے ایک ڈائرکٹر کا تقرر ابتدائی کام کو انجام دینے کے لئے عمل میں آچکا ہے اور ۵۶-۱۹۵۵ء کے بجٹ میں اس ادارہ کے لئے ساڑھے تین لاکھ روپے کی رقم محفوظ کردی گئی ہے۔

پاکستان میں نابینا اشخاص کی تعلیم کا منصوبہ حکومت

پاکستان نے ماہر بصریات سر کلوتھا میکنزی کی خدمات حاصل کیں جو نابینا اشخاص کی تعلیم کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس بارے میں وہ ملک کی حالت کا اندازہ لگائیں اور نابینا اشخاص کی عام تعلیم صنعتی تعلیم اور ملازمت و بہبود کے بارے میں حکومت کو مشورہ دیں۔ اس مسئلے کے طبی پہلو کے متعلق سر کلوتھا میکنزی کی مدد سر ہنری ہالینڈ نے کی۔ سر کلوتھا نے اپنی سفارشات حکومت کے سامنے پیش کردی ہیں جن پر غور کیا جا رہا ہے۔

یونیسکو کی عام کانفرنس کا آٹھواں اجلاس مانٹی ویڈیو (اوروگوئے) میں ۱۲ نومبر سے ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء تک منعقد ہوا۔ اس میں شمولیت کے لئے ایک پاکستانی وفد بھیجا گیا جس میں ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی بحیثیت سربراہ مسٹر ایس۔ ایم شریف بحیثیت متبادل سربراہ اور ڈاکٹر ایم احمد شامل تھے۔

کھیل جسمانی تعلیم کی کونسل پاکستان کی سفارشات کو عمل میں لانے کے لئے مرکزی حکومت نے اپریل ۱۹۵۴ء میں پاکستان اسپورٹس کنٹرول بورڈ کا تقرر کیا جس کے صدر آنریبل وزیر تعلیم ہیں مختلف کھیلوں کے قومی اداروں کے دائرۂ عمل کو ترقی دینا، ان میں رابطہ پیدا کرنا اور ان پر عام نگرانی رکھنا اس بورڈ کے فرائض میں شامل ہے نیز یہ بورڈ ملک میں کھیلوں کو فروغ دینے کے متعلق مرکزی حکومت کو مشورہ بھی دیتا ہے مرکزی حکومت نے مختلف قومی کھیلوں کے اداروں کو دو لاکھ اکتیس ہزار روپیہ کے بقدر امداد بھی دی تاکہ وہ اپنے مشغلوں کو جاری رکھ سکیں۔

کراچی اور ڈھاکہ میں اسٹیڈیم قائم کرنے کے لئے علی الترتیب ۱۰ لاکھ اور ۲۰ لاکھ کی امداد دی گئی۔

بوائے اسکاؤٹ ایسوسی ایشن اور گرلس گائیڈ ایسوسی ایشن کو حسب ذیل رقوم بطور امداد دی گئیں۔

(۱) پاکستان بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن ۱۰,۰۰۰ روپے
(۲) پاکستان گرلس گائڈ ایسوسی ایشن ۵,۰۰۰ روپے
(۳) بوائے اسکاؤٹس ایسوسی ایشن سندھ و کراچی ۲,۰۰۰ روپے
(۴) گرلس گائڈ ایسوسی ایشن سندھ و کراچی ۱,۰۰۰ روپے

معاشرتی سدھار کا پروگرام

گزشتہ سالوں کے مقابلہ میں اس سال معاشرتی سدھار کے منصوبوں کی ترقی ملک کے مختلف حصوں میں بحیثیت مجموعی بہتر رہی۔ سال زیر نظر میں مرکزی حکومت نے دو کروڑ ۴ لاکھ اکسٹھ ہزار روپیہ کی امدادی رقوم معاشرتی سدھار کے لئے ادا کیں۔ یہ امدادی رقمیں تعمیر مکانات اور مزید سامان کے لئے دی گئیں اور صرف ان منصوبوں پر صرف کی جا سکتی ہیں جو مرکزی حکومت نے منظور کر لئے ہیں۔

یونیورسٹی کی تعلیم

مرکزی حکومت یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کی بے حد خواہشمند ہے۔ سال زیر تبصرہ میں مرکزی حکومت نے پشاور، لاہور، سندھ، ڈھاکہ اور کراچی کی یونیورسٹیوں کو ۳۰ لاکھ روپیہ کی غیر متوالی امداد ترقی کی اسکیموں کے واسطے ادا کی۔

فوقانی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے لئے ایک دوسرا قدم بھی اٹھایا گیا ہے جس کے تحت حکومت پاکستان اور حکومت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان ایک انٹر کالج اکسچینج اگریمنٹ پر دستخط ہو گئے ہیں۔ پاکستانی یونیورسٹیوں اور امریکی یونیورسٹیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنے کیلئے بھی معاہدہ ہو چکا ہے اور اس پروگرام پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ امریکہ کے ماہر پنجاب، پشاور، کراچی اور ڈھاکہ میں کام کر رہے ہیں۔ انٹر کالج اکسچینج پروجیکٹ کے لئے ۳,۴۱,۵۵۵ ڈالر کی مزید رقم امریکی مالی سال ۱۹۵۹-۶۰ء کے لئے فراہم کی گئی ہے اور اس طرح اس منصوبہ کے لئے کل ۳,۰۹,۰۲۰ ڈالر کی رقم فنڈ میں موجود ہے جس کو دو سالہ پروگرام کے لئے کام میں لایا جائے گا۔ اس بیرونی صرفہ کے علاوہ جو انٹرنیشنل کوآپریشن ایڈمنسٹریشن نے مہیا کیا ہے اندرونی اخراجات کا اندازہ پہلے سال کے لئے ۱۲ لاکھ تیس ہزار روپیہ اور دوسرے سال کے لئے ۲۸,۲۷,۰۰۰ روپیہ کیا گیا ہے۔

وسائل اطلاعات کی فراہمی کا پروگرام

(انفارمیشنل میڈیا گارنٹی پروگرام) ایک دوسرا معاہدہ بھی حکومت پاکستان اور حکومت ریاستہائے متحدہ کے درمیان عمل میں آیا ہے جس کے تحت اطلاعات کے وسائل درآمد کئے جائینگے جن میں کتب، رسالہ جات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی قیمت پاکستان میں روپیہ کی صورت میں ادا کی جائیگی۔ یہ پروگرام ۱۵ مئی ۱۹۵۸ء سے زیر تکمیل ہے۔ وزارت تعلیم نے کتب، رسالہ جات وغیرہ درآمد کرنے کے لئے اجازت ناموں کی سفارش کر دی ہے۔ ان اجازت ناموں کی مجموعی قیمت ۲۰ لاکھ روپیہ ہوتی ہے۔

صنعتی تعلیم

فورڈ فاؤنڈیشن کی امداد سے ایک کثیر الصنعتی ادارہ (پولی ٹیکنک) کراچی میں قائم کیا جا رہا ہے جس کے لئے عمارتوں کی تعمیر، عملہ کے انتخاب اور ٹریننگ اور سامان کی فراہمی اور آراستگی کا مسئلہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ ادارہ جولائی ۱۹۵۹ء سے کام شروع کر دے گا۔

حکومت انگلستان نے اپنی پیش کش کے مطابق پاکستان کے صنعتی ہائی اسکولوں کے لئے اس سال ...

فراہم کرنا شروع کر دیا ہے اور امید ہے کہ گوشہ اول پر میں ایک ایک صنعتی ہائی اسکول جولائی ۱۹۵۵ء سے کام کرنے لگے گا۔

تجارتی اور زراعتی تعلیم حکومت نے تجارتی تعلیم کی جدید تنظیم کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی رپورٹ پر کارروائی شروع کر دی گئی ہے۔ صنعتی تعلیم کی کونسل نے بھی زراعتی تعلیم کے متعلق ایک کمیٹی قایم کی تھی اس کی سفارشات بھی زیر عمل لائی جارہی ہیں۔

وظائف

غیر ملکوں میں ٹریننگ مرکزی حکومت کی سپلیمنٹری اوورسیز ٹریننگ اسکیم کے تحت ۱۲۶ وظائف سمندر پار کے ملکوں میں ٹریننگ کے لئے مشتہر کئے گئے ان وظائف کے لئے مستحق امیدواروں کا انتخاب پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ کیا جائے گا۔

جذبہ خیر سگالی کے طور پر غیر ملکی حکومتوں نے حکومت پاکستان کو سمندر پار ٹریننگ کے لئے ۵ قسم کی سہولتوں کی پیش کش کی۔ ان پیش کشوں کو قبول کر لیا گیا اور ان سے فائدہ اٹھایا گیا۔

مرکزی حکومت نے قابلیت کی بنا پر وظائف دیئے جانے کی اسکیم شروع کی ہے تاکہ ہر سال ہر یونیورسٹی سے دو طلبا کو سمندر پار جاکر مزید ٹریننگ پانے میں مدد مل سکے۔

مرکزی حکومت کی شیڈولڈ کاسٹ انٹرنیشنل اسکالرشپ اسکیم کے تحت، ۱۲ وظیفے جن کی مجموعی رقم ۵۵ ہزار روپے ہوتی ہے درمیانی سال میں دیئے گئے۔

تاریخی ریکارڈ فروری ۱۹۵۵ء میں ہسٹاریکل کانفرنس کا تیسرا اجلاس کراچی میں ہوا۔ سال زیر بحث میں ڈائرکٹریٹ کی تاریخی لائبریری میں ۱۲۰۰ کتب خرید کر داخل کی گئیں۔

آثار قدیمہ اور میوزیم محکمہ آثار قدیمہ نے پاکستان کے دونوں حصوں میں اہم تاریخی مقامات اور یادگاروں کی حفاظت کا فرض حسب معمول ادا کیا۔

۱۹۵۴-۵۵ء میں محکمہ کے نمایاں کاموں میں ۱۲ جدید مقامات کا تحفظ، وادی ژہب سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں تحقیقاتی کام، مشرقی پاکستان میں میناماتی کے مقام پر کھدائی اور نیشنل میوزیم آف پاکستان میں دو خاص نمائشوں کا انتظام شامل ہیں۔

مشرقی پاکستان میں میناماتی کے مقام پر وسیع پیمانہ پر کھدائی کی گئی۔ اور وہاں بدھ راہبوں کی ایک اقامتگاہ برآمد ہوئی جس کے وسط میں استوپ بنا ہوا ہے اسکے علاوہ سادہ اور جالدار نمونوں کی اشیا، انسانی اور حیوانی تصاویر سے مزین تختیاں اور نقشین اینٹیں بھی بڑی تعداد میں ملی ہیں۔ یہاں پائی ہوئی اشیا میں سب سے اہم ایک طلائی سکہ، ۱۲ نقرئی سکے، تانبے کے سکے ایک تانبہ کا گلدان اور تانبہ کی تختیاں ہیں جن پر حروف کندہ ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کانفرنس کے موقعہ پر نیشنل میوزیم میں ثقافت اسلامیہ کے متعلق بین الاقوامی نمائش منعقد کی گئی دوسری خاص نمائش میں میناماتی کے مقام پر دستیاب شدہ اشیا دکھانے کا انتظام کیا گیا۔ نیشنل میوزیم آف پاکستان کے ذخیرہ میں فیروز شاہ تغلق کے ۳ عدد نادر فرامین [illegible]

زمانہ کے ایک مغل تاجدار کا شاہی لباس، اور مصر، لبنان اور پاکستان کی چند دیگر دلچسپ اشیا شامل کی گئیں۔

ضمیمہ الف۔ نقشہ مظہر تعداد مدارس معہ تعداد طلباء

پرائمری مدارس

۱۹۵۴-۵۵ء

صوبائی رقبہ یا ریاست کا نام	تعداد پرائمری مدارس			تعداد طلباء		
	طفلاں	نسواں	میزان	لڑکے	لڑکیاں	میزان
کراچی	۱۹۲	۱۱۰	۳۰۲	۴۴۵۸۱	۲۵۰۳۸	۶۹۶۱۹
بلوچستان	۱۹۰	۱۷	۲۰۷	۱۵۰۵۸	۳۳۰۸	۱۸۳۶۶
سندھ	۴۰۲۷	۲۲۹	۴۲۵۶	۲۶۰۰۰۰	۲۵۲۴۵	۲۸۵۲۴۵
خیرپور	۴۴۶	۱۵	۴۶۱	۲۵۰۴۵	۶۷۲	۲۵۷۱۷
بہاولپور	۲۹۵۴	۱۹۱	۳۱۴۵	۸۶۲۲۶	۴۵۸۹	۹۰۸۱۵
پنجاب	۶۱۹۴	۲۰۵۱	۸۲۴۵	۶۵۰۴۰۱	۱۲۷۵۲۰	۷۷۷۹۲۱
صوبہ سرحد	۹۴۷	۱۶۱	۱۱۰۸	۱۰۰۸۳۵	۱۴۹۰۵	۱۱۵۷۴۰
قبائلی علاقہ	۲۴۴	۸	۲۵۲	۱۳۷۳۷	۴۳۴	۱۴۱۷۱
مشرقی بنگال	۲۴۲۲۶	۲۳۱۳	۲۶۵۳۹	۱۹۹۵۲۱۱	۷۶۶۲۶۱	۲۷۶۱۴۷۲
آزاد کشمیر	۳۸۲	۶۰	۴۴۲	۸۹۰۸۴	۲۵۶۰	۹۱۶۴۴
میزان	۳۹۸۰۲	۵۱۵۵	۴۴۹۵۷	۳۲۸۰۱۷۸	۸۰۸۵۳۲	۴۱۴۰۷۱۰

نوٹ:۔ مندرجہ بالا نقشے میں جو اعداد مشرقی بنگال کے مقابل دیئے گئے ہیں وہ ۱۹۵۳-۵۴ کے متعلق ہیں۔ ۱۹۵۴-۵۵ء کے متعلق اعداد ابھی فراہم نہیں ہو سکے ہیں۔

کراچی، سندھ، مشرقی بنگال کے متعلق پرائمری مدارس کی تعداد میں ملا مکاتب بھی شامل ہیں۔ پنجاب، صوبہ سرحد، قبائلی علاقہ، بلوچستان وغیرہ میں منظور شدہ ملا مکاتب یا مدارس نہیں ہیں۔

ضمیمہ ب

ثانوی مدارس

۱۹۵۴-۵۵ء

نام صوبائی رقبہ یا ریاست	تعداد مدارس			تعداد طلبہ		
	طفلاں	نسواں	میزان	لڑکے	لڑکیاں	میزان
کراچی	۶۲	۲۶	۸۸	۲۴۸۳۲	۸۲۴۵	۳۳۰۷۷
بلوچستان	۲۳	۶	۲۹	۴۸۶۰	۶۸۳	۵۵۴۳
سندھ	۳۳۳	۱۵	۳۴۸	۳۵۰۶۳	۲۹۲۵	۳۷۹۸۸
خیرپور	۱۶	۱	۱۷	۳۳۴۱	۱۱۱	۳۴۵۲
بہاولپور	۹۴	۵	۹۹	۲۴۴۶۳	۹۹۸	۲۵۴۶۲
پنجاب	۱۱۹۱	۲۵۱	۱۴۴۲	۴۵۷۴۱۶	۸۳۲۲۵	۵۴۰۶۴۱
صوبہ سرحد	۳۱۱	۴۲	۳۵۳	۹۲۳۲۹	۷۸۶۱	۱۰۰۱۹۰
قبائلی علاقہ	۲۹	۱	۳۰	۸۸۳۳	۹۲	۸۹۲۵
مشرقی بنگال	۲۸۲۵	۲۶۸	۳۰۹۳	۳۹۸۶۷۱	۴۳۸۱۸	۴۴۲۴۸۹
آزاد کشمیر	۸۱	۳	۸۴	۱۹۵۰۲	۶۵۶	۲۰۱۵۸
میزان	۴۹۶۵	۶۱۸	۵۵۸۳	۱۰۶۹۳۱۰	۱۴۸۶۱۴	۱۲۱۷۹۲۴

نوٹ:- مندرجہ بالا نقشے میں جو اعداد مشرقی بنگال کے مقابل دیئے گئے ہیں وہ ۱۹۵۳-۵۴ء کے متعلق ہیں۔ ۱۹۵۴-۵۵ء کے متعلق اعداد ابھی فراہم نہیں ہو سکے ہیں۔

رشید ہاشمی

معلم خطاب

سنٹرل گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج کراچی کے تربیت یافتہ معلمین کے وداعی جلسے کے موقع پر لکھی اور پڑھی گئی۔ (ایڈیٹر)

یہ بزمِ علم و فن اب کس قدر پر نور ہے ساقی
مگر ہر فرد اب دلگیر ہے رنجور ہے ساقی

تمہاری سعیِ پیہم نے کچھ ایسا رنگ دکھلایا
کہ تم نے علم سے سوئے عمل رختِ سفر باندھا

سنو! علم و اخوت کے علمبردار ہیں ہم سب
نئی نسلوں کے حق میں قافلہ سالار ہیں ہم سب

جہاں علم و دانش کے حقیقی نکتہ داں ہم ہیں
کہ شرق و غرب میں انسانیت کے پاسباں ہم ہیں

دھماکوں کی صدا کانوں میں ہر سو آ رہی ہے اب
صدائے جنگ سے انسانیت تھرا رہی ہے اب

اٹھو! اب جنگ کے دیوتا کو زیرِ خاک دفنا دیں
اٹھو سہمی ہوئی انسانیت کو اب سہارا دیں

غم و آلام، ظلم و بربریت کو فنا کر دیں
اخوت، عدلِ بے پایاں سے جامِ زندگی بھر دیں

یہ فرضِ آدمیت، علم و دانش کا تقاضا ہے
اسی بنیاد پر انسانیت بھی ناز فرما ہے

جو ہم چاہیں تو پرچم امن کا دنیا پہ لہرا دیں
جو ہم چاہیں تو جنگبازوں کو درسِ امن سکھلا دیں

ہمیں دنیا کو عافیت کا گہوارہ بنانا ہے
ہمیں انسانیت کو امن کے نغمے سنانا ہے

جہانِ آب و گل کو اک نئے ڈھنگ سے سجائیں گے
ز مشرق تا بہ مغرب امن کا سکہ جمائیں گے

اٹھو آزاد ملت کو حیاتِ جاوداں دیدیں
خزاں دیدہ چمن کو پھر بہارِ بے خزاں دیدیں

شبِ تاریک میں ہم علم کی شمعیں جلائیں گے
بہ فیضِ علم تاریکی جہالت کی مٹائیں گے

جوانانِ وطن کو ہم نئی راہیں دکھائیں گے
معلم ہیں شعارِ امن دنیا کو سکھائیں گے

معلم ہیں ہم اپنے علم کے جوہر دکھائیں گے
یہ طرزِ نو وطن کے نونہالوں کو پڑھائیں گے

رشید اس بزم کو علم و فن کی منزل سمجھتا ہوں
کہ اس پیغام ہی کو حاصلِ محفل سمجھتا ہوں

قدیم عربی ادب میں بہاریہ مضامین

(از حافظ سید رشید احمد ارشد ایم۔ اے لیکچرار ممتاز کالج خیرپور میرس)

بہت سے لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عرب کے صحرانشین اور بدو شاعروں کے اشعار میں بھی موسم بہار کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عرب کی جغرافی حیثیت کی مطابقت میں عرب کی قدیم جاہلیت کی شاعری بہاریہ نظموں کی ان رنگینیوں اور رعنائیوں سے خالی ہے جو عجمی اور فارسی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے جس کی وجہ .... محض یہ ہے کہ اس زمانہ کے عرب صحرانشین اور خانہ بدوش تھے اور شہری زندگی کے تکلفات اور آرائشوں سے آلودہ نہیں ہوئے تھے۔ عرب کے لق و دق بیابانوں اور ریگستانوں کی تند و گرم ہواؤں اور آتشیں بگولوں میں موسم بہار کی دھندلی سی جھلک اگر نظر آتی تھی تو وہ ان قدرتی نخلستانوں میں دکھائی دیتی تھی جو خط کی آب و ہوا سے پرورش پاتے تھے اور چند دنوں کے لئے ان بادیہ نشینوں کے خیمے وہاں گڑ جاتے تھے۔ یہی ان کے خوشگوار دن تھے جسے بہار سمجھئے اور انہی خوشگوار دنوں کی یاد عرب کے ان فطرتی شاعروں کو ہمیشہ تڑپاتی تھی چنانچہ عرب کی عشقیہ شاعری کے بانی اور نامراد شاعر امراء القیس کی شاعری ان ہی خوشگوار ایام اور مٹے ہوئے آثار کا نوحہ ہے۔

جاہلیت کی شاعری:- عرب کا شاعر ہمارے ان اردو شاعروں کی طرح نقال نہ تھا جو اپنے ہندستانی ماحول کو چھوڑ کر ایرانی شاعری کی تقلید پر گل و بلبل کے فسانے سناتے ہیں جن کی وجہ سے انکی شاعری حقیقت اور ماحول سے کوسوں دور ہو کر ہمارے جذبات اور زندگی کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی ہے۔ برخلاف اس کے عہد جاہلیت کے ان ہی شاعروں کے کلام سے ان کی طرز معاشرت، جذبات و خیالات، مشاغل یہاں تک کہ ان کے عارضی پڑاؤ، درختوں، پھلوں، پھولوں، پرندوں اور جانوروں تک کے نام معلوم کر سکتے ہیں۔ ان کا موسم بہار بہت مختصر اور سادہ تھا، اس کی تفصیل اور کیفیت آپ ان کی زبان سے خود سن سکتے ہیں۔ یہ بہاراً فریں ایام ان کے دلوں پر جو نقش چھوڑ گئے تھے ان سے انکا کلام بھرا پڑا ہے۔ تپتے ہوئے ریگستانوں میں کسی وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں بغداد، بصرہ، شیراز و کشمیر کے چمنستانوں سے زیادہ لطف دیتے تھے۔ خاردار جھاڑیاں اور درخت ان کے سبزہ زار تھے۔ گھوڑے اور اونٹنیاں ان کے رفیق اور محبوب تھے جو اس بحر خشک میں ان کے لئے سفینہ اور جہاز کا کام دیا کرتے تھے۔ محبوبہ کے فراق اور گزشتہ ایام وصال کی یاد کے نغمے ان کی موسیقی تھی۔

اسلامی دور کے عربی شاعروں کے برخلاف جاہلیت کی شاعری میں موسم بہار کے مخصوص پھل اور پھولوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ گلاب، یاسمین، گل لالہ، گل لاجورد، بنفشہ، گل خیری اور پھلوں میں سے کسی مشہور پھل کی رنگینی اور خوبصورتی کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ چند ایسے غیر مشہور درختوں، پھل اور پھولوں کا ذکر آتا ہے جن میں سے کسی کا بھی تشخص

کرنا آج کل کے ماہر علم نباتات کے لئے بھی دشوار ہے۔ تاہم نیچرل یا فطری شاعری کا اقتضا یہی تھا کہ بیان اور تخیل میں مطابقت رہے۔ ان لوگوں کی تشبیہات اور تخیل آرائی آجکل کے مہذب زمانے میں بعض اوقات مضحکہ خیز معلوم ہوگی۔ لیکن ہم ان کی قوت مشاہدہ اور صحیح قوتِ متخیلہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان دعووں صداقت کے لیے قدیم شعراء کا نمونۂ کلام پیش کریں۔ لیکن چونکہ اس سے ہم اصلی موضوع سے دور چلے جاتے ہیں اس لئے ہم مختصر اشارات کے ساتھ قدیم اور اسلامی دور کے عربی شعراء کے بہاریہ اشعار کا نمونہ پیش کریں گے جو ہمارے خیال میں اس موضوع پر پہلی کوشش ہے۔

(بہار نجد)

قدیم زمانہ میں سرزمین نجد عرب کا بہار آفریں اور حسن خیز خطہ رہا ہے۔ اسی جگہ قیس عامری کا وجود بیان کیا جاتا ہے جو مجنوں لیلیٰ کے لقب سے آج تک عربی، فارسی اور اردو کے شعرا کی محبوب ترین شخصیت سمجھا جاتا ہے اور اس نے ان زبانوں میں نجد کے نام کو روشن کر رکھا ہے۔ اسی سرزمین میں سے ایک دفعہ ایک بادیہ نشیں شاعر بہار کے ایام میں اپنے دوستوں کے ساتھ اونٹوں پر سوار ہو کر گذر رہا تھا کہ ان "صبحت الشیٔ" کی عطر بیز ہواؤں نے اس کو سرمست بنا کر بے اختیار یہ اشعار اس کی زبان سے ادا کرا دیئے۔

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِيمِ عَرَارِ نَجْدٍ   فَمَا بَعْدَ الْعَشِيَّةِ مِنْ عَرَارِ

أَلَا يَا حَبَّذَا نَفَحَاتُ نَجْدٍ   وَرَيَّا رَوْضِهِ بَعْدَ الْقِطَارِ

؎ یعنی اے دوست تو سرزمین نجد کی خوشبودار گھاس عرار سے جلد لطف اندوز ہو کیونکہ بعد از شب عرار کی خوشبو نہیں رہے گی (کہ ہم وہاں سے کوچ کر جائیں گے)، نجد کی ہوا کے خوشبودار جھونکے کیا ہی نشاط انگیز ہوتے ہیں اور خصوصاً بارش کے بعد گلشن نجد کی عطر بیز ہوا نہایت لطف دیتی ہے۔

آگے چل کر شاعر کہتا ہے کہ جس وقت ہمارا قبیلہ نجد میں فروکش ہوتا ہے تو ہمارے خاندان کی رہائش اس لطف کو دوبالا کر دیتی ہے اس وقت ہمیں زمانے کی بالکل شکایت نہیں ہوتی۔ عیش و مسرت کی گھڑیاں اس قدر جلد گزر جاتی ہیں کہ نہ ہمیں کسی مہینے کے نصف کا پتہ چلتا ہے نہ آخری دنوں کا۔

(کیفیت ابر و باراں)

مشہور شاعر امرؤالقیس اپنے مشہور قصیدہ معلقہ کے آخری حصہ میں مناظر بہار کا نقشہ کھینچتے ہوئے ابر و باراں کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے

"اے دوست تم بجلی کو دیکھ رہے ہو جس کی چمک ابر آلودہ آسمان میں ایسی معلوم ہوتی ہے گویا دونوں ہاتھوں کی حرکت سے چمک پیدا ہو رہی ہے اسے بجلی کی چمک کہیے یا یوں سمجھیے کہ وہ راہب کے چراغ ہیں جنہیں تیل ڈال کر اس نے اور روشن کر دیا ہو۔ اس قسم کی تشبیہ علامہ اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے ایمانِ کامل کی وضاحت کے لیے بیان فرمائی ہے جس سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

آگے چل کر امرؤالقیس کہتا ہے کہ آسمان اور بجلی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابر دائیں سمت کوہ قطن تک چھایا ہوا ہے اور بائیں طرف کوہ ستار اور یذبل تک اس کی وسعت۔

اتنے میں یہ ابر موضع کتیفہ کے اردگرد پانی برسانے لگا اور اس قدر موسلا دھار بارش ہوئی کہ یذبل جیسے درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بارش کے آغاز میں کوہ تبیر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بزرگ دھاری دار کمبل لپیٹے بیٹھا ہو اسکے بعد صحرائے غبیط میں بارش نے اپنا مال و متاع پھینک دیا جس سے پھل پھول نکل آئے، اور رنگا رنگ پھل پھول اور برگ گیاہ سے یہ وادی ایسی معلوم ہونے لگی جیسے ایک یمنی سوداگر بھاری گٹھڑیاں لاد کر آیا ہو اور اس نے نہایت خوبصورت پوشاکیں اس وادی میں پھیلا رکھی ہوں وادی کے مکا پرندے اس صبح ایسے مست اور بے خود تھے کہ گویا انھیں تیز شراب پلائی گئی ہے

طرفہ اور لبید

امرؤالقیس کے بعد طرفہ بن العبد عرب کا جواں مرگ شاعر بھی چھائی ہوئی گھٹا کا بیحد دلدادہ تھا۔ اس نے نوجوانوں کی تین مسرت خیز خصائل میں سے اس کو بھی شمار کیا ہے کیا خوب کہتا ہے۔

تقصیر یوم الدجن والدجن معجب۔ ببهکنة تحت الطراف المعد

یعنی خوشگوار ابر آلود دن کو ایک نازک اندام اور خوش اخلاق پری پیکر کی صحبت میں ایک وسیع خیمہ کے اندر گزار دیا جائے۔

"سبعہ معلقہ کے شاعروں میں سے لبید بن ربیعہ العامری مشہور شاعر تھے جنھیں مسلمان ہونے کا بھی شرف حاصل تھا وہ بھی "سبعہ معلقہ" کی مشہور نظم کے آغاز میں "محبوبہ کے آثار اور نشانات کے محو ہونے پر نوحہ و شیون رقمطراز ہیں" ان مقامات اور کھنڈرات کو موسم بہار کی خوشگوار عمدہ اور ہلکی بارش نے سیراب کیا تھا جس میں بجلی کی کڑک کی آمیزش بھی تھی ان مقامات پر صبح و شام اور شب میں متواتر بارشیں برستی رہتی ہیں اور بڑی زور کی گرج بھی تھی"

اسلامی دور میں جب عربی شاعروں نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا تو عربی زبان میں اس وقت کے بلند اور نازک تخیلات سے ایک عجیب قسم کی لطافت، لچک اور سلاست پیدا ہو گئی اور چونکہ عربی زبان کو عراق، ایران، ترکستان، شام و مصر میں بھی فروغ حاصل ہو گیا تھا۔ اور عربی النسل نوجوان ایسے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے جہاں قدرت کی فیاضی نے بہشت کا نمونہ پیش کر رکھا تھا۔ اس وجہ سے عربی کی بزمیہ، بہاریہ اور عاشقانہ شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا اور اسی دور کی شاعری میں ایران کی بہار آفریں شاعری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ہم تمام تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے عربی زبان کی ان تین نظموں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو دور متوسط میں خاص موسم بہار پر لکھی گئی ہیں اور جن میں بہار کی سحر کاریوں کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ قوم کی بد فعلی کی وجہ سے ہم محض ان کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس سے اصل خوبی کا اندازہ پورے طریقے سے نہیں کیا جا سکتا۔

بدیع الزماں ہمدانی

عربی ادب کی مشہور کتاب "مقامات بدیعی" کے مصنف بدیع الزماں ہمدانی نے جو عربی نثر و نظم دونوں میں ید طولیٰ رکھتا ہے موسم بہار کا نقشہ اپنی نظم میں اس طرح کھینچا ہے۔

موسم بہار پوری رونق کے ساتھ ہم پر نمودار ہو گیا ہے، دیکھو زمین و آسمان کیسے دلکش دکھائی دے رہے ہیں موسم بہار کی آب و ہوا اور دلکشی سے خاک مشک و عنبر بن گئی ہے۔ پانی صندل اور کافور کی طرح صاف اور خوشبودار ہے۔ اس موسم میں پرندے مطرب دلنواز کی مانند گیت گا رہے ہیں۔ موسم بہار کے چھینٹے جب گلاب کے پھول پر پڑتے ہیں تو وہ اپنی خوشبو سے ہمارے دماغ کو معطر کر دیتا ہے۔ موسم بہار نے کیا ہی اچھا ہمارے لیے سامانِ تفریح مہیا کر دیا ہے مناظرِ قدرت کے دلدادگان کے لئے یہ عجیب منظر ہے۔

مُقری الوحش

مشہور شاعر "مقری الوحش" اپنی بہاریہ نظم کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

"آسمان میں ابر گریاں ہے اور وہ قطراتِ شبنم کے آنسو سے اپنا کام لے رہا ہے۔ باغوں میں پھول مسکراتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے فرش پر زبرجد چمک رہا ہو۔ یہ خداوند تعالیٰ ہی کے کام ہیں جو اپنی صنعت کاری میں لاثانی اور یکتا ہے۔ باغیچوں میں گلِ لالہ اور گل اُس اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور پرندے خدا کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔ پانی کبھی اچھل رہا ہے اور کبھی مسلسل بہتا ہے بادِ نسیم چل رہی ہے جس کی وجہ سے درخت رقص کر رہے ہیں۔ گلاب اور یاسمین کے پھول ابھی بند تھے کہ یکایک غنچے شگفتہ ہو گئے۔ گل نسرین تبسم کناں ہے اور اس نے تازہ خوشبو سے چمن کو مہکا دیا ہے۔ گل انحواں اپنی تلوار اور ڈھال کے ساتھ شمشیرِ بے نیام کی طرح دکھائی دے رہا ہے تشنہ لب نرگس ہجراں نصیب غمگین عاشق کے مشابہ ہے جو گم کردہ راہ ہو۔

یہ چمنستان ایک جامع مسجد کی طرح ہے جس میں پھولوں کے تختے فرش کا کام دے رہے ہیں اور ترنج کی قندیلیں اس میں آویزاں ہیں۔ پرندے اس چمن میں شاخوں کے ممبروں پر خطبہ پڑھ رہے ہیں (چہچہا رہے ہیں) اور نغمہ حمد و ثنا کے نغمے گا رہے ہیں۔

ابوالحسن زبناع

فقیہ ابوالحسن زبناع موسم بہار کی رنگینیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

"موسم بہار نے شگفتگی اور ترو تازگی کا لباس پہن لیا ہے۔ ویرانی کے بعد اب زمین سرسبز ہو گئی اور خشک سالی کے بعد یہی سرزمین نعمتِ الٰہی کا مظہر بن گئی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ زمین بڑھاپے کے بعد از سرِ نو جوان ہو گئی ہے۔ اس کی حالتِ زار پر ترس کھا کر بادلوں نے اپنی آنکھوں سے گریہ وزاری شروع کر دی ہے (برسنے لگے ہیں) مگر مجھے ان پھولوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ گریۂ ابر سے کیسے شگفتہ ہو گئے ہیں اور اس کی ترشروئی (گرجنے اور کڑکنے کی آواز) سے وہ کیوں خوش ہیں۔ دراصل پھولوں کی شگفتگی اس طرح سے ہوئی کہ بادل ان کی بلند زمینوں پر برسے اور تمازتِ آفتاب نے انھیں پیدا کیا۔

تم پھولوں کو نہیں دیکھتے کہ ہر ایک پھول (کثرت کی وجہ سے) ایک دوسرے پر سوار ہے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کی شاخیں معلوم ہوتی ہیں۔ پرندے ان کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے طرح طرح کے نغمے الاپ رہے ہیں

جب وہ چہچہاتے ہیں تو شاخیں جھومنے لگتی ہیں گویا ان نغموں سے مسرور ہو کر رقص کر رہی ہیں۔

یہ ان نظموں کا نمونہ ہے جو خاص طور پر موسم بہار پر تحریر کی گئی ہیں مگر بہار کا تذکرہ ..... ان کی عشقیہ شاعری اور فارسی قصائد کی طرح تشبیب میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کا اثر ان کے کلام پر اس قدر ہے کہ بہار کے لوازم پھل اور پھولوں کی تعریف اور (؟) پر نادر اور لطیف تشبیہوں سے نازک خیال شعرائے عرب کا کلام بھرا پڑا ہے اور محبوب کے سراپا کی تعریف میں اس قسم کی نادر و پاکیزہ تشبیہیں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں کہ بے اختیار ان کے تخیل آرائی کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس قسم کے اشعار کا نمونہ ہم سردست شمالی افریقہ اور جزیرہ سسلی کے مشہور شاعر اور نقاد ابن رشیق کے کلام سے پیش کریں گے۔

ابن رشیق اور بہار

ابن رشیق نے شعر کی ماہیت اور تنقید شعر میں عربی میں ایک زبردست کتاب لکھی ہے جس میں حقیقت شعر سے متعلق اس کے نتائج افکار کو اہل یورپ نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس کے خیالات کی داد دی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جزیرہ سسلی کے اس بے مثل شاعر کا کلام مکمل حالت میں موجود نہیں ہے (خدا ہمارے ملک کے ادیب مولوی عبدالعزیز میمنی کا بھلا کرے کہ انھوں نے ادبی کتب سے اس کے اشعار کا ایک مختصر مجموعہ اخذ کر کے شائع کیا ہے)

باغ و بہار پھل اور پھولوں کی توصیف میں ابن رشیق نے اپنی لطیف قوت متخیلہ کی مدد سے نہایت بہتر اور عمدہ تشبیہیں رقم کی ہیں جن کی مثالیں مغربی ادب میں بہت کم ملتی ہیں۔

شاعر موصوف انار کے ایک گنجان باغ کی توصیف یوں کرتا ہے۔

"میں نے باغ میں کیا اچھے مناظر دیکھے (باغوں میں پیڑ اس قدر تھے) درختوں کی شاخوں نے مشرق کے آفتاب کو چھپا رکھا تھا۔ انار کے پھلوں کے جوڑے ایسے دکھائی دیتے تھے گویا کہ وہ مضبوط طلائی قندیلیں ہیں"۔ ایک خوبصورت لڑکے کے ہاتھ میں سیب دیکھ کر شاعر موصوف یوں تخیل آرا ہے "شامی سیب سرمگیں چشم والے اُس لڑکے کے ہاتھ میں ہے اس کے سیب کی سرخی شرم آلود رخسارے کی سرخی سے مشابہ ہے"۔

موسم بہار میں بنفشہ کی روئیدگی کو دیکھ کر شاعر پکار اٹھتا ہے۔

"بنفشہ ایسے وقت میں نمودار ہوا ہے کہ جب نہ موسم گرما ہے نہ سردی کی شدت ہے جب ہم اس کے قریب گئے تو وہ لاجوردی لباس پہنے ہوئے تھا"۔

گل لالہ کو ابن رشیق کی قوت متخیلہ اس طرح پیش کرتی ہے۔

"میں نے سرخ گل لالہ کو ملاحظہ کیا جس کے ارد گرد سیاہی کی آمیزش تھی۔ یہ سرخ پھول اس سیاہی کی آمیزش کے ساتھ ایسا نظر آتا تھا جیسے بچے کے ہونٹوں پر روشنائی لگ گئی ہو"۔

ابر کے برسنے اور اس میں بجلی کے چمکنے کی شاعرانہ توجیہ صرف ایک شعر میں اس طرح بیان کی ہے۔

خلیلی حل للمزن مقلته عاشق ... ام النار فی احشائها وهی لا تدری

یعنی اے میرے دوستو! کیا بادل عاشق کی آنکھ ہے (جو ہر وقت ابر کی طرح آنسو بہاتی رہتی ہے) یا اس کے اندر آگ ہے جس کی اسے خبر نہیں (مگر وہ بجلی کی چمک کی صورت میں کبھی نمودار ہو جاتی ہے)

شاعر موصوف نارنگی کے درختوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

"نارنگی کے درختوں کا رومان انگیز منظر دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے۔ ان شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور شاخوں پر نارنگیاں لٹکی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ زبرجد کے آسمان پر عقیق کے ستارے درخشاں ہیں"

ابن المعتز کا انداز بیان

نارنگیوں کے رنگوں کی تشبیہ و توجیہہ کے سلسلے میں مشہور عباسی شہزادہ عبداللہ بن المعتز نے اس سے بہتر تخیل آرائی کی ہے۔ ابن المعتز کہتا ہے

کانما النارنج لما بدت ٭ مُصفرّتہ فی حمرۃ کاللہیب
وجنۃ معشوق رأی عاشقہ ٭ فاصفرّ ثم احمرّ خوف الرقیب

یعنی نارنگی ایسے موقع پر جبکہ اس کی سرخی میں زردی شعلہ کی طرح نمودار ہو جاتی ہے۔ محبوب کے رخسار کے مانند ہے جو اپنے عاشق کو دیکھ کر اور رقیب کے خوف سے زرد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہی رخسار نہایت سرخ ہو جاتا ہے۔

ایک ہی چیز میں زردی اور سرخی کی شاعرانہ توجیہہ کو اس نوجوان شاعر نے ایسے بے مثل انداز میں بیان کیا ہے کہ اس پر ہزاروں شعر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ نارنگی کے متعلق اس شاعر عباسی کی دوسری نادر تشبیہہ ملاحظہ ہو۔

وکانما النارنج فی اغصانہ ٭ من خالص الذہب الذی لم یخلط
کرت رماہا الصولجان الی الہواء ٭ فتعلقت فی جوّہ لم تسقط

یعنی شاخوں پر نارنگیاں خالص سونے کی گیندیں معلوم ہوتی ہیں جنہیں گیند کے بلے نے اوپر ہوا میں پھینک دیا ہو اور وہ وہیں خلا میں لٹک کر رہ گئی ہوں اور گری نہ ہوں؟ کیا مغربی شاعروں کا آرٹ اس سے بہتر تخیل اور تشبیہہ پیش کر سکتا ہے۔

ابن رشیق کی زبان سے خیام کا فلسفہ مسرت بھی سن لیجئے جو موسم بہار میں ہر نوجوان کے دل میں موجزن ہوتا ہے "اے دوست صبح سویرے ہی خوشبودار سے لطف اندوز ہو جاؤ اور مسرت انگیز گھوڑے پر سوار ہو کر جلد پہونچو اس سے پیشتر کہ چاشت کا آفتاب صبح برسنے والے بادلوں کو جذب کر لے"

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابن رشیق کے رفیق باصفا ابن شرف قیروانی کے دو شعر پیش کریں جو اس نے بانسری کی تعریف میں لکھے ہیں۔ ابن شرف کہتا ہے—

"خدا اس زمین کو سیراب کرے جہاں تیری چوب کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے شاخیں اور درخت بھی پاکیزہ ہو گئے ہیں۔ جب اس بانسری کی چوب سرسبز تھی تو اس وقت اس پر طیور خوش نوا گیت گاتے تھے اور جب یہ چوب خشک بن گئی تو اس پر حسینان نازک اندام نغمہ ریز ہیں"

عربی شعر میں بہار

عربی شعراء اور ادیب انگریزی، فارسی شعراء مناظر قدرت کے دلدادہ تھے۔ وہ موسم بہار

محوِ گلگشتِ چمن رہتے تھے اور کھلی فضا میں ان قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونا ان کا خاص شیوہ تھا۔ ایسے موقع پر ان کے شاعرانہ تخیل کو جو چیز اپنی طرف کھینچ لیتی تھی بے ساختہ اس پر ان کی زبان سے اشعار موزوں ہو جاتے تھے۔ اور مختلف شعراء وادبا موازنہ اور محاکمہ کے طور پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ مذکورہ بالا شاعر ابن رشیق کا ایسا واقعہ بھی کتب ادب میں مذکور ہے جس میں شاعر اپنے ہم عصر شاعروں کے ساتھ شہر سے باہر کھلی فضا میں محوِ گلگشت چمن رہا اور ابر آلود فضا میں گل لالہ کے باغ میں نثر اور لطیف اشعار سے مختلف شعراء طبع آزمائی کرتے رہے ہم اس بزم سخن کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔

اس قسم کا واقعہ اور موسم بہار میں شاعروں کی سیر و تفریح کا حال مشہور عربی نثر نگار ابو محمد قاسم بن علی الحریری نے اپنی مشہور کتاب مقاماتِ حریری کے چوبیسویں مقام قطیعیہ میں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

صاحب موصوف اپنے فرضی راوی حارث بن ہمام کی زبانی رقمطراز ہیں۔

حارث بن ہمام کہتے ہیں کہ موسم بہار میں مجھے بغداد کے مشہور و معروف محلہ "قطیعۃ الربیع" میں چند ایسے نوجوانوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جن کے چہرے موسم بہار سے زیادہ شاداب اور خنداں تھے اور ان کے اخلاق گلہائے بہار سے زیادہ شگفتہ تھے۔ اور ان کی گفتگو بہار نسیم سحری سے زیادہ شیریں تھی چنانچہ میں نے ان کے صحبت سے وہ لطف اٹھایا جس نے رنگین اقتباس افروز دیکھی بات کر دیا اور جس میں رباب اور چنگ کے نغموں سے زیادہ محظوظ کیا۔ ہم نے پیمانِ رفاقت کو مستحکم کر رکھا تھا اور ہر ایک کو اس بات سے منع کر رکھا تھا کہ وہ تن تنہا کسی چیز سے لطف اندوز نہ ہو خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔

ایک دن جب گھٹا چھائی ہوئی تھی اور دن نہایت ہی خوشگوار تھا فضا ایسی سرمست کر دینے والی تھی کہ بہار کی گھٹائیں شرابِ صبوحی پی لینے پر مجبور کرتی تھیں، ہم نے کسی سبزہ زار کی طرف گلگشت کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ہم ان پرفضا چمنوں کو "جنت نگاہ" بنائیں اور اپنے دل و دماغ کو ابر و باراں کے نظاروں سے تر و تازہ کریں۔ ہم سب احباب نے جو سال کے بارہ ماہ کی تعداد پر مشتمل تھے اور (شاہ حیرہ) جذیمۃ الابرش کے ہمنشینوں کی طرح مودت و اخلاص میں کامل تھے، ایک ایسے چمنستان کی طرف رخ کیا جو اپنی خوبی میں لاجواب تھا اور گلہائے رنگا رنگ سے مزین تھا (اس سیر میں) شراب ارغوانی بھی ہمارے ساتھ تھی جیسی ساقی اور ایسے مطرب خوش نوا بھی ہمراہ تھے جن کے نغمے "فرو دین گوش" کا حکم رکھتے تھے۔

یہ ہے مختصر خاکہ عربی کے بہاریہ ادب کا۔ افسوس ہے کہ وقت کی کمی اور طوالت کے خوف سے زیادہ طول نہیں دیا گیا تاہم عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس سے مستفید ہوں گے ہم نے دیدہ دانستہ قدیم عربی ادب سے مثالیں پیش کی ہیں کیونکہ جدید عربی ادب تو مغربی ادب کی تقلید میں ہر طرح کے بہاریہ مضامین اور قدرتی مناظر کی عکاسی سے مالا مال ہے۔ قدیم عربی ادب پر ہماری یہ ابتدائی کوشش اس سلسلے سے تعلق رکھتی ہے کہ ہم قدیم عربی ادب سے ان اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کریں جو ناواقفیت کی بنا پر مغربی اور مشرقی نقادوں کی طرف سے بار بار کیے جاتے ہیں کہ قدیم عربی ادب بہاریہ مضامین اور مناظر قدرت کی صحیح عکاسی سے خالی ہے امید ہے کہ ہماری یہ خامہ فرسائی اور ابتدائی کوشش دیگر اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر سکے گی کہ وہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

عربی زبان پاکستان میں انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے[1]

(از پروفیسر حسن الاعظمی ازہری)

منشورِ عربی:۔ (۱) سیاسی دنیا کے موجودہ دو طاقتور بلاک (روسی اور اینگلو امریکن بلاک) کی مستقل کشمکش و مخالفت آرائی سے دنیا اضطراب و شوق کے ساتھ ایک تیسرے غیر جانبدار طاقتور بلاک قیام کی منتظر ہے بلکہ اس مقصد کے لیے کوشاں ہے۔ یہ تیسرا بلاک دنیائے معلومہ کے متمدن ممالکِ اسلام پر مشتمل خود بخود ظہور میں آ رہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب شرک و کفر کی جنگ زرگری سے تنگ آ کر تمام جہاں تیسرے بلاک کی آغوش میں پناہ لے کر نجات حاصل کرنے کی سبیل تلاش کرے گی اس بلاک کے ایک ایک حصہ کو جو مشترک رابطہ استوار و مضبوط رکھ سکے گا وہ اس تمام بلاک کی مشترکہ دینی زبان عربی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

(۲) حالات سے ظاہر ہے کہ موجودہ دونوں ملحد و مشرک روسی و اینگلو امریکی بلاکوں میں یقیناً جلد ایک فیصلہ کن ٹکر ہو گی۔ پھر کفر و اسلام کا تصادم لازمی و لابدی ہے۔ اور بطور نتیجہ مستقبل قریب میں ایک عالمی حکومت ضرور قائم ہو جائے گی۔

(۳) پاکستان دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اور اہم حکومت ہے اور صرف اسی غرض سے انتہائی قربانیوں کے بعد قائم کی گئی ہے کہ (احیاء ثقافتِ اسلامیہ) کی رائد و قائد بن کر اسلامی حکومتوں کے لئے مشعلِ راہ بنے۔ اور اب تو یہ حقیقت بالکل تسلیم کر لی گئی ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل کسی ملک کی تشکیل مذہب کی بنیادوں پر نہیں ہوئی اور چونکہ ہماری دنیا جمہوریت کے اس جدید تخیل کو قبول کرنے کے لئے مطلقاً تیار نہ تھی۔ اس لئے عوام نے فطرتاً اس عجیب و غریب ملک کے وجود کو حیرت زدہ ہو کر دیکھا کیونکہ وہ مذہب کو ایک خانگی اور شخصی دھندا قرار دیکر یہ تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے کہ اسے سیاست میں دخل دینے کا بھی کوئی حق حاصل ہے اور پاکستان کا تصور انہیں درحقیقت اس درجہ انوکھا معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی جو براہ راست اس سے مستفید ہونیوالے تھے اس کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکے۔ حالانکہ اسلام پاکستان کا وہ اولین عنصر ہے جس پر اس کی قلبی حرکت کا ابھی تک انحصار ہے۔ چونکہ اسلام دیگر مذاہب عالم کی طرح صرف نجی معاملہ یا محض آخرت میں کام آنیوالا جنتر منتر نہیں ہے اس لیے مغربی اور ہندی ساخت کے دماغ ایک ایسے دینِ فطرت کی اہمیت کو کماحقہٗ کس طرح سمجھ سکتے ہیں جو دین و دنیا اور افراد و اجتماع نیز بین الاقوامی

[1] یہ مقالہ پروفیسر حسن الاعظمی ازہری کو جس وقت پرنسپل عربک کالج کراچی نے عزت مآب عبدالوہاب خان صاحب صدر مجلس دستور پاکستان کے اعزاز میں ایک عصرانہ کے موقع پر پیش کیا

دفاتی مقتضیات کا مکمل کفیل ہے

یہی وہ دین فطرت ہے جس کی زبان بلا نزاع صرف عربی ہے اور پاکستان میں عربی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنا لینا ویسے بھی قرار دادِ مقاصد کے عین مطابق ہے کیونکہ بانیٔ پاکستان قائداعظم نے بار بار فرمایا تھا "پاکستان کی بنیادیں اسلام کی مستحکم چٹان پر رکھی جائیں گی" اور اگر دفاتر کی زبان عربی بنا دی گئی تو اس سے اقلیتوں کے حقوق کو بھی ٹھیس نہیں لگ سکتی چنانچہ بدھسٹ لیگ ڈھاکہ کے سکریٹری نے ۱۰ فروری ۱۹۵۲ء کو ڈھاکہ سے اپنے ایک اہم بیان میں عربی کے سرکاری زبان بننے کے امکان کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ نیز آل پاکستان بلوچ لیگ کے جنرل سکریٹری مسٹر علی محمد مکرانی نے ۱۷ فروری ۱۹۵۴ء کے ڈان وغیرہ کے ذریعہ ایک بیان نشر کیا ہے، جس میں انھوں نے اردو بنگالی دونوں کی مخالفت کرتے ہوئے عربی زبان کے سرکاری بنانے کا مطالبہ کیا ہے اور پوری یقین دہانی کی ہے کہ اگر عربی کو حکومت کی زبان بنا دیا جائے تو پاکستان کے ایک کروڑ بلوچی پوری تائید کریں گے۔

(۴) پاکستان کے استحکام کے لئے صوبہ واری اور فرقہ واری لعنتوں سے گلوخلاصی ضروری ہے جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ عربی کو بلا تاخیر پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کا اعلان کر دیا جائے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ بیس سال کی میعاد کا ایک منصوبہ تیار کیا جائے، توقع کی جا سکتی ہے کہ اس مدت میں پاکستان کے طول و عرض میں عربی زبان کی اتنی اشاعت یقیناً ہو سکتی ہے، جتنی ڈیڑھ سو سال میں انگریزی کی ہو چکی ہے، یہ سات سمندر پار کی غیر مالوف وغیر مانوس انگریزی زبان آج آزادی کے بعد بھی ہمارے ملک میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہے اور عربی کے آسان ہونے کی تائید تو خود خدا کا یہ کلام "ولقد یسرنا القرآن" (بے شک ہم نے قرآن کو آسان بنایا ہے) کرتا ہے (بیس سال کی مدت کا تعین بھی صرف موجودہ حکمرانوں کی مرضی کے مد نظر ہی کیا گیا ہے ورنہ فقط دس سال بعد عربی انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے)۔

(۵) پاکستان میں بیک وقت دو سرکاری زبانیں بنانا ایک سنگین غلطی ہوگی۔ یہ اقدام پاکستان جیسی عظیم اسلامی مملکت میں ملتِ اسلامیہ کے جسم کو دو منہ والے سانپ سے ڈسوانے کے مترادف قرار دیا جائے گا۔ جس طرح کسی ملک میں دو بادشاہ یا دو جمہوری صدر بہ یک وقت برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتے، اسی طرح دو زبانیں بھی سرکاری نہیں ہو سکتیں اس کے علاوہ صرف اردو یا محض بنگالی کو اختیار کر لینا بھی عملاً محال ہے البتہ عربی کو پیش نظر رکھنے سے صوبائی عصبیت اور دیگر اختلافات کا قطعی سدِّباب اور خاتمہ ہو جائے گا اس سلسلے میں کناڈا یا سوئٹزرلینڈ کی مثال دینا غلطی ہے، کیونکہ وہاں ایک سے زائد زبانیں تمام باشندوں کی مشترکہ طور پر مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں، نیز وہاں کے مختلف باشندے جغرافیائی فصل کا شکار نہیں۔

(۶) زمانہ ماضی میں صرف بیس سال کی قلیل مدت کے اندر مصر و سوڈان و دیگر ممالکِ شمالی افریقہ فلسطین اور شام و عراق کی قدیم مقامی زبانوں (قبطی بربری عبرانی سریانی اور کلدانی وغیرہ) کا استیصال کر کے صرف عربی، سرکاری اور عوامی زبان بن گئی اور بحمداللہ آج تک وہی ہے۔

(۷) اینگلو امریکن اور روسی سازش سے قائم شدہ نام نہاد اسرائیلی حکومت ہزار سال کی مردہ عبرانی زبان جیسی ناقص فرسودہ زبان کو زندہ کر کے اگر اسے چند سال میں سرکاری زبان بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے اور پاکستان کا ہمسایہ ملک بھارت اگر ہندی جیسی ناقص فرسودہ زبان کو پندرہ سال میں سرکاری زبان کا درجہ دے سکتا ہے تو کیسے شرم کی بات ہے کہ ہم مقدس و جامع زندہ عربی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان نہیں بنا سکتے۔

اس سلسلے میں یہ امر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ سرکاری زبان اور عوامی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے، فی الوقت ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ عربی کو سرکاری زبان قرار دے دیا جائے اور یہ حکومت کے حد اختیار میں ہے

بطور مثال انگریزوں نے ہندستان پر قبضہ کر کے انگریزی کو حکومت کی بلا مشورہ سرکاری زبان بنا دیا تھا لیکن انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انگریزی ہندستان کی عوامی زبان تھی ہے۔ انگریزی ہمارے لیئے بالکل غیر مانوس اور بیگانہ تھی اور ہے لیکن عربی روز اول سے "اسلامی زبان" ہے اور یہ ڈیڑھ فی صد انگریزی دانوں کی جوتیوں کا ہی صدقہ ہے کہ آج بھی بھارت کے مختلف حصے اسی کے طفیل اتحاد کی رسی میں منسلک ہیں۔ عربی یقیناً پاکستان اور بیرون پاکستان کے اجزا میں انگریزی سے کہیں زیادہ جاذبیت اور اتحاد پیدا کر سکتی ہے۔

(۸) اگر بنگالی اور اردو کے نزاع کو جلد ختم کر کے متفقہ طور پر عربی کو سرکاری زبان بنانے کے لئے جدوجہد نہ کی گئی تو پاکستان پر قدیم استعماری زبان انگریزی ابھی برسوں مسلط رہے گی، اور ڈیڑھ فیصد انگریزی دانوں کی قلیل ترین تعداد کی آمرانہ حکومت کروڑوں پاکستانی عوام کے سروں پر ہمیشہ منڈلاتی رہے گی۔ اور ملت اسلامیہ کے اس مبارک و ضروری مطالبہ کی راہ میں اب یا آئندہ جتنی مشکلات پیش کی جا سکتی ہیں وہ اغلباً اسی گروہ کی سازش سیاست کاری کا نتیجہ ہوں گی جو ہمیں انگریزوں اور انگریزی کی غلامی سے آزاد نہیں دیکھنا چاہتے۔

(۹) پاکستان کو خصوصاً اور عالم اسلامی کے دیگر ممالک کو عموماً ان تاریخی واقعات سے بھی سبق حاصل کرنا چاہیے جو آٹھ سو سال پیشتر قسطنطنیہ میں رونما ہوئے تھے یہ وہ زمانہ تھا جب ترک مجاہدین عیسائیوں کے اس حسین شہر پر حملہ کر رہے تھے تو صلیبی قائدین اور پادری اس موشگافی میں منہمک تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا فضلہ پاک تھا یا ناپاک۔ بے عمل بال کی کھال اتارنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ دلپذیر شہر آج تک ترکوں کے قبضہ میں ہے، قسطنطنیہ کی تسخیر صرف ترکوں کی شجاعت کا ثبوت ہی نہیں بلکہ عیسائیوں کی نا اتفاقی انتشار اور لایعنی موشگافیوں کا شاہکار بھی ہے۔

اس بیسویں صدی میں جبکہ دشمنانِ اسلام چاند اور ستارۂ مریخ میں قیام کی فکر کر رہے ہیں اور ایٹم بم ہائیڈروجن بم جیسے خوفناک و مہلک اسلحہ بنا کر اپنے مخالف کو فنا کرنے پر تلے ہوتے ہیں، پاکستانی مسلمانوں کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ وحدتِ فکر کے بجائے فضول بحثوں یا فرقہ وارانہ فروعی مسائل کو ہوا دینے میں منہمک رہیں۔

(۱۰) پاکستان پر واجب ہے کہ وہ عربی کو اپنا کر عرب

ممالک اور دیگر ممالک اسلامیہ سے رشتۂ اخوت و مودت استوار کرے اور اشتراکی و سرمایہ پرست (روسی اور اینگلو امریکن) ممالک پر اعتقاد کو سراسر ناعاقبت اندیشی تصور کرے۔

(۱۱) اگر عربی زبان سرکاری زبان ہوگئی تو عالم اسلام کا یہ سب سے بڑا ملک یقینی طور پر مشرق وسطی کا رہنما بننے کی اہمیت پیدا کرلے گا۔ اس لیئے کہ اکثر عرب ممالک کرۂ ارض کے اسی حصہ میں آباد ہیں جن کی مجموعی تعداد چھ سات کروڑ ہے۔ (پاکستان کی آبادی آج آٹھ کروڑ پر مشتمل ہے)، انشاءاللہ العزیز چند سال میں یہ عربی زبان بولنے والا خطہ پچیس کروڑ انسانوں کی آبادی پر مشتمل ہوگا جو اخوت اسلامی و وحدت لسانی کے مستحکم رشتہ میں منسلک ہوں گے جہاں ایک مضبوط و جانباز فوج ہوگی اور اطمینان بخش اقتصادی ذرائع ہوں گے۔

(۱۲) چونکہ جمہوریت کے اصول کے مدنظر سابق وزیراعظم پاکستان نے سرکاری زبان بنانے کے بارے میں استصواب رائے کا اعلان کیا ہے۔ اسلئے ہم نہایت فراخدلی اور اطمینان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر اردو و بنگالی زبانوں کے سلسلے میں رائے لی جائے تو عربی زبان کے لئے بھی رائے لینی چاہیئے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ آزادانہ انتخاب میں تنہا عربی ہی کو زیادہ تائید حاصل ہوگی بشرطیکہ صرف ایک زبان کا ہی انتخاب کرایا جائے۔ درحقیقت ایک ساتھ دو زبانوں کے بارے میں استصواب ہی ضروری ہے، تو مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام سے صرف ایک زبان کے لئے رائے لینی چاہیے، چاہے وہ دنیا کی کوئی زبان بھی ہو لیکن صرف ایک ہی ہو۔ بشرطیکہ وہ اسلامی ثقافت اور مقصدِ پاکستان کی مکمل ترجمان ہو۔ اس لئے کہ تقسیم ہند ایک مخصوص ثقافت کی بقا کے لئے ہی عمل میں آئی ہے اور قرارداد مقاصد اس کی برہانِ قاطع ہے۔ جب ایک زبان کے استصواب کا اصول قبول کرلیا جائے تو اس کی کامیابی کے لئے لابدی شرط یہ ... ہونی چاہیے کہ پوری آبادی کی ایک تہائی آراء کا حصول ضروری ہو

(۱۳) کہا جاتا ہے کہ قائداعظم نے اعلان کیا تھا کہ "اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی" اگر یہ صحیح ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آپ اس سیاسی تدبر و مصلحت سے ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی صفوں کو اور متحد و مضبوط کرنا چاہتے تھے اور اس کا خاطر خواہ فائدہ بھی ہوا لیکن یہی واقعہ ہے کہ قائداعظم کے بعد اب پاکستان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں رہی جو طوعاً و کرہاً یہ مطالبہ منوا سکے اگر عربی کو سرکاری زبان بنانے کے دعویٰ کو قائداعظم کے قول کی مخالفت ہی تصور کرلی جائے تو کیا عربی کی مخالفت رسولِ اعظم کی مخالفت کی بنا پر خطرناک نہیں ہے؟ موجودہ حالت میں زبان کے پیچیدہ مسئلہ کا حل صرف عربی زبان کو بلاچون و چرا اختیار کرلینے میں ہی مضمر ہے۔

عربی کیوں؟

(۱) چونکہ رب العزت نے اپنے آخری و مکمل پیام کے لئے اسی جامع زبان کو منتخب کیا ہے اور حقیقت میں قرآن کا کسی بھی زبان میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اگر بفرضِ محال ترجمہ کو علم کر دیا گیا تو اور آسمانی کتب کی طرح قرآنِ کریم کے بھی (نعوذ باللہ) مسخ ہونے اور بدلنے کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لہٰذا ہر مسلم کو خدا کا یہ کلام اصل عربی ہی میں سمجھنا چاہیے

(۲) عربی جانے بغیر قرآن فہمی ناممکن ہے اور عدم فہم قرآن کی حالت میں اسلام کے ستونِ اوّل نماز کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ ہماری دلیل خود خدا کا یہ کلام "لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری حتیٰ تعلموا ما تقولون" ہے کہ نشہ کی وجہ سے جب قرآن نہ سمجھ سکو تو نماز سے دور رہو اور جہالت سے چونکہ جاہل قرآن کو سمجھتا ہی نہیں اس لیئے اس کی نماز میں نقص یقینی ہے اور امام ابن تیمیہ کا بھی یہی قول ہے۔

(۳) دیرینہ مسلسل تجربہ شاہد ہے کہ مسلمانانِ عالم کے لئے صرف عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جسے وہ جلد سیکھ سکتے ہیں مثلاً بنگالیوں کے لیئے اردو کی بہ نسبت عربی بہت آسان ہے۔ اسی طرح انگریز، امریکی، جرمنی اور چینی جاپانی وغیرہ بھی عربی بہت جلد سیکھ سکتے ہیں۔ نمائندہ ولنے مصری یونیورسٹی میں برسوں عربوں کو اردو سکھانے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پاکستانیوں کے لئے عربی آسان اور عربوں کو اردو مشکل ہے۔

(۴) دوسری عالمگیر جنگ کے بعد پھیلاؤ کے لحاظ سے دنیا میں عربی کا درجہ دوسرا ہو گیا ہے اور انگریزی کے بعد یہی زبان دنیا کے ہر مقام میں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور دنیا کی ساری جامعات میں اس کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے اور تیسری عالمگیر جنگ کے بعد توقع ہے کہ عربی دنیا کی درجۂ اوّل کی زبان بن جائے گی۔

(۵) علامہ اقبال سے جب علامہ ندوی مرحوم نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں ولیوں کے کلام سے بھی زیادہ تاثیر ہے تو آپ نے جواب دیا کہ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میری عادت تھی کہ سیالکوٹ آکر میں ہمیشہ روزانہ قرآن کی بلا فہم تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک بار میرے صوفی منش والد نے مجھ سے کہا "اقبال کیا کرتے ہو" اور جب میں نے سوال کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ "تم قرآن اس طرح پڑھو گویا وہ تمہیں پر اتارا گیا ہے"۔ اس جملہ نے میری آئندہ کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، اور قرآن فہمی کی کوشش نے میری روح میں بلندی بخشی۔ اگر عربی کو اپنا لیا گیا تو ہر پاکستانی میں اقبالی شان کی گنجائش ہو جائیگی۔

مذہبی اہمیت:۔ (۱) عالم الغیب اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر بولی جانیوالی لاکھوں زبانوں میں سے صرف عربی کو ہی اپنے آخری اور کامل پیام کے لئے پسند فرمایا ہے، حالانکہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ کے لئے اور زبانوں کو بھی یہ رتبہ دینا ممکن تھا۔

(۲) تمام اسلامی اور الہامی کتب تراجم ہونے کے بعد مسخ ہو کر رہ گئی ہیں اور آج قرآن کریم کے سوا کوئی دوسری الہامی کتاب اصلیت و صحت کا بجا طور پر دعویٰ نہیں کرتی ہے۔

(۳) صفحۂ ارض کے تمام مسلمانوں کو بوقت ولادت آذان و تکبیر (عربی) پھر عقیقہ، ختنہ، رسم بسم اللہ ازدواج اور تجہیز و تکفین، نیز زندگی کے دیگر بیشتر لمحات میں عربی زبان ہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کے علاوہ تمام نمازوں اور خطبوں میں عربی زبان لازمی طور پر مستعمل ہے

(۴) ہر ملک کے مسلمانوں کو اگرچہ اپنی اپنی مادری زبان سے فطری لگاؤ ہے، لیکن انھیں بھی اور حقیقی محبت

عربی ہی سے ہے، واحد اسلامی زبان ہونے کی وجہ سے محض عربی ہی ایسی کشش رکھتی ہے کہ مسلمان اپنی مادری یا ملکی زبانوں کو اس پر بخوبی قربان کر سکتے ہیں۔ اس کی تازہ اور تاریخی مثال یہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت کی زبان یعنی بنگالی کے حامیوں نے عربی کی خاطر اپنی زبان کو قربان کر دینے کا علانیہ مظاہرہ کیا ہے چنانچہ انھوں نے ایک محضر نامہ پر لاکھوں دستخط کرا کے اسے صدر مجلس دستور ساز کو ارسال کیا۔ نیز ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ کونسل نے ایک قرار داد منظور کی جس میں عربی کو پاکستان کی مرکزی اور سرکاری زبان قرار دینے کا پر زور مطالبہ کیا گیا علاوہ ازیں مجلسِ دستور ساز مرکزی اور مشرقی بنگال کی مجلس قانون ساز (اسمبلی) کے ۶۵ بنگالی ارکان نے بھی مسلم لیگ کی کونسل کی قرار داد کی پر زور تائید کی ہے، کہ جب زبان کا مسئلہ مجلسِ دستور ساز میں پیش ہو تو وہ عربی کی پر زور حمایت کریں۔

اجتماعی و ثقافتی اہمیت:- (۱) ۵۰ تا ۷۰ فیصد عربی الفاظ پاکستانی زبانوں (اردو، بنگالی، پنجابی، پشتو، بلوچی، کشمیری، سندھی وغیرہ) میں موجود ہیں اور ان پاکستانی زبانوں میں سے اکثر کا رسم الخط عربی ہے، بنگالی زبان کا رسم الخط بھی کسی زمانے میں عربی تھا اور آج بھی بنایا جا سکتا ہے چنانچہ چاٹگانگ سے شائع ہونے والا بنگالی عربی رسم الخط کا رسالہ "معروف القرآن" ہمارے اس دعویٰ پر برہان ہے۔

(۲) جو لوگ غیر عربی تبلیغ کے ذریعہ مسلمان ہوئے وہ حقیقی جذبۂ اسلامی سے دور نظر آتے ہیں اور جہاں عربی زبان کے ذریعہ تبلیغ ہوئی وہاں کی اکثریت عظمیٰ ہے۔

اس سلسلے میں بطور مثال سندھ اور سرحد و بلوچستان کے صوبے پیش کئے جا سکتے ہیں اس کے علاوہ بیرون ملک ملایا اور انڈونیشیا کے ملک بھی بطور زندہ مثال موجود ہیں۔

(۳) مصر، شام، فلسطین، اردن اور عراق وغیرہ میں مصری کلیات و جامعات کے سارے درسی علوم کی تمام کتب عربی زبان میں موجود ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری ان ہی عربی کتب کے مطالعہ و تکمیل کے بعد حاصل ہو سکتی ہے۔

(۴) عربی زبان ثقافت، صحافت اور علوم و فنون کے لئے بہترین آلہ ہے۔ عربی ٹائپ پہلے ہی سے موجود ہے اور ٹائپ رائٹر لینو ٹائپ مشینوں کے ذریعے عربی کی کتابت و طباعت کا اعلیٰ انتظام اکثر ممالک عرب میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر جیسے ترقی یافتہ اسلامی ملک میں عربی روزناموں کی تعداد اشاعت ڈھائی تین لاکھ تک ہے۔ مصر کا روزنامہ "الہلال" ایک گھنٹہ میں دس لاکھ کاپیاں شائع کر دیتا ہے۔ الہلال کے پاس ایشیا میں بہترین طباعت کی مشینیں ہیں اس کے مقابلہ میں مصر کی آبادی سے چھ گنا زیادہ آبادی کے ملک پاکستان میں اردو اور دوسری زبانوں کے تمام اخبارات کی مجموعی تعداد اشاعت بمشکل ایک لاکھ ہوگی۔

میدانِ کتابت میں پاکستان کی اس پس ماندگی کی اصلی وجہ صرف یہ ہے کہ اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کی طباعت عربی ٹائپ میں رائج نہیں ہے۔

سیاسی اہمیت:- (۱) کرۂ ارض کے ستر کروڑ مسلمانوں کے درمیان آج بھی صحیح معنوں میں عربی ہی مشترک زبان ہے اور اس کے مقابلہ میں کسی دوسری زبان کو یہ

درجہ دینا خلافِ عقل و واقعہ ہے۔

(۲) مستقبل قریب میں جب اتحادِ عالم اسلامی کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا تو تمام سیاسی معاہدوں کی زبان صرف عربی ہی ہو سکے گی۔

(۳) تقریباً ۷۰ھ سے چار سو سال ہجری تک ایران و افغانستان کی سرکاری زبان عربی ہی رہی، البتہ تاتاری حملوں کے بعد اس زبان کے خلاف برابر تعصب بڑھتا گیا۔

(۴) اردو، فارسی، ترکی میں ۷۰ فیصدی تک الفاظ عربی ہی کے ہیں اور ان زبانوں کے بولنے والوں کے لئے بلا شبہ عربی کا سیکھنا سب سے زیادہ آسان ہے۔

عملی اقدام:- (۱) عربی زبان کی اشاعت کیلئے تمام پاکستانی زبانوں اور اردو کا رسم الخط لازمی طور پر عربی کر دینا چاہئے، تاکہ عرب ممالک نیز ایران و افغانستان کے مانند پاکستان کا بھی بلحاظ رسم الخط اتحاد ہو جائے۔ عربی رسم الخط اختیار کر لینے سے مشرقی بنگال میں "پاک بنگلہ" کو بھی چار چاند لگ جائیں گے۔

(۲) جب انتخاب اور مجلس دستور ساز کی رائے سے عربی زبان کو سارے عالم اسلام کی مشترکہ زبان ہونے کی بنا پر پاکستان کی سرکاری زبان مان لیا جائے تو مختلف صوبوں کی مقامی زبانوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے۔ اس طرح باشندگانِ کراچی کے لئے مرکزی عربی کے ساتھ ساتھ اردو اور بنگال، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کیلئے بنگالی، پنجابی، پشتو، سندھی اور بلوچی زبانوں کو علاقائی زبانوں کی حیثیت سے ترقی کا پورا موقع ملے گا اور یہی زبانیں عوام کی ہوں گی عربی تو صرف انگریزی کی جگہ لے گی اور وہ خواص کی زبان ہو گی۔

(۳) پاکستان اور دوسرے مشرقی ملکوں میں مسلمان بچوں کو جتنی مدت میں لازمی طور پر قرآن کریم ناظرہ پڑھایا جاتا ہے، جدید اسلوب سے اتنی ہی مدت میں قرآن مجید ترجمہ و فہم کے ساتھ پڑھ جا سکتا ہے یقینی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ شروع میں ایسی چھوٹی چھوٹی سورتیں اور دعائیں یاد کرائی جائیں جو نماز وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔

(۴) عربی ممالک کے بعد پاکستان میں دیگر ممالکِ عجم سے بہت پہلے عوام و خواص کی زبان عربی بن سکتی ہے، اسلئے کہ پاکستان کے بیشتر صوبوں کی مقامی زبانوں کا طرزِ تحریر (کتابت) بالکل عربی ہے اور زیادہ تر علمی، ادبی، ثقافتی، تمدنی، مذہبی اور معاشرتی الفاظ ان زبانوں میں عربی سے لئے گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر زبان کی کتابت بذاتِ خود نصف علم کا درجہ رکھتی ہے اور کم و بیش ساٹھ فیصدی عربی الفاظ پاکستانی باشندے روزمرہ بولتے اور لکھتے ہیں لہٰذا انہیں صرف چالیس فیصدی نئے الفاظ سیکھنے ہوں گے جو معمولی توجہ سے بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔

(۵) تعلیمِ بالغان اور راست طریقۂ تعلیم کے اصول پر دو تین ماہ میں عربی کی روزمرہ کی زبان سکھائی جا سکتی ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ گفتگو کے لئے چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل جیبی و ارزاں کتب شائع کی جائیں۔

(۶) اگر مسلمان عربی زبان کو فوراً اپنا کر قرآن پڑھنے کی اہلیت پیدا نہ کریں گے تو وہ "الفاظ پرست" کہلانے کے مستحق ہوں گے اور وہ ہندوؤں کو "بت پرست" عیسائیوں کو "انسان پرست" اور پارسیوں کو "آتش پرست" کہہ کر ان پر معترض ہونے کے اہل نہیں رہتے

(۷) اوسط درجہ کی ذہانت کا مالک انسان چھ ماہ کی قلیل مدت میں عربی کی اتنی استعداد پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اس پاک و دلکش زبان میں معمولی طور سے لکھنا اور بولنا شروع کر دے اور بلا شبہ

عربی دنیا کی آسان ترین زبان ہے۔ لیکن لوگ اسے اب تک اس طرح پڑھتے پڑھاتے ہیں جس طرح ہندستان میں پنڈت لوگ سنسکرت کو اور یورپی ممالک میں عیسائی پادری لاطینی زبان کو پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں۔ اگر عربی کو زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھایا جائے تو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اکثر عوام کی تائید تو کم از کم یقینی ہے۔

(۸) عربی کو ہر دلعزیز بنانے کیلئے حکومت کا فریضہ ہوگا کہ تشویق کے مختلف ذرائع استعمال کرے مثلاً دکانوں اور آفسوں کے لوحوں کو عربی اور مقامی زبان (مغربی پاکستان میں اردو وغیرہ اور مشرقی پاکستان میں بنگالی) میں لکھنے کی ہدایت کرے یا سرکاری یا کمپنیوں کے خطوط وجوابات میں اسی قسم کی ہدایات ہوں کہ اگر عربی میں مراسلات نہ کی گئی تو جواب میں تاخیر ہوسکتی ہے۔

(۹) ہر آزاد ملک میں ثانوی مدارس کے طلبا عام طور سے مادری زبان کے علاوہ دو اور زبانیں یعنی کل تین زبانیں سیکھتے ہیں چنانچہ یورپ کے علاوہ مصر و شام و ایران و ترکی اور انڈونیشیا کے طلبا عام طور سے تین زبانیں سیکھتے ہیں اور عربی سرکاری زبان قرار دینے پر علاقائی زبان کے علاوہ ایک بین الاقوامی زبان انگریزی وغیرہ کو بھی بآسانی پاکستانی طلبا سیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ بین الاقوامی زبان ان کے لئے ضروری ہوگی جو سائنس وغیرہ میں ترقی کرنا چاہتے ہیں۔

آخری بات :۔ عالم اسلام میں عربی کو سرکاری زبان بنا دینا نہایت ہی آسان کام ہے اور بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ تشکیلِ پاکستان اس سے کہیں زیادہ مشکل مرحلہ تھا اور اگر یہ ناممکن مرحلہ (قیامِ پاکستان) سات سال کی قلیل مدت میں طے کیا جا سکتا ہے تو ایک ممکن اقدام کو (عربی کو سرکاری زبان قرار دینا) عملی جامہ پہنانا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

پورے وثوق کے ساتھ یہ یقین دلایا جا سکتا ہے کہ پندرہ سال کے معمولی عرصہ میں عربی پاکستان میں ہر جگہ رائج ہوسکتی ہے اور حکومت کے نظم ونسق (سرکاری مشینری) کو بخوبی چلا سکتی ہے ہم اپنے معترض بھائیوں کو چھتری کا مشہور واقعہ بیان کرکے قائل کر سکتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک گنجے نے اپنے سر کو آفتاب کی تپش سے بچانے کیلئے ایک چھتری بنائی اور جب وہ اسے پہلی بار اپنے سر پہ تان کر بازار سے گزرا تو لوگوں اور جاہلوں نے اس پر آوازے کسے لیکن چونکہ اسے چھتری سے نمایاں فائدہ حاصل ہوا اسلئے اس نے لوگوں کے تمسخر اور طعن و تشنیع کی مطلق پرواہ نہ کی اور روزانہ اپنی چھتری سر پہ تان کر بازار میں نکلتا رہا۔ بالآخر چھتری کا رواج روز بروز بڑھتا گیا اور آج ہر ملک میں لاکھوں چھتریوں کا استعمال عام ہے اور مذاق اڑانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے (اقبالؒ)

مذکورہ بالا لسانی منصوبہ کی سماعت کے بعد عزت مآب عبدالوہاب صدر دستور ساز نے جوابی تقریر میں اعلان فرمایا کہ ہم اہل مشرقی پاکستان عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان کے بنانے کے روزِ اول سے مؤید رہے ہیں چنانچہ اس سلسلے میں ہم نے عملاً کانفرنس بھی منعقد کی تھی جس کا میں بھی ایک معتمد تھا۔

کوشش کروں گا کہ ارکانِ دستور ساز کو میں اس اعلیٰ مقصد کا ہمنوا بناؤں اور میری فوری معروضہ ہے کہ عربی تحریک ہذا کے چند افراد مجھے کامیابی کے لئے کوئی عملی مشورہ دیں

قطعات تاریخ وفات

نجم الانشا چودہری محمد اطہر زبیری صاحب سابق جج بھوپال خیرپور

بعض ہستیاں ملک و ملت کے لئے مایہ ناز ہوتی ہیں لیکن اخباری و اشتہاری شہرت نہ رکھنے کے باعث ان کے جینے اور مرنے کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ انھیں میں سے ایک چودہری محمد اطہر مارہروی تھے جن کا بروز جمعہ ۸ ارنومبر ۱۹۵۵ء آٹھ بجے شب بعمر ستر سال کراچی میں انتقال ہوگیا اور اس حادثہ کی ہمیں بہت عرصہ بعد خبر ملی۔ مرحوم مارہرہ یو۔ پی کے نامور لوگوں میں سے تھے اور آپ نے علیگڈھ سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کیا تھا۔ کامیاب وکیل اور علمی و ادبی اعتبار سے ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ تحریک خلافت و ترک موالات میں چھ مہینے قید فرنگ سے بھی سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد ریاست بھوپال میں عرصہ تک سکریٹری لیجسلیٹو کونسل و مشیر قانونی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد جناب مرزا ممتاز حسن قزلباش صاحب کی شرفانوازی کی بدولت ان کے پرائیویٹ سکریٹری اور بعد ازاں خیرپور کے سپیشل و سیشن جج مقرر ہوئے۔ انصاف و دیانت اور دوست نوازی آپکے کردار کی خصوصیات تھیں۔ شاعر، ادیب اور بلند پایہ مصنف تھے۔ افسوس کہ مرحوم کے رشحات قلم منظر عام پر نہ آسکے۔ ممکن ہے ان کے لائق صاحبزادے چودہری محمد انور اور صاحبزادی عزیزہ رابعہ خاتون اب اس طرف توجہ فرماکر ان کی معنوی یادگاروں کو دوام بخشیں۔ ذیل کے "قطعات تاریخ" نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔ "العلم" کے پڑھنے والے اس مرحوم کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں (ایڈیٹر)

—— ازجناب مولانا حامد حسن قادری مدظلہ ——

لهم من الله فضلاً كبيرا

۱۳۷۵ھ (سورہ احزاب)

دیگر

نجم الانشا محمد اطہر آج — ہوئے داخل نعیم جنت میں
یہ دعا بھی ہے سال رحلت بھی — ہوں وہ قرب شفیع امت میں

۱۳۷۵ھ

—— ازحضرت اختر زبیری ——

کیوں نہ ہوں اہل جہاں فرط الم سے چشم تر — دے گئے داغ جدائی اطہر عالی گہر
جن کے دم سے رونقیں تھیں محفل احباب کی — جن کے تیور سے عیاں تھا خاندانی کرّوفر
جن کی ہستی پر بجا ہے اہل دانش کو غرور — جن کے مداح و ثنا گستر ہیں ارباب نظر
آہ وہ اخلاق پاکیزہ کہ آپ اپنی مثال — ہائے وہ ذوق حمیت حیف وہ سوز جگر
گفتگو یکسر ادب آموز تسلیم و نیاز — آرزو سر تا قدم آئینہ جذب و اثر
الفراق اے معدن جود و تواضع الفراق — الوداع اے مظہر اکرام و مخدوم البشر
یاد رکھیں گی تمھیں سینہ کی پیہم دھڑکنیں — یاد رکھیں گے تمھیں اشکوں کے یاقوتی گہر
آہ اس بے درد مرگ ناگہاں کو کیا کہوں — لوٹ لی جس نے بہار لمحۂ شام و سحر

پوچھتے ہیں مصرعۂ تاریخ احباب اے اختر
از سر جذب دروں لکھدو کہ "مازاغ البصر"

۱۳۷۶ھ

چند محسن:-

"بھائی جان"

دوسری کہانی

از سید الطاف علی بریلوی

شاہجہان پور کے ایک ڈپٹی صاحب بھائی جان
ے نہایت عزیز دوست تھے چنانچہ جب کبھی وہ بریلی آتے تو بڑی
ل پہل ہوجاتی۔ پرتکلف دعوتیں ہوتیں اور اُن کی ہر فرمائش
پ ہے اُس سے کتنی ہی زیرباری اور تکلیف کیوں نہ ہوتی
وری کی جاتی تھی۔ ڈپٹی صاحب ایک دفعہ جب وہ بدایوں میں
عینات تھے ایک سخت فوجداری کے مقدمہ میں پھنس گئے
ور اُن کی ملازمت خطرہ میں پڑگئی تو بھائی جان نے ایک سال
لے مقدمہ کی پیروی کی اپنے کاروبار کا حرج کرکے صعوبات سفر
برداشت کیں اور کم و بیش ایک ہزار روپیہ بھی اپنی جیب
سے خرچ کیا۔

اِن ڈپٹی صاحب کے ایک بھائی تھے جو کہیں
ملازم نہ تھے اور انہیں فرصت ہی فرصت تھی۔ وہ آئے دن
شاہجہانپور سے بریلی آتے اور ہفتوں بھائی جان کے مہمان
رہتے۔ کافی خوش وضع اور خوش مزاج آدمی تھے۔ سیر و شکار
اور دیہاتی زندگی کے لطائف تیز ڈاکوؤں سے اپنے جدال و
قتال کے قصے کچھ ایسے مزے میں سُناتے کہ سننے والے بہوت
ہوجاتے تھے خصوصیت سے مجھے اُن کے انہیں قصوں کی وجہ
سے اُن سے بہت دلچسپی تھی اور بھائی جان سے زیادہ وہ
میرے دوست ہوگئے تھے۔

ایک دفعہ غالباً ۲۲ء کے موسم سرما میں ڈپٹی صاحب
کے یہ بھائی حسب معمول ہمارے یہاں مقیم تھے۔ اُنہیں دنوں
ایک تھیٹریکل کمپنی بھی آئی ہوئی تھی جس میں آغا حشر مرحوم کے
ڈرامے "خوبصورت بلا" اور "دردِ جگر" وغیرہ کے پروگرام چل رہے
تھے۔

شہر کے گلی کوچوں میں دن رات ان تماشوں کا چرچا
تھا اور اُن کے مکالمے اور گیت من چلے نوجوانوں کے وردِ زبان
بنے ہوئے تھے جب کسی اچھی یا بُری چیز کی فضا میں عام گونج
ہوجاتی ہے تو اُس سے ثقہ سے ثقہ اور محتاط سے محتاط گھر اور اُس
کے مکین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ لہٰذا ہمارے یہاں بھی
کرل لگا اور ڈپٹی صاحب کے بھائی کا موضوعِ سخن زیادہ تر تھیٹر
رہنے لگا۔ بالآخر ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا۔

"چلو بھئی آج تھیٹر دیکھا جائے۔"

میں نے عرض کیا، "بہتر ہے لیکن میرے لئے بھائی جان سے اجازت
آپ کو حاصل کرنا پڑے گی۔" بولے "ہاں یہ کام میں کرلوں گا۔"

بعد مغرب بھائی جان مکان تشریف لائے تو کھانے سے
فارغ ہوکر ڈپٹی صاحب کے بھائی نے تھیٹر جانے اور مجھے ساتھ

ـــے جانے کی تمہید اٹھائی۔ منجملہ دیگر دلائل کے ایک دلیل یہ بھی پیش کی کہ بزرگوں کو چاہیئے کہ اپنی موجودگی اور نگرانی میں نوجوانوں کو ہر قسم کے تجربات کرادیں۔ کچھ دیر تبادلۂ خیال کے بعد مجھے تھیٹر جانے کی اجازت مل گئی۔ اور جب میں کپڑے پہن رہا تھا تو بھائی جان نے چپکے سے مجھے ایک روپیہ دے کر فرمایا "اپنا ٹکٹ خود خریدنا۔" دس بجے شب کو تماشہ شروع ہوتا تھا نو بجے میں اور ڈپٹی صاحب کے بھائی اپنے مکان محلہ عقب کوتوالی سے نکلے، تھنی مال روڈ، ٹاؤن ہال اور سول اسپتال ہوتے ہوئے گلی ہاری نیوبلی کالج کی سڑک پر تماشا گاہ پہونچ گئے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں آج کل امپیریل سینما ہے۔ اس جگہ اُس زمانہ میں دور دور تک کوئی خاص عمارت اور آبادی نہ تھی، نہ موجودہ کوتوالی کی عمارت اور نہ دل کشا سینما وغیرہ۔ سڑکوں پر بجلی بھی نہ تھی اور نہ آج کل کا سا ٹریفک تھا، لہٰذا سرِ شام سے بالخصوص جاڑے کے موسم میں سناٹا ہو جاتا تھا احاطہ تھیٹر میں البتہ گیس کے لیمپوں کی روشنی تھی، گیٹ سے ملا ہوا ٹکٹ گھر تھا اس خیال سے کہ تھوڑی دیر میں بھیڑ بھاڑ ہو جائے گی ہم لوگوں نے جاتے ہی ٹکٹ خرید لئے اس کے بعد کھیل شروع ہونے کے انتظار میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ ٹہلتے ٹہلتے ساڑھے نو۔ دس۔ ساڑھے دس بج گئے نہ تماشہ نہ تماشائی۔ ارے یہ کیا بات ہے! عجیب حیرت ہے آخر ڈپٹی صاحب کے بھائی مجھے اور میں اُن سے پوچھتے پوچھتے تھک گئے۔ بالآخر میں نے کہا چلئے منیجر سے مل کر معلوم کریں! کئی جگہ دریافت کرنے کے بعد پتہ چلا کہ "وہ سامنے خیمہ میں منیجر ملے گا۔" خیمہ کے پاس پہونچے تو دیکھا کہ اس کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور اندر سے کافی آدمیوں کی اول فول بکواس اور غل غپاڑے کی آوازیں آرہی ہیں۔ چنانچہ پردہ اٹھاکر خیمہ میں داخل ہونے میں قدرتاً تامل ہوا۔ لیکن تماشہ ہونے یا نہ ہونے کی قطعی اطلاع حاصل کرنی بھی ضروری تھی لہٰذا میں نے قدم آگے بڑھایا اور پردہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ قریب ایک درجن آدمی وحشت ناک حال حلیئے اور شراب کے نشہ میں دھت طرح طرح کی لغویتوں میں مبتلا ہیں۔ اس غول بیابانی نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ایک شخص نے البتہ جو بہت زیادہ اپنے ہاتھ پیر پھینک رہا تھا اور مجھ سے قریب تھا چیخ کر کہا "کیا ہے صاحب! کیا ہے؟" میں نے نہایت نرمی سے دریافت کیا "بھائی منیجر صاحب کہاں ہیں؟" جواب دیا "کیا کریں گے آپ منیجر صاحب کا؟" یہ کہہ کر منیجر کو موٹی سی گالی دی جس پر سب لوگوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ تاہم میں نے پھر جرأت کی اور پوچھا کہ "تماشہ ہوگا یا نہیں؟" اس پر وہی بدمست شرابی جھومتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آکر میرے چہرے کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا

"نہیں صاحب! تماشہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا نہیں۔" اس شخص کی دست درازی سے بچنے کے لئے میں آہستہ آہستہ اُلٹے پیروں پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ ویسے بھی خیمہ میں سستے قسم کے سگرٹوں کا دھواں اور شراب کی بدبو ناقابل برداشت تھی۔

جتنا جتنا میں پیچھے ہٹتا گیا اتنا ہی اُتنا وہ شخص میری طرف بڑھتا گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ میرے چہرے کو چھو لے اُس وقت تیز ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے میں ایک تہ پہ تہ پتلی سی اونی چادر سے اپنے سر اور کانوں کو لپیٹے ہوئے تھا۔ لہٰذا ایک دو دفعہ اُس کا چادر پر بھی ہاتھ پڑا۔

اس اہانت آمیز رنگ ڈھنگ میں ڈپٹی صاحب کے

بھائی کا عدم وجود برابر تھا اور وہ سایہ کی طرح صرف میرے پیچھے پیچھے تھے۔ میں پیچھے ہٹتا تو وہ بھی میری آڑ لے کر پیچھے ہٹ جاتے عجب تکلیف دہ اُلجھن تھی "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"

لمحہ بہ لمحہ میرا غصّہ بڑھ رہا تھا۔ بھائی جان کے فیض تربیت سے رگ رگ میں خودداری اور عزت نفس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور روزانہ ورزش کا عادی ہونے کی وجہ سے جسم میں طاقت اور دل میں جوش و خروش تھا۔ لہٰذا طبیعت بے قابو ہونے لگی۔ اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ڈپٹی صاحب کے بھائی اپنے دل میں مجھے بہت بڑا آدمی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہونہ ہو میں آوارہ ہوں جب ہی تو ایک بدمعاش غالباً سابقہ ملاقات کی وجہ سے اس قدر بدتمیزی کر رہا ہے۔

یہ خیال میرے مجروح پندار پر آخری ضرب تھی اور پیچھے ہٹنے کے بجائے اب میں قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔ اور جوں ہی اس بدمعاش نے پھر میرے اوپر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی میں نے بھرپور طاقت سے ایک تھپڑ رسید کیا جس سے اُس کا منہ لوٹ گیا اور چکر کھا کر تڑسے زمین پر گر پڑا۔

"مار ڈالا! ہائے مار ڈالا!! ہائے مار ڈالا!!!"

میرے زوردار تھپڑ اور مضروب کے چیخنے چلانے کی آواز پر خیمے کے سب بدمعاش باہر نکل آئے "ارے کون ہے۔ کون ہے؟ کس نے مارا" مضروب نے زمین پر تڑپتے ہوئے بین کئے۔ "ہائے ہائے اس نے مارا ہے" بس وہ پورا غول بیابانی میری طرف جھپٹا اور چاروں طرف سے میرے گرد گھیرا ڈال کر چلانے لگا "مارو۔ مارو" آناً فاناً اس دار و گیر سے پورے احاطہ تھیٹر میں ہیجان پھیل گیا۔ جدھر نگاہ ڈالو جس کو جو ہاتھ لگ رہا تھا ڈنڈا۔ لاٹھی۔ اینٹ اور پتھر ہاتھ میں لئے بھاگا چلا آرہا تھا۔ بات کی بات میں حملہ آوروں کا ایک بڑا ٹڈی دل سا جمع ہو گیا۔

اس عالم میں ڈپٹی صاحب کے بھائی کا برا اور بہت ہی برا حال تھا مارے خوف کے تھرتھر کانپ رہے تھے اور گھگیا گھگیا کر جیسے کہہ رہے تھے،

"بھاگو! بھاگو! خدا کے واسطے بھاگ چلو
اماں بھاگتے ہو کہ نہیں؟ یا اللہ میں کس
مشکل میں پھنس گیا! آج جان نہیں بچے گی"

خود میں بھی موقع کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن جب کوئی مصیبت سر پر آ پڑے تو اس کا قائل نہ تھا کہ بزدلی اور بدحواسی دکھائی جائے۔ بھائی جان کا قول تھا کہ اس قسم کے نازک مرحلہ پر جان اور آبرو بچنے کی اگر کوئی ایک صورت ہوتی ہے تو صرف یہی کہ زیادہ سے زیادہ اچھے تحمل اور جرأت و دلیری کا آخر دم تک ثبوت دیا جائے لازماً امداد غیبی دستگیری کرتی ہے۔ اور خدانخواستہ خلاف صورت پیش آتی ہے تو اُس کی بھی ایک شان ہوتی ہے اور نام باقی رہ جاتا ہے۔

ان خیالات کے دل میں آتے ہی میں اپنے مقابل حریفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا پہلے میں نے اپنے سر اور چہرہ پر پڑی ہوئی چادر کو اتار کر ڈپٹی صاحب کے بھائی کی طرف پھینکا۔ اُس کے بعد تیزی سے لپک کر ایک آدمی کے ہاتھ سے اس کی لکڑی چھینی اور اس کے بعد لاٹھی چلنے ہی والی تھی کہ حملہ آور گروہ میں سے ایک دو چار پانچ آدمی چلائے

"ارے بیٹا تم ہو! ابے ہٹو بے! خبردار کوئی

ہمارے بھیا پر ہاتھ ڈالا۔" ان میں ایک ہمارے محلے کے بلّو پہلوان تھے جن کو اُن کے دوسرے چند ساتھیوں سمیت شہر کے بدمعاشوں سے نبٹنے کے لئے کمپنی نے ملازم رکھ لیا تھا۔

اُس زمانہ میں یہ عام دستور تھا۔ پولیس تعداد میں کم تھی۔ بیسیوں لڑائی جھگڑے یوں ہی آپس میں لڑ بھڑ کر چکا لئے جاتے تھے۔ بات بات پر پولیس کی دست اندازی نپٹنے نپٹانے کے بعد تھانہ میں جا کر رپٹ لکھانا اور مقدمہ بازی کے جنجال میں پڑنے کے لوگ عادی نہ تھے اور اس کو نامردی کی علامت سمجھتے تھے۔ ایک مقابلہ میں پٹ گئے۔ دوسرے میں بدلہ لے لیا۔ انتقام در انتقام کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ شادی غمی کے مواقع پر یا کسی ذی اثر آدمی کی مداخلت سے یہ دُشمنی رفع دفع بھی ہو جاتی اور باہمی خون خرابہ کرنیوالے آپس میں گلے مل جاتے۔

بلّو پہلوان اور اُن کے ساتھی کوئی نامور لڑنے والوں میں نہ تھے تیسرے درجہ کے ضرور تند لوگوں میں اُن کا شمار تھا اور اُن کی گزر بسر اسی قسم کے وقتی اور ہنگامی کاموں میں لگ جانے سے ہوتی تھی۔ تھیٹر کے ایک آدمی سے اس وقت جو میرا جھگڑا ہوا اُس میں بلّو خاں اور اُن کے ہمراہیوں کو اپنی کارگزاری دکھانے۔ بندو کی اُس کی شیخیاں مارنے اور کمپنی کے سیٹھ سے انعام اکرام لینے کا بہترین موقع تھا لیکن اُنہوں نے اس کے برعکس عمل کیا۔ اپنی لاٹھی کو ٹیکر دے کر اور گالیاں دے دے کر مجمع کو دور ہٹایا اور پھر مجھ سے کہا۔

"بھیا تم یہاں کیسے آ گئے؟"

میں نے کہا "تھیٹر دیکھنے آیا تھا۔"

ڈپٹ کر بولے "آج تھیٹر کی تو چھٹی ہے۔"

میں نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں تھا۔"

بلّو خاں "لیکن سوال یہ ہے آپ تھیٹر دیکھنے گئے ہی کیوں؟"

میں "یہ ڈپٹی صاحب کے بھائی لائے تھے اور بھائی جان سے اجازت لے لی تھی۔"

"اچھا! اس بندو ایکٹر کو کیوں مارا؟"

اس پر میں نے اُس کی بدتمیزی بتائی۔

میری بات سنتے ہی بلّو خاں کو جوش آ گیا اور مجمع کی طرف رُخ کر کے بولے "اچھا کیا جو اس حرام زادے کو مارا، اور مارو اس کو۔" یہ کہہ کر زمین پر پڑے ہوئے بندو ایکٹر کے ایک لات ماری اور کہا۔ "اُٹھ بے اُٹھ! معافی مانگ بھیا سے! ابے اُٹھتا ہے کہ نہیں۔ سالے تیری ہڈیاں کچل دونگا۔"

اپنی لاٹھی لے کر اُس کی طرف بڑھنے لگے تو اور لوگ بیچ میں آ گئے ہوا کا رُخ پلٹ چکا تھا ہر شخص نے لعنت ملامت کی۔ کمپنی کا سیٹھ اور منیجر بھی اس عرصہ میں آ گئے وہ بھی بولے :-

"ہاں جی! ٹھیک ہے۔ رسریوں کے
سنگ بدتمیزی ہوگی تو ہماری کمپنی بدنام
ہو جائے گی۔ اُٹھا ذرا اسے بندہ کو۔ مافی
مانگے یہ ان بھائی لوگاں سے۔"

بلّو خاں کے دو چیلوں نے بندو کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا کیا۔ اُس نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ٹکٹ بابو کی بھی طلبی ہوئی کہ جب تماشہ کی چھٹی تھی

تو اس نے ٹکٹ کیوں بیچے منیجر نے اُسے ڈمیوں کا بیل دے ڈالیں اور ہمارے ٹکٹ کے دام واپس کرلئے گئے۔

اس بے وجہ کے قضیہ سے چھٹکارا پاکر ڈپٹی صاحب کے بھائی اور میں باہر سڑک پر آئے گیارہ بجے تھے۔ تیز ٹھنڈی ہوا سناٹا اور اندھیرا۔ کافی کافی فاصلہ پر چنگی کی مٹی کے تیل کی لالٹینیں البتہ ٹمٹما رہی تھیں جو بیوہ کے لال کی طرح دل کا سہارا تھیں۔ گزرے ہوئے واقعہ کی اثرانگیزی اور فضا کی ہولناکی میں غرق ہم دونوں خاموش کوئی سو قدم چلے ہوں گے کہ ڈپٹی صاحب کے بھائی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور میں نے محسوس کیا کہ اُن کا ہاتھ اس قدر سردی کے باوجود پسینہ میں تربتر ہے، گھگیا کر بولے :-

"اُب سڑک سڑک مت چلو"

میں نے کہا "کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"اُجی بدمعاشوں کا کیا اعتبار۔ ہمارے پیچھے پیچھے آتے ہوں گے"

میں نے جواب دیا "جھگڑا ختم ہوگیا وہ اب نہیں آئینگے"

"اُجی صاحبزادے! کچھ جھگڑا ختم نہیں ہوا ہے تم نے مارا ہے!"

میں نے جل کر کہا "مارتا نہیں تو اور کیا کرتا۔ آپ اس قدر ڈرتے کیوں ہیں؟"

"ارے صاحب! یہ ڈر کی بات نہیں احتیاط کی بات ہے۔ آپ تو بے وقوف ہیں۔ ابھی ہم دونوں جان سے مارے جاتے۔ اللہ نے خیر کرلی۔ لیکن میرا کہنا مانو سڑک سڑک نہ جاؤ۔ یہ تھیئٹر کے پیچھے کھیت ہیں ان میں سے ہوکر نکل چلینگے"

میں نے کہا "کمال کرتے ہیں آپ! میں تو اُدھر اندھیرے گھپ میں نہیں جاتا۔" اس پر ڈپٹی صاحب کے بھائی نے ڈرک کر لال پیلی آنکھیں نکالیں!

"خبردار جو ایک قدم آگے بڑھایا۔ تمہاری حفاظت میرا فرض ہے کوئی بات ہوگئی تو میں بھائی جان کو کیا منہ دکھاؤں گا!"

قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں وہ چیل کی طرح میرے اوپر جھپٹے اور پوری طاقت سے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے مجھے کھیتوں کی طرف سے لے کر بھاگے۔ کھینچتے ہی چلے جاتے تھے اور میں تھا کہ کھنچا چلا جا رہا تھا۔ کٹے ہوئے کھیتوں کی ٹھنٹیاں ناہموار زمین اور کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ۔ قدم قدم پر گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے۔ اندھیرے! ایسے اندھیرے میں کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دے۔ بس بھاگے چلے جا رہے تھے کچھ سدھ بدھ نہیں کہ کب تک بھاگیں گے اور کدھر جاکر نکلینگے

اتنے میں اڑاڑاڑ ۔ تڑا۔ دھڑم۔ سر نیچے پیر اوپر جسم ہوا میں معلق۔ ایسا معلوم ہوا کسی اندھیرے کنوئیں میں گر رہے ہیں۔ لو اب جسم گہرے پانی میں جانے ہی والا ہے کہ دھماکے سے زمین پر جاکر گرے۔ مٹی میں لت پت شاید سوکھا ہوا کنواں ہے تھوڑی دیر سکتہ کا سا عالم ہوا۔ پھر اپنے وجود کا احساس اور آخر میں مادر ارضی کا جس سے ہم آغوش تھے حس ہوا۔ چلو شکر ہے پروردگار عالم کا۔ جان بچی اور پانی میں نہیں ڈوبے۔

اوندھے منہ لیٹے سے میں اُٹھ کر بیٹھا اور ہاتھ بڑھا کر ڈپٹی صاحب کے بھائی کو اِدھر اُدھر ٹٹولا وہ ابھی تک پڑے ہائے رہے تھے۔ میں نے انہیں سہارا دے کر اُٹھایا اور دریافت کیا:۔

خیریت زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟

نحیف آواز میں رُک رُک کر بولے "نہیں ٹھیک ہوں"!

انسان بھی کس قدر ناشکر گذار ہوتا ہے۔ جان کی امان پاتے ہی ذرا بھی تو اُس کا مزہ نہ لوٹا۔ فوراً فکر شروع ہو گئی کہ اب یہاں سے نکلا کیسے جائے۔ دل پر خوف طاری ہونے لگا کہ یہاں دور دور کوئی آدمی ہے نہیں لہذا چیخنا چلانا بیکار اور اگر رات بھر پڑا رہنا پڑا تو اول تو نمی اور ٹھنڈ اور دوسرے ممکن ہے یہاں زہریلے سانپ ہوں۔ سانپوں کے تصور نے لرزہ براندام کر دیا اور مارے خوف کے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ بہرحال جب تک سانس اُس وقت تک آس۔ میں نے چاروں طرف ہاتھ کو گردش دی کر آس پاس کی بجائے خود کنوئیں کی دیوار کا جائزہ لیا۔ معلوم ہوا تین طرف کچی دیوار ہے اور چوتھی جانب کافی وسیع خلا ہے۔ اس خلا کے رُخ پر میں نے آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے۔ یہ بہت ڈھلوان زمین سی تھی جس پر گویا مجھے چڑھنا چاہیئے۔ بڑی احتیاط سے چڑھنا شروع کیا۔ کوئی پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد مجھے ایک پختہ کنوئیں کی من ملی۔ اس جگہ کچھ روشنی بھی تھی۔ دیکھا کہ قریب ہی مسجد ہے۔ اچھا اب معلوم ہوا کہ احاطہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے شرقی رویہ سڑک پار جو چھوٹی سی مسجد ہے یہ اُس کا کنواں ہے اور ہم لوگ اِس کنوئیں کی نیچیا میں جا کر گرے تھے۔ اُس کے سب سے نشیبی حصہ میں جہاں تک چرس کے بیل پہونچ کر واپس لوٹتے ہیں تاریکی اور اچانک بدحواسی کے عالم میں گرنے سے ہم سمجھ اور سمجھے گہرا کافی گہرا تھا لیکن نہ اس قدر جس قدر کہ ہم نے خیال کیا تھا۔ اور جان کا خطرہ! استغفراللہ!

میں نے کنوئیں کے پاس کھڑے ہی کھڑے ڈپٹی صاحب کے بھائی کو آواز دی:۔

"اجی آیئے آیئے! وہاں کب تک آرام کیجیے گا؟"

جب وہ آ گئے تو اب ہم لوگ سیدھے سڑک سڑک چلے اور پندرہ بیس منٹ میں مکان پہونچ گئے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔

ہم لوگوں کے جانے کے بعد بھائی جان کو کسی سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آج تھیٹر کی چھٹی ہے اور وہ ہمارے انتظار میں سخت متفکر بیٹھے ہوئے تھے اور لاٹھی پاس رکھی تھی۔ جب ہم اُن کے سامنے آئے تو ہمارا عجیب حال حلیہ تھا۔ سر سے پیر تک مٹی میں اَٹے ہوئے اور جگہ جگہ سے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بھائی جان نے گھبرا کر پوچھا "خیریت ہے تمہارا کیا حال ہے؟"

میں نے مسکرا کر عرض کیا "جی ہاں! بفضلہ خیریت ہے"۔ "لیکن یہ بات کیا ہے؟" بھائی جان نے فرمایا "کیا کسی نے تم لوگوں کو مارا ہے؟"

اس پر ڈپٹی صاحب کے بھائی بولے "یہ صاحبزادے بہت خطرناک ہیں انہوں نے غضب کر دیا۔ تعجب ہے ایسی غلط تربیت آپ نے ان کی کی ہے۔ صاحب آپ ان کو سمجھاتے نہیں ہیں بلکہ صاحب ان پر سختی کرنے کی ضرورت ہے"۔

بھائی جان بولے "آخر بات تو معلوم ہو کہ کیا ہوا کسی نے مارا ہے تو بتاؤ مجھے میں ابھی جاتا ہوں" اور یہ کہہ کر ہاتھ میں لاٹھی کی گرفت سخت کی اور اٹھنے لگے پلنگ سے۔ میں نے عرض کیا "بھائی جان آپ تشریف رکھئے!" اور اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا تھا من و عن بیان کر دیا۔ تھینسے کے پیچھے سے بھاگنے اور گڑھے میں گرنے کا حصہ بیان نہ کیا تاکہ ڈپٹی صاحب کے بھائی کو شرمندگی نہ ہو۔ اس حصہ کے اخفا کی وجہ سے بھائی جان کی بدگمانی دور نہ ہوئی اور انہوں نے مشتعل ہو کر ڈپٹی صاحب کے بھائی کو مخاطب کیا اور کہا کہ "دیکھیے صاحب! آپ پوری بات بتائیے۔ آپ تو پردیسی ہیں اور کل کو چلے جائیں گے ہمیں اس شہر میں رہنا ہے اور ہم ذلیل ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اگر اس لڑکے کے ساتھ کوئی بے عنوانی ہوئی ہے تو میں ابھی اسے اپنے ساتھ لے جا کر بدلہ لوں گا۔ صبح ہونے کا انتظار نہ کروں گا۔ مجھے یہ گوارا ہوگا کہ اس کی لاش گھر میں آئے بجائے اس کے کہ یہ بے آبرو ہو کر آئے۔"

بھائی جان کی یہ پُرہیبت تقریر سُن کر ڈپٹی صاحب کے بھائی کو بھی پہلی دفعہ ہوش آیا اور انہوں نے اقرار کیا کہ "جناب یہ تو بہادر آدمی ہیں۔ بہادری دکھا کر آئے ہیں۔ اور یہ جو ہم لوگوں کی بُری گت بنی ہوئی ہے یہ میری بزدلی اور بے جا گھبراہٹ کا نتیجہ ہے۔" اور اس کے بعد مذکورہ سرگزشت کا وہ حصہ بھی سُنایا جو میں بیان کرنے سے قاصر رہا تھا۔ پوری بات معلوم کرنے کے بعد بھائی جان مطمئن ہو گئے۔

نعت

حضرت عزیز صفی پوری رح

زبان شستہ با آب سخن تر می تواں کردن ۔۔۔ اگر جوہر شناسی عرض جوہر می تواں کردن
کلام از حلقۂ زلف معنبر می تواں کردن ۔۔۔ رہ عمر دراز از پیچ و خم سر می تواں کردن
اگر از آفریں گوئی بہ انصاف آبرو بخشی ۔۔۔ سخن ما از تسلسل سلک گوہر می تواں کردن
سراپا سوز با یکدست ہر شب تا سحر آنگہ ۔۔۔ بہ بزم عاشقاں چوں شمع سر پر می تواں کردن
بر افگن سایہ چوں خورشید چوں با عارض روشن ۔۔۔ شبستان سیہ روزاں منور می تواں کردن
ز مویش می زنم حرفے بیا باد صبا پیہم ۔۔۔ کہ داماں تو پر از مشک و عنبر می تواں کردن
سرشک خوں بکار آمد۔ نگار آمد۔ بہار آمد ۔۔۔ بیا ساقی کہ اکنوں مے بہ ساغر می تواں کردن
فرشتے کے بر داند ہوائے او تعالی اللہ ۔۔۔ کہ پروانہ چنیں بال شہپر می تواں کردن

عزیز از مہر خیر البشر گر ایں چنیں کارے
سر شوریدہ قربان پیمبر می تواں کردن (عابدی)

انگریزی تعلیم کے اجرا کا مختصر جائزہ

(از سید الطاف علی بریلوی)

اگرچہ انگریزی حکومت کا آغاز مغل شہنشاہ کے فرمان دیوانی سنہ ۱۷۶۵ء سے ہوتا ہے مگر انگریزی باضابطہ تعلیم کی تاریخ سنہ ۱۷۹۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے قبل جو نظامِ تعلیم مسلمانوں کا تھا وہ عمومیت و افادیت کے لحاظ سے اتنا وسیع تھا کہ کمپنی کے عہدیداروں نے بھی عرصہ تک اس کو قائم رکھا۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی اس سے کامل طور پر مستفید ہوتے تھے۔ تعلیمی زبان عموماً فارسی تھی اور ہندوؤں کی قوم میں جو طبقہ تعلیم کا اجارہ دار بنا وہ بلا تامل بالخصوص کایستھ وہ یہ تعلیم حاصل کرتا۔ اور فارسی میں ہی نہیں بلکہ عربی میں بھی اس کو دستگاہ حاصل ہو جاتی۔

انگریز یا کمپنی کی حکومت میں ملکی زبان فارسی اور فقہ اسلامی بطور قانونِ حکومت رائج تھی اور عدالتی عہدوں پر تقریباً مسلمان ہی مامور ہوتے تھے۔ سنہ ۱۷۸۱ء میں کلکتہ میں اسی تعلیم کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر ایک مدرسہ قائم کیا گیا مگر سنہ ۱۷۹۲ء میں بنارس میں ایک سنسکرت کالج کا قیام بھی عمل میں آیا جس میں ہندوؤں کے علوم کی تعلیم مشتمل تو اولیٰ حصہ دھرم شاستر ہوتی تھی۔

اب اٹھارہویں صدی کے خاتمہ سنہ ۱۷۹۲ء میں سر چارلس گرانٹ نے جو کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے قابل ترین ممبر تھے اور عرصہ تک ہندوستان میں رہ چکے تھے اس ملک میں اشاعتِ تعلیم پر ایک مبسوط رسالہ لکھکر سنہ ۱۷۹۷ء میں ڈائرکٹر کورٹ کے سامنے پیش کیا جس کا مفاد یہ تھا کہ ابتداً ہندوستانی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے اور بتدریج انگریزی رائج کی جائے اور جس طرح کہ مسلمانوں نے فارسی جاری کی تھی اسی طرح کمپنی کو انگریزی جاری کرنا چاہیے، اسی زمانہ میں ... بیپٹسٹ مشنری ولیم کیری نامی نے سیرام پور میں (جو اس وقت ڈنمارک کے حدود میں تھا) یوروپین اور ہندوستانی لڑکوں کے لیے مدرسے جاری کیے اور ایک مطبع قائم کرکے ہندوستانی زبانوں میں انجیل کی اشاعت کی پھر ایک انگریز نے جو سنہ ۱۸۰۰ء سے کلکتہ میں مقیم تھا راجہ رام موہن رائے[1] کی شرکت عمل سے ایک کالج

---

[1] سنہ ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ ذات کے برہمن تھے۔ عربی فارسی اور سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ انگریزی اور دوسری یورپین زبانیں بھی جانتے تھے سنہ ۱۸۱۴ء میں کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور ایک نیا مذہب برہمو سماج قائم کیا تھا جو ان کے نزدیک کل مذاہب عالم کا عطر و جوہر تھا۔

قائم کیا جو ہندو کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کالج ابتدائی زمانہ میں قطعی طور پر ایک مذہبی اکھاڑہ تھا اور اس کے اساتذہ مذہب میں زیادہ سے زیادہ آزاد خیالی کو ترقی دینے کے حامی اور مبلغ تھے۔ یہ کالج ہندو مذہب پر حملہ آوری کا ایک مورچہ بن گیا۔ اس کے اساتذہ اور طلبا، زبردست حملہ آور تھے خود بانی کالج (ڈیوڈ) تمام مذہبی عقائد کا منکر تھا۔ راجہ رام موہن رائے ہندو مذہب کے سخت نکتہ چیں تھے۔ وہ عرصہ تک عیسائی اور موحدین کی عبادت میں شریک ہوتے رہے اور بالآخر ایک جدید مذہب "برہمو سماج" کے بانی ہوئے۔ وہ مغربی تعلیم کے سرگرم حامی اور قدیم علوم کے احیا کے سخت مخالف تھے۔ جدید حکومت میں یہ سوال بھی زیرِ بحث تھا کہ مشرقی علوم کا احیا کرنا چاہیے یا مغربی تعلیم کو امداد دینی چاہیے جس سے بہت سی ملکی مصلحتیں بھی وابستہ تھی جاری تھیں۔ کمپنی کے متقدر عہدیداروں کا ایک بڑا گروہ اول الذکر مقصد کا اور دوسرا (جس میں ہندستانیوں کی شمولیت نے قوت پیدا کر دی تھی) موخر الذکر مقصد کا حامی تھا چنانچہ ۱۸۱۷ء میں کلکتہ کے ہندو رئیسوں نے اپنے چندوں سے ایک کالج قائم کر لیا۔ تاہم حکومت بھی ان تجاویز و تدابیر اور مسائل پر متواتر غور کرتی رہی تا آنکہ ۱۸۱۳ء میں برطانوی ہند میں نشر و اشاعتِ تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم بجٹ میں رکھی گئی۔

سررشتہ تعلیم کی ابتدا

۱۸۲۳ء میں پریسیڈنسی کلکتہ میں ایک جنرل کمیٹی کی تشکیل ہوئی کہ علمِ تعلیم کی تحقیقات کرے اور وہ تدابیر پیش کرتی رہے جو اشاعتِ تعلیم کے لیے مناسب ہوں بجٹ کی رقم بھی اس کو سپرد کر دی گئی گویا اس طرح ایک سررشتہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا۔ جب اس کمیٹی نے ۱۸۲۴ء میں بمقام کلکتہ ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت کالج قائم کیے جانے کی تجویز کی تو راجہ رام موہن رائے نے صدائے مخالفت بلند کی اور کہا

"اس کالج میں طلبا جو کچھ حاصل کریں گے وہ آج سے دو ہزار سال قبل کا علم ہوگا جس میں درمیانی زمانہ کے خیالی لوگوں نے محض لاطائل اور بے مغز تفصیلات کا اضافہ کر دیا ہے۔ سنسکرت زبان اس درجہ مشکل ہے کہ ایک پوری زندگی اس کی تحصیل کے لیے درکار ہے اور سب جانتے ہیں کہ اسی وجہ سے وہ اشاعتِ علوم میں سالہا سال سے مزاحم ہو رہی ہے پھر اس دشوار گزار دیوار کے پیچھے جو کچھ ہے وہ اس درجہ ناکافی ہے کہ کسی طرح اس محنت کا معاوضہ نہیں ہو سکتا جو اس کے حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔"[۱]

مگر مذکورہ بالا کمیٹی نے سنسکرت کالج ہی قائم کیا اور اس پرائیویٹ کالج کو بھی جو ۱۸۱۶ء میں قائم ہوا تھا اپنی نگرانی میں لے لیا۔ آگرہ اور دہلی میں جدید کالج قائم ہو گئے اور کچھ دن بعد کلکتہ اور آگرہ کے کالجوں اور سنسکرت کالج بنارس میں انگریزی کی جماعتیں کھولی گئیں اور ۱۸۲۹ء میں بمقام دہلی وہاں کے حکام کی خواہش کے موافق تعلیم علومِ عربیہ کے لیے ایک جداگانہ کالج قائم کیا گیا

۱۸۳۱ء میں آٹھ سال کی کوششوں کے متعلق کمیٹی نے جو یادداشت پیش کی اس میں لکھا کہ "کمیٹی نے اشاعت اور رواج علومِ مفیدہ کو سب سے بڑا مقصد اپنی تدابیر کا گردانا اور جو تجاویز کیں ان میں خیالات اور آرا، اور خوشنودی

---

[۱] اقتباس از لیکچر سید محمود صفحات ۳ تا ۶

اور نیز ان لوگوں کی بھی مدد منظور رکھی جن کی بہتری کے لیے تعلیم کی تدبیر کی جاتی تھیں - اسی نسبت سے کمپنی ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے علوم کی اعانت کرتی رہی اسی قسم کے مدارس میں جیسے کہ کلکتہ کا مدرسہ اور سنسکرت کالج بنارس تھے کمپنی نے اس قسم کے اور مدارس حسب اقتضائے موقع آگرہ اور دہلی میں قائم کیے کیونکہ اسی قسم کے مدارس میں معزز اور خواندہ لوگ جن کے گھروں میں علم موروثی ہے یا جنھوں نے تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا ہے یا فقہ اور مذہب کے علوم سیکھ کر مولوی اور پنڈت ہو گئے ہیں تعلیم کے لیے داخل ہونے کو آمادہ ہوتے ہیں بنظر اس امر کے کہ ان کے اصلی مربی یعنی ان کی قوم اور مذہب کے ذی مقدرت لوگ اب باقی نہیں رہے - کمپنی نے یہ بات اپنے اوپر واجب گردانی کہ ہندوستان کے عالم لوگوں کی معاش کو امداد کرے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو وظیفہ دیا جاتا ہے اُن ہی کی مدد معاش ہوتی ہے بلکہ ان لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے جو ان کے ہم قوم ہیں اور کالجوں کی تعلیم سے ان کی وقعت اور گزارہ کا سامان مہیا ہوتا ہے - اسی نہج پر شرع محمدی یعنی فقہ اور ہندو لا یعنی دھرم شاستر کی تعلیم سے ایک راستہ حصولِ ملازمت سرکاری ان کے لیے کھلتا ہے اور سرکار کو لائق عہدہ دار ملتے ہیں اور قابل قدر رعایا موجود ہوتی ہے کیوں کہ اس امر میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ اگرچہ مشرقی علوم میں کتنا ہی نقص ہو تاہم ان علوم میں کس جس قدر ہندوستانی زیادہ اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کریں گے اتنے ہی زیادہ ذہین اور فہیم ہوتے جائیں گے اور اس وجہ سے گورنمنٹ کی کارروائی اور منشا کے سمجھنے کے زیادہ لائق ہوتے جائیں گے مگر یہ گمان کرنا ہر قسم کی

معقول تا بید ہندوستانی طرز تعلیم کو دی جاتی رہی ہے کمپنی نے کوئی موقع اس تعلیم کے زیادہ بہتر کرنے اور زیادہ کار آمد کرنے میں ضائع نہیں کیا تمام کالجوں کا اہتمام اور نگرانی اعلیٰ یورپین عہدیداروں کے سپرد رکھا ہے اور اسی وجہ سے اس بات کا ثبوت ہے کہ نہایت معتد بہ بہبودی اور ترقی ہوئی ہے کلکتہ مدرسہ میں اور ہندو کالج بنارس میں جو سب سے قدیم ہیں بہت مدت تک یورپین عہدیداروں کا دخل اور نگرانی قائم کرنے کی مخالفت رہی مگر اب بہت دنوں سے وہ مخالفت جاتی رہی ہے اور وہ کالج یورپین عہدیداروں کے انتظام اور نگرانی میں ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے اور نہایت مستعدی اور منضبط عادات پیدا ہوتے جاتے ہیں اور ہر چیز کے حسن و قبح پر انصافانہ رائے قائم کرنے کی لیاقت ہوتی جاتی ہے اور یہ ایسے نتائج ہیں کہ جو کسی ایسے مدرسے سے حاصل نہیں ہوتے جس کا انتظام و نگرانی ہندوستانیوں کے بھروسہ پر چھوڑ دی گئی ہو ان کالجوں میں جو ترتیب تعلیم اختیار کی گئی ہے وہ ہندوستانی طریقہ تعلیم پر بہت فوقیت رکھتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مستحکم علم ان زبانوں کا حاصل کرایا جائے جو کہ پڑھائی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اور تعلیم بھی سکھلائی جائیں اور تعلیم حتی الوسع جلد پوری کی جائے - ہندوستانی طریقہ تعلیم کے موافق جو شخص کہ دھرم شاستر یا شرع محمدی کی تحصیل میں سب سے بہتر زمانہ اپنی عمر کا صرف کرتا ہے اس کو اس زبان کے علم ادب سے کہ جس میں وہ یہ قانون تحصیل کرتا ہے دیگر علوم اور مضامین کی کتابوں کی عبارت اور طرز تحریر سے اس کو ناکافی آگاہی ہوتی ہے کلکتہ مدرسہ اور سنسکرت کالج میں ابتدائی حصہ تعلیم کا جو اب جاری کیا گیا ہے اس سے اول تو طریق اور

سنسکرت زبانوں میں پوری استعداد حاصل ہوتی ہے۔ اور زاں بعد شاستر اور فقہ و قانون کی معتدبہ استعداد آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اور شاخوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے علوم سے بھی آگہی پیدا ہوئی ہے پس جو ترقیاں کہ عمل میں آئی ہیں ان سے صرف ہندستانی طریقہ تعلیم اور اس کی مقدار پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جب کبھی موقع ملا ہے نئے نئے اور بہتر تعلیم کے مضامین پرانے طریقہ تعلیم پر اضافہ کیے گئے ہیں مثلاً (کلکتہ) مدرسہ میں تحریر اقلیدس بہت دنوں سے سکھائی جاتی ہے اور اس سے فائدہ ہوا ہے۔ اور یوروپین طریقہ کا علم تشریح بھی جاری کیا گیا ہے۔ سنسکرت کالج بنارس میں یوروپین علم تشریح اور طب کی وجہ سے ہندستانی طریقہ ان علوم کے سیکھنے کا قریب معدوم ہو گیا ہے۔ آگرہ کالج و دہلی کالج میں جغرافیہ اور علم ہیئت اور ریاضیات درس کے اندر داخل کیے گئے ہیں کلکتہ مدرسہ اور سنسکرت کالج میں انگریزی پڑھانے کے لیے بھی جماعتیں مقرر کی گئی ہیں اور دہلی اور بنارس میں جداگانہ اسکول انگریزی زبان کی تعلیم کی اشاعت کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ پس بلا اس کے کہ ہندستانیوں کے خیالات اور تعصبات پر کچھ تشدد کیا جائے اور معصیت نیا ضانہ اعانت کے جو کہ محض دینی تعلیم کی جاتی ہے اس اصول کو کبھی فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے کہ اصلی علم اشاعت پا وے۔

فی الواقع ایک عظیم اور سودمند بنیاد تبدیلی مزاج اور خیالات اہل ہند کے لیے ڈالدی گئی ہے کہ جن کی خصلت اور پیشہ علم اور ذی موقعی کی وجہ سے ہندستانیوں کے ذہن پر ڈکا پر مفید اثر منحصر ہے ماسوا ان تدابیر کے جو کہ انگریزی کی اشاعت کے لیے اضلاع میں کی گئی ہیں اور جو کہ بالفعل اپنی کم عمری کی حالت میں کمیٹی کی توجہ زیادہ اعانت ودیالا یعنی ہندو کالج کلکتہ پر مبذول رہی ہے اور اس توقع سے بھی زیادہ بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں زبان انگریزی پر قدرت اور اس کے علم و ادب اور فنون سے اس قدر آگہی ہو گئی ہے کہ یورپ کے اسکولوں میں بھی شاذ و نادر پیدا ہوئی ہے۔ انگریزی زبان کا شوق بہت پھیل گیا ہے اور نوجوان آدمیوں نے جن کی تعلیم ودیالا یعنی ہندو کالج میں ہوئی ہے انھوں نے بطور خود ہر نواح و جانب میں مدرسے قائم کرنے شروع کیے ہیں جو اخلاقی اثر کہ پیدا ہوا ہے وہ بھی قابلِ تحسین ایسا ہی نمایاں ہوا ہے اور جو قیود کہ ہندو مذہب نے قائم کر رکھی ہیں ان کی طرف سے ناگواری اور اس کے مراسم کی طرف سے لاپروائی کھلم کھلا ہو گیا آدمی معزز خاندان اور ذی لیاقت حیثیت کے بیبا کانہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور بہت سے اور لوگ بھی جو ظاہر میں اپنے ہم مذہبوں کے برتاؤ اور رسم کے موافق پابندی کرتے ہیں ان کے بھی ایسے ہی خیالات ہیں۔ ایک پشت گذر جانے کے بعد کلکتہ کے تعلیم یافتہ باشندوں کے معلومات اور خیالات میں غالبا ایک بڑا انقلاب واقع ہو جاوے گا۔"

غرض حکومت کے انتظام اور توسیع کے ساتھ نظامِ تعلیم میں بھی وسعت ہوتی رہی لیکن بقول ڈاکٹر ہنٹر کے کہ

"اپنی ہمدردی کے تعلق پچہتر سال ۱۸۳۲ء تک ہم نے اپنے انتظامی عہدیدار تیار کرنے کے لیے مسلمانوں کے اسی نظامِ تعلیم کو جاری رکھا اس دوران میں ہم نے اپنا سررشتہ تعلیم قائم کر دیا تھا اور جلدی ہی کہ اس سے ایک نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو اٹھا کر پھینک دیا جس سے مسلمان نوجوانوں کی

ملازمت کے تمام راستے بند ہو گئے۔

سنہ ۱۸۳۴ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں "میکالے" شامل کیا گیا اس کی رائے تھی کہ "انگریزی تعلیم حکومت کا ایک فرض ہے، انگریزی ہندستانیوں کے لیے مغرب کے ترقی یافتہ اور وسعت پذیر علوم کا دروازہ کھول دے گی اور ایک زمانہ آئیگا کہ ہندستان مغربیت کا جامہ اختیار کرے گا۔ اس طریقہ سے امید ہے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندستانی ہوگا مگر خیالات اور تمدن میں انگریز ہوگا۔

اگرچہ اس رائے سے شدید اختلاف بھی ہوا مگر "میکالے" کو فتح ہوئی اور اتنی زبردست کہ لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل نے فیصلہ کر دیا کہ مشرقی علوم بیکار اور اصل مقصد اشاعت علوم انگریزی ہے

فارسی کا اخراج

اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۳۷ء میں عدالتوں سے فارسی کا اخراج کیا گیا اور انگریزی تعلیم کا رواج تیزی سے بڑھ گیا۔ سرکاری اور نجی مدارس میں بھی توسیع ہوئی اور ان کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا اور سنہ ۱۸۴۴ء میں سرکاری ملازمت میں انگریزی دانوں کا حق وضع کر دیا گیا۔

تعلیمی پالیسی کی غرض یہی تھی کہ مغربی خیالات اور علوم کے ذریعے ہندستانیوں میں تہذیب و تمدن کو ترقی دی جائے اور ایسی نسل پیدا کی جائے جو ملکی نظم و نسق کے انگریزی طریقوں کو اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں زیادہ آسانی سے اختیار کر سکے چنانچہ اس مقصد میں کامیابی ہوئی کلکتہ اور

برطانوی ہند کے دوسرے خاص شہروں میں اور بنگال کی علمی قوموں میں مغربی تعلیم کی طلب پیدا ہو گئی جو لوگ کلکتہ کے کالجوں اور اسکولوں میں تعلیم پاتے تھے وہ زیادہ تر ان ہی ذاتوں کے تھے جن کا مدت ہائے دراز سے علوم پر روایتی اجارہ تھا اور انھوں نے اس کو برقرار رکھنے میں کوششیں کیں

بہرحال اس نظام تعلیم میں وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی رہی حتیٰ کہ ۱۸۵۵ء–۵۶ میں مختلف صوبوں میں تعلیمی محکمے قائم ہوئے اور ۱۸۵۷ء میں پریسیڈنسی شہروں (کلکتہ مدراس، بمبئی) میں یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں

نظام تعلیم میں تبلیغ مسیحت

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں تعلیم کی بنیاد ہی مذہب عیسائیت کے خیالات پر قایم ہوئی تھی۔ مشنریوں نے انہیں خیالات اور عقائد کو تعلیم کا جزو لاینفک بنایا تھا اور کمپنی کے عہدہ داروں کی حوصلہ افزائی سے ان کو بڑی مدد ملتی تھی ان میں سے اکثر کے ذہن میں ہر وہ برائی اور بداخلاقی جو ممکنات میں ہے ہندستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں میں پائی جاتی تھی چنانچہ سر چارلس گرانٹ نے جو رسالہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے پیش کیا اس میں جملہ باشندگان ہند کی اخلاقی حالت پر اظہار رائے کرتے ہوئے مسلمانوں کے خصائل و اخلاق کے متعلق نہایت سخت متعصبانہ خیالات ظاہر کیے خواہ یہ خیالات کتنے ہی غلط اور مبالغہ آمیز ہوں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبان اقتدار کے دل و دماغ پر انہیں کا تسلط تھا اور انہیں کے لحاظ سے وہ علاج سوچتے تھے چنانچہ گرانٹ نے یہی سوچا کہ تاریکی کا اصلی علاج ان میں روشنی پھیلانا ہے عیسائیت کی جائیوں کا علاج جو سب سے بہتر ہے وہ ہمارے علوم اور ہماری روشنی کا ان تک پہنچانا ہے کیونکہ

ما پولیٹیکل انڈیا

ہرمانغ التعقیبہ عیسائی دنیا کی نجات ہی عیسائیت میں سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک بنی نوع انسان کی بڑی ہمدردی یہی ہے کہ عیسائیت کا حلقہ بگوش بنایا جائے۔

گرانٹ کی یادداشت میں یہ اندراج موجود ہے کہ

"اس میں کلام نہیں کہ سب سے اہم تعلیم جو ہندو ہماری زبان میں پاسکتے تھے وہ ہمارے مذہب کی تعلیم تھی جو متعدد رسالوں میں آسان الفاظ میں درج ہے اور جو مکمل طریقہ سے انجیل مقدس میں موجود ہے۔

ہندوستانیوں کی حالت اخلاقی حد درجہ خراب ہے، اور اس لئے ان کی سوسائٹی نہایت ذلیل ہے ان خرابیوں کی اصلاح قوانین کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہو سکتی خواہ وہ کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں در اصل تمام خرابیوں کی جڑ ان کی مذہبی رسمیں ہیں جن کی روح ان کے قوانین میں موجود اور ان کے جھوٹے ناپاک قابل مضحکہ مذہبی اصولوں میں مضمر ہے ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہی ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہنچائی جائے جو تاریکی میں ہیں بالخصوص ہمارے ربانی مذہب کے خالص اور پاک اصول انہیں بتلائے جائیں اس بارے میں ہماری ذمہ داری اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفیض ہیں اسے دوسروں تک کیوں نہ پہونچائیں"۔

غرض مبلغین عیسائیت یا مشنریوں کو اشاعت تعلیم کے نام پر امدادیں دی گئیں اور ملک بھر میں عیسائی مشنوں کا ایک جال بچھ گیا اس سے ہندو زیادہ متاثر ہوئے اور ان کی نیچ ذاتوں میں تو سرعت کے ساتھ عیسائیت پھیلنے لگی۔

سرکاری نظام تعلیم سے مسلمانوں کی بیزاری، مسلمانوں میں ہمیشہ تعلیم عام رہی اور ان میں تعلیمی اجارہ داری کا نام نہ تھا ان کے علوم زندہ تھے۔ بقول سید احمد خاں کے کہ

"مسلمانوں کی تعلیم کا حال اور قوموں کی تعلیم
سے جو ہندوستان میں آباد ہیں بالکل
مختلف ہے ان کی مذہبی تعلیم عام تعلیم میں
ایسی ملی ہوئی ہے کہ جیسے جسم و جان جب
اس کو علیحدہ کیا جائے گا جسم بے جان
رہ جائے گا"

علاوہ بریں چونکہ حکومت کی زبان فارسی تھی اور قانون حکومت فقہ اسلامی پر مبنی تھا ان کو اطمینان تھا کہ ۱۸۰۵ء کے اس معاہدہ کی رو سے جو "شاہ عالم ثانی" اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ہوا تھا دفاتر کی زبان فارسی رہے گی پھر علوم مشرقی کے احیا کی طرف جو رجحانات تھے وہ اس اطمینان کو اور تقویت دیتے تھے اس لئے انہوں نے انگریزی کی طرف توجہ نہ کی بلکہ اس کو مذہب کے لئے خطرہ سمجھنے لگے۔

جس وقت حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ جو وظائف طلبا کو دیئے جاتے ہیں بند ہوں اور جملہ روپیہ تعلیم انگریزی کی اشاعت پر صرف کیا جائے تو مسلمانان کلکتہ نے جمع ہو کر ایک درخواست تیار کی جس پر قریب آٹھ ہزار آدمیوں نے دستخط کئے جنمیں جملہ معزز، عالم، مولوی اور رئیس شامل تھے اور اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا۔ اس عرضی میں بعد بیان ان دلائل اور اصولوں کے جو گورنمنٹ نے اس نئی تدبیر تعلیم میں اختیار کئے تھے انہوں نے یہ صاف بیان کیا کہ،

"ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہندوستانیوں
کو عیسائی کرنے کا ہے اور انگریزی تعلیم پر

اس قدر کلیتہً توجہ کرنے اور علوم اہل اسلام اور اہل ہنود کو بند کرنے سے صرف یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو عیسائی ہو جانے کی ترغیب دیں اور اس طرح کلیتہً انگریزی پر توجہ کرنا صرف ایک تدبیر اشاعت دین عیسوی کی قرار دی ہے۔"

انہوں نے بجواب ایک سوال کے پھر یہ بیان کیا کہ :-

"ایسی تدبیر سے بجائے اس کے کہ سرکار انگریزی کی طرف خیر خواہی اور وفاداری کی اور ترقی ہو اس کے برعکس اثر پیدا ہوا ہے اور اس سے گورنمنٹ کی طرف اور ناراضگی پیدا ہو گئی۔"

(لکچر سرسید صلا)

سرسید کا ایک بیان

غرض ۱۸۵۷ء تک اشاعت تعلیم میں مشنریوں کا کافی اثر و رسوخ تھا جس سے بدگمانی بھی شدت کے ساتھ پھیل گئی۔ سرسید نے اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں اس پر کافی اور واقعاتی روشنی ڈالی ہے :

"مشنری اسکول بہت جاری ہوئے ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالیقدر حکام ان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو ان میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے یہ پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون تمہارا نجات دینے والا کون اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے اس بات کو عدم ناراضی پر خیال کرنا نہیں چاہئے بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے نہ رضامندی سے،

دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے کے سبب لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوتے ہیں پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر ہر گاؤں اور قصبہ میں گشت"

ملہ یہ شکایت نہ صرف مسلمانوں کو تھی بلکہ ۱۸۵۸ء میں مدراس کے ہندوؤں نے پارلیمنٹ میں [illegible] قسم کی [illegible] تھی کہ سرکاری [illegible] اسکولوں میں [illegible] بچوں کی تعلیم نہ ہونی چاہئے۔

کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو
مکتبوں میں داخل کرو ہر ہر گاؤں میں کالا
پادری آن کا نام تھا جس گاؤں میں ڈپٹی
یا ڈپٹی انسپکٹر پہونچا اور گنواروں نے
آپس میں چرچا کیا کہ کالا پادری آیا عوام الناس
یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں
اور کرستان بنانے کو بٹھاتے ہیں اور فہمیدہ
آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے
تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم
ہوتی ہے ہمارے لڑکے ان میں پڑھکر اپنے
مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات
اور دینیات سے بالکل ناواقف ہوجائیں گے
اور عیسائی بن جائینگے
اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ
ہے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم
کردے تاکہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل
جائے، اکثر اضلاع مشرقی ہندوستان میں
ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل
ہونا صاف تحکما ہوا اور کہدیا کہ گورنمنٹ کا
حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔
جیسے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر
تھے اول اول گو ان سے بھی کچھ کچھ وحشت
لوگوں کو ہوئی تھی اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز
جو تمام ہندوستان میں نہایت نامی
مولوی تھے زندہ تھے مسلمانوں نے ان سے
فتویٰ پوچھا انہوں نے صاف جواب دیا
کہ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا اور
انگریزی زبان سیکھنا بموجب مذہب
سب درست ہے۔ اس پر سیکڑوں
مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے مگر
اُس زمانہ میں کالجوں کا حال ایسا نہ
تھا بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت
اچھا تھا ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی
اور سنسکرت اور انگریزی پڑھائے
جاتے تھے فقہ اور حدیث اور علم ادب
پڑھانے کے لئے اجازت تھی فقہ میں
امتحان ہوتا تھا سندیں ملتی تھیں کسی طرح
کی ترغیب مذہبی نہ تھی مدرس بہت فری
عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور
پرہیزگار مقرر ہوتے تھے مگر آخر کو یہ بات
نہ رہی قدر عربی کی بہت کم ہوگئی اور فقہ
و حدیث کی تعلیم اکثر جاتی رہی فارسی بھی
چنداں قابل لحاظ نہ رہی تعلیم کی صورت
اور کتابوں کے رواج نے بالکل تغیر پکڑا
اُردو اور انگریزی کا رواج بہت زیادہ ہوا
جس کے سبب وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو
ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کرنا
منظور ہے قایم ہوگیا مدرس لوگ معتبر اور
ذی علم نہ رہے۔ طالب علم کہ جنہوں نے
ابھی تک لوگوں کی آنکھوں میں اعتبار نہ پیدا

کیا تھا مدرس ہونے لگے اس سے ان مدرسوں
کا بھی وہ ہی حال ہوگیا۔"

مسلمانوں پر غدر کا اثر

اگر مستثنیات سے قطع نظر اس میں بھی شبہ نہیں کہ زوال و انتزاع سلطنت سے مسلمانوں میں بہت کچھ تعلیمی تمدنی اور مجلسی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور روز بروز اقتصادی اور مالی تنزل بڑھ رہا تھا۔ زمینداریاں قبضہ سے نکلی چلی جارہی تھیں صنعت و تجارت میں بھی زبوں حالت تھی ملازمتوں کا دروازہ بند ہی ہو رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں نائرۂ غدر بلند ہوا جس نے اس تباہی کو مکمل کردیا۔

انگریزوں کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے خلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی ان کا یہ خیال اس آگ پر اور تیل چھڑک رہا تھا کہ خلفائے راشدین کے زمانہ سے اب تک مسلمانوں میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا وہ آج تک ویسے ہی غیر متزلزل غیر رواداراور سے گزرجانے والے ہیں وہ عیسائیوں سے اسی طرح متنفر ہیں اور ہر ممکن ذریعہ سے اپنا اقتدار قایم کرنا چاہتے ہیں وہ کسی غیر مذہب والی حکومت کے ساتھ وفادار نہیں ہوسکتے کیونکہ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر مسلمان حاکم کے علاوہ کوئی اور ان کا فرمانروا ہو تو وہ خود کو ایسی حالت میں پاتے ہیں کہ جس پر راضی ہوجانا ان کے ضمیر کے خلاف ہے اس لئے اعزازات و مراعات سے ان کو خوش رکھنا ناممکن ہے مگر ان کو نمائشی وفاداری کا ڈھب خوب آتا ہے اور وہ موقع کے منتظر رہتے ہیں لیکن عیسائیوں کے ساتھ اس طبعی منافرت کے علاوہ اور بھی وجوہ تھے جن کے باعث ہندوستان کے مسلمان ہماری بربادی کے خواہاں تھے وہ بھولے نہ تھے کہ ہندوستان کئی پشت تک ان کے زیر نگیں رہ چکا تھا اور پھر انہیں یقین تھا کہ برطانیہ کی قوت اگر کامل طور پر برباد ہوگئی تو ان کی عظمت رفتہ واپس آجائے گی اور وہ دوبارہ ہندوؤں پر حکومت کرسکیں گے۔ ہندوستانی فوج میں جو بددلی پھیل رہی تھی اس کو انہوں نے تاڑ لیا اور اپنی ریشہ دوانی سے اس چنگاری کو بھڑکا کر آگ لگا دی۔[1]

(ماخوذ از حکومت خود اختیاری)

چنانچہ غدر فرو ہونے پر انہیں سے سخت انتقام لیا گیا اور دونوں قوموں (مسلمانوں اور عیسائیوں) میں مصالحت کی امید جاتی رہی۔[2]

اوقات تعلیم و تفہیم مسلمانان کے متعلق حکومت کا رویّہ

یہ حقیقت بھی اس سلسلہ میں قابل بیان ہے کہ نظام تعلیم ہی مسلمانوں کی تعلیم کا سدِراہ نہ تھا بلکہ حکومت کی قبل غدر جو پالیسی تھی اور بعد غدر جو منتقمانہ جذبات صاحبان اقتدار کے دلوں میں تھے اس سے مسلمان بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

---

[1] تقریر سر آکلنڈ کالون بجواب ایڈریس مدرسۃ العلوم علیگڑھ کالج ۱۸۹۲ء

[2] صوبہ متحدہ میں غدر کی یادتازہ رکھنے کیلئے نشیب کا ایک چھوٹا بکس بناکر اور ایک صلیب نصب کرکے جابجا انگریزوں نے تقسیم کیا تھا جس کا نیچے واقعہ کی تاریخ نہایت پرجوش کیفیت کے ساتھ دکھلائی گئی تھی اس سے یہ فائدہ اٹھایا گیا تھا کہ جس قدر مشہور مقامات ہیں اور جہاں عام جاتے رہتے ہیں وہاں یہ بکس رکھا جائے تاکہ عام انگریزوں کو ہندوستانیوں کی سفاکی و ظلم کی مقدار معلوم ہو۔

بنگال میں کہ بنگال میں اوقاف کی ہگلی ہگلی کے گرانقدر وقف کا جسے جا مصرف اور کم و بیش اسی ہزار روپیہ سالانہ کا وہ صرف جس سے دوسری قومیں تو مستفید ہوتی تھیں اور مسلمان محروم رہتے تھے اور اتنی گرانقدر رقم میں سے صرف دو ہزار پانچسو ایک عربی مدرسہ پر خرچ ہوتا تھا۔

اس بے ایمانی پر ایک سویلین افسر نے لکھا تھا کہ

"میرے خیال میں اس نفرت و حقارت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو گورنمنٹ نے اپنے اس فعل سے مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کی ہے یہ الفاظ ممکن ہے کہ سخت معلوم ہوں لیکن میں اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ ہندوستان میں اپنے اٹھائیس سال کے قیام میں میں نے اس مسئلے پر بارہا غور کیا ہے اور میں یہ بات پختہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی ہندوستانی یا یوروپین سے بجز مذکورہ بالا بیان کے کوئی اور بیان نہیں سنا خیر یہ صحیح ہو یا غلط مگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اس معاملہ میں گورنمنٹ نے ان کے ساتھ ناانصافی بلکہ کمینہ پن کا برتاؤ کیا ہے اور اس سے مستقل طور پر ان کے دلوں میں ہماری طرف سے بدظنی کا ایک زخم ہو گیا ہے۔"

بنگال کی یہ داستانِ غم بہت طویل ہے اب پنجاب کی طرف دیکھیں تو وہاں ۱۸۵۶ - ۵۷ء کی تعلیمی رپورٹ کے مطابق اگرچہ مسلمان بچے بہت زیادہ تھے اور معلمی کے پیشہ پر ان کا قبضہ تھا لیکن تعلیم کے اعلیٰ افسر نے اس میلان اور کثرت کو روکنے کی ضرورت پر زور دیا اور ۱۸۶۰ - ۶۱ء میں کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے مسلمان استادوں کی ٹریننگ کی درسگاہوں میں تعداد گھٹانے کی تدابیر کیں اور ہندوؤں کو بڑھایا اور اس پالیسی کا جو یقینی نتیجہ تھا وہ حاصل ہوا۔

اسی طرح ملازمتوں کا حال تھا ۱۸۶۹ء میں سندھ کے کمشنر نے سرکاری اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوں گی ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے گا۔

بقول ڈاکٹر ہنٹر "نئے حکام تو ان کے وجود ہی کو تسلیم کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اور کلکتہ میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی نوکری مل سکے۔"

ڈاکٹر موصوف پھر یہ صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ

"اچھے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل بے چینی سے لبریز ہو گئے ہیں یہ احساس اگر اس خیال پر مبنی نہ بھی ہو کہ ان کو ان کے مذہب کی وجہ سے ستایا جا رہا ہے لیکن ضرور ہے کہ ان کے ساتھ ان کے مذہب کی وجہ سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔"

یہ حالات تھے کہ ۱۸۶۸ء میں خداوند جل و علا نے مسلم قوم پر سید احمد خان کے وجود اور ہمت و کوشش میں اپنی رحمت نازل کی اور علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا اور ہنوز دوسری صدی بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ ۹۰ سال کے دوران میں اسی تحریک کی بدولت مسلمانوں نے ... کر ہر شعبہ میں ترقی کی اور ایک مسلم سلطنت کا قیام کر لیا۔

پسماندہ ممالک میں اقتصادی ترقی کے چند پہلو

(از جناب محمد ابعاد حسین قمر رتی سی۔ ایس پی)

ذیل کا عالمانہ مقالہ کانفرنس اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے ساتویں جلسہ میں جو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب چیرمین ٹیرف کمیشن کے زیر صدارت ۲۰ر جنوری ۱۹۵۶ء کو بمقام ایس۔ ایم لا کالج کراچی مسٹر حسن علی عبدالرحمٰن بیرسٹرایٹ لا کی دعوت عصرانہ پر منعقد ہوا پڑھا گیا تھا۔ مقالہ انگریزی میں تھا جس کا ایک حد تک آزاد اُردو ترجمہ ہمارے رفیق مسٹر انعام عظیم برنی ایم۔ اے نے کیا ہے۔ چونکہ مقالہ ایک نہایت اہم اور مفید موضوع کا حامل ہے اسلئے اُمید ہے کہ جس طرح جلسہ میں غور و توجہ سے سُنا گیا اسی طرح ناظرین العلم بھی اُس کو دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ فرمائینگے۔ (ایڈیٹر)

جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر کے پسماندہ ممالک میں کی اقتصادی ترقی کے مسئلے نے روز افزوں اہمیت حاصل کرلی ہے ان ممالک میں قومیت کا جذبہ، مساوات، ہم رنگی اور خودداری کی پرجوش خواہش اور اپنی مفلسی کا شدید احساس پیدا ہوگیا ہے جس کی اساس مغربی ثقافت کا اثر، وہاں کے اعلیٰ معیارِ زندگی اور کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے حلقۂ اثر پر ہے۔ ہم لوگ جو پسماندہ ممالک میں رہتے ہیں گہری نیند سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ہمارا جمود جس نے ہم کو صدیوں تک یکساں حالت میں رکھا ہے دور ہوتا جا تا ہے۔ دُنیا تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور مختلف ممالک ایسے حالات قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے پسماندہ ممالک بھی مغربی یورپ امریکہ کی ترقی یافتہ ممالک کی ترقیوں سے رفتہ رفتہ روشناس ہوتے جاتے ہیں۔ روحانی اطمینان اور خودکفالتی کا رجحان بڑھتی ہوئی جدید کے انقلاب میں تبدیل ہوتا جاتا ہے جس قسم کے خیالات چین کے شہنشاہ چین لنگ نے برطانیہ کے شہنشاہ جارج سوم کے نام ایک پیغام میں ظاہر کئے تھے کہ

"تمہاری آسمانی سلطنت میں ہر قسم کی اشیاء کی فراوانی ہے اور بیرونی ممالک کے وحشیوں کی بنائی ہوئی اشیا کو درآمد کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے"۔

اب ماضی بعید کے افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کل کے لئے اس قسم کے خیالات پر قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

درحقیقت پسماندہ ممالک کے باشندے عرصہ دراز سے اپنی مفلسی کا شدید احساس رکھتے ہیں اور اس امر کے بے حد خواہشمند ہیں کہ جلد از جلد انتہائی اقتصادی ترقی کے منازل طے کرلیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم سے قبل مغربی ممالک کو شاید اس کا یقین نہیں تھا کہ ان ممالک کی اقتصادی ترقی کا سوال بھی دنیا کے اہم مسائل کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ جنگ کے بعد کے زمانہ کا ایک نمایاں معجزہ یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کی اقتصادی فلاح کے مسئلہ کو دنیا کے اہم مسائل میں شامل کرلیا گیا۔ اور اس کو موجودہ شکل میں ترتیب دیا گیا تاکہ کمیونزم کو شکست دی جاسکے اور دنیا میں اقتصادی استقلال اور توازن قائم کیا جاسکے۔

دنیا کے آزاد ممالک اور کمیونسٹ ملکوں کے درمیان کشمکش بڑھ جانے اور خاص طور پر ایشیا میں کمیونسٹ اثرات کے نشوونما پانے کی وجہ سے اقتصادی ترقی کے اس مسئلہ پر بھی دن بدن زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ موجودہ غیر متوازن حالت میں دنیا کے سامنے مرکزی سوال یہ ہے کہ آیا بے نظمی اور انتشار کی قوتیں جو کمیونزم پر منتج ہوتی ہیں بغیر روک تھام کے چھوڑ دی جائیں یا ایسے اطمینان بخش اقتصادی ادارے قائم کئے جائیں جو بین الاقوامی اقتصادی ہم آہنگی اور تعاون کے لئے کارآمد ہوسکیں۔ معلوم ہوتا ہے مغربی دنیا کی پالیسی ترتیب دینے والوں نے پسماندہ ممالک اور اقوام کو ایک وسیع تر اور عالمگیر اقتصادی تنظیم میں مربوط کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرلیا ہے۔ مغرب کے نقطۂ نظر کی تشریح ان الفاظ سے ہوتی ہے جو [illegible] نے اپنی حال ہی میں شائع شدہ کتاب "پسماندہ ممالک کی ترقی" میں نیشنل ایسوسی ایشن آف مینوفیکچررز کے بیان [illegible] ۱۹۴۹ء سے نقل کئے ہیں:

"صحت مند اقتصادی ترقی سے دوسرے ممالک نہ صرف بہتر ہمسایہ بن جاتے ہیں بلکہ مال خریدنے اور مال فراہم کرنے کے معاملہ میں بھی وہ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ جوں جوں ان کی قوت پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے وہ اپنی ضروریات کی کفالت کے لئے اشیاء اور کچا مال بہم پہنچانے کے زیادہ قابل ہوتے جاتے ہیں۔ چونکہ ان ملکوں کے باشندوں کا معیار زندگی بلند تر ہوجاتا ہے اور قوت خرید میں ترقی ہو جاتی ہے اس لئے وہاں اُن اشیاء کی فروخت کے لئے منڈی پیدا ہوجاتی ہے جو ہم بیچنا چاہتے ہیں۔ اس طرح تمام دنیا کی معاشی حالت ریاست ہائے متحدہ کی معاشی حالت استحکام حاصل کرے گی" معلوم ہوتا ہے کہ اس اقتصادی استقلال، کمیونسٹ حلقہ اثر کی توسیع کے امکان کو روکنے کی ضرورت اور دنیا کو جمہوریت کے قیام و بقا کے لئے محفوظ بنانے کی غرض کے اشتراک نے مغربی پالیسی وضع کرنے والوں کو پسماندہ ممالک کی فوری اور مکمل اقتصادی ترقی کے پرجوش کارکنوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کو پسماندہ اور کم ترقی یافتہ ممالک کی اقتصادی بہبودی کی [illegible] کا پہلا پہلا احساس ان ممالک کے باشندوں کیلئے [illegible] ہے کہ یہ وسیع تر بنیادوں پر اقتصادی ترقی کا مقصد حاصل کرنے کیلئے آگے بڑھیں غالباً تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ دنیا کے آزاد ممالک کے باشندے جنہیں پسماندہ ممالک اور مغربی ممالک دونوں شامل ہیں عام طور پر اس امر پر متفق ہیں کہ اول الذکر ممالک کی [illegible]

گری [illegible] فی کس آمدنی میں اضافہ کرنے کیلئے تدابیر مہیا کرنے میں مطلق تاخیر نہ ہونی چاہئے۔ انسانی ضمیر اور کمیونزم دونوں کا خطرہ لیکر اس امر کو ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں کہ دنیا کے ایک حصہ میں انتہائی عیش کے سامان فراہم ہوں جبکہ دوسرا حصہ فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا ہو۔ اس امر کو بھی عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ حقیقی معاشرتی خوشحالی متعدد سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کی حامل ہے اور افراد کے تجاویز اور عقیدوں کو نئے قالب میں ڈھالتی ہے تاکہ انکے روزانہ کاموں میں آزادی اور نئے امکانات مہیا ہو سکیں۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ملک کی اقتصادی ترقی ایسی چیز نہیں ہے جسکو فوک ہنیا کی طرح بیرونجات سے برآمد کیا جا سکے بلکہ قربانی اور محنت سے مرحلہ وار اندرونی طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اقتصادی ترقی کے مسلسل اور کامیاب حصول کے لئے صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ کوئی انقلاب جبراً پیدا کیا جائے بلکہ اس کو اس طریقہ سے رائج کیا جائے کہ ان اقوام کے افراد کے لئے بہتر ہو جن کی زندگی سے اس کا تعلق ہو۔

آنریبل چودھری محمد علی نے فنڈ اور انٹرنیشنل بنک کے بورڈ آف گورنرز کے جلسہ منعقدہ ۲۳ستمبر ۱۹۵۳ء کو خطاب کرتے ہوئے پسماندہ ممالک کے مسائل کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا:-

"پسماندہ ملکوں میں بنیادی ترقی کی اسکیموں کو آگے بڑھانے زراعت کے ڈھنگ اور طریقوں کو بہتر بنانے اور صنعتی پیداوار کو معقول حد تک ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ سماجی تعمیر کا کام بھی ہاتھ میں لیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ عام تعلیم اور صحت عامہ کے ذرائع کو وسعت دی جائے۔ اس قسم کے منصوبوں سے پیداوار کی قوت بڑھے گی اور معیار زندگی میں بلند ہوگا۔ پسماندہ ملکوں کو زیادہ تر اپنی ذاتی کوشش پر بھروسہ کرنا ہوگا مستحکم اندرونی پالیسیاں زیر عمل لانی ہونگی اور اپنے ذرائع سے زیادہ سے زیادہ سرمایہ فراہم کرنا ہوگا۔ بلکہ اس قسم کے ذرائع محدود ہیں اور بعض حالتوں میں بچت اور سرمایہ فراہم کرنے کی شرح آبادی کے اضافہ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ترقی حسب خواہش تیز رفتاری سے کرنی مقصود ہے تو بیرونی امداد حاصل کرنا بھی ناگزیر ہے اور اس کی مقدار بھی اس سے کہیں زیادہ ہونا ضروری ہے جتنی کہ اس وقت تک دینے کا خیال کیا گیا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ان مسائل پر مسلسل بحث کی جائے مگر عدم گنجائش کے سبب تفصیلی بحث ممکن نہیں ہے تاہم یہ امر ظاہر من الشمس ہے کہ یہ معاملات نہایت اہم ہیں۔

اقتصادی خوشحالی کا حصول محنت طلب طویل اور پیچیدہ ہے کسی پسماندہ ملک کی اقتصادی ترقی کے تمام شعبوں کی متوازن نشوونما کا راستہ طویل اور ڈھلوان سڑک پر سے گزرتا ہے اور کسی پگڈنڈی کے بجائے کوئی جادو کی چھڑی ہی اس راستہ کو مختصر کر سکتی ہے۔ یہ الفاظ اُن ملکوں کے متعلق خاص طور پر صادق آتے ہیں جہاں آمریت نہیں ہے۔ جمہوریت کے ارتقا میں خصوصی مسائل پیش آتے ہیں جنکی نوعیت پیچیدہ ہوتی ہے اور جن کا سلجھانا دیر طلب ہوتا ہے اور مختلف بااثر فرقوں اور سیاسی جماعتوں کی کشمکش ایسے تنازعے پیدا کر دیتی ہے جو منزل مقصود تک مستقل پیش قدمی کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ کسی جمہوری ملک کی اقتصادی حالت میں [illegible] کے لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ تمام آبادی میں یکجہتی کار کردگی پیدا کی جائے اور ان کے دلوں میں محنت [illegible]

کوشش کی جائے تاکہ ان کی تمام پوشیدہ تخلیقی قوتیں اور خواہشیں بروئے کار آسکیں۔ درحقیقت ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف چوٹی کے لیڈر اور اولوالعزم سرمایہ دار ہی اعلیٰ قابلیت کے حامل ہوں بلکہ اس سے متعلق تمام افراد میں یہ صفات موجود ہونی چاہئیں۔

کسی ملک کی اقتصادی ترقی اسی وقت کامیاب کہی جاسکتی ہے جبکہ ہر حصہ کی ترقی ہم آہنگ ہو اور ہر شعبہ میں نشو و نما متوازن ہو۔ اگر پسماندہ ممالک معاشی ترقی کا مقصد حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں تو ان کو اپنے باشندوں میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کرنی ہوگی، ایک ایسا اقتصادی اور مالی نظام قائم کرنا ہوگا جس میں سرمایہ لگانے کی ترغیب ہو اور ایسی اقتصادی زندگی ترتیب دینی ہوگی جو جمود کی بجائے حرکت اور آگے بڑھنے کی قوت مہیا کرے۔ اب تک رواج اور قدامت پرستی کی وجہ سے ثقافت اور تقدس کی روحانی اقدار پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اب اقتصادی معاملات میں نئی راہیں تلاش کرنے اور مادی فلاح و بہبود پر زیادہ زور دینا ہوگا تاکہ اقتصادی میدان میں بہترین دماغی صلاحیت والے اصحاب کو لگایا جاسکے۔ ایسا سماج جس میں صنوبر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر (روحانی نشو و نما اور عروج کے لئے) مراقبہ کرنا، پشت کی تعمیر کیلئے مٹی لے جانے کی نسبت بہتر خیال کیا جاتا ہے، کبھی اقتصادی طور پر نہیں پنپ سکتا اور نہ دولتمند ہو سکتا ہے۔ بروس زکن نے اپریل جون [illegible] کے انڈیا کوارٹرلی میں ایک مضمون لکھا ہے کہ "اگر پسماندہ ممالک اپنے ملک کی دولت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنی تمام کوششیں حصول زر کیلئے وقف کرنی ہونگی۔ اگر ایسا کرنے سے ان کو اپنی زندگی کی بعض دلکشیوں اور خوشیوں کو قربان بھی کرنا پڑے تو بھی بخوشی خاطر دینی چاہیئے۔" لیکن اس طریقہ کو بہت تیز رفتاری کے ساتھ عمل میں نہیں لانا چاہیئے۔ مجلسی اور ثقافتی اقدار اور خصائل کو تبدیلی کی منزلوں سے بتدریج گذرنے کے لئے ان میں قطع و برید کرنی ہوگی۔ نئے اسلوب میں ڈھالنا ہوگا اور جدید ضروریات کے مطابق بنانا ہوگا۔

ہمیں اس امر کی بڑی احتیاط کرنی ہوگی کہ موجودہ اقدار بالکل تباہ نہ ہو جائیں۔ اقدار کا مطلب یہاں دیہاتی جماعتوں کے سماجی تعلقات اور مختلف طبقوں کی مجلسی یکجہتی سے ہے۔ اس وقت ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ سماجی تعلقات کو کس طرح کارآمد بنایا جائے بجائے اس کے کہ نئی روح اور نیا خون داخل کرنے سے قبل ان تعلقات کو منقطع کر دیا جائے۔ اقتصادی ترقی کے لئے سرمایہ کی فراہمی کے علاوہ ایسا رجحان پیدا کرنے کی ضرورت بھی ہے جو جدید کارگاہوں پیداوار کے بدلتے ہوئے طریقوں اور اداروں کی ایسی نئی تنظیم سے ہم آہنگ ہو سکے جس کے تحت سرمایہ لگانے والے اور کام کرنے والے خوشحال رہ سکیں۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو فنی اور انتظامی اہلیت رکھتے ہوں تاکہ پیداوار کے جدید طریقوں کو کامیاب اور موثر طریقہ پر عمل میں لا سکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تربیت یافتہ اور ضروریات زندگی سے مطمئن مزدور بھی فراہم کئے جائیں جو کارخانوں اور کھیتوں میں جدید طریقوں پر کام کرنے کے اہل ہوں۔ اقتصادی ترقی سے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایسی سریع الاثر قوتیں پیدا کی جائیں جو

ملک کی اقتصادی فلاح کو آگے بڑھا سکیں اور ہر سمت میں پیداوار کے اضافہ کے لئے جدید میدانوں کی تلاش اور دریافت میں سرگرم عمل رہیں۔

کسی ملک کی اقتصادی بہبودی کا یہ مطلب ہے کہ فی کس آمدنی کی مقدار کو بڑھایا جائے۔ قومی آمدنی کے اضافہ کی شرح کا انحصار مندرجہ ذیل امور پر ہے:۔

(ا) بچت اور کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ کی اوسط شرح یعنی خالص سرمایہ۔

(ب) سرمایہ کی فراہمی کا تناسب۔

(ج) آبادی میں اضافہ کی شرح۔

(د) بیرونی ممالک سے سرمایہ کی درآمد اور اس کی مقدار جس میں ذاتی غیر ملکی سرمایہ، غیر ملکی قرضہ جو ایک حکومت نے دوسری حکومت سے لیا ہو اور وہ قرضہ جو بین الاقوامی اداروں سے لیا گیا ہو شامل ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کے متعلق مختصراً لکھوں گا۔

کسی ملک کی اقتصادی خوشحالی اور پیداوار کی سطح کا انحصار خاص طور پر اس سرمایہ پر ہے جو اس کے پاس موجود ہو اور جس کو وہ کام میں لا سکے۔ ایسے سرمایہ میں فیکٹری، مشینری زراعتی سہولتیں، بجلی گھر، انجن، ذرائع رسل اور رسائل اور زمین کا رقبہ شامل ہیں۔ ان سب چیزوں کو صنعتی اور پیداواری سامان اور مفاد عامہ کی اشیا کہا جاتا ہے۔ کسی ملک کی ترقی کا انحصار اس کے موجودہ سرمایہ میں اضافہ کی شرح پر ہوتا ہے۔ ایسا سامان فراہم کرنا سرمایہ فراہم کرنے کے مترادف ہے اور موجودہ سرمایہ میں اضافہ کی شرح پر کسی ملک کی اقتصادی خوشحالی کی رفتار کا انحصار ہوتا ہے۔

سرمایہ فراہم کرنے کی رفتار تیز کرنے کے دو طریقے ہیں:۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صرفہ میں آنے والے سامان کی پیداوار کے ذرائع کو دوسری سمتوں میں منتقل کر دیا جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس وقت تک جو ذرائع استعمال نہیں ہو سکے ہیں ان کو کام میں لایا جائے۔ اقتصادی بہتری کے لئے اولین شرط بچت ہے۔ بچت اور سرمایہ لگانا اقتصادی خوشحالی کی کنجی ہے۔ بچت اور لگائے ہوئے سرمایہ کی اوسط شرح (یعنی موجودہ سامان کی مرمت اور تجدید کے لئے ضروری اخراجات وضع کرنے کے بعد جو خالص لگا ہوا سرمایہ باقی رہے۔) ایسے ملکوں میں جو اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ کہے جاتے ہیں ۱۵ اور ۲۵ فی صدی کے درمیان ہے لاطینی امریکہ میں ۸ اور ۱۰ فیصدی کے درمیان ہے اور ایشیائی ممالک میں ۳ اور ۶ فیصدی کے درمیان ہے، بچت کی شرح ہی ایک ایسا اہم عنصر ہے جو ترقی کی رفتار متعین کرتا ہے لیکن برائیوں کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں کیونکہ وہاں قومی آمدنی بہت کم ہے اس لئے بچت کے مواقع بھی برائے نام ہیں اور چونکہ بچت برائے نام ہے اس لئے قومی آمدنی قلیل ہونا بھی ناگزیر ہے سینگر نے لکھا ہے کہ "ہم کو نہ صرف ایسے نظام کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے جس کو برائیاں حلقہ کئے ہوئے ہیں بلکہ جیسے برائیوں کے حلقے در حلقے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ برائیوں کے حلقے صنعتی پیداوار کی قلت، اقتصادی کاموں میں لگانے کے لئے بچت کا فقدان، اوزار اور سامان کی عدم فراہمی، اور پیداوار کے گھٹیا معیار پر مشتمل ہیں۔ ایک کم ترقی یافتہ ملک میں غربت ہونا لازمی ہے کیونکہ اس میں صنعتوں کا

فقدان ہوتا ہے جو لازمی ہے کیونکہ ملک میں دولت نہیں "سمٹتی" پسماندہ سماج میں باشندوں کی اکثریت اس قدر غریب ہوتی ہے کہ ان کو زندگی قائم رکھنے کے لئے شکم سیر ہوکر کھانا بھی بمشکل نصیب ہوتا ہے۔ اس بیان کی وضاحت کے لئے یہ امر کافی ہے کہ پسماندہ ممالک آبادی کی بڑی اکثریت کی آمدنی انکم ٹیکس سے معافی کی حدود کے اندر آتی ہے۔ اس کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ قومی آمدنی میں اضافہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ بچت کی شرح میں مسلسل اضافہ ہو جائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچت کہاں سے آئے؟ غربائیوں کے حلقے سے نکلنے کے لئے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے اور سرمایہ اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب پہلے سے بچایا ہوا روپیہ موجود ہو۔ اسکے علاوہ بچت زر نقد کی صورت میں ہونا بھی ضروری نہیں ہے وہ اجناس یا دوسری صورت میں بھی ہوسکتی ہے جو شخص جنگل سے بانس لاکر اپنی جھونپڑی تیار کرتا ہے یقیناً ایسا ہی کفایت شعار ہے جیسا کہ وہ شخص جو ڈاک خانہ میں اپنی بچت جمع کرتا ہے تاکہ ایک دن اس سے مکان خرید سکے۔ کم ترقی یافتہ ممالک میں اجناس سامان یا دوسری صورت میں جو بچت ہوتی ہے اس سے سرمایہ بہم پہنچانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ میں جو "گھریلو مالیات اور اقتصادی ترقی" کے عنوان سے شائع کی گئی ہے ان اداراتی تبدیلیوں کے متعلق کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں جن سے بچت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے ایسے تمسک جاری کرنے بہتر ہوں گے جن کی قیمت اور میعاد ہر قسم کی بچت کرنے والوں کے لئے موزوں ہو۔ ایسے اداروں کا کام جو بچت میں مدد ہوتے ہیں ڈاکخانوں کے ذریعہ لیا جاسکتا ہے اور بینکوں کی شاخیں جابجا کھولی جاسکتی ہیں۔ اور بنک کاری نظام کی ازسرنو تنظیم کرکے قصبات کے رہنے والوں کی بچت سے دیہات کے کسانوں کو مالی امداد پہنچائی جاسکتی ہے اور اس طرح دیہات کی بچت کو شہری سرمایہ میں ضم ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ امداد باہمی کا ایک صحت مند نظام قائم کیا جاسکتا ہے جس میں مقامی باشندے حقیقی حصہ لیں اور قابل اعتماد قرض لینے والوں کی تلاش رکھی جائے۔

بنک اور بیمہ کمپنیوں کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنے سرمایہ کا ایک حصہ صنعتی کاموں میں لگا سکیں۔ ان فنڈ کے استعمال سے غالباً بچت میں اضافہ کرنے اور انکو بہتر طریقہ پر استعمال کرنے کی ترغیب ہوگی۔ آخری امر یہ ہے مگر اس کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے کہ حکومت خود افراط زر سے بچے تاکہ روپیہ کی اصل قوت خرید امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کم نہ ہوتی چلی جائے لہذا لوگوں کو زیادہ بچت کرنے کی ترغیب ہو۔ مگر کم ترقی یافتہ ممالک کی آبادی کی اکثریت میں معقول بچت کے فقدان کے پس منظر ایک بنیادی بات یہ ہے کہ ان میں پس انداز کرنے کی عادت تقریباً مفقود ہو۔

ہمارے سماجی اقدار اور رواج بھی اکثر صورتوں میں بچت کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم لوگ اور اسی وقت بچا سکتے ہیں جب شادی اور جہیز میں اسراف سے کام نہ لیں اور زیورات اور زمین وغیرہ کی خریداری میں روپیہ صرف نہ کریں۔ پسماندہ سماجوں کی آب و ہوا (ماحول) روپیہ بچانے کی اہمیت اجاگر نہیں کرتی ہے۔ لوگ اپنے صدیوں پرانے

ہم دروفاع اور سماجی اقتدار پر عمل کرنا کفایت شعارانہ انداز خیال سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پسماندہ ممالک میں مشترکہ خاندان کی ذمہ داریاں بھی مغربی ممالک سے زیادہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ضعیفی کے زمانہ کے لئے روپیہ پس انداز کرنے کی ضرورت بھی مقابلتاً بہت کم محسوس کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے بیمہ کے کاروبار کے مواقع بھی بہت محدود ہوگئے ہیں صنعتی ادارے جن کا غیر تقسیم شدہ منافع ترقی یافتہ ممالک کی بچت کا معتد بہ حصہ ہوتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے پسماندہ ممالک میں معدوم ہیں۔ پسماندہ ممالک میں ٹیکسیں اور کسٹم وغیرہ سے حاصل کیا ہوا تقریباً سارا روپیہ دفاع، تعلیم، امن عامہ اور صحت پر صرف ہو جاتا ہے بمشکل ہی کوئی پسماندہ ملک ایسا ہوگا جس کے پاس کوئی معتد بہ رقم چالو حساب میں بطور بچت موجود ہو۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان ممالک میں خسارہ پورا کرنے کیلئے نہایت جز رسی سے کام لینا پڑتا ہے اور دفاع اور ملکی انتظام کے متعلق اہم اخراجات میں بھی کمی کرنی پڑتی ہے۔ ان پسماندہ ممالک کی قلیل آمدنی بجلی بنانے، بند باندھنے اور بجلی گھر تعمیر کرنے اور اسی قسم کے دیگر مفاد عامہ کے کاموں میں صرف کرنی پڑتی ہے اور بیماروں کی نگہداشت اور بچوں کی تعلیم جیسے ضروری امور پس پشت پڑ جاتے ہیں پسماندہ ممالک میں پس انداز کرنے کی خواہش تو عموماً موجود ہے مگر اس کی اہلیت مفقود۔ یہ امر بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ لوگ بمشکل ہی کچھ پس انداز کرسکتے ہیں ۱۹۵۲ء کے متعلق دنیا کے ممالک کی آمدنی کے نقشے پر پہلی نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے:۔

نمبر شمار	ممالک جن کی آمدنی زیادہ ہے	دنیا کی آمدنی	دنیا کی آبادی	فی کس آمدنی
۱	ریاستہائے متحدہ کناڈا مغربی یورپ	۷۰ فیصدی	۱۸ فیصدی	۹۱۵ ڈالر
۲	ممالک جن کی آمدنی اوسط درجہ پر ہے، ارجنٹائن، ارگادی، مشرقی یورپ کے بعض ملک اور روس۔	۱۸ فیصدی	۱۵ فیصدی	۳۱۰ ڈالر
۳	کم آمدنی کے ممالک، ایشیا، افریقہ وغیرہ	۱۵ فی صدی	۶۷ فیصدی	۵۴ ڈالر

ان اعداد و شمار سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام پسماندہ ممالک افلاس میں ڈوبے ہوئے ہیں یعنی غریب طبقے آبادی کا قلیل حصہ نہیں ہیں جن کی نگہداشت فلاحی ریاست کر سکے جیسا کہ مغربی ممالک میں ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے گریز نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں بچت ان لوگوں پر دباؤ ڈال کر حاصل کی جاتی ہے جو انتہائی غربت کا شکار ہیں ۵ یا ۶ فیصدی بچت جو ترقی یافتہ ممالک خوشی کے ساتھ ہر سال جمع کرتے ہیں شاید پاکستان، ہندوستان اور انڈونیشیا جیسے ملکوں کے باشندوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ثابت ہوگی۔

کسی ملک کی اقتصادی ترقی کے سلسلے میں ایک اور اہم امر لگے ہوئے سرمایہ اور قومی سرمایہ میں اضافہ کا تعلق ہے یعنی ان کا تناسب۔ سرمایہ کی فراہمی اور قومی سرمایہ کا تعلق ایک پیچیدہ تعلق ہے۔ اس کی نوعیت مختلف ملکوں اور مختلف صنعتوں میں مختلف ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نسبت کم ترقی یافتہ ممالک میں بہتر ہونی چاہئے کیونکہ ان ممالک میں

[illegible] شدہ زمین زیادہ ہوتی ہے جہاں تھوڑی محنت سے زیادہ پیداوار ہو سکتی ہے۔ مگر اس حقیقت کا اطلاق عالمگیر پیمانہ پر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ اصول صرف اس حد تک صحیح ہے جہاں تک کیمیاوی کھاد ڈالنے سے پیداوار میں اضافہ کا تعلق ہے۔ مگر محض صنعتی میدان میں یہ نظریہ ہمیشہ صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ صنعتی معاملات میں کام کے طریقے کو پوری طرح واضح نہیں ہیں اور بیش قیمت اور پیچیدہ مشینوں کو گرم آب و ہوا میں زیادہ نقصان پہنچتا ہے اس کے علاوہ کم تربیت یافتہ کام کرنے والے بھی اس نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔

قدرتی طور پر پسماندہ ممالک کو سرمایہ کے تناسب کو بہتر بنانے پر توجہ دینی چاہئیے اور تھوڑا سرمایہ لگا کر بہتر نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ خاص طور پر ایسے زمینوں اور کاموں میں روپیہ لگانا چاہئیے جہاں زیادہ منافع حاصل ہو سکے۔ انکو پیداوار کے موجودہ ذرائع کو بھی بہتر طور پر اور مکمل طور پر کام میں لانا چاہئیے نیز اپنے ذرائع کو احتیاط اور کفایت شعاری کے ساتھ استعمال کرنا چاہئیے۔ اور پیداوار کے زیادہ کفایت شعارانہ طریقوں پر جو اس ملک کی ضروریات کے مطابق ہوں عمل کرنا چاہئیے اور بلاواسطہ یا زر پیہ کے علاوہ دوسرے طریقہ کا سرمایہ

(non-monetary investment)

لگانا چاہئیے سرمایہ لگا کر بہترین نتائج حاصل کرنے کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ انکا مکمل پیشہ ورانہ کاروباری اور انتظامی تربیت دی جائے اور کام کرنے والوں، نگرانی کرنے والوں، مشیروں، منیجروں اور روپیہ لگانے والوں اور منتظموں کی ضرورتی قوت کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔

اس کے علاوہ دوسری [illegible] مثلاً کیمیاوی کھاد وغیرہ (ترقی یافتہ) بیج، کیڑے مارنے والی دوائیں، گوداموں کی گنجائش میں وسعت اور بہتر آلات کی فراہمی سے بھی قابل قدر زراعتی پیداوار میں اتنا زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے جتنا بنجر زمینوں کو قابل برداشت بنانے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال لاطینی امریکہ کے برخلاف ہندوستان اور پاکستان جیسے پسماندہ ملکوں میں جہاں آبادی بہت گنجان ہے قابل کاشت بنانے کے لئے بنجر زمین بہت زیادہ نہیں ہے موجودہ ذرائع کو زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ہی پیداوار کی نسبت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض پسماندہ ممالک میں پھلوں کو محفوظ کرنے ڈبوں میں بند کرنے اور "process" کی صنعتوں کو فروغ دے کر حصول زر میں نمایاں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

سرمایہ کے تناسب میں اضافہ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ پیداوار کے کفایت شعارانہ طریقے استعمال کئے جائیں ہم کو ایسے صنعتی ڈھنگ کی ضرورت ہے جو سائنٹیفک علوم کی جدید معلومات پر مبنی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ہماری ضروریات سے مطابقت رکھتا ہو۔ ایک ایسے صنعتی ڈھنگ کو عمل میں لانا ضروری ہے کہ جس میں سستی انسانی محنت کا استعمال بھی کیا جا سکے نہ کہ صرف بیش قیمت مشینوں کا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹے پیمانہ پر گھریلو صنعتوں کی ترقی ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ پسماندہ ملک کی فی کس قومی آمدنی کا تعین کرنے میں آبادی کے اضافے کی شرح کا بھی خاص دخل ہے۔ [illegible] بہبودی کے لئے بہترین کوششیں بیکار ثابت ہوں گی اگر [illegible] میں اضافہ کی شرح بہت زیادہ ہو جائے۔ اس اضافہ [illegible]

ہیں کہ معیارِ زندگی بلند نہ ہو سکے گا یا دوسرے لفظوں میں فی کس قومی آمدنی میں اضافہ نہ ہو سکے گا۔ ایشیا کے ممالک میں اضافہ کی شرح ایک فی صدی سے ۱½ فی صدی تک ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہاں کا معیارِ زندگی برقرار رکھنے پر ہی قومی آمدنی کا ۳ فی صدی سے ۵ فی صدی حصہ خرچ کرنا پڑے گا۔ اور معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے نہایت قلیل رقم باقی رہے گی۔ ان ملکوں میں ایسے اشخاص کی تعداد بہت زیادہ ہے جو یا تو بے روزگار ہیں یا جن کے روزی کمانے کے وسائل ناکافی ہیں۔ اگر آبادی میں اضافہ کی شرح حتی الامکان کم رہے تو وہاں ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔

ترقی اس پیمانہ پر ہونی چاہیئے کہ آبادی کے اضافہ کا تحفظ کر سکے اور فی کس آمدنی کی سطح کو مستقل طور پر اونچا رکھ سکے۔ قوم کی بچائی ہوئی دولت کا تناسب آبادی کے اضافہ سے زیادہ ہونا چاہیئے۔

دنیا کے پسماندہ رقبوں میں جس قدر روپیہ لگانے کی ضرورت ہے اس کے متعدد اندازے لگائے گئے ہیں۔ پسماندہ ملکوں میں اقتصادی بہبودی کے منصوبوں کے متعلق اقوامِ متحدہ کی رپورٹ میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان ممالک میں قومی آمدنی کو ۲.۵ فی صدی سالانہ بڑھانے کے لئے ۱۹ ارب روپیہ لگانے کی ضرورت ہوگی۔ یہ اندازہ آبادی میں ایک فیصدی اضافہ کے مدنظر بہت معتدل ہے۔

یہ سرمایہ اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب یہ ممالک اپنی قومی آمدنی کا ۲۰ فی صدی حصہ پس انداز کر سکیں۔ پسماندہ ملک کی آبادی صرف جان و جسم کا تعلق قائم رکھنے کی سطح پر زندگی بسر کرتی ہے اور یہ مشکل فرض کیا جا سکتا ہے کہ ان ممالک میں بچت کی تنظیم اور طریقوں کو بہتر بنانے کے باوجود یہ ممالک اتنی کثیر رقم پس انداز کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں سے پس انداز کرنے کی اُمید بھی مشکل ہی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہاں نفع آور کاموں میں سرمایہ لگانے کے مواقع کا فقدان ہے۔ مہمان نوازی اور سخاوت کے مقابلہ میں کفایت شعاری کو انسانی خوبیوں میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ برا خیال کیا جاتا ہے جو صرف بقالوں کے لئے زیبا ہے۔ تمام اور سماجی اقدار تمام تر بجود کفایت شعاری کے برعکس اقوامِ متحدہ کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ پسماندہ ممالک سے ۱۰ ارب کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ ۵ ارب کی بچت کی جا سکتی ہے مگر ڈاکٹر ڈی وریز نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام رقبوں کے لئے ۱۳ ارب ۸۰ کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔

اگر پسماندہ ممالک صحت مند مالیاتی پالیسی پر عمل کرنے کی سچے دل سے کوشش کریں تو بھی جمود، مفلسی اور آبادی کے اضافہ کے سبب بچت کا صرف ہو جانا جیسی برائیوں سے نجات نہیں حاصل کر سکتے۔ ان کے ذرائع آمدنی بہت کم ہیں اور ان کے لیے بیرونی امداد لینا بالخصوص ابتدائی مراحل میں ناگزیر ہے تاکہ فی کس آمدنی کے اضافہ کو قائم رکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس امر کی کوشش بھی کرنا ہوگی کہ آمدنی کا جس قدر زیادہ حصہ ممکن ہو سرمایہ کا ذخیرہ کرنے کے کام میں لایا جائے تاکہ اقتصادی ترقی کا کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ لگے ہوئے سرمایہ کی معتدبہ فیصدی ان ممالک سے حاصل کرنی پڑے گی جہاں زائد سرمایہ موجود ہے یعنی جہاں بچت ضروریات کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ مثلاً یہ سرمایہ ممالک متحدہ سے مل سکے گا اگر ہندوستان، پاکستان اور [illegible]

ممالک کو مثلاً تیسرا سرمایہ کا کچھ حصہ دولت مشترکہ کے ترقی یافتہ ممالک
مثلاً برطانیہ، کناڈا اور آسٹریلیا سے بھی حاصل ہو سکتا ہے پسماندہ
ملکوں کے لئے بیرونی امداد یا تو پرائیویٹ سرمایہ کی صورت میں
ہوگی یا حکومتوں کے درمیان بیرونی قرضہ کی صورت میں یا
بین الاقوامی اداروں کی امداد کی شکل میں کم آمدنی والے
ممالک کی اقتصادی فلاح کے لئے غیر ملکی پرائیویٹ تجارتی
سرمایہ ملنے کی امید نہیں کی جا سکتی کیونکہ سرمایہ لگانے کیلئے کوئی
محرک موجود نہیں ہے۔ امریکی سرمایہ لگانے والے اس قیمت
ہی بیرونی ممالک میں مزید خطرات مول لے سکتے ہیں جبکہ انکو
کچھ زیادہ آمدنی ہو مثلاً جو منافع انکو اپنے ملک میں ملتا ہے اس سے
۴ فیصدی زیادہ منافع ملے۔ سمندر پار سرمایہ لگانے والے
اداروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اپنے سرمایہ پر ۱۰ فیصدی
سے ۱۲ فیصدی تک منافع دے سکے۔ غیر ملکی پرائیویٹ سرمایہ
پسماندہ ملکوں میں صرف ان مخصوص تجارتی کاموں میں لگایا
جاتا ہے جس میں شرح مذکورہ کے مطابق منافع ہو سکے۔ یہ اندازہ
لگایا گیا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں ریاستہائے متحدہ کے براہ راست
سرمایہ کا ۵۰ فیصدی ایسے صنعتی کاموں میں لگا ہوا تھا جنہیں
مقابلتاً زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔

اس لئے پسماندہ ممالک کو آخرکار مختلف حکومتوں اور
بین الاقوامی اداروں سے غیر ملکی قرضہ لینا ضروری ہو گیا ہے یہ
بیرونی امداد ترقی کا آغاز کرنے کیلئے ناگزیر ہے۔ سرکاری حصے مثلاً
قرضے ریاستہائے متحدہ کے ایکسپورٹ امپورٹ بنک اور
... ہو یا ورلڈ بنک کے ذریعے جیسے بین الاقوامی
... پرائیویٹ کاروباری قرضوں کی نسبت کہیں زیادہ
... یہ قرض فوری منافع حاصل کرنے کی غرض سے
نہیں دیئے جاتے ہیں بلکہ انکو ایک متوازن اور مربوط اقتصادی
پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔
اگر یہ قرضے معقول رقم کی صورت میں مل سکیں تو پسماندہ ممالک
میں ترقی کے کاموں کا آغاز کرنے میں خاص مدد مل سکتی ہے
اور جوں جوں ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائے گی امدادی رقم میں
آہستہ آہستہ کمی کرنا ممکن ہو جائیگا۔

اُمید کی جاتی ہے کہ مختلف ذرائع یعنی ملکی سرمایہ غیر ملکی
پرائیویٹ سرمایہ، امریکی حکومت اور ورلڈ بنک کے قرضوں سے
پسماندہ ممالک کو ایک خطیر رقم مل سکے گی جو بڑھتی ہوئی آبادی
کی ضروریات بھی پوری کر سکے گی اور کچھ بچ بھی رہیگی۔ غیر ملکی
سرمایہ سے معقول رقمیں حاصل کر لینے کے باوجود بھی عوامی روپیہ
کو مقابلتاً مفید تر کاموں میں لگانے کے لئے محفوظ رکھنے اور
خرچ کرنے کے ایسے منصوبے جن سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل
ہو اور سماجی مقصد پورا ہو انتخاب کرنیکا مسئلہ محض تدریسی مشق بنکر
رہ جائیگا۔ اگر پروگرام مناسب طور پر منضبط نہ کئے جائینگے تو لوگ
اس میں بطیب خاطر اور عملی طور پر حصہ نہ لینگے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی
نہیں ہے کہ اقتصادی ترقی صرف موجودہ مقامی اداروں کے
ذریعہ عمل میں لائی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کو کسی
نئے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور موجودہ رجحانوں میں مکمل انقلاب
پیدا کیا جائے۔ کیونکہ سرمایہ ذخیرہ کرنے اور نتیجتاً مختلف شعبوں
صنعت، زراعت، تعلیم وغیرہ میں ترقی کرنے کیلئے اجتماعی
اقدامات کی ضرورت ہے اسلئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بجائے
روپیہ لگانے والوں کی بجائے حکومتیں تحریک کو آگے
بڑھائیں کم از کم ابتدائی منازل میں تو یہ بہت ہی ضروری ہے
بعض صورتوں میں نئے پبلک اداروں کو جو مرکزی ...

اور جیسے کہ مقامی طور پر اعتماد حاصل ہو ترقی کی اسکیمیں چلانے کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔ دوسری صورتوں میں امدادِ باہمی کے اداروں کی ہمت افزائی کی جا سکتی ہے اور موجودہ ناکارہ اداروں سے کوتاہی کرانے کے لئے ان سے مدد لی جا سکتی ہے تاکہ شہریوں سے اپیل کرنے کے لئے نئے دروازے کھل جائیں۔

اس امر پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے کہ عوام کی صحت، قوت اور مرضی میں سرمایہ لگانا اقتصادی فلاح کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مشینوں اور سامان میں روپیہ لگانا۔

اگر مقامی بچت اور غیر ملکی سرمایہ کو موثر بنانا ہے تو دوسری اہم بات یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کی حکومتیں بجلی گھروں، رسل و رسائل کے ذریعوں اور دوسرے مفادِ عامہ کے کاموں کو اولیت ترجیح دیں۔ ابتدا میں اس کو بروئے کار لانے کے لئے ایک خطیر سرکاری سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ امر تسکین بخش ہے کہ پسماندہ ممالک کو اس بنیادی ضرورت کا بخوبی احساس ہے۔ مثلاً حکومتِ پاکستان بجلی کی قوت کی ضرورت پیدا کرنے کو بہت اہم خیال کرتی ہے۔

پسماندہ ممالک برقی قوت، ذرائع رسل و رسائل وغیرہ کی فوری ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیمی معیار کو معقول سطح پر لانے کے لئے بھی پورا پورا زور لگانا ضروری ہے۔ ڈاکٹر [illegible] نے [illegible] میں [illegible] اور متعلقہ منصوبوں کے ایشیائی مرکز کے روبرو تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ ملکی ذرائع اور بلاواسطہ منافع آور کاموں کے لئے بیرونی سرمایہ کو کھپا کر لینے کے بعد بھی سماجی کاموں کے لئے بالخصوص تعلیم کے لئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ میں ان کی ذاتی رائے سے متفق ہوں کہ جن ممالک کی قومی آمدنی زیادہ ہے ان کا فرض ہے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس بہبود کام کی تکمیل میں لگائیں کیونکہ پسماندہ ممالک کے باشندوں کو کارخانوں میں کام کرنا ہوگا۔ پیچیدہ مشینوں پر کام کرنا پڑے گا۔ ٹریکٹر چلانے ہوں گے امونیم سلفیٹ یا کیمیاوی کھادوں کا استعمال کرنا ہوگا اس لئے ان کو کافی حد تک تعلیم بھی دینی ہوگی۔ تعلیم کی بنیاد نظری یا روحانی ہونے کی بجائے جدید ضروریات کے مطابق بدلنی ہوگی۔ اس تعلیم کا مقصد یہ ہوگا کہ توہمات کا پورا سلسلہ تبدیل ہو جائے اور علم بالکل جدید صورت میں حاصل کیا جائے۔ دیہاتی رقبوں میں تعلیم کے مسائل شہری رقبوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کسان اپنے صدیوں پرانے عقیدوں کو خیرباد کہہ کر علم نباتات، علم حیوانات اور بازاری قیمتوں کے تعامل کا علم حاصل کریں۔ کیمیائی کھادوں کا استعمال افراط اور تفریط کے درمیان ایک توازن قائم کرتا ہے۔ ترقی یافتہ نسل کے مویشیوں کے لئے زیادہ چارہ درکار ہوگا بہ نسبت چارہ کی اس مقدار کے جو کسان اس وقت دیتا ہے۔ روئی کی نئی پود کے لئے اس کی زمین ناموافق ثابت ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے آبادی کے تمام طبقوں کی تعلیم ضروری ہے نہ کہ چند منتخب جماعتوں کی۔ اگر عوام کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو ان کو اس امر کا احساس ہوگا کہ ان کے مستقبل کو بہتر بنانے اور ملک کو خوشحال دیکھنے کے لئے موجودہ وقت میں ایثار و قربانی سے کام لینا کتنا ضروری ہے۔ میرا پختہ نظریہ ہے کہ معقول اور وسیع تعلیمی نظام کے بغیر کوئی موثر اقتصادی ترقی نہیں کر سکتا۔

دیہاتی رقبوں میں تعلیم اسی وقت مفید اور موثر ہو سکتی ہے

جاگیرداروں کا کاشتکاروں کو زمین دینے کے طریقہ میں اصلاح کی جائے تاکہ ہر شخص کو حسب مرضی کام کرنے اور سرمایہ لگانے کا موقع بہم پہنچ سکے۔ پسماندہ ملکوں کی دیہاتی معاشرت میں جو خرابیاں ہیں ان میں سے چند بہت ہی اہم ہیں مثلاً زمینداروں کا دوسروں کو زمین دے دینا، عارضی طور پر زمین لگان پر دینا، روپیہ یا اجناس کی شکل میں بہت زیادہ لگان وصول کرنا اور ان سب کے علاوہ زمین کا چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی میں تقسیم ہونا۔ اگر قطعات اراضی ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہیں اور ایک خاص حد سے کم ہو جائیں تو زراعت کے جدید طریقے اختیار نہیں کیے جا سکتے۔ اراضی پر آبادی کا دباؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے قطعات اراضی کو از سر نو منظم کرنے اور زراعت کے جدید طریقے استعمال کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہو کہ قانون اراضی میں وسیع اصلاحات کی جائیں تاکہ کاشتکار خود کو محفوظ سمجھنے لگیں یا ایسے کسانوں کی جماعت پیدا ہو جو زمین پر مالکانہ قبضہ رکھتے ہوں مگر منافع اور ترقی کے لئے روپیہ حاصل کرنے کے علاوہ اور کسی مقصد کے لئے زمین کو رہن نہ کر سکیں۔

اراضی آئندہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کیلئے بھی سخت اقدام کرنے ہوں گے اگر تمام پسماندہ ممالک میں اراضی ملکیت کا وسیع نظام قایم کر دیا جائے قطعات اراضی کا رقبہ آمدنی کے لحاظ سے مناسب ہو اور زمین پر قرضہ نہ ہو تو لوگوں میں قیمت اور اعتماد کی وہ لہر پیدا ہو سکتی ہے جو پیشتر معدوم تھی۔ غالباً یہ سب سے بڑا اقدام ہوگا جو ہمارے امکان میں ہے کیونکہ پیداوار میں اضافہ ہو، معیار زندگی بلند ہو اور سماجی استقلال روبہ ترقی ہو۔

اس مختصر مقالہ کی حدود کے اندر رہ کر یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تمام اقدامات کا حصر کیا جائے جو اقتصادی بہبودی کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ اور پھر ان کو دنیا کی وسیع تر اقتصادیات سے ربط دیا جائے۔ دنیا کی ترقی کا تصور ہمارے زمانہ کے اہم تعمیری اور امید افزا تصورات میں سے ہے ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پسماندہ ممالک کے باشندے ترقی کرنے کی لگن پیدا کریں۔ کسی ملک کی اقتصادی ترقی کا انحصار اس کے اپنے ذرائع اور قومی کردار پر ہے نہ کہ باہر سے لائے ہوئے تصورات پر۔ ایسے طریقے اور ذرائع تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر طبقہ کے افراد میں کام کرنے اور نئی نئی باتیں نکالنے کا جوش پیدا ہو۔ پسماندہ ممالک کے رہنماؤں اور باشندوں کو سیاسی استقلال حاصل کرنے کے لئے بھی اقدام کرنا چاہیئے۔ اس سے غیر ملکوں کے سرمایہ لگانے والوں میں اعتماد پیدا ہوگا اور ملک میں بھی مدریجاً مستقل اقتصادی ترقی ظہور میں آئے گی۔

بالآخر اقتصادی ترقی کے لئے عوام کو ہی کام کرنا ہوگا اور تاوقتیکہ ان کو کام کرنے پر راغب کرنے میں کامیابی نہ ہوگی ملک کو منزل مقصود تک پہنچانے میں نہ منصوبہ بندی کام آئے گی اور نہ غیر ملکی سرمایہ!

نقد و نظر

ماہنامہ دانش: مرتب سید مقصود حسین عابدی
ناشر ادارہ دانش ۷۷، نیپیئر بندر روڈ، کراچی۔ صفحات ۶۴۔ چندہ سالانہ دس روپے۔

ماہنامہ دانش کا پہلا شمارہ پیش نظر ہے۔ رسالہ کے اجرا کا مقصد "اس مجلہ کے ذریعہ علمی، ادبی اور ثقافتی مسائل پر ہمہ گیری کے ساتھ تحقیقی مضامین پیش کرنا" اور اسلام و اسلامیات کو "پڑھے لکھے روشن خیال طبقہ کے سامنے اپنے اصلی خط و خال میں پیش کرنا ہے تاکہ موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کی تشنگی تحقیق بھی آسودہ ہو سکے اور پرانے خیال کے بزرگوں کے لئے تسکین و اطمینان کا سامان مہیا ہو جائے"۔ ان مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے رسالہ میں مذہب اخلاق، تاریخ اور ادب کے متعلق جو مضامین درج کیے گئے ہیں خاصے بلند معیار کے حامل ہیں۔ "تحقیقی تشنگی" کو کافی آسودگی بخشتے ہیں، اور معلوماتی ہیں۔ "نئے شہر کے نئے اخلاقی اقدار" کے زیر عنوان نظیر حیدر کا مضمون اہلیانِ پاکستان کے لئے لمحۂ فکریہ مہیا کرتا ہے۔

رسالہ کے مطالعہ کے بعد یہ تاثر ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر بعض مضامین کی زبان دانشؔ آسان تر اور شگفتہ تر ہوتی تو رسالہ کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا اور اس سے طالب علموں کا وہ وسیع حلقہ بھی استفادہ کر سکتا جو بہ لحاظ تعداد

از حکیم ریحان الزماں اکبر آبادی

علمی و مذہبی مضامین کو خالص علمی انداز بیان میں سمجھنے سے قاصر ہے۔

تمام رسالہ مضامین نثر پر مشتمل ہے۔ اخلاقی، مذہبی اور ادبی نظمیں بھی تہذیبی اقدار کو فروغ دے سکتی ہیں اور دلچسپی میں اضافہ کر سکتی ہیں۔

تذکرۃ الواقعات جوہر آفتابچی (اردو)

شہنشاہ ہمایوں کے مشہور سوانح نگار جوہر آفتابچی کی فارسی کتاب ہندوستان کی تاریخوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ تاریخ ہند پر جتنے مؤلف گزرے ہیں، ہمایوں پر قلم اٹھاتے وقت کم و بیش سبھی نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے اس اعتبار سے اس کتاب کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے ہنوز اصل کتاب کہیں شائع نہیں ہوئی ہے۔

جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اس کتاب کی اہمیت کو محسوس فرما کر اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مترجم نے متعدد قلمی نسخے بڑی کوشش سے مہیا کیے اور ان سے مقابلہ کرنے کے بعد اس کا ترجمہ اردو میں اس شائستگی سے کیا ہے کہ ترجمہ متن سے زیادہ کامیاب بن گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کا لکھا ہوا ایک عالمانہ مقدمہ ہے۔ پھر جا بجا پر از معلومات نوٹ دیے گئے

اختلافی مسائل کے علاوہ اہم واقعات کی ضروری تشریح کی گئی اور اس طرح جہاں کہیں اصل کتاب میں کچھ تشنگی رہ گئی تھی رفع کر دی گئی ہے۔ آخر میں اشخاص و مقامات سے متعلق ایک مکمل اشاریہ بھی شامل کر دیا گیا ہے تاکہ کتاب کے مطالعہ میں کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ غرض ان خوبیوں کے اعتبار سے یہ کتاب تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں، ریسرچ اسکالروں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی اچھے کاغذ اور اچھے ٹائپ پر طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی سے بقیمت مجلد للعہ مل سکتی ہے۔

تذکرہ صدیق رض: - مؤلفہ پروفیسر فیروز الدین روحی۔ شائع کردہ ادارہ تبلیغ القرآن۔ گولی مار۔ کراچی صفحات ۱۰۴، برائے تقسیم مفت

پروفیسر فیروز الدین صاحب روحی نے خلیفۂ اول حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی بڑی قابلیت سے عام فہم زبان میں ترتیب دیکر ادارۂ تبلیغ القرآن سے شائع کئے ہیں۔ فاضل مؤلف نے حالات و سوانح صدیقی کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے تمام واقعات صحت و استناد کے ساتھ درج کئے گئے ہیں خاص بات یہ ہے کہ طرزِ تحریر ایسا واضح، مشرح اور مدلل ہے کہ بعض بے بنیاد اعتراضات خود ہی رفع ہو جاتے ہیں کتاب نہایت سلیس زبان میں لکھی گئی ہے تاکہ معمولی پڑھا لکھا شخص بھی مستفید ہو سکے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کا تبلیغی لٹریچر مسلمانوں میں کافی تعداد میں پھیلایا جائے خدا کرے کہ مؤلف کی یہ آرزو پوری ہو کہ وہ بقیہ تینوں خلفائے کرام رض کے حالاتِ زندگی بھی ترتیب دے کر شائع کر سکے۔

القرآن کا سیرت نمبر: - ماہنامہ القرآن (گولیمار) کراچی۔ ارکان ادارہ تحریر مظہر صدیقی، خلیل احمد اختر سالانہ چندہ للعہ فی پرچہ ۴ر

رسالہ "القرآن" ادارۂ تبلیغ القرآن کا آرگن ہے جس کے سرپرست پروفیسر فیروز الدین روحی ہیں۔ رسالہ ہذا نے اپنی زندگی کے تین سال پورے کر لئے ہیں اور یہ ایک مذہبی ماہنامہ کی کامیابی کی دلیل ہے۔ القرآن کا سیرت نمبر ہمارے پیش نظر ہے سرورق نہایت دلکش اور دیدہ زیب ہے۔ یہ خاص نمبر ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے جو اپنے دامن میں نثر و نظم کے گرانقدر مضامین سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ مضامین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مفتی محمد شفیع، پروفیسر روحی، رشید اللہ خاں اور شاہد حسین رزاقی کے مضامین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نظموں کا انتخاب مدیرانہ تجربہ کی عکاسی کر رہا ہے آخر کیوں نہ ہو حضرت سیماب اکبرآبادی کے لائق فرزند ہیں۔

رسالہ کے آخر میں ادارہ القرآن کے تعارف کے عنوان سے آٹھ صفحات کا ایک ضمیمہ شامل ہے، جس میں ادارہ کے حالات، ادارہ سے شائع شدہ لٹریچر کا مفصل ذکر اور آئندہ کا اشاعتی پروگرام درج ہے۔ پروفیسر روحی، مظہر صدیقی اور احمد اختر وغیرہ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ آخر الذکر رسالہ ہذا کے ادارہ تحریر میں شروع ہی سے شامل ہیں۔ مگر آپ کی شخصیت تعارف کی محتاج ہے۔ رسالہ کی دو تین سالہ زندگی میں خلیل اختر صاحب کی نثر و نظم کے دیکھنے کا

مشرف حاصل نہ ہو۔ ادارہ القرآن کا یہ سیرت نمبر یقیناً ادبی اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

روہیلکھنڈ اخبار بریلی:- روہیلکھنڈ اخبار ہفتہ وار (ٹرمی ناتھ روڈ نیکسو پور) بریلی۔ ایڈیٹر کانت وتی سنہا۔ سالانہ چندہ للعہ فی پرچہ ا؎ر

بریلی (روہیلکھنڈ) سے یہ ہفتہ وار اخبار ۱۶ راگست ۱۹۴۳ء سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اسکو ہند و پاکستان کے مشہور ادیبوں اور شعراء کا تعاون حاصل ہے۔ مضامین نہایت قابل قدر اور محققانہ ہوتے ہیں، نظم کا حصہ بھی نہایت مناسب اور موزوں ہوتا ہے نقد و نظر کالم خاصہ معیاری ہوتا ہے جس کے لئے جناب تیج بہادر سنہا صاحب ایم۔ اے خاص طور سے مستحق صد ستائش ہیں۔ جناب جگر بریلوی کی سرپرستی اور انتساب اخبار کی کامیابی کا ایک خاص جزو ہے۔ آج جبکہ بھارت میں اردو کے خلاف ایک محاذ قائم ہے۔ روہیلکھنڈ اخبار کی کوششیں اور مساعی جمیلہ تاریخ صحافت اور اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ سب سے بڑی یہ بات ہے کہ اخبار پارٹی بازی سے الگ رہ کر زمانہ حاضرہ کے مسموم اور مضر اثرات سے کلیتاً پاک ہے نہایت عزم و استقلال، خلوص اور قومی جذبہ کیساتھ ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا داعی اور ان کی متحدہ روایات اور اقدار کا علمبردار ہے۔ اسی لئے ہند و پاکستان میں یکساں طور سے مقبول ہے۔ آخر میں ہم روہیلکھنڈ اخبار کے خاص نمبر (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر) پر خصوصی طور سے مبارکباد پیش کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے آج کی دنیا میں ملک و قوم کے بہت سے جانباز مجاہدوں کے کارنامے روشن ہو گئے اور تاریخ کی بعض گمشدہ کڑیوں کی نشاندہی ہوئی۔ آزادی نمبر میں مولوی محمد سلیمان بدایونی، مفتی انتظام اللہ شہابی، سید مصطفیٰ علی بریلوی، تیج بہادر سنہا اور محمد ایوب قادری کے گرانقدر مقالات بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ اس نمبر سے روہیلکھنڈ میں روہیلکھنڈ اخبار کی دھوم مچ گئی۔ ہم اخبار مذکور کی کامیابی کے لئے ہر وقت دعا کرتے ہیں۔

نصیر ادب:- مؤلفہ نصیر زیدی الواسطی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی شائع کردہ اعلیٰ کتب خانہ ناظم آباد۔ کراچی صفحات ۹۶۔ قیمت عہ ر

زیر نظر کتاب زبان اردو کی ایک مختصر تاریخ ہے جس کا خاص مقصد طلباء کو اردو نظم و نثر کی عہد بعہد ترقی سے روشناس کرانا ہے۔ شعراء و نثار کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام اور طرز ادا کی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ میر حسن اور نسیم، میر انیس و میر دبیر، میر و انشاء، ناسخ و آتش کے کلام کی خصوصیات کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں پیش لفظ کے علاوہ ایک باب "آغاز زبان کی ماہیت" کے عنوان سے بھی شامل ہے جس میں آغاز زبان کی مختصر تاریخ، اسکی منازل ارتقاء، اصناف سخن، صنائع بدائع، معائب و محاسن سخن وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ جس مقصد کے تحت کتاب لکھی گئی ہے اسکی اہمیت ظاہر ہے اور یہ کتاب اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلباء کی دلچسپی میں مزید اضافہ کرتا ہے بلکہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے حضرات کو بھی مفید معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

بزم کانفرنس

مسٹر مشتاق احمد خاں
سابق ایجنٹ جنرل حیدرآباد
از لاہور

العلم کو جو آپ کی توجہ سے مجھے باقاعدہ پہونچتا رہتا ہے۔ میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جو علمی خدمت آپ انجام دے رہے ہیں وہ لائق صد تحسین ہے۔ سابقہ پرچہ میں حضرت محمور اکبرآبادی کا مضمون بعنوان رحلت پاکستان ایک انقلابی جائزہ نظر سے گزرا۔ اس کو پڑھ کر میرے قلب پر بہت اثر ہوا۔ بقول آپ کے جس خلوص باور دردمندی کا یہ آئینہ دار ہے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے حلقہ اثر میں اخلاقی اقدار کو سمجھنے اور پھیلانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں نے حال میں اپنے ادارہ میں ایک دارالمطالعہ قائم کیا ہے جس میں علاوہ محکمہ سے متعلقہ مضامین پڑھے جانے کے اخلاقیات اور نظم کے متعلق بھی توجہ دلائی جاتی ہے میں چاہتا ہوں کہ محمور صاحب کا یہ مضمون اس میں پڑھا جائے۔ اور اس کے بعد زیادہ اشاعت کے لئے پنجاب ٹرانسپورٹ میگزین میں وہ شائع ہو۔ کیا مجھے آپ حضرت محمور صاحب سے اس کی اجازت دلادینگے۔

کبھی لاہور تشریف لانا ہو تو مجھے نہ بھولئے۔ مجھے افسوس ہے کہ کراچی کے قیام کے دوران میں آپ کی صحبت کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔

(۲) آپ کی توجہ کا بہت مشکور ہوں۔ مجھے خود افسوس ہے۔ کہ کراچی کے قیام کے دوران میں آپ سے ملاقات کی مسرت اس حد تک حاصل نہ ہو سکی جس کی کہ مجھے خواہش تھی۔ اس دور میں آپ جیسے مخلص قومی اور علمی خدمت کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ آپ کی مستقل مزاجی اور دھن قابل صد تحسین ہے میرے دل میں ہمیشہ آپ کی ان مخلصانہ کوششوں کی بہت قدر رہی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں جب علم دوست بزرگ عنقا ہیں، اور علم دوستی اور علمی خدمت کا کوئی قدردان نہیں۔ آپ ہی کی ہمت ہے کہ اس کام کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ خدا آپ کی ہمت اور مستقل مزاجی کا اور ترقی دے۔ آپ ہی جیسے علم دوست بزرگوں کو دیکھ کر اپنی قوم کے مستقبل کے متعلق مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن نظر آجاتی ہے۔

میں مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے محمور صاحب سے ان کے مضمون کی اشاعت کے متعلق اجازت دلادی۔ شکریہ۔

مولانا عبدالمجید سالک لاہور

(۱) سرگزشت کا دوسرا حصہ زیر غور ہے لیکن ابھی لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ انشاء اللہ کسی وقت کوشش کروں گا۔ سرگزشت کے بعد یہاں کی "بزم اقبال" کی فرمائش پر "ذکر اقبال" کے نام سے ڈاکٹر صاحب کی سوانح عمری لکھ ڈالی جو محض سوانح عمری ہے۔ شعر و فلسفہ پر کچھ نہیں لکھا اس لئے کہ اس پر بہت لوگ لکھ چکے ہیں۔ اور اب خلیفہ عبدالحکیم نے "فکر اقبال" کے نام سے ایک مبسوط مسودہ تیار کر لیا ہے جو غالباً چند ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ سوانح ابھی تک نہیں لکھے گئے تھے اور چونکہ میری اور ڈاکٹر صاحب کی یکجائی کوئی

چھبیس سال کی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو لکھنا مناسب سمجھا۔

اتحاد پارٹی ہو یا سکندر حیات یا مسلم لیگ، سیاسی کشمکش

میں شخص یا دل کا شکار ہو جائے یا جماعتی مردود قرار دے دی جائے

وہ لازماً بری نہیں ہوتی۔ اور جو فرد یا گروہ عروج حاصل کرے وہ لازماً

اچھا نہیں ہوتا۔ جب سیاست کا بخار اتر جائے تو

ہر چیز پر اصول پر فرد اور ہر جماعت کا جائزہ لینا چاہیئے۔ کسی فرد

یا گروہ کے خلاف مطلق نفرت اپنے دل میں بٹھا لینا کم از کم پڑھے

لکھوں کا شیوہ نہ ہونا چاہیئے۔

سرگزشت کوئی تاریخ کی کتاب نہیں محض ایک اخبار نویس

کی بکھری ہوئی یادداشتیں ہیں جو ادبی لطف کے ساتھ بیان ہوئی

ہیں۔ آپ جیسے صاحب فضل و کمال کی طرف سے جو تاریخ و تحقیق کا

مرد میدان ہے۔ ایک ہلکی پھلکی کتاب کی تعریف ہونا میرے لئے

باعث ناز ہے۔

میں کوئی ایک سال سے ایک کتاب لکھ رہا ہوں "مسلم ثقافت

ہندوستان میں"۔ اب قریب الختم ہے۔ غالباً چھ ماہ تک چھپ کر تیار

ہو جائے گی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ اس کو شائع کر رہا ہے کوئی سات

آٹھ سو صفحات ضخامت ہوگی۔ وہ اخبار نویسانہ یا انشا پردازانہ چیز نہیں

بلکہ ماخذ تاریخ کے مطالعے سے مرتب ہوئی ہے اور ثقافت کے مختلف

شعبوں میں مسلمانوں نے ہزار سال کے اندر ہندوستان کو جو کچھ دیا

اس کا ذکر ہے۔

مہر صاحب نے سیرت سید احمد شہید خوب لکھی۔ وہ

اس کی تحقیق و ترتیب میں کوئی دس بارہ سال سے مصروف تھے

مولوی ابوالحسن علی ندوی بھی اس کتاب کے بہت معترف ہیں۔

لیکن اس کے باوجود شیخ صاحب پر ایک اور کتاب لکھنے میں

مصروف ہیں۔ دیکھیں وہ سید احمد یات" میں کیا خاص اضافہ کرتے

ہیں۔ وہ نہایت ژرف نگاہ اور متبحر عالم ہیں۔ ضرور کوئی نئی بات

پیدا کریں گے۔

مہر صاحب کی خدمت میں آپ کا سلام شوق عرض کر دیا

گیا وہ بھی سلام عرض کرتے ہیں۔ (بٹالوی)

(۲)

میں گزشتہ دنوں مشیر کیلئے دہلی اور امرت سر چلا گیا تھا

اس لئے تحریر جواب میں تاخیر ہوئی۔ "العلم" موصول ہوا

"بھائی جان" کو بہت شوق سے پڑھا، اور زبیری صاحب کا مضمون

(علامہ اقبال کے سوانح نگار) بھی۔ مخمور اکبرآبادی کا مضمون

افادی حیثیت سے بہت اچھا ہے۔ ان مسائل پر زیادہ تفصیل

سے اور بار بار لکھنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے "بھائی جان" میں

انداز تحریر اختیار کیا ہے وہ بے حد دلنشین ہے۔ اشخاص اور

ان کے کرداروں پر لکھنے کے لئے میں اس انداز کو بہت موثر جانتا

ہوں۔ ایک اور کتاب "یاران کہن"، میں نے صرف چند روز کے

اندر ایک دوست کے تقاضے سے لکھی ہے وہ خدمت میں بھیجتا

ہوں۔ علمی مشاغل سے تھک جانے کے بعد اس کو بھی ایک نظر دیکھئے

تفریح ہوگی۔

میں نے آپ کی کتاب "حافظ رحمت خان" کئی سال قبل

پڑھی تھی اور آپ کے ذوق علمی اور جذبۂ تحقیق سے بہت متاثر ہوا

تھا۔ "مصنف" اور "العلم" کے متعدد پرچے بھی نظر سے گذر چکے ہیں

آپ کا علمی شغف بہت غنیمت ہے۔ آجکل کے زمانے میں ایسے

انہماک کی مثالیں نایاب ہیں۔

آپ نے یہ صحیح لکھا کہ کراچی کی آب و ہوا لکھنے پڑھنے

والوں کے لئے نہایت ناموافق ہے۔ لاہور میں گرمی بھی خوب

پڑتی ہے اور سردی بھی۔ لیکن ایک تر و تازہ ہو کے موسم کا ہوتا ہے

دو بھی ایسے دو اعلیٰ درجے کی لائبریریاں موجود ہیں پنجاب پبلک
اور یونیورسٹی۔ صرف جولائی اگست کے لیئے تکلیف دہ ہوتے ہیں
گرمی زیادہ اور ٹمپریچر کم بسنہ آتا ہے۔ اور خنک نہیں ہوتا یعنی
وہاں کراچی کی کیفیت۔ باقی سال بھر موسم اچھا رہتا ہے۔ اور
میں تو جیسا تندرست اور فعال گرمیوں میں رہتا ہوں اتنا
سردیوں میں بھی نہیں رہتا۔

یقین ہے کہ اب تک آپ سیرت سید احمد شہید ختم کر چکے
ہوں گے اور ذکر اقبال زیر نظر ہوگی میں آخر الذکر کتاب کے متعلق
خصوصاً آپ کی رائے کا منتظر ہوں۔ والسلام"

جناب خیر بھوروی نائب معتمد انجمن ترقی اُردو ہند علیگڑھ

(۱)

العلم جولائی تا ستمبر ۱۹۵۱ء وصول ہوا

اختر میاں جوناگڑھی مرحوم کے خطوط کی اشاعت پر مبارکباد قبول
فرمایئے چند خطوط میرے پاس بھی ہیں تلاش کر کے بھیجدوں گا۔

کانفرنس کی مطبوعات برائے تبصرہ بھجوا دیجئے۔ بھارت
ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنی مجلس عاملہ کا ممبر منتخب کیا ہے مگر کام
لینے والا کوئی نہیں ہے اور کام کرنے کا یہی صحیح وقت ہے۔ ورنہ
تاریخ آنکھیں دکھائے گی اور آنے والی نسل کی زبانوں پر نامناسب
الفاظ ہوں گے۔ کبھی ہندوستان بھی آیئے۔

(۲)

عنایت نامہ مورخہ ۷ فروری وصول ہوا۔ آپ کا خیال
صحیح ہے قاضی صاحب کی وفات حسرت آیات اُردو زبان کا بہت
بڑا خسارہ ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔

حکیم عبدالستار کا قیام تا ہنوز آفتاب منزل کے اس حصے
میں ہے جو شمشاد احمد خاں صاحب کے تصرف میں تھا۔

"قاضی صاحب کی جانشینی کے بارے میں پروفیسر
رشید احمد صدیقی صاحب کے متعلق آپ کا گمان صحیح نہیں ہے
۱۱ جنوری سے عارضی طور پر آل احمد سرور صاحب کام کر رہے ہیں
قدیم سنہ ہجری و عیسوی قدیم انجمن نے شائع کی تھی جس کی
کوئی کاپی اب دفتر میں برائے فروخت موجود نہیں ہے۔ تاج
بک ڈپو انجمن ترقی اُردو جامع مسجد اُردو بازار دہلی کو لکھئے ممکن
ہے ان کے پاس ہو یا کہیں اور سے وہ فراہم کر کے آپ کو
بھیجدیں۔ آپ کا بھیجا ہوا العلم اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء مجھے
نہیں ملا۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ اختر میاں کے خطوط شائع
کر رہے ہیں۔ مرحوم کا ایک خط میرے پاس بھی ہے۔ آپ
لکھیں گے تو اس کی ایک نقل بھیجدوں گا۔

خان بہادر مرزا ابو جعفر صاحب سابق انسپکٹر آف اسکولز کلکتہ پریسیڈنسی

(۱)

معلوم نہیں کہ میں آپ کو یاد بھی ہوں یا نہیں۔ اگر آپ
فراموش کر گئے ہوں تو جائے تعجب نہیں۔ کیونکہ برسوں سے ملاقات
نہیں ہوئی۔ میں ایک دفعہ حضرت آفتاب فضل الحق صاحب کی ملازمت
تقریر لیکر علی گڑھ گیا تھا اور آپ کا مہمان تھا۔

مجھے کراچی پہنچے دو ہفتے ہوئے۔ آج اخبار میں آپکا
نام دیکھا تو ملاقات کو دل چاہا۔ اگر صحیح پتہ معلوم ہو تو کسی دن شرف
ہمنشینی حاصل کروں۔

(۲)

الطاف نامہ کا شکریہ [illegible]
اس وقت تو خوش کن [illegible] کر دی

یہ دیکھ کر مزید مسرت ہوئی کہ آپنے [illegible] قدیم مشاغل علمی،
کی از سر نو بنا ڈالی ہے۔ آپ کے [illegible] کا رد مرزا علی اظہر
صاحب) میرے بھی عنایت فرمایئے [illegible] دیکھنے سے مجھے دلچسپی ہے

کانفرنس کے محسن

جنوری تا مارچ ۱۹۵۶ء

مسرز کراچی کاٹن اینڈ وولن ملز کراچی	Rs 500/
مسرز محمد احمد عبداللہ برادرز "	" 101/
مسرز حبیب بینک لمیٹڈ "	" 100/
جناب سید علی رضا صاحب ایڈوکیٹ کراچی	
مسز رعنا لیاقت علی خان صاحبہ	" 50/
جناب ایم اے جعفری صاحب خیرپور	" 36/-
محترمہ جناب لیڈی بیگم شیروانی صاحبہ کراچی	" 30/-
جناب پرنسپل صاحب بی۔ وی۔ ایس پارسی ہائی اسکول کراچی	" 20/-
جناب محمد حسین صاحب "	" 20/-
مولوی اعجاز حسین خان صاحب کراچی	" 20/-
جناب ہیڈ ماسٹر صاحب انجمن مدارس کراچی	" 18/-
جناب سید ... صاحب کراچی	" 10/-
جناب چودھری ... بشیر احمد صاحب کراچی	" 10/-
جناب غلام ربانی صاحب کراچی	Rs 10/-
" پرنسپل عبدالشکور صاحب اٹاوہ	" 10/-
" مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی کراچی	" 10/-
" عبدالقادر صاحب کراچی	" 10/-
ہز ایکسیلنسی گورنر صاحب بہادر ویسٹ پاکستان لاہور	" 6/-
پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج کراچی	" 6/-
جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ سکنڈری اسکول کوتوالی بلڈنگ کراچی	" 6/-
جناب لائبریرین صاحب گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد	" 6/-
" ہیڈ ماسٹر صاحب ہائی اسکول سکھر	" 6/-
" مولانا سید محمد زکریا صاحب مائل کراچی	" 6/-
" پروفیسر محمد اسد خان صاحب شیروانی حیدرآباد دکن	" 5/-
جناب ایم صدیقی صاحب کراچی	" 5/-
" مولوی عبدالحئی خان صاحب "	" 5/-
" محمد ایوب قادری صاحب "	" 5/-

کانفرنس کے سالانہ اجلاس اور ان کے صدر

اجلاس	صدر	تاریخ و مقام
اجلاس اول	زیر صدارت مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب بہادر سی ایم جی	[illegible]
اجلاس دوم	" " منشی محمد امتیاز علی خاں صاحب وکیل و رئیس کاکوری، ضلع لکھنؤ	[illegible]
اجلاس سوم	" " سردار محمد حیات خاں صاحب سی۔ ایس۔ آئی	[illegible]
اجلاس چہارم	" " " " " " " "	[illegible]
اجلاس پنجم	" " " " " " "	[illegible]
اجلاس ششم	" " نواب محمد اسحاق خاں صاحب سی۔ ایس	[illegible]
اجلاس ہفتم	" " مولوی حشمت اللہ صاحب ایم۔ اے۔ سی۔ ایس	[illegible]
اجلاس ہشتم	" " نواب محسن الدولہ محسن الملک سید مہدی علی خاں صاحب بہادر	[illegible]
اجلاس نہم	" " مسٹر محمد شاہ دین بیرسٹر ایٹ لا، لاہور	[illegible]
اجلاس دہم	" " نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خان بہادر	[illegible]
اجلاس یازدہم	" " نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی	[illegible]
اجلاس دوازدہم	" " نواب فتح علی خاں صاحب قزلباش رئیس لاہور	[illegible]
اجلاس سیزدہم	" " آنریبل جسٹس سید امیر علی صاحب سی، آئی، ای	[illegible]
اجلاس چہاردہم	" " نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی	[illegible]
اجلاس پانزدہم	" " آنریبل جسٹس بادم صاحب جج ہائی کورٹ مدراس	[illegible]
اجلاس شانزدہم	" ہز ہائی نس سر آغا خاں بالقابہ	[illegible]
اجلاس ہفدہم	" " آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی جج ہائی کورٹ بمبئی	[illegible]
اجلاس ہیژدہم	" " مسٹر تھیوڈور ماریسن پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ	[illegible]
اجلاس نوزدہم	" " خان بہادر مشیر الدولہ خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر ریاست پٹیالہ	[illegible]
اجلاس بستم	" " آنریبل جسٹس سید شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ	[illegible]
اجلاس بست و یکم	" " شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی	[illegible]
اجلاس بست و دوم	" " آنریبل نواب سر خواجہ سلیم اللہ بہادر رئیس ڈھاکہ	[illegible]
اجلاس بست و سوم	" " آنریبل سر راجہ علی محمد خاں صاحب بہادر کے سی آئی ای تعلقدار محمود آباد	[illegible]
اجلاس بست و چہارم	" " مسٹر عبداللہ بن یوسف علی ایم اے ایل ایل ایم بیرسٹر ایٹ لا آئی سی ایس ڈپٹی کمشنر سلطان پور	[illegible]
اجلاس بست و پنجم	" " نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی سی۔ آئی۔ ای	[illegible]
اجلاس بست و ششم	" " میجر سید حسن صاحب بلگرامی	[illegible]
اجلاس بست و ہفتم	" " آنریبل جسٹس مسٹر شاہ دین صاحب بیرسٹر ایٹ لا جج ہائی کورٹ پنجاب	[illegible]

اجلاس بست و نہم	زیر صدارت آنریبل جسٹس عبدالرحیم صاحب جج ہائیکورٹ مدراس	۱۹۱۵ء بمقام
اجلاس سی ام ،،	،، آنریبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب سی۔ آئی۔ ای بیرسٹرایٹ لاء لاہور	۱۹۱۶ء ،،
اجلاس سی و یکم ،،	،، مسٹر محمد اکبر نذر علی حیدری (نواب سر حیدر نواز جنگ)	۱۹۱۷ء ،،
اجلاس سی و دوم ،،	،، آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ کے۔ ٹی۔ سی۔ آئی۔ ای	۱۹۱۸ء ،،
اجلاس سی و سوم ،،	،، آنریبل سر مولوی رحیم بخش صاحب پریزیڈنٹ کونسل بہاولپور	۱۹۱۹ء ،،
اجلاس سی و چہارم ،،	،، آنریبل خان بہادر ابراہیم ہارون جعفر صاحب رئیس پونا	۱۹۲۰ء ،،
اجلاس سی و پنجم ،،	،، آنریبل میاں فضل حسین صاحب وزیر تعلیمات پنجاب	۱۹۲۲ء ،،
اجلاس سی و ششم ،،	،، آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی	۱۹۲۳ء ،،
اجلاس سی و ہفتم ،،	،، آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ	۱۹۲۴ء ،،
اجلاس سی و ہشتم ،،	،، نواب سر عبدالقیوم صاحب خان بہادر	۱۹۲۵ء ،،
اجلاس سی و نہم ،،	،، آنریبل سر عبدالرحیم صاحب سابق جج ہائیکورٹ مدراس	۱۹۲۶ء ،،
اجلاس چہلم ،،	،، آنریبل سر شیخ عبدالقادر صاحب	۱۹۲۷ء ،،
اجلاس چہل و یکم ،،	،، آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد	۱۹۲۸ء ،،
اجلاس چہل و دوم ،،	،، ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی	۱۹۳۰ء ،،
اجلاس چہل و سوم ،،	،، سید رضا علی صاحب سی۔ بی۔ ای	۱۹۳۱ء ،،
اجلاس چہل و چہارم ،،	،، لفٹننٹ کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ایم۔اے۔ ایل ایل بی (علیگ) وزیر تعلیمات بہاولپور اسٹیٹ	۱۹۳۲ء ،،
اجلاس چہل و پنجم ،،	،، آنریبل جسٹس سر عبدالقادر صاحب	۱۹۳۴ء ،،
اجلاس چہل و ششم ،،	،، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب	۱۹۳۵ء ،،
اجلاس چہل و ہفتم ،،	،، ہز ہائی نس سر آغا خاں صاحب بالقابہ	۱۹۳۶ء ،،
اجلاس چہل و ہشتم ،،	،، نواب سی عبدالحکیم صاحب	۱۹۳۷ء ،،
اجلاس چہل و نہم ،،	،، مولوی فضل الحق صاحب	۱۹۳۸ء ،،
اجلاس پنجاہم ،،	،، نواب کمال یار جنگ بہادر	۱۹۳۹ء ،،
اجلاس پنجاہ و یکم ،،	،، مولوی فضل الحق صاحب	۱۹۴۰ء ،،
اجلاس پنجاہ و دوم ،،	،، نواب ظہیر یار جنگ بہادر	۱۹۴۳ء ،،
اجلاس پنجاہ و سوم ،،	،، سر عزیز الحق صاحب	۱۹۴۴ء ،،
اجلاس پنجاہ و چہارم ،،	،، شہید ملت نوابزادہ خان لیاقت علی خاں صاحب	۱۹۴۵ء ،،
اجلاس پنجاہ و پنجم ،،	،، مرزا ممتاز حسن صاحب قزلباش وزیراعظم ریاست خیرپور	۱۹۵۲ء ،،
اجلاس پنجاہ و ششم ،،	،، مسٹر فضل الرحمٰن	۱۹۵۵ء ،،
اجلاس پنجاہ و ہفتم ،،	،، پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی	۱۹۵۶ء ،،

سید الطاف علی پبلشر نے ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک میں چھپوا کر
دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس [redacted] سے شائع کیا

العلم

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر: سید الطاف علی بریلوی



آنریبل عبدالستار صاحب

وزیر تعلیم و امور داخلہ ۶ اپریل سنہ ۱۹۵۶ء کو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس بمقام سر سید گرلس کالج کراچی اپنی افتتاحی تقریر ارشاد فرما رہے ہیں

فون نمبر
مکان 37101/69

قیمت سالانہ ۵ر
فی پرچہ ۲ر

سہ ماہی العلم
کراچی

جلد ۵ | اپریل تا ستمبر ۱۹۵۶ء | شمارہ ۲ و ۳

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا تیسرا سالانہ اجلاس
روئداد

(مرتبہ جناب سید الطاف علی بریلوی)

اداریہ

کانفرنس اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آغازِ کار

کانفرنس اپنی گوناگوں سرگرمیوں کے ذریعہ اُن تعلیمی مسائل میں عوام کی دلچسپی کو اُبھار رہی ہے جو ہمیں پاکستان میں درپیش ہیں۔ اس کانفرنس جیسی' عالمانہ جماعت' کے اہم فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تعلیم کے متعلق تعمیری منصوبوں کو زیر عمل لائے۔ ہمارے ملک میں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ سرکاری محکموں اور یونیورسٹیوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ رضاکارانہ غیر سرکاری کوشش بھی شامل ہو خصوصاً علمی تحقیقات اور اشاعتِ کتب کے سلسلہ میں یہ امر بہت

ضروری ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے نہایت موزون ہے کہ اس نے علمی تحقیقات اور اشاعت کتب کے ادارہ کے کام کی توسیع کے لئے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت کانفرنس ایک تعلیمی کتب خانہ اور مطالعہ گاہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور تعلیم کے متعلق قدیم اور جدید کتب کا اردو ترجمہ کرنا چاہتی ہے۔ یقیناً یہ منصوبے بہت کارآمد ہیں اور ان کے ذریعہ ہمارے مدرسین کے مطالعہ کے لئے عمدہ مواد فراہم کرنے کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ ان معیاری تصانیف کا ترجمہ ایسی بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس پر ملک میں تعلیمی تصورات کی تعمیر صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔ مجھے بہت مسرت ہے کہ اس خاص منصوبہ کی قدر دانی کے طور پر مرکزی حکومت نے سالانہ امداد پانچ ہزار سے بڑھا کر پچیس ہزار روپیہ کر دی ہے۔

۱۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس کی رسم افتتاح ادا کرتے ہوئے آنریبل عبدالستار صاحب مرکزی وزیر تعلیم کے مندرجۂ بالا ہمت افزا ارشادات کی بنا پر اور توسیع کار کے پیش نظر یکم مئی ۱۹۵۶ء کو سندھ مدرسہ سے دفتر کانفرنس سعیدہ منزل ناظم آباد بی روڈ متصل سرسید گرلس کالج میں منتقل کیا گیا۔ اور کانفرنس اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے منصوبہ پر عمل درآمد کا آغاز کیا گیا۔

۱۱ جون ۱۹۵۶ء کو سر پرسی نن کی کتاب "ایجوکیشن اِٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلس" کے پبلشر "میسرز ایڈورڈ آرنلڈ اینڈ کو لندن" اور جون ڈیوی کی کتاب "ڈیماکریسی اینڈ ایجوکیشن" کے ناشر میکملن اینڈ کمپنی نیویارک کو اُردو ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے بارے میں خطوط لکھے گئے۔ اور بہ اُمید اجازت سر پرسی نن کی کتاب کا مسٹر انعام عظیم برنی ایم۔ اے ریسرچ اسسٹنٹ اکیڈیمی نے اُردو ترجمہ شروع کر دیا۔ موصوف نے باریک ٹائپ کی اس ۲۸۶ صفحات کی دقیق المطالب کتاب کے چھ ابواب کا اس وقت تک ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ اُردو ترجمہ کو ساتھ کے ساتھ ٹائپ بھی کرایا جا رہا ہے۔ ٹائپ شدہ ترجمہ کو اصل سے مقابلہ کرنے کے بعد نظرثانی کے واسطے دیا جاتا ہے۔

اس کام میں چند دقتوں کا سامنا ہے اول کوئی کتاب ایسی نہیں مل سکی جس میں تعلیمی اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا گیا ہو۔ دوئم کتابوں کے ترجمے کی اجازت یاددہانی کے باوجود ہنوز موصول نہیں ہوئی ہے۔ اور جب تک وہ نہ آجائے بے اطمینانی کے عالم میں کام ہو رہا ہے۔ اسی اجازت کے انتظار میں ڈیوی کی کتاب کا ترجمہ ابھی تک شروع نہ ہو سکا۔ اضافۃً ایک تیسری کتاب "کلچر اینڈ انارکی" از میتھیو آرنلڈ کے ترجمہ کی اجازت کے واسطے ۸ جولائی ۱۹۵۶ء کو ایک خط لکھا گیا جس کا اُمید افزا جواب آیا کہ اصل کتاب کا کاپی رائٹ [illegible]

لہٰذا اس پر پروفیسر ڈوکر ولسن "کے انٹروڈکشن اور نوٹس کا کاپی رائٹ ہے جن کے ترجمہ کرنے یا رائلٹی کی شرائط طے کی جا سکتی ہیں۔

شرائط مذکور معلوم کرنے کے لئے خط وکتابت ہو رہی ہے۔ اور بالفعل سر پرسی نن کی کتاب کے ترجمہ کو بہ انتظار اجازت روک کر "کلچر اینڈ انارکی" اصل کتاب کا ترجمہ شروع کرا دیا گیا ہے۔

جیسا کہ منصوبہ میں وعدہ کیا گیا تھا "العلم" کے معیار کو مزید ترقی دینے کی کوشش جاری ہے اور بہتر سے بہتر مقالات علمی فراہم کئے گئے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ رسالہ کی طباعت بھی نیا ڈکلریشن حاصل کرکے "انجمن ترقی اردو پریس" سے معاملہ کرلیا گیا ہے۔ مطبوعات اکیڈیمی کی کتابت وطباعت دیدہ زیب اور کاغذ انشاء اللہ بہتر سے بہتر ہوگا۔

پروفیسر سعید احمد رفیق ایم۔ اے کی کتاب "اسلامی نظام تعلیم" کی کتابت مکمل ہو چکی ہے اور اس کو پریس میں بغرض طباعت بھیج دیا گیا ہے۔

مولوی محمد امین زبیری صاحب کی مرتبہ کتاب "مسلم خواتین کی تعلیم" نظر ثانی اور صیغہ کرنے کے لیئے جناب مولانا زکریا مائل صاحب کے سپرد کی گئی تھی جو واپس آگئی ہے۔ اور اس کی کتابت ہو رہی ہے۔

نفسیات تعلیم پر ایک اور کتاب مرتبہ مسٹر مجیب اللہ صدیقی ایک ماہر فن کو اظہار رائے کے لئے دی گئی ہے۔ اگر یہ کتاب طلبائے ٹریننگ کالج کے لئے مفید اور کارآمد بتائی گئی تو اس کو دوران سال میں طبع کرا دیا جائے گا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے ادارۂ تصنیف و تالیف کی سالہائے گزشتہ کی سابقہ مطبوعات سے علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب "ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں" اس قابل ہے کہ

بھی اکیڈیمی کی مطبوعات میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال سے اس کا خوبصورت گرد پوشر چھپنے کو دے دیا گیا ہے۔

علم و عمل، اور کتابوں کی کتابت کیلئے کاتب صاحبان کو دفتر اکیڈیمی میں ہی بٹھایا گیا ہے۔ یہ لوگ مسلسل کام کر رہے ہیں۔

اکیڈیمی کے کتب خانہ کو بھی ترقی دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک تجربہ کار (پارٹ ٹائم) لائبریرین مقرر کئے گئے ہیں جنہوں نے اس عرصہ میں لائبریری کی مضمون وار تقسیم اور اس کی ترتیب و تنظیم کا کام انجام دیا ہے۔ لائبریری میں ڈیوای کا کارڈ سسٹم شروع کر دیا جائے گا۔ اس وقت تک لائبریری میں راقم کی مستعار دی ہوئی ذاتی کتابوں اور جناب مفتی انتظام اللہ شہابی کی عطا کردہ کتابوں کو شامل کر کے مجموعی تعداد کتب ۱۱سو سے متجاوز ہو گئی ہے۔ منظور شدہ بجٹ کے مطابق نئی اور پرانی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ جاری ہے۔ توقع ہے کہ اس سال کے اختتام تک انشاء اللہ دو ہزار کتابیں اکیڈیمی لائبریری میں ہو جائیں گی۔

اکیڈیمی کی عمارت کے جنوب رویہ دو کمروں اور برآمدہ میں ایک "میوزیم" قایم کرنے کا ارادہ ہے جس کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ اور تصاویر، مشاہیر کے خطوط اور مخطوطات وغیرہ فراہم کرنا شروع کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کوشش بھی کی جاری ہے کہ تصاویر پر شیشے اور چوکھٹے چڑھانے نیز کتابوں کی جلد بندی کا کام دفتر ہی میں ہوا کرے چنانچہ دفتر کے ایک آدمی کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے۔

منظور شدہ بجٹ کے مطابق دفتر اکیڈیمی کا اسٹاف ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ موزوں اور مناسب آدمیوں کی تلاش جاری ہے۔ گورنمنٹ گرانٹ کے علاوہ اکیڈیمی کے فنڈ میں کم از کم پندرہ ہزار روپے کی مزید ضرورت ہے جس کے بغیر اسٹاف وغیرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

کانفرنس اور اکیڈیمی کے موجودہ دفتر میں اہل علم و تحقیق حضرات کی کافی تعداد میں تشریف آوری

سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اور سال گزشتہ کی طرح ماہانہ علمی جلسوں کا انعقاد بھی شروع ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ گذشتہ سال اس قسم کے آٹھ نہایت کامیاب جلسے ہوئے تھے۔

ارکان و عہدیداران آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" اور ملک کے تعلیم یافتہ حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اکیڈیمی کے اس انتہائی مفید مگر ساتھ ہی سخت اور خشک کام کو کامیاب بنانے میں بیش از بیش معاونت کریں اور اپنی تشریف آوری اور قیمتی مشوروں سے کارکنانِ اکیڈیمی کی ہمت افزائی فرمائیں۔

سید الطاف علی بریلوی

آہ! غلام محمد صاحب!

فرائضِ منصبی کی بے پناہ گراں باری اور شدید خرابیِ صحت کی بنا پر سابق گورنر جنرل پاکستان غلام محمد صاحب کی زندگی عرصہ تک تلوار کی دھار پر رہی۔ لیکن ریٹائر ہونے کے بعد اُن کی حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی اور اُمید تھی کہ مسلسل آرام و علاج سے شاید وہ بالکل اچھے ہو جائیں۔ مگر ۲۹ اگست ۱۹۵۶ء کی شب میں حرکتِ قلب بند ہو گئی اور وہ اچانک اللہ کے پیارے ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

غلام محمد صاحب ایک معرکے کے آدمی تھے اور ہر معرکہ کی شخصیت کے بارے میں ہمیشہ مخالف و موافق دو رائیں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اُن کی بڑائی اور بزرگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شہیدِ ملت کے بعد ہمارے ملک کے وہ تیسرے بڑے آدمی تھے۔ حتیٰ کہ برسرِ اقتدار نہ رہنے کے باوجود اُن کے متعلق گمان رہتا تھا کہ گویا ایک شیر ہے جو فی الوقت کچھار میں سو رہا ہے۔ نہ معلوم کس وقت کروٹ بدلے اور اس کی ہیبت و تاز سے دُنیا دہل جائے۔ وہ ایک آہنی عزم و ارادہ کے انسان تھے اور لاجواب دماغی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ساتھ ہی اُن کی دوست نوازی۔ وضع داری۔ مذہبیت اور رقیق القلبی تو ایسی صفات تھیں کہ اُن کو کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

(ایڈیٹر)

ایک قابلِ تقلید تعلیمی قیادت

کنووکیشن ایڈریس

از جناب جنرل اسکندر مرزا صاحب (صدر جمہوریہ پاکستان)

تاریخ شاہد ہے کہ ملکوں اور قوموں کی علمی اور فنی سربلندی کا سرچشمہ حاکمانِ وقت ہوا کرتے ہیں۔ انہیں کی سرپرستیوں اور فیاضیوں کی بدولت بڑے بڑے دارالعلوم۔ دانش گاہیں۔ تجربہ خانے اور کتب خانے وجود میں آتے ہیں اور انہیں کی ہمت افزائیوں کے طفیل علمی و فنی لوگوں کے جوہر کھلتے ہیں اور اُن کے تخلیقی کارناموں سے دُنیا روشن و منور ہوتی ہے۔

حاکمِ وقت ہی کی تقلید ملک کے دوسرے بااختیار اور اہلِ ثروت اصحاب کرتے ہیں اور اس طرح وافر روپیہ جو علم و فن کی ترقی کے لئے ناگزیر ہے بآسانی مہیا ہو جاتا ہے۔

ہمارے حاکموں کو صبح سے شام تک باعزت سرمایہ دار اور جاگیردار حضرات گھیرے رہتے ہیں اگر اُن کو محسوس کرا دیا جائے کہ دین و دُنیا میں سربلندی کا ایک ذریعہ علمی و تعلیمی اداروں، نیز اہلِ علم کی خدمت بھی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے ملک کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ متمدن ممالک میں قدا ہونے لگے گا۔

ہم اکثر سوچتے تھے کہ ہمارے حاکموں میں سے کون ایسا حاکم ہو سکتا ہے جس کی خدمتِ گرامی میں ہم اپنا مندرجۂ بالا معروضہ پیش کریں۔

'جوینده یابنده'

۱۲ اپریل ۱۹۵۶ء کو کراچی یونیورسٹی کانووکیشن میں ہمیں اُس متقدر بزرگ کا پتہ لگ گیا جس کے دل میں حقیقی علمی لگن ہمیں نظر آئی۔ یہ بزرگ صدر جمہوریۂ پاکستان جنرل اسکندر مرزا صاحب ہیں جنہوں نے اس موقع پر ایک لاجواب کنووکیشن ایڈریس پڑھا۔ اس ایڈریس کا ایک ایک لفظ خلوص۔ دردمندی اور ذوقِ علمی کا حامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ناظرینِ العلم ایڈریس مذکور کے درج ذیل ترجمۂ اُردو کے مطالعہ سے ہمارے حسنِ انتخاب کی داد دیں گے اور اس امر کا خود بخود اندازہ کر لیں گے کہ جناب صدر جمہوریۂ پاکستان کی علمی و تعلیمی قیادت کے کس قدر اہل ہیں۔ ع مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

(ایڈیٹر)

ہمیں کراچی یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ کو جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ دینے کے لئے مدعو کیا ایسے امتیازی اجتماع کو مخاطب کرنا میرے لئے باعث عزت ہے۔

یونیورسٹی کے جلسہائے تقسیم اسناد بہت اہم ہوتے ہیں اور کچھ ایسا سنجیدہ موقع بہم پہنچاتے ہیں جس میں جوان مردوں اور عورتوں کا ایک گروہ ہمیں زندگی کی مہم میں قدم رکھتا ہوا نظر آتا ہے اور جوان اوصاف وخصوصیات سے آراستہ ہوتا ہے جنہیں ان کی مادر علمیہ نے ذہنی ترقیات پیشہ ورانہ تربیت اور اخلاقی انضباط کے شعبوں میں ان کے لیے مہیا کیا ہے' ایسے موقع پر یہ کارآمد ہوگا کہ جامعی تعلیم کے اغراض ومقاصد سے بحث کی جائے اور دیکھا جائے کہ یونیورسٹی سے نکلے ہوئے طلبہ زندگی کی آزمائشوں اور امتحانات سے جو ان کو آئندہ پیش آنیوالے ہیں عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کس حد تک رکھتے ہیں۔

میں بجائے خود کوئی ماہر تعلیم نہیں تاہم میں اہم تعلیمی موضوعات پر چند عمومی خیالات ظاہر کرنے کی جرأت کروں گا جو جامعی تعلیم کے نصب العین' اساتذہ کی ذمہ داری اور طلبا کی ذمہ داری سے متعلق ہیں۔

یونیورسٹی کے فرائض

نوجوانوں کی تعلیم اور نئے حقائق کی دریافت یونیورسٹی کے مخصوص فرائض منصبی ہیں۔ تعلیم یافتہ شہری ایک جمہوری ملک کے دفاع کے لئے اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنی ایک طاقتور مستعد فوج۔ پاکستان میں ایک جمہوری دستور اختیار کرنے کے ساتھ ہی ہمیں تعلیم پر اس حیثیت سے ازسرنو غور دینا چاہیئے کہ وہ آزادی کے ارتقاء اور معاشی تبدیلیوں کی ضرورت کے متعلق جسم دماغ اور روح کی ترقی کے لئے ایک واسطہ ہے۔ معاشرتی انصاف کے بغیر کوئی جمہوری آزادی نہیں ہوسکتی کیونکہ معاشرتی انصاف افلاس بزدلی' نقص تغذیہ اور جہالت جیسی تباہیوں سے عوام کو نجات دلانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

آج ہم کئی اہم سماجی اور قومی مسائل سے دوچار ہیں مثلاً معاشرتی آزادی کا حصول' عوام کی خوشحالی میں اضافہ ایک موثر جمہوری نظام کا قیام جو فرقہ' مذہب' غربت اور امارت کے امتیازات سے بالاتر ہو اور تہذیب و ثقافت کی سطح کو بلند تر کرسکے۔ تعلیم ان مقاصد کے فوری اور موثر حصول کا ایک طاقتور آلہ ہے۔ تعلیم معاشرتی نجات کا ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعہ جمہوریت قایم ہوتی ہے' باقی رہتی ہے اور اپنے ارکان کے درمیان مساوات کی روح کو برقرار اور محفوظ رکھتی ہے۔

جامعی تعلیم جمہوریت کے لئے شہریوں کی تربیت کرنے کے علاوہ علم کے حدود کی توسیع اور قوم سے ان کے استعمال کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پروفیسر ہیڈ کی رائے ہے کہ ترقی پذیر معاشرہ کا انحصار اس پر ہے کہ وہ علما اور محققین اور موجدین کے تین گروہوں پر مشتمل ہو اگر علماء ماضی کا ازسرنو انکشاف کرتے ہیں اور عقل حس اور نیکی کے تصورات ہمارے سامنے رکھتے ہیں تو محققین نئی صداقتوں کو دریافت کرتے ہیں اور موجدین انہیں موجودہ ضروریات پر منطبق کرتے ہیں۔ یونیورسٹیاں اس قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں ہمالے قومی ادارے کی حیثیت سے ہماری یونیورسٹی کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے

جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ علمی شعبوں میں تحقیقاتی کام کیا جائے اور تربیت یافتہ ریسرچ کرنے والے کثیر تعداد میں تیار کئے جائیں جو اپنے مطالعے اور تحقیق کے ذریعہ نہ صرف علمی فضیلت اور سائنسی تحقیقات میں اپنی زندگی کے اعلےٰ معیار قایم کریں بلکہ ہمارے ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی کی رفتار بھی بڑھائیں۔

ایک نئے حل کی ضرورت

علم کو ترقی دینا ابتدائی طور پر اساتذہ کا فرض ہے ان کا کام ہے کہ وہ علم سے متعلق اپنی خدمات کے ذریعہ طلبہ میں دریافت و تجسس کی روح پھونکیں یہ ایک افسوسناک موقف ہے کہ آج کل ہماری یونیورسٹیاں اپنی بیشتر توجہ محض مقررہ درس اور امتحانات تک محدود رکھتی ہیں ریسرچ کے کام پر کافی توجہ مبذول نہیں کی جاتی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ تجربہ گاہوں اور لائبریریوں کے سازوسامان سے متعلق ذرائع وسائل سردست بہت تھوڑے ہیں مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہمارے معاشی وسائل ترقی کریں گے اس کے ہمراہ مزید فنڈ یونیورسٹیوں کے تصرف میں دیئے جائیں گے لیکن مجھے اسکا بھی احساس ہے کہ صرف مادی وسائل کی کمی ہی معاملات کی موجودہ صورت کی ذمہ دار نہیں ہے۔ قومی پیمانے پر تجربہ خانوں اور لائبریریوں کی توسیع کے ساتھ ہی جن کی اسکیمیں میری دانست میں وزیر تعلیم کے زیر غور ہیں۔ ہمیں ریسرچ کے مسئلہ پر اپنی یونیورسٹیوں میں ایک نئی روح پیدا کرنا ہوگی اور اس کا ایک نیا حل ڈھونڈھنا ہوگا

سائنسی تعلیم

پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے لئے جس کی کوششیں اس امر پر مبذول ہیں کہ اس کی معاشیات کا رخ خالص زرعی حیثیت سے نیم صنعتی حیثیت کی طرف موڑا جائے سائنسی اور فنی تعلیم کی خاص ضرورت ہے ایسی صورت میں کہ صنعت میں سائنس کے روز افزوں استعمال سے متعلق ہمارے قومی تجربہ خانوں اور تحقیقاتی اداروں کو بہت نمایاں حصہ لینا ہے۔ سائنس کے میدان میں ایسے کام کرنے والوں اور لیڈروں کی مسلسل فراہمی کے لئے جو تحقیق کے جذبہ سے سرشار ہوں ہمیں یونیورسٹیوں پر انحصار کرنا پڑے گا اسلئے ضروری ہے ہماری یونیورسٹیاں بنیادی تحقیقات کی غرض سے اپنے شعبوں کو طاقتور بنائیں تاکہ وہ ایسی بنیادی دریافتوں کا تسلسل یقینی طور پر قایم رکھ سکیں جو اطلاقی سائنس اور فنون کے لئے غذا کا کام دیتی ہیں۔

شریفانہ مقاصد

نوجوانوں کی طرف ذہنی و اخلاقی ورثہ کی منتقلی، سائنسی اور فنی تحقیقات اور حدود علمی کی توسیع جامعی تعلیم کے شریفانہ مقاصد ہیں مگر ان پر وہ مادی و انسانی عوامل محیط ہیں جن کے تحت یہ ادارے کام کرتے ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں یونیورسٹیوں کے لئے ایک بڑے پیمانے پر عمارتی پروگرام کی سخت ضرورت ہے تاکہ ان میں مناسب ماحول کے ساتھ لکچر روم اور کتب خانے تجربہ گاہیں اور کھیلوں کے میدان مہیا ہو سکیں جن کے ذریعہ تعلیم کا مجوزہ فریضہ ادا ہو سکے اور اجتماعی زندگی کا انصرام

ممکن ہو سکے ۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کراچی یونیورسٹی کی تعمیر جدید کے منصوبے عملی شکل اختیار کر رہے ہیں اور یہ یونیورسٹی جلد ہی موزوں عمارت میں جگہ پا سکے گی ۔ میں چاہتا ہوں کہ تعلیمی طریق کار میں مادی سہولتوں کے جزکی اہمیت کو کم کئے بغیر آپ کی توجہ انسانی عنصر کی اہمیت پر بھی مبذول کی جائے جس سے یونیورسٹی کی تشکیل ہوتی ہے ۔ یعنی اساتذہ اور طلبا کا وجود ۔

اساتذہ

ہمارے اساتذہ حقیقی معنوں میں قوم کے معمار ہیں قومی تعلیم کی محراب کا بنیادی پتھر وہ لائق محنتی اور ایماندار استاد ہے جو اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ وہی قوم کے استحکام و ترقی اور شہرت کا امین ہے اس لئے کہ جوان قوم کی تربیت اور نشو و نما کا کام اس کے سپرد ہے یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسے ذمہ دارانہ پیشے کے ارکان دوسرے پیشے والوں کے مقابل میں کم تنخواہ پاتے ہیں یہی صورت حال بشمول ہمارے ملک کے دُنیا کے بہت سے ملکوں میں پائی جاتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ اس پیشے میں اعلیٰ قابلیت والے اشخاص اپنے لئے کوئی کشش نہیں پاتے ہیں ، جہاں میری خواہش یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ کی تنخواہیں بڑھیں وہیں میں یہ بھی کہوں گا کہ بدقسمتی سے ہمارے بہت سے اساتذہ نے توقعات کو پورا نہیں کیا اور تعمیر قومی میں ان کا جو حصّہ ہونا چاہئے اُس کا دُھندلا سا شعور بھی انہیں نہیں پایا جاتا ایسا استاد درحقیقت ایک ناقص استاد ہے جو اپنے کام کو دفتری معمول سمجھتا ہے اور جس کے متعلق وہ کلاس روم میں چند معینہ ساعتیں صرف کرتا ہے ، اور کم سے کم کوشش کم سے کم دلچسپی اور کم سے کم جدو جہد کے ساتھ چند مقررہ معمولی فرائض سرسری طرز پر مشین کی طرح انجام دیتا ہے ۔

اگر تدریسی پیشے میں چند معاشی نقصانات ہیں تو کم از کم ایک اچھے اُستاد کے لئے اس میں تلافی کی چند صورتیں بھی پائی جاتی ہیں جو نسبتاً زیادہ شریفانہ نوعیت رکھتی ہیں اس ضمن میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اُستاد کو اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ ایسی عمر میں انسانی مسالہ کو کام میں لائے جبکہ اُس کا ذہن بہت جلد نقش قبول کر لیتا ہے ۔ اُستاد کا کام اس قسم کا روکھا پھیکا نہیں ہوتا کہ وہ مشینی انداز میں کلوں اور بیجان چیزوں یا بے قابو مواد سے کام لیتا رہے وہ پروان چڑھتے ہوئے بچوں کے نرم اور کچے دماغوں پر اپنا عمل کرتا ہے جن میں استعجاب ، شادمانی اور تجسس کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں ۔ اس کا کردار اگر وہ اسے صحیح طریقے پر انجام دے تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے ۔ ایک اچھا اُستاد صرف واقعاتی مواد اُن سے برآمد ہونے والے عمومی نتائج ہی طلبہ تک نہیں کرتا اُسے تحقیق اور تنقید کی روح کو بھی اکسانا ہے تاکہ طلبا کے ذہن آزادانہ اور غیر متعصبانہ فیصلہ کرنے اور حق و ناحق کے درمیان امتیاز قایم کرنے کی عادت پیدا کر سکیں ۔ اُستاد اس فریضہ کو صرف اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جبکہ اُس میں علم کی نہ بجھنے والی پیاس موجود ہو اور وہ اپنے علم و دانش کو دلچسپ اور پُرشکوہ انداز سے دوسروں میں منتقل کرنے کا ماہرانہ ڈھنگ سیکھ چکا ہو ۔

طلبہ

یہ بات میرے ذہن کو طلبہ کی جانب متوجہ کرتی ہے جو یونیورسٹی کی مقصدی پیداوار ہیں۔ کسی یونیورسٹی کی عمارت اور اس کا ساز و سامان سے لیس ہونا ضروری امور ہیں اور ہنر مند اساتذہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں مگر تعلیمی نظم میں طلبا کا وجود سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ اصل میں طالب علم یونیورسٹی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ یونیورسٹی کا وجود طالب علم کے لئے عمل میں آتا ہے۔ ایسی کسی جد و جہد میں دریغ نہیں ہونا چاہئے اور نہ کسی ایسی تدبیر کو نظر انداز کرنا چاہئے جو خواہ جسمانی ہو، ذہنی ہو یا روحانی، طلبا کے امکانات ترقی کو زیادہ سے زیادہ اور کامل سے کامل طریقہ پر آگے بڑھا سکتی ہو۔ جسمانی طاقت کا تحفظ اور تیاری، اچھی عادتوں کی تشکیل و تربیت، خوش گوار اجتماعی زندگی کا استقبال، مباحثہ ڈرامے اور ذہنی و جسمانی دونوں طرح کی تفریحات کا انتظام، ضبط و نفس کے ذریعہ اچھے رویہ کی بحالی ایسی چیزیں ہیں جن کی سہولتیں یونیورسٹی کو مہیا کرنا چاہئیں۔ ان سب سے زیادہ قوی چیز استاد کا طلبہ کو سمجھنا اور ان سے ہمدردی کرنا ہے۔ یہ دراصل انسانی میل جول کا سوال ہے۔ ایسا اُستاد جو طلبہ کے اندر گھل مل جانے اور ان کی بعض مصروفیتوں میں اپنے آپ کو انہیں جیسا بنا لینے کی قابلیت نہیں رکھتا وہ کمرۂ درس کے اندر یا اُس سے باہر نہ انہیں متاثر کر سکتا ہے نہ ان میں کوئی اچھا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔ ایک اچھے اُستاد میں اس بات کی صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ جہاں تک اُس کی قابلیت اور کردار کی سالمیت زیر بحث ہے وہ اپنے شاگردوں کی توقعات پوری کر سکتا ہو۔

خلوص کی ضرورت

ہمارے طلبا میں تعلیم کے نصب العین سے زیادہ سے زیادہ وابستگی، اور اس کی اہمیت اور سنجیدگی کا عظیم تر احساس، زیادہ محنت، اور توجہ میں یکسوئی درکار ہے۔ میرے نزدیک ایک بے مقصد اور کاہل نوجوان سے زیادہ افسوسناک اور کوئی منظر نہیں ہو سکتا جو صرف اس لئے کالج جاتا ہے کہ اُس کے والدین اُسے کالج میں تعلیم دلانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور جو معمولی طلبا کی طرح بحیثیت کے ساتھ بے نتیجہ انداز میں کالج کا کام کرتا ہے، نہ اسباق میں دلچسپی لیتا ہے نہ کھیلوں میں اور نہ کالج کی کسی اور مصروفیت میں۔ وہ جب کالج چھوڑتا ہے تو اپنے اوپر اپنے والدین پر اور اپنے ملک پر بار ہوتا ہے۔ اُس کی حقیقت ایک ایسے ناموزوں فرد کی ہوتی ہے جو دل شکستہ، نااہل اور نقصان رساں اثرات قبول کرنے کی طرف مائل ہو۔ اس قسم کے طالب علم کو اعلیٰ تعلیم دلانا بالکل رائیگاں ہوتا ہے، اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہے کہ ایسے فرد کی بدولت ایک زیادہ مستحق شخص کالج سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

ہماری نئی قوم جس بحرانی دور سے گذر رہی ہے اُس کے لئے زیادہ جفاکش مرد اور عورتیں درکار ہیں۔ ہمیں ایسے جوان اشخاص کی ضرورت ہے جنہوں نے محض ڈگریاں حاصل کرنے پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ ان وافر اور گوناگوں تجربات سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہو جو ایک اچھی یونیورسٹی میں انہیں

فراہم ہونے چاہئیں ہمیں ایسے لوگ درکار ہیں جو علم و ذہانت سے آراستہ ہوں جو اپنی صلاحیت اور انتہائی دیانت کی بدولت نظم و نسق، پیشوں اور مسلح فوجوں اور صنعت و تجارت کے شعبوں میں پیش رو بننے کی استعداد پیدا کریں ہمیں اس قسم کے پاکیزہ اور حساس مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو انسانی اوصاف اور علم و ادب کے سرچشموں سے خوب سیراب ہوں اور تعلیم، فنون اور ثقافت کے میدانوں میں قیادت کر سکیں اور ان سب سے بڑھ کر ہمیں ایسے مردوں اور عورتوں کی حاجت ہے جنہوں نے جفاکشی اور ضبط نفس کے وسیلے سے کردار کی پختگی اور سالمیت حاصل کر لی ہو اور جو ہر شعبہ میں زندگی کا مقابلہ بے خوفی اور ہمت کے ساتھ کر سکیں ایک نئی ملت کو ایسے قائدین درکار ہوتے ہیں جو عام انسانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں اور جن کی حب وطنی کے آگے قوم اور سماج کے فائدے کے لئے کسی چیز کی قربانی بھی کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو، اسلامی تاریخ ایسے اشخاص کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جو ایسی استعداد کے حامل تھے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے اندر ان اعلے مقاصد کو حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہ کریں۔ تہذیب کے یہ ذہین پیشرو یونیورسٹیوں ہی میں مل سکتے ہیں، اور وہیں ان کی تربیت ہو سکتی ہے، کیونکہ یونیورسٹیاں قوم کی ذہنی زندگی کے لئے مقدس پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ فرسودہ شیریں الفاظ میں صلاح و مشورہ دینا آسان ہے لیکن حقائق کا مقابلہ کرنا ذرا اس سے مختلف نوعیت رکھتا ہے اپنے ان نوجوان دوستوں کے لئے جو آج ایک نئی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں میری نصیحت یہ ہے کہ زندگی کا جوہر یہ نہیں ہے کہ جیسی زندگی نصیب ہو بسر کر لی جائے بلکہ زندگی کا جوہر یہ ہے کہ اس کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کی جائے۔ جب آپ اپنی یونیورسٹی کی چار دیواری کے باہر نکلیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی اپنی حقیقی صورت میں پھولوں کی سیج نہیں ہے، نہ وہ کانٹوں بھرا جنگل ہی ہے۔ زندگی کی کشاکش بعض اوقات صعوبت انگیز اور مخالفت پر آمادہ معلوم ہوگی حقائق کی بے نقابی اور محرومیاں بھی اکثر آپ کے سر پر منڈلاتی رہیں گی، لیکن اس قسم کے موقع پر تعلیم کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے شخصی مشکلات و حوصلہ شکن حالات ایک غیر تعلیم یافتہ دماغ میں ملک و قوم کی جانب سے بے اطمینانی کو بڑی آسانی سے پروان چڑھا سکتے ہیں لیکن ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اس عام لغزش کے مقام سے صاف بچ کر نکل جانا چاہئے۔ آپکو اپنی شخصی مشکلات پر دانشمندانہ زاویہ سے نظر کرنا چاہئے آپ کو اپنی ذاتی مایوسیوں کو اجازت نہ دینا چاہئے کہ وہ وطن پرستی اور فخر و نازش کے ان احساسات پر جو ملک کے شہری کی حیثیت سے آپ کے دل میں موجزن ہیں۔ کدورت بن کر چھا جائیں۔ یاد رکھئے کہ نا اہل جنرل اپنی شکستوں کا الزام ہمیشہ موسم پر لگایا کرتا ہے۔

میرے نوجوان دوستو! آپ زندگی کی جس مہم کی طرف آج قدم بڑھا رہے ہیں میں آپ کے لئے خاطر خواہ شادمانی اور خوش نصیبی کا متمنی ہوں دعا ہے کہ علم کی مشعل آپکے راستے کو روشن رکھے اور بہترین اخلاص، دیانت داری اور

کامیابی اس عظیم جدوجہد کے افراد اور شہری ہونے کی حیثیت سے آپکے ذہن اور جسم کو فیض پہنچاتی رہے" (مترجمہ مولانا ذکریا ماٹل)

بھائی جان

تیسری حکایت

از

(سید الطاف علی بریلوی)

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم شروع ہونے تک بلکہ اس کے خاتمہ تک بھی ہمارے تعصبات اور شہروں کی زندگی میں ایک طرح کا مستقل ٹھہراؤ تھا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ کچھ اس طرح جمے ہوئے تھے جیسے کہ پہاڑ۔ ٹیلے اور پرانے درخت ہوتے ہیں۔

اسی طرح زندگی کی قدریں لازوال تھیں جن لوگوں سے تعلق اور واسطہ تھا اُن کے کردار کی خصوصیات معلوم و معروف تھیں اور انہیں کے مطابق اُن سے برتاؤ ہوتا تھا۔

لیکن جب سیاست حاضرہ اور تہذیب نو نے زیر و زبر کر دیا تو پرانے سانچوں کے ڈھیلے پڑ جانے سے لوگوں کو بڑی مشکل کا سامنا ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے گوشہ نشین ہو جائیں۔ مثلاً ایک وقت تھا کہ بھائی جان کی وفاشعاری۔ شرافت۔ سمجھداری اور فرزندی کا عام اعتراف تھا۔ لوگ اُن کے سامنے بے قاعدہ گفتگو اور بے ڈھنگی نشست و برخاست اختیار کرنے کی جسارت نہ کرتے خاندانی تنازعات۔ محلے کے باہمی اختلافات اور میونسپل انتخابات میں اُن کا فیصلہ واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا مگر جب طلب آزادی کی فضا میں آنکھ کھولنے والی نئی نسل نے ہر قسم کی اخلاقی جکڑبندیوں سے اپنے کو آزاد کرنا شروع کر دیا تو بھائی جان اپنی اور اپنے اہل خاندان کی آبرو کے تحفظ کے خیال سے حد درجہ غم خور، محتاط، اور صابر و شاکر ہو گئے۔ ایسی سڑکوں اور ایسے کوچوں سے نکلنا تک چھوڑ دیا جہاں کوئی ناگوار بات پیش آنے کا خفیف سا بھی امکان ہوتا۔

بھائی جان لکڑی۔ بانک۔ بنوٹ اور کُشتی کے مشہور ماہروں میں سے تھے۔ اپنی زندگی میں بیسیوں معرکے سر کئے۔ بڑے بڑے حریفوں کو نیچا دکھایا۔ لیکن زیر تذکرہ دور میں اُن کا یہ قول ہو گیا تھا کہ

"بھائی! کسی کو مار لینا تو بالکل سہل ہے
مگر اس کے ردِ عمل کو بھگتنا اب میرے
بس کی بات نہیں ہے۔"

اچھا تو اس احتیاط کے باوجود بھائی جان ایک سخت قضیۂ نامرضیہ میں پھنس گئے۔ سچ ہے!

"تدبیر کند بندہ۔ تقدیر زند خندہ"

———◆———

ہمارے مکان واقع محلہ عقب کوتوالی بریلی (مدہل کھنڈ) سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر کچھ شریف زادوں نے اپنی خاندانی دولت و ثروت کے خاتمہ کے بعد گذر بسر کے لئے ایک آٹے کی چکی لگالی تھی جس پر دور دور سے پسائی آتی تھی۔ خوب کام چل رہا تھا مگر اسی نسبت سے مالکان کی "شریف عادات" بھی ترقی پر تھیں چکی کے مالک دو نوجوان بھائی تھے۔ اُن کے دو تین ہم عمر قریبی عزیز اور چھ سات عدد بے تکلف ملازم سب مل کر دس بارہ آدمی ہر وقت کارخانہ میں دھما چوکڑی مچائے رکھتے۔ ہر آنے جانے والے کا مذاق اڑاتے اور بات بات پر مارنے کو لپٹ جاتے۔

ایک روز ہمارے گھر کا ایک ملازم لڑکا (رفعت) صبح کے وقت آٹا پسوانے اس چکی پر گیا تو شام کے چار بجے تک لوٹ کر نہ آیا۔ ہمارے دادا سید اصغر علی صاحب قبلہ مکان آئے تو دادی صاحبہ نے اُن سے ذکر کیا جس پر دادا صاحب کسی سے کہے سنے بغیر خود ہی چکی پر چلے گئے اور جیسا کہ بوڑھے لوگوں کا قاعدہ ہے جاتے ہی چکی والوں کو فہمائش شروع کر دی کہ

"میاں تم لوگ بھی عجیب ہو۔ یہ لڑکا صبح سے آیا ہوا ہے تم نے اب تک اس کا آٹا پیس کر نہ دیا بڑی نالائقی کی بات ہے۔ اگر یہی طریقہ رکھا تو بس چل چکی تمہاری چکی"!

"چکی کے شریف زادے" بھلا کیوں کسی کو خاطر میں لاتے ایک بوڑھے بزرگ کی فہمائش سخت ناگوار گذری اور ان میں سے ایک نے پہلے اُن پر کوئی مذاقیہ نعرہ چسپاں کیا جس پر انہوں نے اور ڈانٹا تو بیہودہ قسم کی بدکلامی کرنے لگا۔ دادا صاحب اس حرکت سے سناٹے تک آ گئے۔ چکی پر آئے ہوئے دوسرے لوگ بھی چلائے کہ ارے یہ کیا کیا تم نے؟ کیا جانتے نہیں ہو بڑے میر صاحب کو؟ اس پر چکی والے بھی چونکے۔ لیکن بجائے اس کے کہ اپنی نادانستہ غلطی کی فوراً تلافی کرتے یا معافی مانگتے نتائج کے خوف سے "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے"۔ یہ ہنگامہ اٹھایا کہ

"یہ بڑھا تحویل کی صندوقچی اُٹھا کر لے جا رہا تھا، ہم نے پکڑ لیا ہے۔ بلاؤ پولس کو"!

اور یہ کہکر دادا صاحب کو بٹھا لیا ایک چارپائی پر اور کھڑے ہو گئے اُن کی نگرانی کرنے پولس کے آنے تک!

جب معاملہ یہاں تک پہونچ گیا تو ملازم لڑکا دوڑا ہوا گھر آیا اور دادی صاحبہ کو رو رو کر سارا واقعہ سنایا۔ عین اُس وقت بھائی اشفاق علی (مرحوم) مکان آئے۔ یہ حد درجہ صادق القول اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ مغلوب الغضب اور بہت بے تکے تھے۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے فوراً بے تحاشہ خالی ہاتھ بھاگتے ہوئے مقام واردات پر چلے گئے۔

اس کے بعد میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ہنگامہ برپا ہے حقیقت حال معلوم کر کے میں بھی چکی کی طرف چلا لیکن کٹرہ مان رائے جانے کے لئے بنی آل روڈ پار کر کے جب میں گلی نوابان میں داخل ہوا تو مجھے خیال آیا کہ اپنے دوست شفیق میاں (بعدہٗ نواب حسنین احمد خاں) کو بھی ساتھ لے لینا چاہیے اُن کا مکان راستہ ہی میں تھا۔ میں نے زور زور سے اُن کے کواڑ دھڑ دھڑائے۔ وہ فوراً باہر آئے تو معلوم ہوا کہ کھانا

کھا رہے تھے پلک نالہ صفہ میں اور ایک ہانپ میں۔ میں نے واقعہ بتایا اُسی عالم میں ساتھ ہو لئے۔ ہم لوگ چند منٹ میں دوڑ کر حکی کے پاس پہونچ گئے۔ یہ حکی بزریہ کٹرہ مان رائے میں لب سڑک پانچ چھ فٹ ٹیلہ نما عریض و طویل چبوترہ پر واقع تھی۔ چبوترہ کیا تھا اچھا خاصا میدان تھا۔ شام کے چھ بج چکے تھے اور اس وقت وہاں کافی آدمی جمع تھے اوپر جا کر کیا دیکھا کہ ایک چارپائی پر بوڑھے دادا مجبور ولاچار پریشان بیٹھے ہیں۔ ایک لکڑی کی صندوقچی ان کے سامنے رکھی ہے۔ چار پانچ آدمی اُنہیں گھیرے کھڑے ہیں اور قریب ہی اشفاق بھائی کو جو جاتے ہی ان لوگوں سے گتھ گئے تھے تین چار آدمی بُری طرح لپٹے ہوئے مار رہے ہیں۔ زمین پر گرا لیا ہے اور وہ عجیب بے بسی کی حالت میں ہیں۔

یہ صورت حال دیکھ کر میں نے رفیق میاں سے کہا کہ پہلے ان کو بچاؤ نہیں تو یہ ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اور میں اس طور پر ـــــ گویا کہ غیر متعلق ہیں ـــــ پہلے چیخ چیخ کر کہا:

چھوڑو! چھوڑو!! بیچ بچاؤ کرنے لگے اور بس کے بعد موقع پا کر بھائی اشفاق علی کو مارنے والوں کی گرفت سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

کافی دیر کچلے جانے سے اشفاق بھائی بے دَم ہو گئے تھے۔ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ مگر جوشِ مقابلہ میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ دشمنوں سے آزاد ہوئے تو لگے پھر دوبارہ لڑنے کے لئے۔ لیکن میں نے اور میرے دوست نے اُن کو اچھی طرح گرفت میں لے لیا اور کھینچتے ہوئے رفیق میاں کی بیٹھک میں لا کر ان کو بند کر دیا اس طرح کہ نکل نہ سکیں اور مارے نہ جائیں۔

بھائی اشفاق علی کی طرف سے اطمینان حاصل کر کے میرا اور رفیق میاں کا مشورہ ہوا کہ وہ تو دادا صاحب کے پاس جائیں اور میں بھائی جان (والد صاحب) کو جا کر خبر کروں۔ کیونکہ معاملہ اب آسانی سے طے ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ دادا صاحب کی توہین اور عصبیت بیجا اور اشفاق بھائی کی مار پیٹ کا انتقام لینا ازبس ضروری ہو گیا تھا۔ اور ہم دو آدمی بارہ مخالفوں کے لئے ناکافی تھے۔ علاوہ ازیں حکی والے خاص اپنے محلہ میں تھے اور "سیدوں سے جھگڑے" کی خبر سُن کر اُن کے عزیز اور محلہ دار برابر دَوڑے چلے آ رہے تھے۔ بھائی جان اپنی کوہاڑا پیر والی لکڑی کی ٹال پر تھے اور اُن کے پاس ایک بہت مضبوط کلہ جبڑے کے بڑے میاں اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ اونچا سا ترچھا صافہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی سُرخ چڑھی ہوئی داڑھی۔ میانہ قد۔ لانبے لانبے ہاتھ۔ شکرے کی سی تیز آنکھیں۔ جسم پر خوب کسا ہوا نیچا سا سیاہ کوٹ۔ ہاتھ میں لاٹھی۔ عمر ستر سال سے متجاوز۔ جوں ہی بھائی جان کو میں نے سخت متوحش لہجہ میں حادثہ سے مطلع کیا وہ حسب معمول اپنے پاس رکھی ہوئی لاٹھی کا سہارا لے کر فوراً کھڑے ہوئے اور میرے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ وہ بڑے میاں بھی بھائی جان کے قدم سے قدم ملا کر ہمارے ساتھ ہو لئے نصف راستہ طے ہوا تھا کہ بھائی جان نے مڑ کر بڑے میاں سے فرمایا: "مہربانی کر کے خان صاحب آپ الگ رہیے گا" بڑے میاں خاموش رہے کوئی جواب نہ دیا۔

گرد ماڑئے بجلی والے چبوترہ پر پہونچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور نیچے سڑک سے لے کر گلی تک پچاسیوں آدمی جمع ہو گئے تھے ان میں ہمارے خاندان اور محلہ کے بھی کافی آدمی تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی آلۂ ضرب تھا۔ دونوں طرف کے لوگوں کی آمد کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا ٹولیوں پر ٹولیاں بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ عنقریب گھمسان کی لاٹھی چلنے والی تھی کہ بھائی جان کو دیکھ کر ہماری طرف کے سب لوگ رُک گئے۔ بھائی جان تیز تیز قدموں سے اُس چارپائی کے پاس گئے جہاں دادا صاحب بیٹھے تھے رفیق میاں پروانہ وار اُن کے پاس تھے۔

بھائی جان نے جاتے ہی دادا صاحب سے کہا:

"چلئے گھر چلئے"!

دادا صاحب اُٹھنے لگے تو مخالف جماعت کے دس بارہ آدمی جھپٹ کر آئے اور بھائی جان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:۔

"آپ تو لڑنے آئے تھے اب جانے کہاں ہیں؟"

بھائی جان نے جواب دیا:۔

"نہیں میں لڑنے نہیں آیا ہوں۔ اپنے والد کو لینے آیا ہوں"

جواب الجواب:۔

"تو پھر یہ لاٹھی لے کر کیوں آئے؟"

بھائی جان: "یہ تو ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہتی ہے"۔

مخالفین: "اپنی لاٹھی دے دیجئے تو ہمیں یقین آئے کہ آپ لڑنا نہیں چاہتے"

بھائی جان: "یہ لو"!

اور یہ کہہ کر اپنی لاٹھی سوال و جواب کرنے والوں میں جو شخص پیش پیش تھا اُس کے ہاتھ میں دیدی۔ اُس ظالم لکڑی پر قبضہ کرتے ہی اُسے فوراً سر سے اونچا اُٹھایا اور لگا کرنے ایک بھرپور وار بھائی جان پر۔ حسنِ اتفاق کہ میں اس شخص کے بالکل پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے جو اُس کی یہ حرکت دیکھی تو اُچک کر پیچھے ہی سے لاٹھی کو کھینچ لیا اور فوراً اُسے بھائی جان کے ہاتھ میں دے دیا۔ لاٹھی دوبارہ ہاتھ میں آتے ہی انہوں نے اُلٹے پیروں پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جتنا جتنا وہ پیچھے ہٹ رہے تھے اُتنے ہی اُنکے حملہ آور آگے بڑھ رہے تھے تا آنکہ چبوترہ کی حد ختم ہو گئی اور بھائی جان ایک چھلانگ مار کر پختہ اور چوڑی سڑک سرکاری پر عین بجلی کے کھمبے کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے دوست دشمنوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور سب لوگ چبوترہ سے سمٹ سمٹ کر سڑک پر آ گئے۔

چبوترہ پر شب کی تاریکی چھا رہی تھی اور یہاں بجلی کی روشنی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اس وقت بھائی جان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور گرد آلود ملبوس پسینہ میں تربتر ہو رہا تھا جس وقت لوگ کود کود کر سڑک پر جا رہے تھے میرا چبوترہ پر سے پیر پھسل گیا اور نیچے زمین پر گرتے گرتے میں چلایا۔

"بھائی جان! میں گرا"!

میری اس آواز سے بھائی جان یہ سمجھے کہ مجھ پر کسی نے حملہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا پیمانۂ صبر و ضبط جو بڑی دیر سے لبالب تھا چھلک گیا۔ احتیاط کا دامن ہاتھ سے

چھوٹ گیا اور ذہن و دماغ پر سے

تو ضربے زدی ضرب ما فرش کن
غم ہر دو عالم فراموش کن

کی خطرناک کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک سکنڈ ضائع کئے بغیر بھائی جان نے ماہرانہ انداز میں اپنی لکڑی زَن زَن گھمانا شروع کردی اور ساتھ ہی اپنے آدمیوں سے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا

"تم سب دور ہٹ جاؤ"

چنانچہ ہماری جماعت جس کی تعداد بیس پچیس کے لگ بھگ تھی علیحدہ جاکر کھڑی ہوگئی۔ میدان میں صرف تیس پینتیس حملہ آوروں کا ہجوم رہ گیا۔ جن کے بیچوں بیچ بھائی جان تڑپ تڑپ کر اس تیزی سے اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے چوٹ کر رہے تھے کہ اُن پر نظر جمانا دُشوار ہو رہا تھا۔

حملہ آور بھی جی جان سے کوشش کر رہے تھے کہ انہیں گھیر کر مار لیں اور کس کس کر لاٹھیوں کے وار ہو رہے تھے لیکن بھائی جان کسی کی زد میں نہ آئے۔ خود ہر ایک کی ضرب سے بچ جاتے اور اُن کی کوئی ضرب خالی نہ جاتی۔ گُتکے کی اصطلاح میں "پالٹ" "کمر" اور "لمبا ہاتھ" کے وہ وہ ہاتھ دکھلائے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو ہو گئے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ سر جھکا کر زمین کی طرف اس قدر خمیدہ ہو جاتے کہ ہم خوف زدہ ہو کر اُن کو بچانے کا ارادہ کرتے اتنے میں وہ پھر صحیح و سالم کسی رُخ سے نمودار ہو جاتے اور تڑپ تڑپ کر ایسے زور شور کے حملے کرتے کہ دشمنوں کی صفیں درہم برہم ہو جاتیں۔

الغرض پندرہ بیس منٹ میں بھائی جان نے بھگدڑ مچا دیا۔ کوئی ایک لاٹھی کھا کر بھاگا۔ کوئی دو۔ کوئی چار۔ آخر میں صرف وہ دو بھائی مقابلہ میں رہ گئے جو بانی فساد تھے سو اُن کو تو بھائی جان نے ایسا دُھنا کہ الامان والحفیظ! ان میں سے بھی ایک پٹتے پٹتے گر پڑا۔ بڑے بھائی نے لبِ سڑک ایک اونچی سی بیٹھک کے بند کواڑوں کی چوکھٹ کو پکڑ لیا تھا اور بھائی جان نے اُس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر دو چار لاٹھی کے ہاتھ مزید مار کر اُسے بھی گرا دیا۔

اب میدان بالکل خالی تھا۔ ہم لوگ دوڑ کر بھائی جان کو لپٹ گئے وہ ایک ہاتھ سے اپنا پسینہ پونچھتے جاتے اور دوسرے سے مجھے اور وادا کو اپنی بغل میں لیتے جاتے۔ اس کے بعد ہم لوگ کثیر التعداد تماشائیوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے بازار کٹرہ کے پھاٹک میں سے نکلے۔ قلعہ والی بڑی سڑک پر آئے اور پرانی کوتوالی کے چوراہے سے گھوم کر نینی تال روڈ اور وہاں سے اپنے گھر پہونچ گئے۔ ایک دوسرے راستہ سے رفیق میاں بھائی اشفاق علی کو بھی لے کر آگئے۔

اس فوجداری کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ بھائی جان کے ضبط و تحمل اور بہادری کی داستانوں سے تمام کوچہ و بازار گونج اُٹھے۔ مکان پہونچے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دور و نزدیک سے خیریت دریافت کرنے والوں اور مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ بڑی تعریف اس بات کی تھی کہ بھائی جان کے پورے جسم پر کہیں خراش بھی نہیں آئی تھی۔ کپڑے کی اونچی باڑ کی ٹوپی البتہ گر گئی تھی اور بھائی جان ننگے سر مکان لوٹے تھے۔ مکان کے

باہر چبوترہ پر بہت سی چارپائیاں، موڑھے اور کرسیاں، بچھی ہوئی تھیں جن پر ہمدردوں، بہی خواہوں اور منافقوں کا مجمع جمع ہوا بیٹھا تھا۔ اگر دس اُٹھ کر جاتے تو اُن کی جگہ دس اور آجاتے۔ کرید کرید کر لڑائی کی تفصیلات پوچھی جارہی تھیں اور اُن پر پرجوش تبصرے ہو رہے تھے۔

بھائی جان بالعموم خاموش رہنے کے عادی تھے اس موقع پر بھی نہ کوئی رنجش۔ نہ اظہار تفاخر بلکہ چہرے سے غیر معمولی تشویش و فکرمندی ظاہر ہو رہی تھی۔ اتنے میں قریب بارہ بجے رات کو اُن کے بہترین دوست مولانا سید عبدالودود صاحب درد سہسوانی میونسپل کمشنر و سکریٹری اسلامیہ اسکول تشریف لائے۔ مولانا صاحب شہر کے نامور سیاسی راہ نما، اعلےٰ درجے کے شاعر و ادیب اور فہم و فراست میں لاثانی شخصیت کے مالک تھے۔ بھائی جان مولانا کے میونسپل حلقۂ انتخاب میں سب سے زیادہ ذی اثر ہونے کے علاوہ ان کے قلبی محب تھے۔ جب اُن کو اس سنگین واردات کی اطلاع ہوئی تو فوراً آئے۔ پہلے بھائی جان کو سینے سے لگایا اُس کے بعد دو تین کرسیاں مجمع سے علحدہ ڈلوا کر انہوں نے اس مشورہ کا آغاز کیا کہ ــــ اب آئندہ کیا ہوگا؟

مولانا صاحب کو بتایا گیا کہ معاندین میں سے اور لوگ تو دو دو اور چار چار لاٹھیاں کھا کر بھاگ گئے لیکن چکّی کے مالک دونوں بھائیوں کی فکر ہے ــــ کہ نہ معلوم وہ کس حال میں ہیں؟ ــــ بالخصوص بڑا بھائی جو سب سے آخر میں گرا ــــ وہ اس وقت تک زندہ بھی ہے تو بڑی بات ہے۔ خدانخواستہ وہ مرگیا ہوگا تو کیا ہوگا؟ یعنی یہی کہ قتل کے جرم میں گرفتاری ــــ تباہ کن قتل کا مقدمہ ــــ اور پھر انجام کار . . . . . .

مولانا نے حاضرالوقت لوگوں میں سے ایک صاحب کو منتخب کرکے ہدایت کی کہ "بھئی! تم اُدھر جاسکتے ہو ذرا خبر تو لاؤ کہ کیا معاملہ رہا؟"

وہ صاحب چلے گئے اور اُن کی واپسی کا انتظار شروع ہوگیا ــــ آہ! یہ انتظار کی گھڑیاں ــــ

اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْت

اپنی پوری طولانی کے ساتھ زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ کیا چیز ہوتا ہے ــــ بھائی جان اور گرفتار ہوں حوالات اور جیل میں رہیں۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں ــــ ہتھکڑی اور بیڑی پہنیں اور آخر میں ــــ یا اللہ ہم بے کسوں پر رحم فرما!

بھائی جان کے سوا اور کون ہے جو خاندان کے بیس بائیس بڑھوں۔ بچوں اور عورتوں وغیرہ کی کفالت کرے گا۔ ہم میں سے کوئی بھی تو برسر کار نہیں ہے۔ بھائی جان نے لاکھوں روپیہ لکڑی کی تجارت میں کمایا۔ لیکن سب دوستوں اور اہل خاندان کی خدمت میں صرف کر دیا۔ گھر میں کچھ بھی تو اندوختہ نہیں ہے۔ تھوڑی سی جائیداد ہے سو وہ مقدمہ کی نذر ہو جائے گی۔ خدایا تیرے ہی ہاتھ لاج ہے۔ تو ہی اس مصیبت سے نجات دے گا!

بھائی جان، میں، مولانا صاحب اور گھر کے سب چھوٹے بڑے دم بخود سہمے ہوئے اور ششدر سر جھکائے بیٹھے ہیں ــــ گلی میں ہر قدم کی چاپ بار بار چونکا دیتی کہ ــــ پیغامبر آیا اور نہ معلوم کیا خبر لایا۔

سوا بارہ۔ ساڑھے بارہ۔ پون۔ ایک۔ ایک بجکر بیس منٹ ڈیڑھ۔ ایک بجکر پچاس۔ دو بج گئے۔ کچھ لوگ بے چینی میں ٹہل رہے ہیں۔ کچھ مختلف گلیوں کے نکڑوں پر کھڑے تہلا کر رہے ہیں۔ یا اللہ! یا اللہ!!

لیجئے وہ آ گئے! کیا خبر لائے؟" اِں تو کیا ہوا؟"

"جی! تو وہ چار پائیوں پر ڈال کر پہلے کوتوالی اور اُس کے بعد سول ہسپتال دونوں کو لے جایا گیا۔ بڑے بھائی کی حالت نازک ہے۔ خون بہت نکل گیا ہے۔ بے ہوش ہے۔ شفاخانے کے ڈاکٹر بڑی بھاگ دوڑ کر رہے ہیں کہ ہوش آ جائے تو بیان لے لیا جائے۔ . . . .

مضروب کے اعزا۔ اقارب رو پیٹ رہے ہیں" اس اطلاع نے رہے سہے حواس باختہ کر دیئے۔ سناٹا آ گیا۔ جسم میں کاٹو تو خون نہیں۔

لیکن بھائی جان؟ اُب اُن کی حالت تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد بولے:۔

"ارے بھئی تم لوگ اس قدر پریشان کیوں ہو؟ جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے ہمارے اپنے اختیار کی بات نہ تھی ہم نے کوئی بُرا کام نہیں کیا جو کچھ ہوا مجبوراً ہوا۔ آخر چارہ کار ہی کیا تھا!

ہرچہ بادا باد . . . .
بر سرِ اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد

"اچھا مولانا صاحب! آپ کی تکلیف کا بہت بہت شکریہ ـــــ اب آپ جائیں اور آرام فرمائیں"۔ اور بھئی تم لوگ بھی سو جاؤ"

"اِں مولانا صاحب! ایک کام ضرور کیجئے۔ آپ کے بنگلے کے راستہ میں کوتوالی پڑتی ہے کپتان سید حسین کوتوال سے ملتے جایئے اور میرا پیغام دیجئے گا کہ میں گھر پر موجود ہوں۔ صبح ہونے پر حسب معمول ٹال پر جاؤں گا جس وقت چاہیں مجھے بلا لیں"

مولانا نے فرمایا "مناسب"!

اور اس کے بعد تانگہ پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

بھائی جان بھی زنانخانہ میں تشریف لے گئے۔ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کئے اور پلنگ پر خاموش لیٹ گئے اُن کی دیکھا دیکھی گھر کے دوسرے آدمی بھی لیٹ گئے۔ سنا ہے ع

مترس از بلائے کہ شب درمیاں

صبح ہوئی تو سب سے پہلے وہ بوڑھے خان صاحب آئے جو بھائی جان کے ہمراہ ٹال سے اُٹھ کر گئے تھے سلام دُعا کے بعد بولے:

"ارے بھئی سید! رات تم نے بڑا کام نہ کیا اور بھئی مجھے تو تم نے منع ہی کر دیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں پھر جب کہو گے دیکھا جائے گا"

بھائی جان خاموش رہے۔ تھوڑی دیر میں خان صاحب چلے گئے۔ میں نے دریافت کیا "یہ کون صاحب ہیں؟"

بھائی جان نے فرمایا:۔

"یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔ انہوں نے کوتوال شہر کو بازار سنہری مسجد میں گھوڑے پر سے کھینچ کر مارا تھا۔ کئی سال روپوش رہے پھر خود ہی حاضر عدالت ہو گئے۔ ابھی حال میں سات سال کی سزا کاٹ کر آئے ہیں۔ بڑی خیریت ہوئی کہ ہمارے جھگڑے میں انہوں نے دخل نہیں دیا۔

ورنہ نہ معلوم کتنے آدمی مارے جاتے۔ اور دیکھو! میری بات یاد رکھنا۔ اپنی لڑائی کو ہمیشہ خود ہی چکانا چاہیئے کبھی کسی دوسرے سے کام نہ لینا چاہیئے۔ اگر کسی کو مجبوراً مارنا پڑے جیساکہ رات ہوا تو خود اپنے ہاتھ سے مارو۔ کرایہ کے لوگوں سے کام لینا بڑا غلط ہے۔ اوّل تو توازن قایم نہیں رہتا۔ آپ اپنے دشمن کو رفع شر کے لئے معمولی سزا دلانا چاہتے ہیں یہ لوگ سنگین حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ پھر اُن کی طرف سے مقدمہ لڑاؤ۔ اُن کے گھر کا بوجھ اُٹھاؤ۔ ذرا سی کمی ہو جائے تو بدشمن ہو جائیں۔ اپنے ساتھ تمہارا بھی بھانڈا پھوڑ دیں اور اس کے بعد آئندہ عمر بھر تمہارے اور تمہارے متعلقین کے واسطے عذابِ جان بنے رہیں۔"

ہم لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ مولانا سید عبدالودود صاحب تشریف لائے اور آپ سے اسپتال اور کوتوالی کا حال معلوم ہوا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ

"رات میں سب سے پہلے اسپتال گیا۔ سول سرجن سے کافی تعلقات تھے اُس سے مل کر اس کی ہمدردی حاصل کی اور تاکید بھی کی کہ مضروب کی جان بچانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ آج صبح میں اسپتال ہو کر آیا ہوں ——— اللہ کا شکر ہے کہ جان کا خطرہ باقی نہ رہا۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو!"

مولانا صاحب کی لائی ہوئی یہ خوشخبری سرعت کے ساتھ سارے خاندان میں پہونچ گئی ایک ایک نے بہت شکر ادا کیا۔ گھر کی مستورات بالخصوص دادی صاحبہ رات سے دیوانی ہو رہی تھیں اُنہوں نے فوراً نذر نیاز تیاری شروع کر دی۔ بھائی نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اُس کے بعد کوتوالی کا حال مولانا صاحب نے بتایا کہ دفعہ ۳۰۷ ضربِ شدید بہ آلۂ دھاردار کی رپٹ لکھائی گئی ہے۔ اور بعد رپٹ ملازم گیارہ آدمیوں کو ملزم قرار دیا گیا ہے۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ تین چار دور کے عزیزوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ مسٹر سید حسین نائب کوتوال کو رات ہی پورا واقعہ بے کم و کاست معلوم ہو گیا تھا۔ وہ بریلی سے قریب ہی بدایوں کے باشندے ہونے کی وجہ سے بھائی جان اور اُن کی زندگی سے واقف تھے۔ مدعیان کی جانب سے ہر قسم کے دباؤ اور اشتعال انگیزی کے باوجود اُنہوں نے گرفتاری وغیرہ کی کارروائی نہ کی۔ ساتھ ہی مولانا صاحب کی معرفت یہ دریافت کرایا تھا کہ

آلۂ دھاردار کیا استعمال ہوا تھا؟"

بھائی جان نے فرمایا "اس کا تو کوئی وجود نہ تھا!"

"پھر چھری کے سے کاٹ کے زخم کیسے آئے؟"

بھائی جان سوچتے رہے آخر اُنہیں یاد آیا اور کہا:-

"لاؤ میری لکڑی!"

لکڑی جو دیکھی گئی تو اُس کا نیچے کا حصّہ ضربات سے پھٹ کر چھوٹے چھوٹے ہو گیا تھا اور ہر شگاف دھاردار ہو گیا تھا۔ برس ہا برس بکثرت تیل پی ہوئی مرزا پوری لٹھ تھی جو کسی حالت میں نہیں ٹوٹتی ہے، البتہ کثرتِ ضربات سے اُس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے جو بیان کی گئی۔

مولانا صاحب اس انکشاف سے بہت خوش ہوئے۔ بلا تاخیر اپنے تانگہ میں بیٹھ کر اسپتال اور کوتوالی چلے گئے۔

قریب گیارہ بجے سیکیٹن صاحب سائیکل پر ٹال کے پاس سے گذرے۔ سامنے سڑک پر رک کر بھائی جان کو اپنے پاس بلایا اور ایک کاغذ ہاتھ میں دے کر فرمایا :-

"میر صاحب! یہ رپٹ کی نقل ہے۔ اور دیکھیے! آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ آپ نے صبر و ضبط کی حد کر دی ——— کون شریف آدمی اپنے باپ کی توہین برداشت کر سکتا ہے؟"

شام کو مولانا سید عبدالودود صاحب پھر تشریف لائے اور اُن سے خوشخبری ملی کہ وہ بھائی جو زیادہ مضروب ہوا تھا اُس کی حالت اب مزید قابلِ اطمینان ہے اور وہ آلۂ دھار دار والی دفعہ ۳۲۴ ختم ہو کر ۳۲۵ باقی رہ گئی۔ یہ دفعہ بھی کچھ کم سخت نہ تھی مگر ہم تو اس وقت :

بمرگش بگیر تا بہ تپ راضی آید

کے مطابق اس کو بھی غنیمت سمجھے۔ لہٰذا کافی خوشی ہوئی۔

دوسرے روز مدعیان کی جانب سے عدالت سٹی مجسٹریٹ میں استغاثہ دائر کر دیا گیا اور اب ہر دو جانب سے مقدمہ کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ ہماری طرف علاوہ واقعہ کی سنگینی کے دو چیزیں بہت پریشان کن تھیں۔ رفو ملازم بزدلی کا بدترین نمونہ بن گیا۔ ہر وقت روتا اور اس فکر میں رہتا کہ کسی طرح فریقِ مخالف تک اُس کی رسائی ہو جائے اور وہ اپنی خطا معاف کرا کر بھاگ جائے۔ اسی طرح وہ ایک عزیز جن کو ملزمان کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ بھائی جان کے مدت العمر کے احسانات فراموش کر کے اس وقت جانی دشمن بنے ہوئے تھے اور ہر قیمت پر دشمنوں سے ساز کر لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ تقریباً بارہ سال سے میونسپل الیکشن میں اپنے حلقہ سے مولانا سید عبدالودود صاحب کو کامیاب کرانے کے باعث مولانا کی مخالف پارٹیوں کے لیڈروں کو بھی اس وقت انتقام لینے کا اچھا موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔ علاوہ ازیں مدعیان گو زوال دیدہ تھے مگر عالی خاندان ہونے کے باعث ان کے بزرگوں کے کافی اثرات باقی تھے۔ ایک دو اُن کے ایسے بزرگ حیات بھی تھے جن کا شہر میں عام طور پر احترام کیا جاتا تھا۔ آخر الذکر کو مدعیان کا طریقۂ عمل ناپسند تھا مگر بربنائے قرابت قریبی ساتھ دینے پر مجبور تھے۔

یادش بخیر! ہمارے محلہ کے ایک وکیل صاحب کا ان دنوں بڑا طوطی بول رہا تھا۔ قانون دانی میں لاجواب تھے لیکن فطرت نقصان رسانی کی طرف مائل تھی اور وہ دو دھاری تلوار کی طرح دوست دشمن دونوں کو کاٹتے تھے۔ بھائی جان سے ملتے بھی تھے اور ان کو تباہ کرنے کا بھی فیصلہ کر چکے تھے۔ خیر اُن کا تو بھائی جان نے یہ علاج کیا کہ جب اُنکی ریشہ دوانیاں حد سے گزر گئیں تو ایک روز اُن کی کوٹھی پر جا کر اُن کو خوب ڈانٹا پھٹکارا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آئندہ اس معاملہ میں خدائی فوجدار بننا ترک نہ کیا تو پھر پسلی توڑ دی جائے گی اور ایک کے بجائے دو فوجداری کے مقدموں کو بھگت لیا جائے گا۔

مفسد بزدل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا وکیل صاحب سہم گئے اور پھر اُن کی صورت دیکھنے میں نہ آئی۔

فریقین کی جانب سے اب خاص جدوجہد کیس کے متعلق شروع ہوئی۔ فوجداری جہاں ہوئی وہ بازار تھا

اور وہاں ہندو مسلمانوں کی گھنی آبادی تھی۔ سرِ شام پچاسیوں آدمیوں کے سامنے واردات ہوئی تھی۔ ثبوت کے گواہوں کی کیا کمی تھی۔ اس کے علاوہ ہم محلہ ہونے کے باعث مدعیان کے بزرگ اس جگہ کے لوگوں پر کافی اثرانداز تھے۔ ان دنوں حالات اصل معرکہ گواہوں کا تھا سو اس کے لئے یہ ہوا کہ مسلمانوں کا چارج مولانا سید عبدالودود صاحب نے لیا اور ہندوؤں کو ہموار کرنے کی ذمہ داری بھائی جان کے ایک معزز دوست بابو گیا نند چودھری نے لی۔ ان بزرگوں نے دن رات کیسی محنتِ شاقہ کی۔ اپنی جیب خاص سے کس قدر روپیہ صرف کیا اور موقعے کے گواہوں کو توڑنے کے کیسے کیسے جتن کئے زبان و قلم ان کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ شہر اور پولیس کے حلقوں میں شہرت تھی کہ کوشش ہو تو ایسی ہو۔

قصہ مختصر کچھ عرصہ بعد زیر دفعہ ۲۰۲ ضابطہ فوجداری ابتدائی ثبوت کا اسٹیج آیا۔ عدالت سٹی مجسٹریٹ میں مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ اُس روز کمرۂ عدالت، اُس کا برآمدہ اور سامنے میدان فریقین کے حامیوں اور عام تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ مدعیان کو اگرچہ شفاخانے سے نکلے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے مگر اُن کی کمزوری اور نقاہت دیدنی تھی۔ سروں اور ہاتھ پیروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جسموں میں خون نام کو نہ رہا تھا بالکل بلاٹنگ کا کام ہو رہے تھے۔ لڑائی سے پہلے ان کی تیزی و طراری اور اس وقت کی زار و نزار حالت کا کوئی مقابلہ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ عجیب عبرتناک منظر تھا۔

مقدمہ پیش ہوا۔ استغاثہ۔ نقل رپٹ ابتدائی اور ڈاکٹری معائنہ وغیرہ پڑھے گئے۔ پہلے مدعیان کے بالترتیب بیان ہوئے۔ اس کے بعد ثبوت کے تائیدی گواہ طلب ہوئے۔ چھ سات گواہوں کی فہرست داخل کی گئی تھی بہتیرا پکارا گیا ایک بھی حاضرِ عدالت نہ ہوا۔ اس صورتِ حال پر مجسٹریٹ نے دریافت کیا کہ کیا مدعا علیہ آئے ہیں بھائی جان عدالت کے باہر موجود تھے طلبی پر پیش ہوئے اور مجسٹریٹ نے بہ اختیارِ خاص اُن کا بیان بھی لے لیا۔

بھائی جان نے بے کم و کاست سچ سچ واقعہ بیان کر دیا ازاول تا آخر مار پیٹ کی پوری ذمہ داری تنہا اپنے سر لے لی۔ اور کہا کہ

"میں نے جو کچھ کیا حفاظت خود اختیاری، کے خیال سے کیا۔ اگر مجرم ہوں تو صرف میں ہوں۔ باقی میرے ساتھی قطعاً بے قصور ہیں۔ بھائی جان نے مضروبین کے ساتھ بھی اظہارِ ہمدردی کیا اور فرمایا کہ یہ مثل میرے بچوں کے ہیں۔ کاش! یہ اس قدر حد سے متجاوز نہ ہوتے اور یہ درد انگیز صورت سامنے نہ آتی۔"

بھائی جان کا یہ بیان ہمارے مشیرانِ قانونی کی رائے کے بالکل خلاف تھا۔ اس کو سُن کر دوست دشمن حیرت زدہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ عدالت تک متاثر ہوئی اور اس نے فریقین کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگ شریف خاندان اور بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ باہمی تصفیہ کی کوشش کی جائے۔ عدالت آئندہ ہفتہ تک اپنے فیصلہ کو محفوظ رکھے گی۔

بھائی جان کے اعلیٰ کیرکٹر کی خصوصیات سے بڑی

کے ہر طبقے کے لوگ واقف تھے۔ لہٰذا یہ خواہش زبان زدِ خاص و عام ہو گئی کہ اس معاملہ میں راضی نامہ ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ متعدد ذی اثر اصحاب نے اس بارے میں جد و جہد شروع کر دی۔ جو انجام کار بار آور ہوئی اور ایک روز چاندنی رات میں ایک اونچی سی چھت پر مدعی مدعیان اور اُن کے ہمدرد و بہی خواہ ایک دوسرے سے گلے مل گئے۔ مٹھائی تقسیم ہوئی اور چائے نوشی ہوئی۔ بھائی جان نے تلافی مافات میں ایک معقول رقم بھی پیش کی لیکن شریف زادوں نے اُسے قبول نہ کیا۔ اور اُن کی یہ شرافت ہمارے افرادِ خاندان میں آج تک دلی شکر گزاری کے ساتھ یاد کی جاتی ہے۔

دوسرے دن باہمی راضی نامہ بھی پوری خوش دلی کے ساتھ عدالت میں داخل کر دیا گیا۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

کئی ہفتہ تک مبارکبادیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا سید عبدالودود صاحب دردؔ اور منشی اعتماد الدین احمد عرشؔ فاروقی نے قطعاتِ تہنیت لکھے۔ مولانا کا قطعہ یاد نہ رہا۔ عرشؔ مرحوم کی عرش سالانی درج ذیل ہے :-

ہیں سید اسحاق علی میرے بزرگ و محترم
تھے بعض تشویشات کے باعث وہ صد درجہ مغمگیں

لیکن خدا کا شکر ہے وہ بات اب جاتی رہی
اعدا کی ساری کوششیں ناکام مقصد ہو گئیں

ہر چند مشکل کار حد درجہ پر از خطرات تھی
قلبِ حزیں کو کامیابی کا نہ ہوتا تھا یقیں

تھا جن عزیزوں کی وفاداری پہ گونہ اعتماد
افسوس اُنکے بھی طریقے تھے نہایت بدتریں

با ایں ہمہ اللہ نے اپنا کرم فرما دیا
. . . . . نے کیا جو سدِ بابِ بغض و کیں

ہم دل سے اُنکے اس طریقِ کار کے مداح ہیں
اللہ اس نیکی کی دے اُن کو جزائے بہتریں

بس عرشؔ تم اب خاموش ہو ہم داد دیتے ہیں تجھے
تاریخ تو نے کیا کہی ہے فضلِ ربُّ العالمیں

۱۳ ۔ ۴۴

سیّد احمد شہید بریلوی ؒ

"سید صاحب شجاعت میں بے مثال تھے ایک مرتبہ فرمایا کہ میرے لئے جان دے دینا ایسا ہی ہے جیسا تنکا توڑ کر پھینک دینا۔ نواب وزیر الدولہ (والیِ ٹونک) فرماتے تھے کہ گھمسان کے رن میں جب گولوں اور گولیوں کا مینہ برس رہا ہوتا تھا تو آپ اپنے غازیوں کو انتہائی اطمینان کے ساتھ مفید نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی اور چہرے پر شادمانی کی بہار جلوہ گر ہوتی۔ جن معرکوں میں شیروں کا پتہ پانی پانی ہو جاتا، ان میں آپ کی پیشانی یا آپ کے چہرے پر کبھی خفیف سا تغیر بھی رونما نہ ہوتا۔"

(غلام رسول مہر)

جدید چین

(از مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی)

اس سال مجھے یہ موقع ملا کہ ملک چین کا ایک طویل سفر کر سکوں، میں نے پاکستانی علماء کی ایک جماعت کے ساتھ اس وسیع و قدیم ملک کا طویل دورہ کیا، کراچی سے ۹ مئی کو روانہ ہوا، اور ۱۲ جون ۱۹۵۶ء کو واپس آیا، اور اس مدت میں دو تین دن سے زیادہ کہیں ایک مقام پر نہ رہا۔ بلکہ اس شہر سے اس شہر، اس صوبہ سے اس صوبہ کو پرواز کرتا رہا۔

چین اتنا بڑا ملک ہے کہ بھارت سے پانچ گنا رقبہ اور دنیا کی سب سے بڑی آبادی (تقریباً ۵۵ کروڑ) رکھتا ہے، اتنے بڑے ملک کو اس قلیل مدت میں پوری طرح دیکھنا تو ناممکن تھا، ہاں یہ البتہ ہوا کہ جنوب سے شمال تک ہم نے عبور کر لیا، ۸ شہر اور دو تین دیہات دیکھے، تعلیمی و تمدنی جدوجہد دیکھی اور کسی نہ کسی قدر واقفیت وہاں کی زندگی سے بہم پہنچائی۔ اگرچہ زبان کی دقت ہر جگہ حائل رہی، اس لئے کان بہر حال ترجمان کے پابند تھے، لیکن آنکھیں تو اپنا کام کرتی رہیں، ناقص ہی سہی، لیکن ایک طالب علم کے لئے معلومات کا جس قدر حصہ بھی مل جائے غنیمت ہے۔

میں نے اس سے پہلے مشرق وسطے کے ممالک کو دیکھا ہے۔ انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور برما کو ابھی دو تین سال پہلے دیکھ چکا ہوں۔ یورپ کے بھی بعض ممالک کی سیر کی ہے مطلق العنان شاہی کو حجاز میں، جمہوریت کو فرانس میں، محدود شاہی کو عراق میں، نظام پارلیمانی کو انگلستان میں اور عمومیت کو انڈونیشیا میں دیکھا ہے۔ کیمونزم (اشتراکیت) کو صرف پڑھا تھا۔ کبھی عمل میں نہیں دیکھا تھا، ایک طالب علم کی طرح مجھے شوق تھا کہ اس نئے نظام زندگی کو بھی عملی حالت میں دیکھوں، یہی وجہ تھی کہ جب مجھے جمعیتہ اسلامیہ چین کی طرف سے چین کے سفر کی دعوت ملی تو میں نے اس طویل سفر کی صعوبتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فوراً یہ دعوت قبول کر لی، میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چین ایک کیمونسٹ ملک ہے جہاں بیرونی سیاح تو الگ رہا خود چین والوں کے لئے بھی جمہوری ممالک کی طرح شخصی و انفرادی آزادی کے قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ نہ وہاں غیر سرکاری اخبار ہوتے ہیں اور نہ ریڈیو پر بیرونی چیزیں سنی جا سکتی ہیں۔ نہ وہاں آزادی تحریر ہوتی ہے اور نہ آزادی اجتماع، نہ جمعیتیں بنائی جا سکتی ہیں، اور نہ ادارے۔ نہ جلسہ عام ہو سکتا ہے، اور نہ غیر سرکاری فلم اور تھیٹر ہوتے ہیں۔ اس کی بھی مجھے خبر تھی کہ وہاں عوام کے ساتھ کھل کر بات چیت کرنا چاہا ہے

ممکن نہ ہوگا۔ اول تو ایسا موقع ہمارے میزبان کیوں آنے دیتے اور اگر کہیں آ بھی گیا تو ہم ترجمان کے وسیلہ کو بیچ سے کہاں ہٹا سکتے ہیں، یہ ترجمان سرکاری ہی ہوں گے۔ لیکن ان سب باتوں سے واقف ہونے کے باوجود، میں یہ سوچ کر چلا گیا کہ ہماری آنکھیں تو بالکل بند نہ ہوں گی، کچھ نہ کچھ تو ہم دیکھ سمجھ سکیں گے اور حقیقتاً یہی ہوا کہ ہم نے بہت کچھ دیکھا اور چین کو کسی نہ کسی قدر سمجھنے کا موقع مل ہی گیا۔

میں جمعیت اسلامیہ چین (مسلمانوں کا واحد ادارہ زیر نگرانی حکومت چین) کے ارکان، حکومتِ چین اور دیگر متعلقہ سرکاری ادارہ جات کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ہماری مہمانداری کی۔ ہمیں اپنے ادارے دکھائے، اور کوئی ایسی رکاوٹ نہیں پیدا کی جس سے ہم یہ محسوس کرتے کہ چین بھی اسی طرح ایک راز ہے جیسے روس کا وسیع و عریض ملک دنیا کے لئے ایک چیستاں بنا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت جو کچھ دکھانا چاہتی تھی ہم وہی دیکھ سکتے تھے، اور جو کچھ سنانا چاہتی تھی ہم وہی سن سکتے تھے۔ ایسا کوئی موقع نہ تھا کہ ہم بلا واسطہ عوام سے مل سکتے، لیکن یہ تو سارے انتظام کے باوجود ناممکن تھا کہ ہم کسانوں کو کھیتوں میں، طلباء کو اسکولوں میں، مزدوروں کو کارخانوں میں اور عام لوگوں کو سڑکوں پر نہ دیکھتے، آخر فلاکت زدہ لوگوں کی آبادی، پہاڑیوں کے دامن میں جھونپڑیوں کو، اور پہاڑی کے اندر رہنے والوں کو ہماری آنکھوں سے دور تو چھپا دیا جاتا، یہ درست ہے کہ ہم عوام سے نہ مل سکے۔ مسجدوں کے قریب غریب مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے ہجوم جو ہمیں دیکھنے کو جمع ہو جاتے تھے ان کے چہرے ہمیں نظر آتے تھے، ان کے پھٹے پرانے کپڑے، ان کے میلے کچیلے پاؤں، اور ان کے تھکے ہوئے اور سہمے ہوئے چہرے کیا ہمیں نظر نہ آتے تھے؟

بہر حال! ہم نے جتنا ممکن ہو سکا دیکھا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چین صنعتی میدان میں حیرتناک ترقی کر رہا ہے، زراعت میں ابھی ترقی شروع نہیں ہوئی ہے، تعمیرات (سڑک، پل، نہر، بند اور صنعتی و رفاہی عمارات) میں بہت زیادہ اور بہت تیز ترقی ہو رہی ہے۔ ہر جگہ تیزی کے ساتھ کام ہو رہا ہے،

تعلیم میں ترقی کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جا سکتا موجودہ مساعی کے نتائج آئندہ چند سال میں ظاہر ہوں گے مختلف مقامات پر متعدد جدید ادارہ جات تعلیم قایم ہوئے ہیں جہاں بڑی تن دہی کے ساتھ تعلیم و تربیت کا کام ہو رہا ہے۔ ریاض الاطفال بہت سے ہر صنعتی ادارے کے ساتھ، اور ہر بڑی آبادی میں قایم ہو گئے ہیں جہاں ابتدا ہی سے کمیونزم کی تعلیم دی جاتی ہے، کار آمد فنون سکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کام ابھی بڑے شہروں تک محدود ہے۔

روسی کمیونزم کو اپنے ملک میں ایک سخت کلیسائی نظام سے واسطہ پڑا تھا، اس لئے مذہب کے خلاف بڑی سخت جارحانہ خونیں کارروائیاں وہاں ہوتی رہی ہیں، اور ہوتی رہتی ہیں، چین میں بھی پورے معاشی و رفاہی نظام کی باگ ڈور اگرچہ ان ہی فنی ماہرین کے ہاتھوں میں ہے جو روسی ہیں، یا روس کے ماتحت تربیت یافتہ دیگر یورو پین ممالک کے باشندے ہیں۔ لیکن یہ لوگ مذہب کے خلاف کوئی خونیں عمل چین میں نہیں کرتے، اس لئے کہ ان کا



بتاریخ ۲۳ مئی سنہ ۱۹۵۹ء بمقام (اورومچی) دالصدر سنکیانگ (چین)
مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی رکن مجلس عاملہ کانفرنس مشہور و معمر
عالم و مصنف مولانا یوسف صحرائی کے لئے یادگار تحریر لکھ رہے ہیں
(دائیں سے بائیں) مولانا ہاشمی، مولانا [illegible] نائب صدر جمعیۃ اسلامیہ
چین (کھڑے ہوئے) مولانا یوسف صحرائی

ممکن نہ ہوگا۔ اول تو ایسا موقع ہمارے میزبان کیوں آنے دینگے اور اگر کہیں آ بھی گیا تو ہم ترجمان کے وسیلہ کو بیچ سے کہاں ہٹا سکتے ہیں، یہ ترجمان سرکاری ہی ہوں گے۔ لیکن ان سب باتوں سے واقف ہونے کے باوجود، میں یہ سوچ کر چلا گیا کہ ہماری آنکھیں تو پابند نہ ہوں گی، کچھ نہ کچھ تو ہم دیکھ سمجھ سکیں گے اور حقیقتہً یہی ہوا کہ ہم نے بہت کچھ دیکھا اور چین کو کسی نہ کسی قدر سمجھنے کا موقع مل ہی گیا۔

میں جمعیتہ اسلامیہ چین (مسلمانوں کا واحد ادارہ زیر نگرانی حکومت چین) کے ارکان، حکومت چین اور دیگر متعلقہ سرکاری ادارہ جات کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ہماری مہمانداری کی۔ ہمیں اپنے ادارے دکھائے، اور کوئی ایسی رکاوٹ نہیں پیدا کی جس سے ہم یہ محسوس کرتے کہ چین بھی اسی طرح ایک راز ہے جیسے روس کا وسیع و عریض ملک دنیا کے لئے ایک چیستاں بنا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت جو کچھ دکھانا چاہتی تھی ہم وہی دیکھ سکتے تھے، اور جو کچھ سنانا چاہتی تھی ہم وہی سن سکتے تھے۔ ایسا کوئی موقع نہ تھا کہ ہم بلا واسطہ عوام سے مل سکتے، لیکن یہ تو سارے انتظام کے باوجود ناممکن تھا کہ ہم کسانوں کو کھیتوں میں، طلباء کو اسکولوں میں، مزدوروں کو کارخانوں میں اور عام لوگوں کو سڑکوں پر نہ دیکھتے، آخر فلاکت زدہ لوگوں کی آبادی کو، پہاڑیوں کے دامن میں جھونپڑیوں کو، اور پہاڑی کے اندر کوہوں میں رہنے والوں کو ہماری آنکھوں سے دور کہاں چھپا دیا جاتا، یہ درست ہے کہ ہم عوام سے نہ مل سکے۔ لیکن مسجدوں کے قریب غریب مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے ہجوم جو ہمیں دیکھنے کو جمع ہو جاتے تھے اُن کے چہرے ہمیں نظر آتے تھے، ان کے پھٹے پرانے کپڑے اُن کے میلے کچیلے پاؤں، اور اُن کے تھکے ہوئے اور سہمے ہوئے چہرے کیا ہمیں نظر نہ آتے تھے؟

بہرحال! ہم نے جتنا ممکن ہو سکا دیکھا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چین صنعتی میدان میں حیرتناک ترقی کر رہا ہے، زراعت میں ابھی ترقی شروع نہیں ہوئی ہے، تعمیرات سڑک، پل، نہر، بند اور صنعتی و رفاہی عمارات) میں بہت زیادہ اور بہت تیز ترقی ہو رہی ہے۔ ہر جگہ تیزی کے ساتھ کام ہو رہا ہے،

تعلیم میں ترقی کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جاسکتا، موجودہ مساعی کے نتائج آئندہ چند سال میں ظاہر ہوں گے مختلف مقامات پر متعدد جدید ادارہ جات تعلیم قایم ہوئے ہیں جہاں بڑی تن دہی کے ساتھ تعلیم و تربیت کا کام ہو رہا ہے۔ ریاض الاطفال بہت سے ہر صنعتی ادارے کے ساتھ، اور ہر بڑی آبادی میں قایم ہو گئے ہیں جہاں ابتدا ہی سے کمیونزم کی تعلیم دی جاتی ہے، کارآمد فنون سکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کام ابھی بڑے شہروں تک محدود ہے۔

روسی کمیونزم کو اپنے ملک میں ایک سخت کلیسائی نظام سے واسطہ پڑا تھا، اس لئے مذہب کے خلاف بڑی سخت جارحانہ خونیں کارروائیاں وہاں ہوتی رہیں، اور ہوتی رہتی ہیں، چین میں بھی پورے معاشی و رفاہی نظام کی باگ ڈور اگرچہ اُن ہی فنی ماہرین کے ہاتھوں میں ہے جو روسی ہیں، یا روس کے ماتحت تربیت یافتہ دیگر یورپین ممالک کے باشندے ہیں۔ لیکن یہ لوگ مذہب کے خلاف کوئی خونیں عمل چین میں نہیں کرتے، اس لئے کہ ان کا

مقابلہ چین میں کسی مذہبی تنظیم نے کبھی نہیں کیا تھا اور نہ آج کر رہی ہے۔ کلیسائی نظام اور عیسائی مذہب کو چین میں کبھی حاکمانہ اقتدار حاصل نہ تھا۔ اس لئے عیسائیت کوئی مدمقابل قوت نہ تھی۔ چین کے مسلمان آزادی پسند تھے اور اسلام میں کلیسائی تنظیم کے قسم کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ سرمایہ داری کے بھی خواہ چینی مسلمان نہ کل تھے اور نہ آج ہیں، اس لئے کیمونسٹوں کو ان کے خلاف جارحانہ کارروائی کی ضرورت بھی کیا تھی، چین کی اکثریت کا مذہب ایک مدت سے تاؤازم اور شنتوازم ہے جن میں محض دو چار اخلاقی نصائح اور اپنے مورث اعلیٰ کی پوجا کے علاوہ نہ احکام ہیں اور نہ ضوابط، اس لئے چینی کیونسٹوں نے سیاسی اقتدار کے لئے مدمقابل تو دیکھا، مذہبی تنظیم سے کہیں اُن کا ٹکراؤ نہ ہوا۔

چین میں کیونزم کے اصول فلسفہ، لامذہبی اور لادینی کی تعلیم سرکاری طور پر ہر تعلیمی ادارہ میں دی جاتی ہے، اور ہر طالب علم کی تربیت میں انتہائی احتیاط کے ساتھ یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ کارل مارکس، لینن، انجلز اور دیگر اکابر مذہب اشتراکیت کی عظمت کا نقش بچوں کے دماغ پر اچھی طرح ثبت ہو جائے، ان کے علاوہ کسی اور شخص کا ذکر اُن کی تعلیم میں نہ آنے پائے۔

تعلیم میں ان مساعی کو تبلیغ اشتراکیت کے لئے کافی قرار دیا گیا ہے۔ حکومت چین نے عقائد و عبادات پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جسلمان اپنی مسجدوں میں جاتے ہیں۔ اذانیں بھی ہوتی ہیں نمازیں بھی ہوتی ہیں، روزہ نماز، اور حج پر کوئی پابندی نہیں۔ حکومت نے مسلمانوں کی ایک جمعیت "جمعیتہ اسلامیہ چین" کے نام سے بنوائی ہے اسے مساجد کی تنظیم اور ان میں قرآن مجید کی تعلیم کیلئے امداد بھی دیتی ہے۔

اشتراکی نظام کی معاشی خوبیاں چین میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ سارے ملک سے گداگری، چوری قحبہ خانے اور قمار خانے ختم ہو گئے۔ اب چین ان تمام بُرائیوں سے جن کے لئے مدت ناپائدہ رہے عظیم الشان ملک بدنام تھا پاک صاف ہے۔ افیون خور چینی اب محنت کش لوگ ہیں۔ مزدوروں کے لئے ممکنہ آسانیاں مہیا کی جاتی ہیں۔ محنت قانون میں نہیں لیکن عملاً جبری ہے اختیاری پیشہ کی آزادی عملاً ختم ہوتی جارہی ہے ہر شخص وہی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے جو حکومت اس کیلئے مہیا کرے۔

گرانی بڑی شدید ہے۔ ہر چیز کی قیمت کراچی کے بازار سے کم از کم چارگنا ہے، سکہ ختم کر دیا گیا ہے، ایک پیسہ کا بھی نوٹ ہی چلتا ہے۔ زندگی انتہائی سادگی پر آگئی ہے کسی عورت کو سنگھار سے آراستہ یا کوئی زیور پہنے ہوئے نہیں دیکھا؛ نہ کان میں بندے اور نہ انگلیوں میں چھلے، نہ گلے میں مالا اور نہ لپ اسٹک، اور پوڈر،

کیونسٹ نظام کی سخت گیری سے مرعوبیت کے آثار نا سمجھ بچوں کے سوا تقریباً ساری شہری آبادی کے چہروں پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ابھی زرعی یا صنعتی پیداوار میں اتنا اضافہ نہیں ہو سکا ہے کہ عام آبادی کے معیار زندگی پر اس کا اثر پڑتا، اور زیادہ خوشحال زندگی دکھائی دیتی، لیکن موجودہ پانچ سالہ پروگرام کی تکمیل کے بعد کہا جاتا ہے کہ چین کے عوام زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔

مولوی بشیر الدین

از

(مولوی سعید احمد مارہروی)

۲۱ جون ۱۹۵۶ء میں مولوی بشیر الدین صاحب کا ایک سو دو سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ آخر کب تک جیتے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔

مولوی صاحب نے اپنی پوری زندگی قومی و ملکی خدمت میں بسر کی اور اپنے کردار اور کارناموں کے اعتبار سے اُن کا شمار ملک کے چوٹی کے مشاہیر میں ہوا۔ بڑی ناانصافی اور ناشکرگذاری ہوگی اگر انتقال کے بعد ہم اُن کو بھول جائیں اور اُن کی قیمتی خدمات کو فراموش کر دیں۔ لیکن کافی عرصہ کی جدائی کے بعد کراچی میں بیٹھکر اُن پر کچھ لکھنا آسان بھی نہیں ہے۔ مولوی بشیر الدین صاحب ایسے نہ تھے کہ اُن پر کوئی سرسری مضمون لکھ کر فرض سے سبکدوشی حاصل ہو جائے۔ لہٰذا جون ۱۹۵۶ء کے العلم میں ہم صرف بطور تعزیت ذیل کا مقالہ شائع کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو مولوی صاحب مرحوم کے ۱۹۲۹ء تک کے حالات پر مشتمل ہے اور جس کو ہم نے اپنے سہ ماہی علمی رسالہ مصنف علی گڑھ کے شمارہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔

صاحبِ مقالہ مولوی سعید احمد مارہروی بانیٔ "شعیب محمدیہ انٹر کالج آگرہ" کا بھی وصال ہو چکا ہے اس لئے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۶ء تک کے بقیہ ۲۶ سال کے حالات مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم کے عقیدتمندوں کو لکھنے باقی ہیں سو اس کے لئے ہماری نظر پر مولوی محمد امین زبیری صاحب خان بہادر عبد القیوم صاحب ہیڈ ماسٹر الفاتحین صاحب۔ خان بہادر ڈاکٹر مولوی حبیب اللہ خاں صاحب پروفیسر عبد الشکور صاحب اور مولوی ابرار حسین فاروقی صاحب پر پڑ رہی ہیں۔ خلوص طویل تعلقِ خاص کی بنا پر راقم بھی ایک مضمون العلم کی کسی آئندہ اشاعت میں پیش کرے گا۔ بالفعل مولوی سعید احمد صاحب مرحوم کا پہلا مقالہ ملاحظہ ہو۔

(ایڈیٹر)

تمہید مولوی بشیرالدین صاحب بانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میرے مخدوم اور عزیز ہیں۔ مجھے مدت سے اُن کی قومی خدمات اور خانگی زندگی کا کچھ نہ کچھ علم ہے، اور اکثر اُن کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ۸ اپریل ۱۹۲۶ء کو اٹاوہ میں اُن کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ تو بوجہ علالت ضعیف العمری اور پے در پے مسلسل خدمات اور چند غیر معمولی اور پُر درد اسکول کی مشکلات اور پریشانیوں کے اُن کو بہت ہی نحیف پایا۔ اُن کی موجودہ حالت دیکھ کر اور پریشان کن حالات سُن کر قلب پر چوٹ لگی۔ اثنائے گفتگو میں خیال آیا کہ اگر خدانخواستہ یہ چراغِ سحری گل ہوگیا تو اُس کے بہت سے واقعات گمنامی کے پردہ میں چھپ جائیں گے۔ ہماری قوم مردہ پرست ہے اُن کی زندگی میں خدامِ قوم کی قدر نہیں کی جاتی اور اُن پر طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کیا جاتا ہے۔ بمصداقِ قدرِ نعمت بعد از زوال؛ مرنے کے بعد جب اُن کے کارناموں کی قدر معلوم ہوتی ہے تو اُن کے گزشتہ واقعات کی تلاش و جستجو کی جاتی ہے اور اُن کی سوانح عمریاں مرتب و شائع کی جاتی ہیں۔

آج مولوی بشیرالدین صاحب کی عام طور سے کوئی قدر نہیں کی جاتی اور زیادہ سے زیادہ ایک اسکول کے منیجر سمجھے جاتے ہیں اور گویا یہ کام وہ اپنی ذاتی اغراض یا شہرت و نام و نمود کے واسطے کر رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اُن کے واسطے لوگ خون کے آنسو روئیں گے۔ اور اُن کے بے لوث کارنامے فخر و عزت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔

یہ خیال آنے پر مولوی صاحب کے واقعاتِ زندگی کے متعلق میں نے اُن سے چند سوالات کرنے پر جواب دینے کی استدعا کی جس کو بمشکل اور بہ اصرار تمام شرف قبولیت حاصل ہوا اور میں نے ایک کاغذ پر انہیں لکھ لیا کہ کسی وقت داشتہ آید بکار کے مصداق ثابت ہوں۔

یہ نوٹ اب تک میرے پاس پڑے رہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو مولوی بشیرالدین صاحب کا والا نامہ مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء موصول ہوا جس میں نہایت محبت و خلوص آمیز الفاظ کے ذریعہ پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ اٹاوہ کی شرکت کی دعوت تھی۔ دوسرے دن اتفاق سے ایک کاغذ کی تلاش میں یہ یادداشت نظر سے گزری اور فوراً خیال آیا کہ حیاتِ مستعار کا کیا اعتبار، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ضائع ہو جائے لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس کو قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے تاکہ آئندہ مولوی بشیرالدین صاحب کے سوانح نگاروں کے واسطے کار آمد ہوں۔ متذکرہ یادداشت اور ذاتی واقفیت نیز چند گزشتہ تحریروں کی امداد سے یہ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین ہیں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاندان۔ پیدائش بچپن تعلیم

مولوی بشیرالدین صاحب ان شیوخ قریشی سے ہیں جن کا سلسلۂ نسب آنحضرت صلعم کے پھوپھی زاد بھائی اور مشہور صحابی حضرت زبیرؓ سے ملتا ہے اور جو شیوخ زبیری اور ایک مقامی نسبت کی وجہ سے کنبوہ کہلاتے ہیں۔

مولوی بشیرالدین صاحب کا سلسلہ نسب حسب

ذیل پندرہ واسطوں سے حضرت شیخ عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے جو سلطان محمود غزنوی کے زمانہ کے مشائخ اور مجاہدین سے تھے اور اسی زمانہ میں ہندوستان میں آکر ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔

مولوی بشیر الدین ابن حاجی قمر الدین ابن نظام الدین ابن عظیم الدین ابن محمد اعظم۔ ابن جوہر خاں۔ ابن اکرام خاں ابن شیخ محمد۔ ابن راشد علی خاں۔ ابن عمر خاں شہید۔ ابن خواجہ حسن ملتانی المارہروی ابن خواجہ بڈی یا خواجہ بڈھے ابن خواجہ عبدالرحمٰن ابن شیخ عبداللہ ابن شیخ جعفر المعروف بہ محمد ظفر۔ ابن شیخ عبداللطیف

۹۳۱ھ / ۱۵۲۴ء میں خواجہ حسن ملتانی مع اپنے بھائی خواجہ محمد امین کے ملتان سے بسلسلۂ طالب علمی مارہرہ تشریف لائے جو کمشنری آگرہ اور ضلع ایٹہ کا مشہور اور قدیم قصبہ ہے۔ یہاں اس زمانہ میں مخدوم ظہیر الدین قدس سرہ ایک مشہور بزرگ سکونت پذیر تھے جو علوم ظاہری و باطنی میں شہرۂ آفاق تھے ان کی خدمت میں دونوں بھائیوں نے علوم ظاہری و باطنی حاصل کئے اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے ان کے ایک عزیز خواجہ علاء الدین نام پہلے ہی سے حضرت کی خدمت میں موجود تھے اُن کی لڑکیوں سے ان دونوں بھائیوں کا حضرت نے عقد کر دیا اور یہی سلسلہ ان کے قیام مارہرہ کا باعث ہوا۔

مخدوم صاحب کی دعاؤں کی برکت سے ان دونوں بھائیوں اور ان کی اولاد میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی۔ ۹۴۹ھ / ۱۵۴۲ء شیر شاہ سوری نے خواجہ حسن کو پرگنہ مارہرہ کا چودھری اور قانون گو مقرر کیا۔ اُس عہد میں یہ عہدے نہایت معزز اور باوقعت سمجھے جاتے تھے اور جو مالی اختیارات اُن کو حاصل تھے وہ آج کلکٹر ضلع کو بھی حاصل نہیں۔

خواجہ حسن کے بیٹے عمر خاں شہید فضائل صوری و معنوی سے آراستہ اور صلاح و تقویٰ اور شجاعت و بہادری میں شہرۂ آفاق تھے۔ شہنشاہ اکبر اعظم نے ان کے حسن انتظام اور سلیقگی سے خوش ہوکر پانچ ہزار بیگہ پختہ آراضی بنام معافی خاص ملحق آبادی قصبہ مارہرہ مرحمت فرمائی اور اسی آراضی میں انہوں نے اپنا جداگانہ محلہ، مسجد، سرائے اور بازار تعمیر کرایا۔ یہ محلہ اب کنبوہ محلہ کے نام سے مشہور اور قصبہ کا سب سے زیادہ آباد محلہ ہے سنہ ۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء میں عمر خاں کسی سید کی حمایت میں شہید ہوئے۔

عمر خاں شہید کا خاندان بفضلہ تعالیٰ خوب پھولا پھلا اور مدت تک ریاست و امارت اور حکومت کے مزے اُڑاتا رہا جس کا کچھ نہ کچھ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے پردادا عظیم الدین بزرگ کامل۔ ذاکر و شاغل اور اہل معرفت تھے۔ ان کی کرامات کی اکثر روایتیں مشہور ہیں۔

دادا نظام الدین کلکتہ میں کسی عہدے پر متعین تھے جنہوں نے مارہرہ سے ترک سکونت کرکے بانس بریلی میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔

مولوی بشیر الدین صاحب کے والد حاجی قمر الدین مرحوم صوفی مشرب۔ آزاد منش۔ قلندر روش۔ مستغنی المزاج بزرگ تھے۔

مولوی بشیر الدین صاحب کا سلسلۂ نسب ننھیال کی طرف سے نواب خیر اندیش خاں میرٹھی تک پہنچتا ہے جو عہد عالمگیری کے مشہور و معروف امیر تھے اور جن کا خاندان میرٹھ میں اب تک معزز و محترم ہے۔

مولوی بشیر الدین صاحب شعبان ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ حاجی قمرالدین صاحب مرحوم کے ایک دوست نے یہ قطعۂ تاریخ آپ کی پیدائش کے وقت موزوں کیا تھا ؎

حاجی قمرالدین صاحب را خدا کرد عطا از فضل خود نورِ سعید
گفت تاریخ ولادت عارفے عارف باللہ فرزندِ رشید

مولوی بشیرالدین صاحب کے بچپن کے حالات پر لاعلمی کا پردا پڑا ہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوسکا کہ ابتدائی اور فارسی کی رسمی اور مروجہ تعلیم مفتی حافظ اشرف خاں مرحوم میرٹھی سے حاصل کی جو ایک سادہ مزاج مقدس ہستی اور بزرگانِ قدیم کا نمونہ تھے۔

اس کے بعد گورنمنٹ اسکول میرٹھ میں چھٹے درجہ تک انگریزی کی تعلیم پائی۔ اُس زمانہ میں مسلمانوں میں خصوصاً شرفاء میں انگریزی پڑھنا پڑھانا کفر سمجھا جاتا تھا۔ سوائے حاجی قمرالدین مرحوم کے کل خاندان اس تعلیم کا مخالف تھا۔ حاجی صاحب اسکول میں داخل کراتے تھے، اہل خاندان جاکر نام کٹوا دیتے تھے اسی کشمکش میں کسی نہ کسی طرح چھٹے درجے تک پہنچے۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں درجہ کی تعلیم اپنے چچا زاد بھائی قطب الدین صاحب کے ساتھ بریلی کالج میں پائی۔

بچپن میں مولوی بشیرالدین صاحب کو ورزش کرنے اور کشتی لڑنے کا خاص شوق و انہماک رہا۔ قیام میرٹھ کے زمانہ میں مولوی نوراللہ صاحب مرحوم نامی ایک بابرکت بزرگ خیرنگر کی مسجد میں رہتے تھے جو مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے ہمراہیوں میں سے تھے مولوی بشیرالدین صاحب اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ انہیں بزرگ کی فیضِ صحبت سے آپ کے دل میں شرک و بدعات سے نفرت اور توحید سے الفت پیدا ہوئی اور مخلوقِ خدا کی خدمت کے شوق و ذوق کی بنیاد پڑی۔

ملازمت، سرسید سے مخالفت و ارادت وغیرہ

تعلیم سے فارغ ہوکر فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ سب سے پہلے ضلع میرٹھ میں دہلی کے پل جمنا پر محررِ تجارت مقرر ہوئے۔ اس کے بعد میرٹھ کے قومی اسکول میں مبلغ چار روپیہ ماہوار تنخواہ پر اسسٹنٹ یا خلیفہ ہوگئے جہاں بچوں کو انگریزی پڑھاتے اور اسی نسبت سے مدتوں ماسٹر کہلاتے رہے۔ ۱۸۸۰ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

حاجی ممتاز علی خاں مرحوم نے جو میرٹھ کے اصلی باشندے اور قبیلہ زبیری کے مشہور و معروف اور ممتاز بزرگ اور قومی لیڈر اور مذہبی معاملات میں غیر معمولی انہماک رکھتے تھے اٹاوہ کی سکونت اختیار کرلی تھی اور وہاں کے مشاہیر حکام رئیس رؤسا میں شمار ہوتے تھے وہ ابتداء میں سرسید احمد خاں مرحوم کے دوست تھے۔ لیکن جب اُن کی تعلیمی اور مذہبی اصلاحی تحریک شروع ہوئی تو اُس زمانہ کے عام راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی طرح مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ "نجم الاخبار" نام اخبار اُن کے بیٹے حافظ رفیع اللہ خاں مرحوم اور حافظ اعلےٰ صاحب مرحوم کی ملکیت میں اٹاوہ سے نکلتا تھا اور سرسید مرحوم کی تحریک کی مخالفت میں سب سے پیش پیش تھا۔

مولوی بشیرالدین صاحب بھی اُس زمانہ جاہلیت میں اس تحریک کے خلاف تھے اور اخبار "طوطی ہند" میرٹھ میں سرسید کے خلاف مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے ان

مضامین کو دیکھ کر اور پسند کر کے حاجی ممتاز علی خاں مرحوم نے مولوی بشیر الدین صاحب کو سرسید کے خلاف ایک پرجوش نوجوان سمجھ کر ۱۸۸۰ء میں اٹاوہ بلا لیا اور اخبار مذکور کا ایڈیٹر مقرر کر دیا جس میں آپ ۱۸۹۰ء تک سرسید مرحوم کے خلاف دھواں دھار مضامین لکھتے رہے اور اخبار کو خوب چمکا دیا۔ اکتوبر ۱۸۹۶ء تک "نجم الاخبار" کے اڈیٹر رہے اس کے بعد مالکان اخبار اور آپ کے درمیان میں اخبار کی پالیسی کے متعلق اختلاف پیدا ہوا، جس کی وجہ سے اخبار مذکور بند کر دیا گیا۔

فروری ۱۸۹۹ء میں آپ نے اپنا ذاتی اخبار "البشیر" نام کا جاری کیا جو سنہ ۱۹ء تک نہایت آب و تاب اور غیر معمولی شہرت کے ساتھ جاری رہا اور آب آپ کے مسلسل صدمات علالت اور ضعیف العمری کی وجہ سے برائے نام جاری ہے۔

سرسید سے پہلی ملاقات

۱۸۷۹ء میں مولوی بشیر الدین صاحب کو سرسید احمد خاں مرحوم کی شرف صحبت یا بیعت کا فخر حاصل ہوا۔ آپ اب تک محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر سرسید کے مخالف بنے تھے اور اُن کو مذہب و ملت کا دشمن خیال کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا حالی مرحوم کا شہرۂ آفاق "مسدس حالی" شائع ہو چکا تھا اور مخالف اخباروں میں اُس پر لے دے ہو رہی تھی۔ اخبار "تیرھویں صدی" آگرہ میں جو سرسید اور اُن کی تحریک کا سب سے بڑا مخالف تھا اُس کا جواب چھپا۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے اس جواب کو پڑھ کر خود بھی اس پر اضافہ کرنا چاہا۔ اسی عرصہ میں اتفاق سے خان بہادر سید جعفر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی جو سرسید کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے اُنہوں نے "مسدس حالی" مولوی بشیر الدین صاحب کو دیا اُنہوں نے جواب لکھنے کے ارادہ سے اُس کو پڑھا، پڑھتے ہی آنکھیں کھل گئیں اور بجائے جواب لکھنے کے خود شکار ہو گئے۔ طبیعت نے فوراً پلٹا کھایا اور سرسید کی تعلیمی تحریک سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس کے متعلق کچھ عرصہ تک حاجی ممتاز علی خاں مرحوم اور خان بہادر حافظ روح اللہ خاں مرحوم اور دیگر مخالفین سرسید سے بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔

سب سے پہلے ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں آپ نے شرکت کی اور انگریزی کی جو ایسی کتابیں داخلِ نصاب تھیں جن میں اسلام پر حملہ کیا گیا تھا اُن کے نصاب سے خارج کئے جانے کا رزولیوشن پیش کیا۔ اس بحث پر آپ پوری تیاری کر کے گئے تھے۔ سرسید مرحوم نے اس کی تائید میں نہایت پرجوش و پُرزور تقریر فرمائی جس کا کافی اثر آپ پر پڑا۔

اسی زمانہ میں "ٹرسٹیز بل" پاس ہو چکا تھا جس میں سرسید کی جانشینی کے واسطے سرسید کے بیٹے سید محمود مرحوم کو تسلیم کیا جا چکا تھا۔ سرسید اور اُن کے رفیقِ کار مولوی حاجی سمیع اللہ خاں مرحوم کی باہمی مخالفت کا عام چرچا تھا مولوی بشیر الدین صاحب حاجی صاحب کے حامی اور اُن کی موافقت میں مضامین لکھ چکے تھے۔ اسی کانفرنس میں "ٹرسٹیز بل" کی موافقت میں ایک رزولیوشن پیش تھا جس کی مخالفت میں حاجی صاحب کی پارٹی کی تقریریں ہوئیں۔ ان مخالف تقریروں کے بعد مولوی بشیر الدین صاحب کھڑے ہوئے اور ایک پُرجوش صلح کن تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ

اب جبکہ قانون پاس ہو چکا ہے، اُس کے حسن و قبح پر تقریریں کر کے مسلمانوں میں باہمی مزید تفریق پیدا کرنا لاحاصل ہے۔ ایسی کوشش ہونا چاہیے کہ موجودہ اختلاف کا خاتمہ ہو کر مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے۔ تاکہ اصل مقصد کو نقصان نہ پہنچے اس تقریر سے سامعین خصوصاً سر سید مرحوم بہت متاثر ہوئے اور جلسہ کے بعد آپ سے خاص طور سے ملاقات کر کے اس تقریر اور خیال کی تعریف کی اور خواہش کی کہ اس باہمی کشمکش اور تو تو میں میں کی روداد جلسہ یا اخبارات میں اشاعت نہ کی جائے۔ مولوی بشیر الدین صاحب اور سر سید مرحوم کی یہ پہلی ملاقات تھی۔

اس ملاقات کے بعد آپ نے نہایت غور اور تلاش و جستجو سے کالج کے ہر صیغہ کو دیکھا اور یہ معلوم کر کے کہ جو افواہیں سر سید اور کالج کے خلاف مشہور اور پبلک اور اخبارات کا ذریعہ مشغلہ ہیں اُن کا کوئی وجود نہیں اُن کی ہمدردی سر سید اور اُن کی تحریک سے بڑھی جس میں سلسلۂ آمد و رفت شروع ہونے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات ہونے سے برابر اضافہ ہوتا گیا۔

سر سید مرحوم کا رعب ایسا غالب تھا کہ عام طور سے کسی شخص کی ہمت اُن کے خلاف تقریر کرنے یا رائے دینے کی نہ پڑتی تھی لیکن مولوی بشیر الدین صاحب پر یہ رعب غالب نہ تھا اور وہ اکثر معاملات میں نیک نیتی اور مخلصانہ طور سے سر سید کے خلاف تقریر کرتے یا رائے دیتے رہے۔ سر سید عام طور سے اپنی مخالفت برداشت نہ کرتے تھے مگر آپ کے ایثار، محبت اور خلوص کا ایسا اثر تھا کہ آپ کی آزادانہ گفتگو کا بُرا نہ مانتے تھے۔

خطاب خان بہادری

سنہ ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں لارڈ میسٹن صاحب لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ کے عہد حکومت میں آپ کی تعلیمی خدمات کے صلہ میں خان بہادری کا خطاب مرحمت ہوا۔

وظیفہ حیدرآباد

سنہ ء سے سرکار نظام حیدرآباد سے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ عطا ہوا جو اب تک مل رہا ہے۔

قومی خدمات

مولوی بشیر الدین صاحب نے جس ایثار و انہماک سے اپنی تمام عمر مخلوق خدا کی خدمت اور قوم کی فوائد و بہبودی میں صرف کی ہے اُس کی نظیر موجودہ مسلمانوں میں اگر بے نظیر نہیں تو کمیاب ضرور ہے، وہ ایک غریب باپ کے بچے تھے جنھوں نے چار روپیہ ماہوار سے ملازمت شروع کی۔ ابتدا سے لے کر اس وقت تک کوئی زمانہ اُن کا فارغ البالی سے نہیں گزرا طرح طرح کی تکلیفیں اور انواع و اقسام کی پریشانیاں اور مصیبتیں اُنھوں نے اٹھائیں اور اُٹھا رہے ہیں۔ اُن کے راستہ میں بہت سی مخالفتیں اور رکاوٹیں پیدا ہوئیں کئی سال تک صوبہ کا حاکم اعلیٰ اُن کا سب سے بڑا مخالف اور اُن کی گرفت کی فکر میں رہا مگر کبھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی تحریر و تقریر میں جس امر کو سچا اور قوم کی بہتری کا باعث سمجھا اُس کے اظہار میں صداقت و خلوص سے دوست و دشمن یا مخالف و موافق کی تمیز نہیں کی سخت سے سخت خطرے کی حالت میں بھی وہ ثابت قدم رہے اور اُن کا قدم دنیوی مصلحتوں کی لغزش سے پاک و صاف رہا اُن کا دور حیات تا ایں دم مختلف حالتوں میں گذرا۔

ایک زمانہ میں وہ مسٹر سید اور اُن کی تعلیمی اور مذہبی تحریک کے سخت ترمخالفین کی صف میں نظر آتے ہیں تو دوسرے عہد میں اُن کے معتقدین خاص کی مجلس میں ع

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِمغاں گوید

کے مصداق معلوم ہوتے ہیں۔ ایک صوبہ کا حاکم اعلیٰ اُن کو غلطی سے اگر گورنمنٹ کا مخالف سمجھتا ہے تو دوسرا حاکم اعلیٰ ان کی قومی اور تعلیمی خدمات کے صلہ میں خان بہادری کا خطاب مرحمت کرتا ہے، جو علی العموم طبقۂ اُمراء کے واسطے مخصوص ہے۔ باوجود اس کے امرِحق کے اظہار میں وہ کسی کی خوشی یا ناراضگی کی پروا نہیں کرتے اور ایسی مجالس میں بھی جہاں متفقہ طور سے کوئی فرد اُن کی رائے سننے یا ماننے پر آمادہ نہیں۔ ع

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

پڑھتے نظر آتے ہیں اُن کی یہی صداقت اور عادت اُن کو قومی مجنون بنائے ہوئے ہے اور اکثر بزرگ اُن کو اس معزز لقب سے ہی موسوم کرتے ہیں۔

منشی فیض احمد مرحوم نے اپنی کتاب "المشاہیر" میں ان کے اوصاف و کمالات کا مختصر مگر نہایت خوشنما الفاظی کھینچا ہے، فرماتے ہیں:۔

"نہایت ہوشمند، نیک خیال، زمانہ شناس۔ ملک و قوم کی خدمات میں انتہا درجہ کا پُرجوش اپنی دُھن میں اپنی ہستی کو شملۂ عافیت کو برباد کئے ہوئے دیکھنے میں بہت ہی بے تکلف، بھولے درجہ ... سیدھا پُرنہایت ہی آزاد، حب قومی

دلدادہ، ہر دلعزیز، سب کا پیارا، غرضکہ عجیب و غریب شخص ہے۔ نہ صرف اپنے خاندان بلکہ تمام قوم میں اپنے اوصاف خاص میں عزیز الوجود اور اپنا آپ ہی نظیر ہے۔ باوصف نحافت و قصر قامت پُردماغ بلند خیال، عالی ہمت "ہر کہ قامت کہتر قیمت بہتر" اس فقرہ کا پورا مصداق ہے۔ گرہ میں کوڑی نہ پیسہ پر قومی بہبودی کے بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی اور بھاری سے بھاری بوجھ اُٹھا لینے میں نہایت ... قوم کی دُھن ..."

... منشی ... انہوں نے اسکول ... ایک ہزار پانچسو ... فرمایا۔ درجہ تک تعلیم کا انتظام تھا ... ی سنہ ۱۹۰۳ء میں مسٹر ... شش سے اس ... محض توکل ... ماد نہیں لی گئی سنہ ۱۹۳۴ء ... منظور کی گئی۔

... اُن کو مسرت ... اور روز افزوں ... اور ... صنعت ... سے قائم کی تھی جس کے مقاصد ... صنعتوں کے علاوہ صنعت ... ن کی عام ...

... سال اوّل

یوں تو ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے چھوٹے بڑے چندوں اور امداد و ہمدردی سے اسلامیہ اسکول موجودہ درجہ پر پہونچا ہے

سکے بقا و ترقی پر خاص زور دیا گیا تھا۔ انجمن کا ہر ممبر تحریری حلف نامہ داخل کرتا تھا کہ صرف دیسی ساخت کے کپڑے استعمال کرے گا اور امکانی کوشش دیسی مصنوعات کی ترقی میں کرے گا۔ اس انجمن میں پچاس ممبر تھے جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ اٹاوہ میں اس انجمن کی کوشش اور عملی تائید سے صنعت پارچہ بافی کو بہت ترقی ہوئی اور وہاں کی موجودہ مشہور صنعت پارچہ بافی اسی انجمن کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بانیِ انجمن مولوی بشیرالدین صاحب نے ہندوستان کے مختلف مقامات سے دیسی کپڑوں کے عمدہ عمدہ نمونے منگوا کر کپڑے بنوائے اور لاگت پر ممبران میں فروخت کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے صناع بطور خود اس کام کو کرنے لگے چسپے مسلمانوں میں بدقسمتی سے عام طور پر یہ تحریک بار آور نہ ہوئی سرسید مولوی بشیرالدین صاحب اور اُن کے گھر والے نہایت مشغلہ میں اُن کے اب تک پابند ہیں اور سر سے پاؤں تک اُن کی تحریک سے نظر آتے ہیں۔

ہونے اور ایک دوسرے بین صاحب علی العموم سرسید مرحوم

اضافہ ہوتا گیا۔ ؛ ی بلکہ عاشق تھے مگر اکثر مذہبی مسائل

سرسید مرحوم ، مخالف اور اس کو قومی تباہی

سے کسی شخص کی ہمت تھے اور ہمیشہ اپنی تحریر و

کی نہ پڑتی تھی کیر کہ زمانہ کی مدش

نہ تھا اور وہ اکثر معاملات ہوا اور آج

سرسید کے خلاف تقریر کرتے یا لا حلوم

عام طور سے اپنی مخالفت برداشت نہ کر

کے ایثار، محبت اور خلوص کا ایسا اثر تھا کہ آپ کی

گفتگو کا بُرا نہ مانتے تھے۔

متاثر ہو کر اپنی برادری اور احباب کے مشترکہ سرمایہ سے ۱۸۹۶ء میں ایک کمپنی موسومہ "افزائشِ نسل مویشیان" بھی قائم کی تھی جس کا دفتر اٹاوہ میں اور کاروبار مضافات اٹاوہ میں شروع ہو گیا تھا مگر بدقسمتی سے اُسی سال قحط پڑ گیا جس کی وجہ سے غلہ اور چارہ میسر نہ آ سکا اور بہت سے مویشی فوت ہو گئے اور سرمایہ کا بڑا حصہ برباد ہو گیا جس کی وجہ سے مجبوراً کمپنی کو توڑنا پڑا اور آئندہ اس قسم کے کاروبار کی ہمت نہ ہوئی۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ

مولوی بشیرالدین صاحب کی قومی خدمات کا کارنامہ میں سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ جس کو ان کی کرامات کہنا یا سمجھنا زیادہ موزوں ہے "اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ" کا وجود ہے۔ مولوی بشیرالدین صاحب میں قومی خدمات کا شوق و ذوق تو بچپن ہی سے تھا۔ سرسید مرحوم کی صحبت سے اس میں مزید ترقی اور جلا پیدا ہو گئی۔ ۱۸۸۳ء میں وہ بحیثیت اڈیٹر "نجم الاخبار" اٹاوہ آئے۔ جہاں عالمگیر کے عہد میں اُن کے جدِ مادری نواب خیراندیش خاں حاکم تھے جنہوں نے یہاں رفاہ عام کے واسطے ایک عالی شان شفا خانہ تعمیر اور جاری کیا تھا یہاں آ کر انہوں نے مسلمانوں کی عام پسماندگی، افلاس وجہالت کی حالت دیکھی اور یہ معلوم کر کے کہ غدر کے زمانہ یعنی ۱۸۵۷ء سے یہاں گورنمنٹ انگریزی اسکول قائم ہے۔ مگر اب تک صرف ایک مسلمان لڑکا کامیاب ہوا ہے اُن کے تعجب اور افسوس کی انتہا نہ رہی۔ دیسی زبان کے سرکاری مدرسہ میں اُس وقت تک صرف ہندی زبان میں تعلیم ہوتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں پر اس کے دروازے بند تھے پہلی کوشش اُنہوں نے یہ کی کہ حاجی ممتاز علی خاں مرحوم

کے ذریعے سے کوشش کرکے اردو کی تعلیم جاری کرائی اور وہاں مسلمانوں کی تعلیم کا دروازہ کھولا۔ پھر انگریزی اسکول میں مسلمان بچوں کے داخلہ کی کوشش کی مگر اس میں اُن کو ناکامی ہوئی اور آخر میں یہی ناکامیابی اسلامیہ اسکول کے وجود کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم اور مولوی بشیر الدین صاحب میں اخبار نویسی کے سلسلہ سے تعارف حاصل تھا۔ ۱۸۸۸ء میں وہ حسن اتفاق سے اُن سے ملنے اٹاوہ آئے۔ آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اُن کے دوران قیام میں ایک جلسہ منعقد کرا کر اُن کی تقریر کرائی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک "انجمن اسلامیہ" قائم ہو گئی۔

انجمن اسلامیہ اٹاوہ جس کے سکریٹری منشی صادق حسین صاحب مختار اور نائب سکریٹری مولوی بشیر الدین صاحب منتخب کئے گئے۔ اشاعت تعلیم۔ اصلاح رسوم تجہیز و تکفین لاوارثان۔ امداد یتامیٰ اس انجمن کے مقاصد قرار پائے

کچھ مدت تک انجمن کے برائے نام سکریٹری منشی صادق حسین صاحب رہے مگر اصل کارکن اور روح رواں مولوی بشیر الدین صاحب ہی تھے کچھ عرصہ کے بعد اتفاق سے نواب محسن الملک مرحوم حیدرآباد سے اپنے وطن اٹاوہ میں تشریف لائے۔ انجمن کی جانب سے اُن کی خدمت میں ایک ایڈریس دیا گیا جس کے جواب میں موصوف نے ہر قسم کی امداد کا وعدہ اور خوشنودی کا اظہار کرکے ہمت افزائی فرمائی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ مبلغ پانچسو روپیہ کا عطیہ بھی مرحمت فرمایا۔

۱۴ر دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایک کرایہ کے مکان میں چندہ سے اسلامیہ اسکول کا افتتاح عمل میں آیا اور حسب ذیل اسٹاف مہیا کیا گیا:-

مدرس انگریزی ۱۵ ماہوار ایک مولوی ۱۲ ماہوار ایک مولوی ۱۰ ماہوار مدرس قرآن مجید ۵ ماہوار مدرس حساب مـہ/ ماہوار۔

بمشکل گھیر گھار کر چند طلباء جمع کئے گئے۔

اسکول کی موجودہ عمارت کی آراضی مولوی محمد محسن صاحب مرحوم کاکوڑی وکیل مین پوری کی ملکیت تھی اور اُس میں اُن کے دادا کی قبر تھی، اُن کا ارادہ اس جگہ ایک عربی مدرسہ بنانے کا تھا۔ مولوی بشیر الدین صاحب کی استدعا پر اُنہوں نے یہ اراضی اسکول کو دیدی۔

منشی نصیر الزماں خاں صاحب سب انسپکٹر پولیس ساکن رائے پور تحصیل قائم گنج ضلع فرخ آباد سے مولوی بشیر الدین صاحب کی دوستی تھی ۱۸۹۵ء میں ان کے بھائی منشی محمد زماں خاں صاحب وکیل کے مبارک ہاتھوں سے اسکول کی موجودہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی مبلغ ایک ہزار پانچسو روپے کا عطیہ بھی موصوف نے مرحمت فرمایا۔

ابتدا میں صرف آٹھویں درجہ تک تعلیم کا انتظام تھا ۱۸۹۹ء سے ہائی اسکول تک ترقی ہوئی ۱۹۰۳ء میں مسٹر ہارلیسن مشہور پرنسپل علی گڑھ کالج کی کوشش سے اس کا الحاق سرشتہ تعلیم سے منظور ہوا۔ ۱۹۰۳ء تک محض توکل پر کام چلتا رہا اور گورنمنٹ سے کوئی امداد نہیں لی گئی ۱۹۰۴ء سے گورنمنٹ کی امداد لینا منظور کی گئی۔

معاونین اوّل یوں تو ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے چھوٹے بڑے چندوں اور امداد و ہمدردی سے اسلامیہ اسکول موجودہ درجہ پر پہونچا ہے

لیکن اس کی امداد و ہمدردی اور معاونین میں اصحاب ذیل کو اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا فخر حاصل ہے۔ اللہ پاک ان صاحبان کو بہترین جزا مرحمت فرمائے۔ آمین

خان بہادر سید جعفر حسین صاحب انجینیئر۔ حاجی ممتاز علی خاں صاحب مرحوم۔ خان بہادر حافظ روح اللہ خاں صاحب مرحوم۔ میر محمد حسین صاحب شوق۔ میر نثار حسین صاحب سب اور سیر۔ منشی محمد زماں خاں صاحب وکیل منشی محمد طیب صاحب انسپکٹر پولیس۔ شیخ عنایت حسین صاحب مرحوم ممتاز حکیم قربان حسین صاحب سوداگر چرم۔ حافظ محمد حلیم شاہ صاحب سوداگر چرم اور مولانا سید طفیل احمد صاحب سب رجسٹرار۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نہ صرف صوبہ متحدہ بلکہ غالباً تمام ہندوستان کے اسلامیہ اسکولوں میں خاص فوقیت رکھتا ہے، یہ ایک فرد واحد کی جو دنیوی حیثیت سے کوئی وجاہت نہیں رکھتا تھا مسلسل کوشش وہمت اور اولوالعزمی وایثار اور حسن انتظام اور کفایت شعاری کا بہترین نمونہ ہے اس کی عالی شان عمارت مسلمانوں کی موجودہ مالی حالت اور معمولی چھوٹے چھوٹے چندوں کے لحاظ سے مدتوں بانی کی نیک نیتی۔ خوش انتظامی۔ بلند ہمتی اور عمارتی واقفیت کی یادگار رہے گی۔ یہ کوئی معمولی ہائی اسکول یا مقامی درسگاہ نہیں بلکہ اس کی شہرت وحالت مرکزی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہے اور تقریباً ہندوستان کے ہر حصہ اور دور دراز مقامات کے طلبا اس سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ یہ پہلا اور غالباً اس وقت تک آخری اسکول ہے جو علی گڑھ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) کے نمونہ خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا كَدَرْ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اقامتی اصول پر جاری ہے اور جب کے تقریباً کل طلبا بورڈر ہیں جن کی مذہبی، اخلاقی اور تمدنی حالت پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر سید محمود یہیں کے فارغ التحصیل ہیں۔

مولوی بشیر الدین صاحب بدقسمت۔ تنزل پذیر مسلمان قوم کے ایک فرد ہیں جس کے بازار میں ایثار تقریباً نایاب ہے۔ کیونکہ کوئی اس کا خریدار نہیں۔ جس چیز کا کوئی خریدار نہیں وہ بازار میں کہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔ اگر کسی دوسری قوم کے کسی فرد کا ایسا کارنامہ ہوتا تو اس کی قوم اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتی۔ سونے کے تول تولتی، اور اس کی امداد وہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی۔

یہاں کس مپرسی کا عالم ہے۔ مشکلات پر مشکلات مصیبت پر مصیبت، پریشانی پر پریشانی پیش آرہی ہے۔ اخراجات روز افزوں، آمدنی روز کمی پر ہے، بہتیرا چیخا چلایا جاتا ہے مگر کوئی خبر نہیں لیتا کس قدر افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ مسلمان اب تک صوبہ کے اس بہترین اسکول کو بھی اعلیٰ درجہ کا کالج تو کیا معنی انٹرمیڈیٹ کالج تک نہیں بنا سکے۔ اب مولوی بشیر الدین صاحب کے بھتیجے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ نے اٹاوہ میں مستقل سکونت اختیار کر کے کمر ہمت باندھی ہے اور امید کی خفیف مگر خوشنما جھلک نظر آتی ہے۔ خدا کرے کہ ان کی کوششیں جلد بار آور ہوں اور اسکول جلد از جلد کالج کے مرتبہ پر پہنچے آمین

علمی عجائب خانہ

مولوی بشیر الدین صاحب کا دوسرا علمی کارنامہ وہ نایاب علمی عجائب خانہ ہے جو کرزن میوزیم کے نام سے موسوم ہے، اس کا افتتاح سنہ

پروفیسر کریشی صاحب کلکٹر آثار وہ کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس میں نادر و نایاب قلمی کتابیں۔ فرامین اور اکثر دیگر قدیم اسلامی صناعوں کے نمونے جمع کئے گئے ہیں مولوی بشیرالدین صاحب نے تمام ہندوستان میں سفر کرکے یہ بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ فرامین شاہی کا تو اتنا بڑا مجموعہ غالباً ہندوستان میں کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔ افسوس کہ مولوی صاحب کی مسلسل علالت پے در پے خانگی صدمات ضعیف العمری اور اسکول کی دیگر مصروفیتوں کے باعث اس بیش قیمت کتبخانہ اور فرامین کی فہرست جدید طریقہ پر مرتب نہیں ہو سکی نہ ابھی کوئی ایسا مددگار یا ملازم دستیاب ہو سکا جو عمدہ طور سے اس کام کو انجام دے سکے۔

تعلیم صنعت و حرفت

مولوی بشیرالدین صاحب کو صنعت و حرفت کی تعلیم کا بھی خاص خیال ہے اور وہ متعدد اسکیمیں اس کے متعلق بنا اور پیش کر چکے ہیں مگر بیچارے "کا نٹھ نہ مٹھی پھڑ پھڑا اٹھی" کے مصداق ہیں اپنی عالی ہمتی سے ایک مرتبہ پارچہ بافی کا اسکول کھولا جو آخر کار کافی سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد چھت باندھی اور نجاری کا اسکول کھول دیا ہے جو اس وقت تک بفضلہ تعالیٰ جاری ہے۔

مولوی بشیرالدین صاحب کے جملہ قومی خدمات کا انحصار اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے وہ تقریباً ہندوستان کی تمام اسلامی تعلیمی، سیاسی اور مذہبی تحریکات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ہر اجلاس میں شریک ہوئے اور صوبہ اودھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی اور سکریٹری مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور خدا معلوم کس کس دیگر انجمنوں کے ممبر ہیں۔ باوجود پیرانہ سالی نہایت جواں ہمت اور جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ سفر کو بجائے سقر کے باعث ظفر سمجھتے اور ہر ایسے اسلامی جلسے میں جو ان کے خیال میں مسلمانوں کی ترقی اور بہبودی کا باعث ہو سکتا ہے۔ خواجہ خضر کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مدت دراز تک ان کو تندرست اور زندہ رکھے۔ آمین۔

مضمون نگاری اخبار نویسی شاعری

مولوی بشیرالدین صاحب کی عمر دس برس کی تھی کہ ایک مرتبہ ان کے والد بیمار ہوئے یہ ان کی دوا لینے کے واسطے عطار کی دوکان پر جایا کرتے تھے سب سے پہلے وہاں دی میں آپ کو اخبار دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا اور مضمون نویسی کا ذوق و شوق پیدا ہوا ۱۸۸۵ء میں تعلیم کے واسطے بریلی گئے۔ مولوی فدا حسین صاحب مرحوم منصف کے پاس متعدد اخبار آتے تھے وہاں خوب اخبار بینی کی اور سب سے پہلا مضمون اسی سنہ میں "نجم الاخبار" میرٹھ میں شائع کرایا۔ اس کے بعد "کشور یا گزٹ" "سیالکوٹ" "طوطی ہند" میرٹھ وغیرہ اخبارات میں مضامین شائع کراتے رہے۔ اسی زمانہ میں سرسید کی تحریک شروع ہوئی تھی اور اخبارات کا سب سے بڑا مشغلہ اور ذریعۂ اشاعت سرسید کی مخالفت میں مضامین شائع کرنا اور ان پر پھبتیاں اڑانا تھا۔ چنانچہ اسی مضمون پر آپ بھی "طوطی ہند" میرٹھ میں قلم فرسائی فرمایا کرتے تھے۔ ملک میں آپ کے یہ مضامین بے انتہا مقبول اور پسند کئے جاتے تھے جو آپ کی ہمت افزائی کا باعث تھے۔

مضامین ۱۸۸۳ء میں آپ کی "نجم الاخبار" اٹاوہ کی
ڈیٹری کا سبب ہوئے جہاں ۱۸۸۳ء تک زیادہ تر اپنی مضمون
آپ اپنا زورِ قلم دکھاتے رہے۔ ۱۸۸۳ء میں یہ دورِ جہالت
تم ہوا اور آپ سرسید کے نظریۂ سحر سے مسحور ہو کر اُن کے
حلقۂ ارادت میں داخل اور فرقۂ نیچری میں شامل ہوئے۔

"نجم الاخبار" کی اڈیٹری کے زمانے میں آپ موجودہ اصطلاح کے مطابق پکے قوم پرست تھے۔ کانگریس اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور اب بھی بدستور ہیں۔

بشیر اٹاوہ ۱۸۹۰ء میں "نجم الاخبار" کے مالکان سے اخبار کی پالیسی کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور آپ نے اس کی اڈیٹری سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اخبار نویسی یا اڈیٹری کا نشہ ایسا نہیں کہ زائل ہو سکے۔ لہٰذا باوجود بے سروسامانی کے فروری ۱۸۹۵ء میں آپ نے اپنا ذاتی اخبار "البشیر" جاری کیا جو بچپن۔ نوجوانی۔ جوانی کے پُرجوش شاندار مراحل طے کر کے اب شیخوخیت کی حالت میں آپ کی رفاقت کا حق ادا کر رہا ہے۔

اُردو اخبارات میں سب سے پہلے صرف "البشیر" انگریزی خواں معزز طبقہ اور حکام میں مقبولیت عام کا فخر حاصل ہوا۔ اس ہفتہ وار اخبار کے لیڈنگ آرٹیکلوں کا ناظرین کو ہفتہ تک اشتیاق و انتظار رہتا تھا۔ متانت سلامت روی۔ بااصولی۔ قومی ہمدردی اور سرسید کی تعلیمی تحریک کی اشاعت میں یہ بے نظیر اخبار برسوں مقبول عام رہا۔ لارڈ میکڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے اپنے عہدِ حکومت میں جب ہندی کو اُردو کا ہم پلہ بنا دیا اُردو ہندی کے مسئلہ پر متواتر سو کے قریب لاجواب مضامین (لیڈنگ آرٹیکل) اُردو کی حمایت میں اس میں شائع ہوئے مشہور ہے کہ لارڈ میکڈانل صاحب پابندی سے "البشیر" کے مضامین کا ترجمہ اس غرض سے ملاحظہ کرتے رہے کہ کسی قانونی گرفت میں اڈیٹر کو پھانس سکیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

تعلیمی امور میں "البشیر" سرسید مرحوم کی پالیسی کا مقلد اور سیاسی میں مستقل کانگریس کا حامی رہا۔ جو اصحاب اس اخبار کو اس کی جوانی کے عالم میں پڑھ چکے ہیں وہ اب تک اُن کے پرجوش تعلیمی۔ اخلاقی۔ سیاسی اور تمدنی مضامین کو یاد کرتے ہیں۔ "البشیر" کے گزشتہ فائل مولوی بشیر الدین صاحب کی عام اور ادبی قابلیت کی بہترین یادگار ہیں۔

مولوی بشیر الدین صاحب اپنے موجودہ تعلیمی انہماک اور فرائض کی وجہ سے اگرچہ عملاً سیاسی امور سے دستکش ہیں مگر ذاتی طور سے وہ موجودہ سیاسی تحریک کے حامی اور "انڈیا فار انڈینس" (ہندوستان ہندوستانیوں کے واسطے ہے) کے مؤید خاص ہیں۔

شاعری مولوی بشیر الدین صاحب کے کثیر الاحباب اصحاب میں غالباً بہت کم اصحاب کو اس کا علم ہوگا کہ ایامِ جہالت میں آپ کو شاعری کا بھی شوق تھا جس کی ابتدا ۱۸۷۵ء میں بریلی کالج کے کلاس روم میں ہوئی تھی۔ بیکلاس میں زیادہ تر مشق سخن کی مشقیں حل کیا کرتے تھے مشاعروں میں شریک ہوتے اور فخریہ اپنے اشعار سنایا کرتے تھے۔ تاریخ نکالنے کا اچھا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب قومی خدمات کا زیادہ جوش ہوا اور سخن فہمی کی قابلیت پیدا ہوئی تو یہ خیال کر کے کہ میں اچھا شاعر نہیں ہو سکتا شاعری سے توبہ کر لی

اور اپنا تمام کلام ضائع کر دیا۔ آپ نے اپنا تخلص عاقل رکھا تھا۔ آپ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو جو بمشکل تمام مہیا کیا گیا ہے۔ ایامِ جہالت میں سر سید مرحوم کی تعریف یا ہجو میں فرماتے ہیں :-

ڈانٹ کر جاکٹ و پتلون بنے صدر صدور
اُردو ہوتا تمہارا قانون پلٹ دیتے ضرور
پر قرآن میں نہ تغیر تھا خدا کو منظور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

دیگر

منہ میں جلتا ہوا پائپ تھا بنیٹی سے نہ کم
تھا گلوبند و کالر جنہیں پٹہ کہیں ہم
شکل بلڈاگ کی اس وہم سے یا شاہِ اُمم
نسبت اُو بہ سگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

دہر سے یادِ رُخ پر نورِ سرور لے چلا
میں اندھیرے کے لئے مشعل جلا کر لے چلا
داغِ ہجراں دردِ فرقت رشکِ دشمن اشکِ غم
الغرض میں آفتوں کی پوٹ بھر کر لے چلا

....

صدمے کیا کیا عشق کے اللہ اکبر لے چلا
میں نے مجنوں کو اٹھایا مجھکو مجنوں لے چلا
مضطرب کو مضطرب۔ مضطر کو مضطر لے چلا

جب سوا نیزہ پہ ہوگا روزِ محشر آفتاب   مجھ کو ہوگا سایۂ لطفِ پیمبر آستہ

جب میں عاقل بیٹھتا ہوں لکھنے نعت مصطفےٰ
چوم لیتا ہے میرے خامہ کو جھک کر آفتاب

مذہبی اور اخلاقی حالت

مولوی بشیر الدین صاحب بلحاظ خاکساری انکساری

غیر تعصبی۔ سادگی صوفی مشرب ہیں اُن کے کثیر الاحباب اصحاب میں امیر سے امیر اور غریب سے غریب۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ جاہل۔ ہر مذہب و ملت اور مختلف الخیال اصحاب شامل ہیں۔ وہ سب سے اس خلوص و محبت سے ملتے ہیں کہ ہر شخص اُن کو اپنا سچا دوست اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ اُن کی دلی تمنا اور آرزو ہے کہ اُن کے سب احباب اور اسکول و بورڈنگ کے جملہ اساتذہ اور ملازم یکساں طور پر مثل ایک خاندان کے محبت و اخلاص سے رہیں اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے درد دُکھ اور شادی و غم میں شریک ہیں وہ حتی الامکان خود اس پر عامل ہیں اور شب و روز اس کی تحریک میں سرگرم رہتے ہیں۔ مذہباً حنفی المذہب ہیں شرک و بدعت سے متنفر اور سچے توحید پرست ہیں۔ تمام عمر رسوم بد کی اصلاح میں کوشش فرماتے رہے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم گنج مرادآبادی کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوکر شرف بیعت سے مشرف ہوئے اور وظیفہ کے واسطے استدعا کی۔ موصوف نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا موجودہ درود و وظیفہ یعنی خدمات قومی سب سے بہتر وظیفہ ہے مسلمانوں کی خدمت سے بڑھکر اور کوئی وظیفہ نہیں ہوسکتا۔ آپ کے اس ارشادِ عالی سے خدماتِ قومی کا مزید جوش پیدا ہوا اور اب ہ

حال ہے کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اِسی نشہ میں سرشار اور سوچ بچار میں مستغرق رہتے ہیں اور جب کوئی ہمدرد ملجاتا ہے تو قومی معاملات اور تجاویز میں گھنٹوں اُس سے تبادلۂ خیالات کرتے اور اپنے پُردرد دل کی کہانیاں سنایا کرتے ہیں اور ایسے محو ہوجاتے ہیں کہ کھانے پینے تک کی بھی فکر نہیں رہتی۔

درمیانی عہد میں کچھ عرصہ تک قومی خدمات کا ایسا غیرمعمولی جنون بڑھا کہ خودرفتگی کی حالت پیدا ہوکر مذہبی فرائض سے غفلت رہی مگراب عرصہ سے نہایت پابند صوم وصلوٰة اور روزانہ پابندی سے باترجمہ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے اور نکاتِ قرآنی کے سمجھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

اختلافی مسائل میں علمار کی کشمکش اور بحث و مباحثہ اور باہمی مذہبی مناظرہ کو افسوس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہندو منصف اٹاوہ کے اجلاس میں آمین بالجہر کا ایک مقدمہ دائر تھا اُس کی باہمی تو تو میں میں کو دیکھ کر اس قدر رنجیدہ اور خاطر ہوئے کہ اس قسم کے اختلاف دور کرنے کی کوشش میں مختلف علمار سے خط وکتابت شروع کی اور اُن سے ملے مگر کسی پران کا رنگ نہ چڑھا۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے زیرِ صدارت "مدرسہ فیض عام کانپور" میں دستار بندی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے مشاہیر علمار مولانا محمد علی صاحب کانپوری مولانا عبدالحق صاحب مؤلف تفسیر حقانی اور مولانا سید سلیمان صاحب پھلواروی وغیرہ شریک تھے۔ مولوی بشیرالدین صاحب کسی ایسے موقع کی تاک میں تھے فوراً جا پہنچے اور اسی مبحث پر جلسہ میں ایسی پُر درد اور پُرجوش تقریر کی کہ صدرِ جلسہ اور سامعین متاثر ہوکر رونے لگے۔ اسی تقریر کے بعد آپ کی تحریک سے علمار کی کانفرنس کا انعقاد منظور ہوا۔ مولانا محمد علی صاحب کانپوری کی تائید و امداد بھی اس تحریک کی کامیابی کا باعث ہوئی اور اس طرح "ندوة العلمار" کی بنیاد پڑی اور دوسرے سال ندوة العلمار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

اولاد ۱۸۸۸ء میں مولوی بشیرالدین صاحب کی شادی ہوئی اور سنہ ۔۔۔ میں اُن کی رفیقۂ حیات نے ناقتہ سے منہ موڑ کر سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے بشیر احمد اور بشیر پاشا اپنی یادگار چھوڑے۔ مولوی بشیرالدین صاحب کی خانگی زندگی بھی قابلِ تقلید اور لائق داد ہے ان کی عمر کا بہت بڑا حصہ کمال عسرت میں بسر ہوا۔ مگر جہاں تک علم ہے کبھی انہوں نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا اور اپنی آمدنی کے مطابق سادہ سے سادہ طرزِ معاشرت اختیار کرکے اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ غریب اعزا اور دیگر اہلِ احتیاج پر صرف کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ سے اپنے چھوٹوں پر باپ کی طرح شفیق ہیں اور بڑوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ مہمان نوازی غربا پروری اُن کا خاص وصف ہے۔ نام و نمود سے متنفر اور نہایت صابر و شاکر بزرگ اس ضعیف العمری کی حالت میں پے در پے دو جوان شادی شدہ لڑکیوں نے انتقال کیا۔ بڑا لڑکا فاترالعقل ہوگیا چھوٹے اور ہونہار بیٹے بشیر پاشا مرحوم نے جو بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی پاس اور نہایت ذکی۔ بلند خیال۔ عالی ہمت اور صالح نوجوان تھا اور جس سے نہ صرف اُن کے ضعیف العمر

اب بلکہ کل قوم کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں، ایسی حالت میں کہ باپ اور برادری مارہرہ سے اس کی شادی کرکے اور دُلہن کو رخصت کراکر آ رہے تھے اٹاوہ کے قریب ریل سے گر کر ایسا صدمہ اُٹھایا کہ چوتھے پانچویں دن داغِ مفارقت دے گیا یہ پُردرد حادثہ ایسا تھا کہ ضعیف العمر باپ اور اعزا کا تو کیا ذکر جس نے سُنا کلیجہ تھام لیا۔ تمام ہندوستان میں جہاں جہاں اُس مرحوم یا اس کے باپ کے احباب و آشنا تھے ایک تہلکہ مچ گیا۔

اخباروں میں رنج و افسوس اور تعزیت کے پُردرد مضامین شائع ہوئے۔ مگر آفریں ہے اس صابر و شاکر بزرگ باپ پر کہ اس نے ان سب صدمات کو کمال صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا اور قومی خدمات سے منہ نہ موڑا۔
کسی بزرگ نے سچ کہا ہے ؎

آزمائش ہی نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اُسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

(سعید احمد مارہروی)

استخارہ

"سے مراد ادبِ خداوندی بجا لانا ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے اپنے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے متبعین کو ارشاد فرمایا کہ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ یعنی جب قرآن کریم کی تلاوت کرو تو اللہ عزوجل کے نام کے ساتھ شیطان مردود سے پناہ مانگو اور استفادہ و استخارہ و استعانت کے معنی طلب کرنا اور اپنے امور کو حق سبحانہ وتعالےٰ کی طرف سپرد کرنا اور طرح طرح کی آفات و بلیات سے نجات حاصل کرنا ہے اور جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم ارشاد فرماتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قرآن کی موافق استخارہ سکھلایا۔

پس جب بندہ جانتا ہے کہ تمام کاموں کی بھلائی کسب و تدبیر پر موقوف نہیں اور بندوں کی بہتری بجز خداوندِ عالم کوئی نہیں جانتا تو لامحالہ اپنے تمام کاموں کو خدا کی قضا کے سپرد کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور خدا سے مدد چاہنے کی بدولت نفس کی آوارگی اور تکلیف تمام امور و احوال میں دور ہو جاتی ہے اور بہتری و صلاحیت تسکین خاطر کا باعث ہے، پس انسان کے لئے لازم ہے کہ اپنے تمام اشغال میں اللہ عزوجل سے بذریعہ استخارہ مدد لے تاکہ اللہ عزوجل اس کے کام کو خلل اور آفت و ذلت سے محفوظ رکھے"

(داتا گنج بخش ہجویریؒ)

پاکستان کا اسلامی آئین

اقتصادی اور معاشی پہلو پر ایک نظر

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

تحریک پاکستان کی اصل محرکات تحفظ مذہب، ثقافت اور قومیت قرار دی گئی تھی۔ مورخین حال نے تحریک پاکستان کا مبداء اس جدوجہد میں تلاش کیا ہے جو مجاہد اعظم حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور ٹیپو سلطان سے لے کر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء تک مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی رہی۔ احیاءِ ثقافتِ اسلامی کی اس جدوجہد کا مقصدِ وحید قیام پاکستان کے بعد کس حد تک پورا ہوا یہ بحالاتِ حاضرہ ایک المیہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس تحریک کے پس منظر پر طائرانہ نظر ڈال کر قیام پاکستان کے بعد پیش آنے والی صورتِ حالات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ

آئے تھے کیا کرنے اور کیا کر چلے!

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد قدرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کون سے وجوہ و اسباب تھے جو اس خونیں المیہ کے وقوع پذیر ہونے کا باعث ہوئے اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کس نے کی؟ یہ تمام باتیں دوسروں کے لئے محض ضمنی تھیں۔ ہدفِ ملامت صرف مسلمان بنے۔ راس کماری سے لے کر کوہ ہمالیہ تک شاید ہی کوئی خطہ ہوگا جو ان کے خون سے لالہ زار نہ بنا ہو۔ مجرموں کی فہرست میں ان کا نام سر فہرست ہوتا تھا چنانچہ لارڈ ایلن برو نے ۱۸۴۳ء میں لکھا:

"میں اس اعتقاد کی طرف سے آنکھیں
نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی
طور پر ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری
صحیح حکمت عملی یہ ہونا چاہئے کہ ہندوؤں
سے مصالحت کر لیں"۔[1]

سر ولیم ہنٹر نے اس دور کی انگریزی پالیسی کی اس طرح وضاحت کی کہ "غدر کے بعد سے انگریز مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور صرف انہیں کو اپنا باغی سمجھنے لگے"۔[2] لیکن یہ عجب تماشہ تھا کہ

رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے

---

[1] ہندوستان کا مستقبل راجندر پرشاد۔ [2] ہمارے ہندوستانی مسلمان از ولیم ہنٹر۔

ہمارا ذوقِ گناہ سزا کے باوجود کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔

۱۸۶۳ء سے لیکر ۱۸۷۰ء تک صرف سات سال کے عرصہ میں پانچ مقدمات بغاوت مسلمانوں پر چلائے گئے نتیجہ میں گھر بار لٹے۔ جلا وطن کئے گئے، تختۂ دار پر چڑھے لیکن کیا مجال جو پائے استقلال میں لغزش آجائے۔ تیور سے تیور ملائے ہر ہر قدم پر سینہ سپر۔ غلامی اور بے چارگی کا داغ دل سے مٹائے نہ مٹتا تھا۔ کوئی سا بھی سحر سامری مسحور کر کے انہیں ابدی نیند سو جانے پر آمادہ نہ کر سکتا تھا ع

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

۱۸۷۰ء کے بعد ہمارے معاملہ میں ایک خاص پالیسی انگریزوں نے ہندوؤں سے سازش کر کے وضع کی۔ تمام جارحانہ اقدامات ترک کئے گئے اور اب اقتصادی مار کے ذریعہ مفلوج بنانے کا کام شروع ہوا اور وہ اس طرح کہ انکو ترسیل زر کے تمام شعبوں سے نکال کر مفلسی و بیکاری کے اس دردناک عذاب میں مبتلا کیا گیا جس میں عظیم گروہوں کی ذہانت کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور خود اعتمادی و اولالعزمی کے جذبات فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ اس کے لئے دیسی حکمرانوں سے اختیارات لے کر ملکی محاصل اور شاہی خزانوں پر قبضہ جمانے کے ساتھ دولت کھینچنے کے دوسرے ذریعے بھی اختیار کئے جاتے تھے۔ مثلاً ۱۸۱۹ء میں ایک قانون بازگشت کے نام سے جاری کیا گیا جس کے ذریعہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ اختیار حاصل کیا کہ تمام لاخراج زمینوں پر جو مغل بادشاہوں نے رعایا کو دی تھیں کمپنی اپنے دخل میں لے لے۔ جس وقت یہ قانون پاس ہوا اس وقت بنگال میں ۹۵ فی صدی مسلمان زمیندار تھے لیکن قوانین مذکورہ کے نافذ ہوتے ہی دس سال کے عرصہ میں تناسب بالکل برعکس ہو گیا۔ اور مسلمان زمینداروں کی تعداد پانچ فی صدی رہ گئی[1]

بنگال میں وہابی تحریک کی ناکامیابی کے بعد انگریزوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے مسلمان جاگیرداروں اور انعام داروں کی تمام املاک جو وسعت میں تمام بنگال کا ایک چوتھائی حصہ تھیں۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے ضبط کر لیں۔ سیکڑوں خوش حال خاندان نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے ہزاروں افراد عالم بیکسی و مفلسی میں دربدر پھرنے لگے[1]

ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانوں کے معاملہ میں اس قسم کی ناانصافی کے بارے میں تحریر کیا۔

"انگریزی حکومت کے شروع میں سرکاری ٹیکسوں کی وصولی کا کام آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا اور یہ تقریباً اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۸۳۰ء کے شروع تک بنگال کے کسی اچھے خاندان کے مسلمان کا غریب ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ دولت کے چشمے جو ہمیشہ جاری رہتے تھے مسلم گھرانوں کے صندوقوں کو لبریز رکھتے تھے۔"[1]

مسلمانوں کو اقتصادی طور پر ناکارہ اور مفلوج بنا کر اُن کو تمام ملکی اور سیاسی تحریکوں سے علیحدہ کر دینے کا حربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

پوری قوم پر یاس انگیز خوف و ہراس طاری ہو گیا ہندو ہر قسم کے تعلیمی اقتصادی اور نیابتی حقوق کے لئے مطالبہ

[1] سیاست ملیہ از مولوی محمد امین زبیری
[2] خطبہ صدارت سر عبدالرحیم صدر اجلاس مسلم لیگ ۱۹۲۵ء

اور جدوجہد کرتے۔ لیکن مسلمان بیچارگی اور مظلومی کی مجسم تصویر بنے برصغیر کے دور افتادہ علاقوں میں اس طرح سر چھپائے بیٹھے تھے کہ ان کا عدم وجود برابر تھا۔

کسی قسم کے حقوق کا نام زبان پر لانے سے لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ مبادا ان کی وفاداری آقاؤں کی نگاہ میں مشکوک ہو جائے اور محض زندہ رہنے کی جو اجازت مل گئی ہے اس کے بھی لالے پڑ جائیں۔ بازو شل اور زبانیں گنگ ہو گئی تھیں سکرات کا سا عالم طاری تھا۔

زباں جلالی کئے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بندوبست ہوئے تھے میری دعا کیلئے

مالی و اقتصادی اعتبار سے وہ جس تحت الثریٰ میں گر گئے تھے ڈاکٹر ہنٹر اس کے بارے میں رقمطراز ہے:۔

"اب تک وہ وقتاً فوقتاً قومیت اور جنگجویانہ حوصلہ مندیوں کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں مگر تمام دیگر امور میں وہ انگریزی حکومت میں ایک برباد شدہ قوم ہیں"[1]

لیکن سرسید اور ان کے رفقاء کار کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک نے اس صورت حال کو بدلا اور مسلمانوں کو کچھ تھوڑی سی مراعات حاصل ہوئیں اور اس امر کی اجازت ملی کہ عرضداشتوں اور ڈیپوٹیشنوں کے ذریعہ اپنے دکھ درد کا اظہار کر سکیں۔ چنانچہ مسلمانان اڑیسہ نے جو عرضداشت وہاں کے انگریز کمشنر کو دی تھی وہ برصغیر کے تقریباً تمام مسلمانوں کی حالت پر منطبق ہوتی تھی:

"اصل یہ ہے کہ اڑیسہ کے مسلمان اس قدر پس دیئے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی سرکاری ملازمت سے خارج ہو جانے کے بعد ہم مفلسی اور اور مایوسی کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپیہ ماہوار کی نوکری میسر ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے دور دراز مقامات تک سفر کرنے اور ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کو بخوشی تیار ہیں"

مسٹر ای۔ سی بیلی سکریٹری گورنمنٹ ہند نے لکھا تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنی پرانی قسم کی تربیت پر بھروسہ رکھنے کے باوجود اپنے کو حکومت کے عہدوں اور منافعوں سے محروم پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تمام منافع کے کام قابل نفرت ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں۔ اچھے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل بے چینیوں سے لبریز ہو گئے ہیں"[2]

اب تک ہر ایک قسم کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی مراعات جو ملی تھیں ان پر استحقاق صرف برادران یوسف کا تھا۔ ملک کی تمام دولت جو سول سروس کی بڑی بڑی تنخواہوں، فوجی ٹھیکوں اور انگریزی فوج کے مصارف کثیر پر خرچ ہو جانے کے بعد بھی وہ ہندو کا حق ٹھہرتی چنانچہ مسٹر مارلیس پرنسپل علی گڑھ کالج نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو اقتصادی مسائل کی

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان مصنفہ ڈاکٹر ہنٹر

[2] روشن مستقبل ص ۱۰۶

طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان پھر تعلیم یافتہ اور دولتمند ہو جائیں تو بمقابلہ ان حقوق کے جو وہ بیس پچیس سال میں حاصل کریں تعلیم یافتہ اور دولت مند بننے میں انہیں زیادہ قوت حاصل ہوگی"۔ ۱

چونکہ ابھی تک مسلمانوں کا کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہ تھا۔ لہٰذا سیاسی حیثیت سے ان کا عدم وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ وقت کی اس سب سے بڑی کمی کو محسوس کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دسمبر ۱۹۰۶ء کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی جس سے وہ اس قابل ہوئے کہ ایک جداگانہ پلیٹ فارم کے ذریعہ اپنے حقوق کے لیے جد و جہد کریں۔

دراصل انگریزی عہد کے آغاز سے مسلمانوں کو مطلب برآری کا ذریعہ بنا کر جو ناانصافیاں کی گئی تھیں ان کا یہ بہت ہی موثر اور مدلل جواب تھا۔ جو مسلمانوں نے دیا؎

ڈر تھا کہ کہیں نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے لٹے دورِ زماں میٹ رہا ہے

مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں ضم ہو جانے سے بچانا اس دور کے مسلم زعماء کا بہت بڑا قومی و ملی کارنامہ تھا جو انہوں نے انجام دیا۔ ہندو مہاسبھا کہتی تھی کہ

"سوراج حاصل کرنے کے لیے ہمیں مسلمانوں کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہماری یہ خواہش ہے کہ ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے"۔ ۲

۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتوں کا دور ایک ہلکا سا نمونہ تھا۔ اس حکومت کا جو آگے چل کر متحدہ قومیت کی بنیادوں پر اکثریت والی جماعت قائم کرنے والی تھی اور جس کا اچھی طرح سے تجربہ کرنے کے بعد مسلمانوں میں علیحدہ نظریۂ قومیت کا نشو نما ہوا اور وہ مسلم لیگ کی واحد کوششوں سے اکثریت میں ضم ہو جانے سے بچے، ۱۹۰۸ء سے جس قدر حقوق و مراعات حاصل ہوئے تھے اس سے نام نہاد متحدہ قومیت کے اجارہ دار فائدہ اٹھاتے تھے اور مسلمان اُن سے جوں کے توں محروم تھے آخر تنگ آمد بجنگ آمد کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس مسلم لیگ میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں علیحدہ نظریۂ قومیت کے جواز میں فرمایا؛

"لفظ قوم کی تشریح و تعریف خواہ کسی طریقہ پر کی جائے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں اپنا علیحدہ وطن اپنا علیحدہ علاقہ اور اپنی جداگانہ ریاست ملنی چاہیے"۔

لیگ کی قیادت کی باگ ہاتھ میں لیتے ہی مسلمانوں کی اقتصادی و معاشی بدحالی نے قائداعظم کی پوری توجہ اُس کی طرف منعطف کرالی تھی چنانچہ انہوں نے لیگ کا جو مینی فسٹو شائع کیا اُس میں مرقوم تھا کہ

"ملک کی اقتصادی لوٹ کو روکا جائے گا ملک کے گرانبار اخراجات کو گھٹایا جائیگا فوج کے اخراجات کو گھٹا کر اسے قومی بنایا جائے گا۔ سکہ و شرح تبادلہ کا

---

۱ نامعلوم مستقبل

۲ ہندوستان کا مستقبل ص۳۱

خیال رکھا جائے گا کہ غریبوں کے بار کو گھٹایا جائے گا۔"

نیز انہوں نے اعلان کیا کہ پاکستان میں آمدنی کے ذرائع اتنے ہوں گے کہ وہ آسانی سے ایک بڑی طاقت بن سکے گا۔ پاکستان کی بڑی صنعتیں اور کارخانے سوشلزم کے اصول پر حکومت کے قبضہ میں دیئے جائیں گے پاکستان کی آمدنی مساوی ٹیکس عائد کر کے وصول کی جائے گی۔

• قیام پاکستان کے بعد قومی اسمبلی میں اپنی پہلی تقریر میں فرمایا،

"اس وقت ہندوستان پر جو بڑی لعنتیں مسلط ہیں ان میں رشوت اور بے ایمانی بھی شامل ہے۔ انہیں فولادی پنجہ سے ختم کر دینا ہے چور بازار والوں کو شدید سزا ملنی چاہئے۔ ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم ایک ریاست کے باشندے اور مساوی باشندے ہیں"

لیکن عین اس وقت جبکہ سفینۂ ملت کا یہ ناخدا ہمارے لئے ایک ایسی نئی دنیا کی تشکیل میں مشغول تھا جسے ظلم ہر گز نا انصافی جو نا جائز استفادہ خود غرضانہ حرص لالچ اور مفلسی سے بالکل پاک ہو گی جس میں کسی قسم کا امتیاز شہری حقوق اور اقتصادی فوائد کے معاملات میں نہ ہوگا۔

عین اس وقت قضا و قدر کا فرستادہ پروانۂ سفر لئے اس کے گرد منڈلا رہا تھا۔ ۱۲ مہینے کا قلیل وقفہ سالہا سال کے قومی و ملی نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کس قدر ناکافی تھا۔

اس قدر جلد قائد اعظم کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک بہت بڑا المیہ اور ایک جانگداز سانحہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر کی تقسیم میں انگریز نے کھلی ہوئی نا انصافی کا ثبوت دیا۔ اس کے پورے رقبہ کا پندرھواں فیصدی غیر ترقی یافتہ علاقہ پاکستان کے حصہ میں آیا ۲۲ کروڑ کے لئے ۸۵ فی صدی اور دس کروڑ کے لئے صرف ۱۵ فی صدی۔ اور پھر اس پر ہماری قومی غربت کا یہ عالم کہ بقول مسٹر کیلورٹ صرف پنجاب میں مہاجنوں کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء میں لائل پور کے کسانوں کا اوسط آمدنی ۱۵۴ روپیہ فی خاندان سالانہ تھا اور اخراجات زندگی ۹،۴ روپئے جو کمی تھی وہ قرض لیکر پوری کی جاتی تھی۔

لیکن شومئ قسمت سے پاکستان بننے کے آٹھ سال کے دوران میں جو جماعتیں برسر اقتدار آتی رہیں انہوں نے تمام ذرائع پیداوار اور قومی دولت کے دوسرے اسباب و وسائل کو صرف ایک مخصوص طبقہ کے لئے محدود رکھا حالانکہ ان کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ دو سو سال سے ہم مسلمانوں پر کشائش رزق کے تمام دروازے بند رکھے گئے ہیں اور اس دوران میں برصغیر کی قومی دولت میں ہمارا حصہ پانچ فی صدی بھی نہیں رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ قیام پاکستان کے شروع ہی سے عام استعمال کی اشیاء کی قلت جاری ہے۔ اور سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۵۶ء تک گرانی میں تین سو فی صدی اضافہ ہوا جبکہ قومی آمدنی فی کس جو بیس روپے ایک آنہ چار پائی

سے آگے نہیں بڑھی۔ لاکھ تدبیریں کی جاتی ہیں لیکن معاشی بحران ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا۔ اصلی جمہوریت یہ ہے کہ عوام اور ریاست کے مفاد میں کوئی تصادم نہ ہو دونوں کے مفاد کلیتہً ایک ہوں۔ درحقیقت قوم انسانوں کے پائیدار مجموعہ کا نام ہے جو ایک ملک میں رہتے ہوں۔ اقتصادی زندگی میں ایک دوسرے کے شریک ہوں اور جن کی مشترکہ تہذیب ہو۔ لیکن آٹھ سال سے یہاں جو صورت حال رونما ہے وہ اس کے برعکس ہے۔

قومی دولت و امارت کی تقسیم جس طریقہ پر کی گئی ہے اس سے یک جہتی کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوتا۔ کام اور معاوضوں کی اس طرح تقسیم کرنا کہ اس کا کوئی فرد بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ رہے۔ ایک جمہوری حکومت کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے۔ قائداعظم فنڈ۔ بہار ریلیف فنڈ اور مہاجر فنڈ کا کروڑوں روپیہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ اگر ان ہی فنڈوں سے عوام کی غربت دور کرنے کی کوشش کی جاتی تو ملک اس غیر مطمئن صورت حال سے دوچار نہ ہوتا جیسا کہ وہ اس وقت مبتلا ہے اور جس کے بارے میں منصوبہ بندی بورڈ نے اپنی رپورٹ میں کھلے ہوئے الفاظ میں کہا ہے کہ ہم پاکستان میں ہنوز جمودی حالات سے گزر رہے ہیں یہ صورت حال ہمارے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ان قوتوں کو جو آگے بڑھ رہی ہیں روکنے کے لئے اقدام نہ کیا گیا اور ملک میں حالات کی رفتار کا قریب سے جائزہ نہ لیا گیا تو بہت نقصان ہوگا۔[۱]

فی زمانہ تمام دنیا کے جمہوری ملکوں میں یہ قاعدہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنے یہاں ایک مقررہ معیاری زندگی بسر کرنے کے لئے تمام ملکی حالات کا جائزہ لے کر اس کے مطابق معاوضہ مقرر کرتے ہیں کیونکہ اخراجاتِ زندگی اور آمدنی خواہ وہ حکومت کی جانب سے ہوں یا انفرادی محنت سے حاصل کی جائیں دونوں صورتوں میں ان کا تصادم پورے معاشرہ کو ناقابل عبور مشکلات میں ڈال دیتا ہے۔ لوگ تنگ آکر ناجائز طریقوں سے تحصیل زر کا کام شروع کردیتے ہیں۔ جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مجھکو باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا کہ سندھ کی ایک ریاست میں صرف چند پیسوں کیلئے ایک شخص نے قتل کی واردات کی۔ گرفتاری کے بعد اس نے بتایا کہ میں نے کئی وقت کے فاقے ہو جانے کے بعد یہ کام کیا تھا۔

کم تنخواہ پانے والے ملازمین کلرک۔ چپراسی اور چوکیدار وغیرہ ہوتے ہیں مثلاً ہمارے یہاں مہنگائی کی زائد اُجرتیں ملاکر کلرکوں کو ایکسو دس اور چپراسیوں کو ۴۶ روپے دیئے جاتے ہیں جبکہ روپے کی قیمت ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں مشکل سے چار آنے رہ گئی ہے۔ مصارف زندگی کا اندازہ ۴۴-۱۹۴۳ء سے پاکستان میں حسب ذیل ہے:

لاہور	فی کس	۹۱ روپیہ
کراچی		۹۶ "
نرائن گنج	"	۱۰۸ "

گرانی کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ملک میں اس وقت جس قدر

۱؎ جنگ ۳ مئی ۱۹۵۶ء

غذائی اجناس پیدا کر رہا ہے وہ صرف نوّے فی صدی آبادی کے لائق ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ جب کسی محکمہ میں خسارہ ہوتا ہے تو تخفیف کی زد سیکڑوں چھوٹے ملازمین کو بیکار کر دیتی ہے۔ گزشتہ سال سرکاری محکمے سیکڑوں کلرک کمی کا شکار ہوئے۔

انگریزی تعلیم یافتوں کی تعداد دس فی صدی ہے لیکن ان میں بھی بیکاری پھیلی ہوئی ہے۔ پچھلے سنہ میں چار سو کلرکوں کی جگہ کے لئے سولہ ہزار درخواستیں موصول ہوئیں۔ مہنگائی الاؤنس جو دیا جاتا ہے اس میں آمد و خرچ کے توازن کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ۵ نومبر ۱۹۵۳ء کو سابق وزیر صنعت خان عبدالقیوم خاں نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی بہبودی کے لئے جو دس لاکھ کی رقم رکھی گئی تھی اس میں سے صرف ایک لاکھ ۸۹ ہزار روپئے خرچ کیئے گئے۔ سچ ہے استغنا ہو تو ایسا ہو۔

دُنیا کے تمام ملکوں میں اہل علم و دانش کا طبقہ ایک امتیازی اور خصوصی سلوک کا مستحق سمجھا جاتا ہے مختلف طریقوں سے اُن کی پذیرائی کی جاتی ہے ان کے علم و فن سے استفادہ کرنے کے لئے خوش منظر اور پرسکون مقامات پر ریسرچ اکیڈیمیاں قائم کی جاتی ہیں جن میں وہ یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر تحقیق و تدقیق کا عملی کام کرتے ہیں۔ گذارہ کے لئے بیش قرار وظائف سفر و حضر کی جملہ سہولتیں بہم پہنچانا اداروں یا حکومت کے ذمہ ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ طبقہ قومی جسم میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا وجود قوم کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ افراد قوم کو ذہنی اور دماغی تربیت دے کر ان کے کیرکٹر کو اخلاقی سانچوں میں ڈھالنا معاشرہ کو انسانیت کے اصول و قوانین سکھا کر انہیں زندگی بخش حرارت پیدا کرنا انہیں کے ذمہ ہوتا ہے۔

لیکن آٹھ سال سے اس طبقہ پر وہ بپتا پڑی ہے کہ خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے انہیں کی تحریروں نے مسلمانوں میں وہ سیاسی شعور پیدا کیا جس کے نتیجہ میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ انگریز کی شاطرانہ سیاست اور ہندو کی پُرفریب ذہنیت سے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی دن کا چین راتوں کی نیندیں قربان کیں۔ لیکن آج اُنکے تخیلات کی دُنیا اُن کے نظریوں کی بہشت بریں لاکھوں انسانوں اور ہزاروں حسرتوں سے بنایا ہوا وطن ثانی اُنہیں کے لئے دیارِ غیر بنا ہوا ہے۔ علمی و ادبی محفلیں اُجڑی پڑی ہیں تحقیق و تدقیق کے دروازے بند ہیں اور یہ تباہ حال لوگ جہاں تہاں زندگی کے دن گذار رہے ہیں ایک طرف علمی کاوشوں نے ذہنی اور دماغی اعتبار سے اس بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ جبکہ انسان کاوش ہی اُس کا مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔ دوسری طرف درباریوں کے آداب و رسوم سے نابلد نقطۂ نظریہ کہ علم و فن صرف خدمتِ انسانیت کے لئے ہے جس کی وجہ سے زبان و قلم مصلحت بینی و دور اندیشی سے دور لہٰذا کوئی سا بھی موسم ہو انہیں سازگار نہیں۔ محروم و معتوب۔ غم خوری و مہجوری اُن کی قسمت میں لکھ گئی ہے کب لکھیں۔ کیسے لکھیں۔ کس کے لئے لکھیں جبکہ ان کے بہتر سے بہتر افکار رعالیہ کو پڑھنے کی کسی کو فرصت نہیں۔ بڑے بڑے جادو رقم اور شگفتہ نگار ادیب صحافی اور صاحبان قلم کس حال میں ہیں کسی کو معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔

سوچتی ہوں یا اللہ! ان کے قلموں کی روانی اور شوخی کو کس دشمن کی نظر لگ گئی جو اس طرح خاموش ہو گئے ہیں۔ حکومت کی جانب سے اگر ہمارے ادیبوں اور دانش وروں کی کبھی کبھار تھوڑی سی پوچھ گچھ ہوتی بھی ہے تو اس طرح کہ کوئی ایسا تحریری کام جس سے ان کے علم و فن کو دور کا بھی تعلق نہ ہو سپرد کر دیا جاتا ہے ع

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

برطانیہ نیز دوسرے جمہوری ملکوں میں سنہ ۱۹۱۰ء سے قانون بحالی غربا رائج ہے جس کے تحت غیر مستطیع اور کام کرنے کے ناقابل لوگوں کو وظائف دیئے جاتے ہیں لیکن پاکستان میں اس اہم مسئلہ کی جانب ہنوز کوئی توجہ مبذول کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے چنانچہ مملکت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں جذامی۔ نابینا اور اعضا بریدہ انسان نیم حیوان کاسۂ گدائی لئے نظر نہ آتے ہوں۔ پچھلے دنوں بین الاقوامی میلہ میں حدود نمائش کے شروع سے لے کر آخر تک درجنوں اعضا بریدہ اور ہر قسم کے امراض متعدیہ میں مبتلا انسانی لیڑے جگہ جگہ سہ پہر سے ڈال دیئے جاتے تھے۔ ایک روز واپس ہوتے ہوئے کیا ہوش ربا منظر دیکھنے میں آیا ان نیم جان لاشوں کو اٹھانے کا اہتمام ہو رہا ہے وہ بھی اس طرح کہ ڈھکیل پر اٹھا کر رکھ رہے ہیں جیسے کوئی باربرداری کا سامان ہو۔ دن بھر کی سخت پتھریلی ٹھنڈی زمین، تیز و تند ہوا۔ از سر تا پا برہنہ۔ اس پر رنگ رنگ کی آوازیں نکالنے کی مصیبت نے مظلوموں کو ادھ موا کر دیا تھا۔ تیرگئ شب میں بے رونق چہرے۔ ملتجی نگاہیں۔ عجب خوفناک اور روح فرسا منظر پیش کر رہی تھیں سنسان فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہوتا معلوم ہوا۔ یا اللہ! کیا ملکی دولت پر اس کے ناکارہ لوگوں کا اس قدر بھی حق نہیں ہے کہ وہ ان کو اس ذلت و خواری سے بچا کر ان کے صرف زندہ رہنے کا تھوڑا سا سامان بہم پہنچا دے۔ بارے شکر ہے! کہ گزشتہ ماہ از راہ غربا پروری کراچی کارپوریشن نے طے کیا ہے کہ وہ لاوارث لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کام کرے گی۔ زہے نصیب کچھ تو پذیرائی ہوئی ؎

نظر لگے نہ کہیں انکے دست و بازو کو

اس تمام خرابی کا سبب مہاجرین کی کثرت سے آمد اور ایک غیر ترقی یافتہ علاقہ پر غیر معمولی بار بتایا جاتا ہے نیز یہ بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہم صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنے کی عادت اگر ڈال لیں تو غربت و امارت کا موجودہ احساس سرے سے ختم ہو جائے درحقیقت یہ تمام دور از کار دلائل ان ناانصافیوں اور حق تلفیوں کی پردہ پوشی کیلئے ہیں جو ہمارے ۹۵ فی صدی عوام کے ساتھ اب تک ہوتی رہی ہیں۔ انگریزی عہد حکومت کی طرح عہدہ داروں کے اخراجات کا وہی عالم ہے ان لوگوں کے شاہانہ ٹھاٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عوام سے جو ٹیکس مالیہ آبیانہ اور مختلف قسم کے محصول لیئے جاتے ہیں ان کا بیشتر حصہ دفاع پر خرچ ہو جانے کے بعد ان کے بیش قرار معاوضوں اور دوسرے الاؤنسوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ اور قومی سرمایہ کا صرف بیس فی صدی تعلیم صحت۔ زراعت اور صنعت پر خرچ ہوتا ہے بجٹ ۱۹۵۲ء کے بجٹ میں بھی آمدنی کا ۲۱ فی صدی سرکاری نظم و نسق کے لئے رکھا گیا ہے۔ حالانکہ معاشی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں تجویز پیش

کی ہے کہ مجموعی آمدنی کا ۶۰ فی صدی سے زیادہ نظم و نسق پر خرچ نہ ہونا چاہیئے۔ پاکستان آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے کم از کم مالی و انتظامی اعتبار سے شبہت ہے۔ لیکن اس پر معاوضوں کا بار انگریزی دور کا سا بلکہ اُس سے زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ لوگ بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ قومی دولت کو نہ صرف اندرونِ ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی فراخدلی سے خرچ کیا جا رہا ہے۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۵۳ء کو احمد جعفر صاحب نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ایوان کو بتایا کہ ۱۹۴۷-۴۸ء کے حسابات پر غور کرنے کے لئے مالیاتی کمیٹی کا جلسہ ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ حالانکہ اس کمیٹی کا جلسہ ہر سال ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ مختلف وزارتیں اس کمیٹی کو کوئی اہمیت نہیں دیتی ہیں ہر سال متعدد وزارتیں منظور شدہ رقم سے زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کروڑوں روپئے فالتو خرچ کر دیئے جاتے ہیں۔ میں نے وزارت خارجہ کو خط لکھا تو جواب انڈر سکریٹری کی طرف سے آیا میں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں"۔ لہ

اسی طرح مسٹر عبدالخالق نے ۱۹ر مارچ ۱۹۵۵ء کے بجٹ پر اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

پاکستانی سفارت خانوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے"

۱۹ر مارچ ۱۹۵۵ء کو اسمبلی میں ۱۹۵۰ء کے حسابات کی آڈٹ رپورٹ پیش کی گئی ہے جس میں اخراجات کے سلسلہ میں سرکاری رقم کا بے جا صرف اور دوسری بے ضابطگیوں کا انکشاف کیا گیا ہے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ

"اس سال ۱۹ مدوں پر اصل منظور شدہ رقم کی نسبت ۲ کروڑ ۳۳ لاکھ ۴۹ ہزار سات کیس روپیہ زائد خرچ کئے گئے"

۱۹۵۱-۵۲ء میں ایک سفارت خانہ کے سربراہ نے سرکاری خرچ پر دنیا کا دورہ کیا جس کا مقصد کاغذات سے ظاہر نہیں ہوتا اور اس نے ایسے لوگوں کے لئے سفر خرچ وصول کیا جو سرکاری الاؤنس لینے کے حق دار نہ تھے"

کیا دنیا کی کسی بھی جمہوریت میں اُن کے عوام کی قربانیوں کا یہی صلہ ہوتا ہے کہ اس کے تمام اسباب و وسائل کو ایک محدود طبقہ کے لئے وقف کر دیا جائے قیام پاکستان کے وقت ہم صنعتی ترقی کے اعتبار سے جس درجہ پر پہونچے ہوئے تھے اس کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں۔

روئی اور کپڑے کے کارخانے	بھارت	۴۲۵
" " " "	پاکستان	۱۶
پٹ سن " " "	بھارت	۹۱
" " " "	پاکستان	صفر
شکر " " "	بھارت	۹۱
" " " "	پاکستان	۹
لوہا اور فولاد " " "	بھارت	۳۶
" " " "	پاکستان	صفر
سیمنٹ " " "	بھارت	۱۳
" " " "	پاکستان	۵

لہ جنگ ۱۹۵۵ء

کاغذ کے کارخانے	بھارت		۲۱
" " "	پاکستان		صفر
شیشہ " "	پاکستان		۴
" " "	بھارت		۱۴۴

اس طرح پاکستان کے حصہ میں صرف ۷ فی صدی کارخانے اور کام کرنے والوں کی تعداد ۲۶ فی صدی تھی یہ صورتِ حال سخت پریشان کن تھی۔ ہندو سرمایہ دار جس کے بل پر تھوڑی سہت صنعتی ترقی چل رہی تھی چلا گیا تھا۔ اس پر مستزاد ساٹھ لاکھ مفلوک الحال مہاجروں کی آمد نے اور بھی حالات نازک کر دیئے۔ مشرقی بنگال کی حالت بہت زیادہ دردناک تھی قحط کے ہولناک اثرات ہنوز کم نہیں ہوئے تھے۔ عین اُس وقت چند مٹھی بھر سرمایہ دار قومی ہمدردی کا روپ بھر کر آگے بڑھے اور حکومت کی تمام صنعتی ترقی کی اسکیموں پر اس طرح چھا گئے۔ جیسے یہ تمام ہنگامہ اسی تقریب کے لئے برپا ہوا تھا۔

ایک ماہر معاشیات کا قول ہے:۔

"ایسے وقت میں جبکہ ضرورت مندوں کی تعداد زیادہ اور سرمایہ محدود ہو اس کو بے مہار چھوڑ دینا بہت بڑی غلطی ہے"

گو اس کی تلافی ترقیاتی بورڈ اور منصوبہ بندی کمیشن اور اقتصادی کونسل قایم کر کے کی گئی۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے صنعتی ترقی نے ملک کو خوشحال نہیں بنایا۔ فی زمانہ جمہوری ممالک میں انفرادی سرمایہ داری موجود ہے۔ لیکن وہاں اُنھوں نے اس قدر بھیانک شکل اختیار نہیں کی ہے جیسی ہمارے یہاں درپیش ہے۔ فرانس میں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ڈبل روٹی پر دو پیسے بڑھ گئے تھے۔ اس پر مزدور بگڑ گئے اور تمام ملک میں علامتی ہڑتالیں ہونے لگیں تقریباً چھ سال سے پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کے تحت صنعتی ترقی کا کام ہو رہا ہے لیکن گرانی، کمیابی اور بے روزگاری کا ملک میں سدباب ہوتا نظر نہیں آتا مسٹر ڈکیلسن نے معاشی منصوبہ بندی کی یوں تعریف کی ہے:۔

"معاشی منصوبہ بندی سے مراد بہت اہم معاشی فیصلہ کرنا ہے۔ کیا اور کس قدر پیدا کیا جائے اور اُسے کس کے حوالہ کیا جائے، یہ فیصلے معاشی نظام کے جملہ پہلوؤں کی روشنی میں طے کئے جائیں اور ان فیصلوں کا اختیار کسی معزز اور مسلمہ جماعت کو حاصل ہو"

ایک ماہر معاشیات کے مذکورہ مشورہ پر عمل درآمد نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ ملک جس تیزی سے صنعتی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتا جاتا ہے اُسی تیزی سے بیکاری، گرانی اور غربت و فلاکت بڑھتی جاتی ہے اخبارات و رسائل اور تعلیمی ادارے افلاس کا شکار رہیں۔ ان کے برعکس ریسٹوران، کارخانے اور فیکٹریاں، سینما اور بلند و بالا عمارتیں گویا معاشرہ کے پورے انتظام کی جان اور فضل سرمایہ کاری کا نصب العین سمجھی جا رہی ہیں۔

انفرادی سرمایہ داری کا سب سے بڑا جواز یہ بتایا جاتا ہے کہ صنعتوں میں چونکہ ان کا روپیہ لگتا ہے لہذا انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ بغیر محنت کے بھی جس قدر

چاہیں منافع حاصل کریں کارل مارکس نے اس کا جواب دیا ہے ملاحظہ ہو:-

"جس چیز کو منافع سمجھ کر سرمایہ دار اپنی جیب میں رکھتا ہے حقیقت میں وہ مزدور کی کمائی ہے اس طرح سے سرمایہ دار مزدور کی کمائی کا ایک حصہ کاٹ کر اپنے پاس جمع کرتا چلا جاتا ہے اور یہ سرمایہ مستقل سرمایہ کی صورت اختیار کر کے مزدور کو بے مائیگی کا پابند بنا دیتا ہے۔"

انفرادی کاروباری معیشت کی صورت میں مکمل روزگار کے دروازے عوام کے لئے بند رہتے ہیں۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۳۰ء میں جو عالمی معاشی بحران پھیلا اس سے یورپ میں تین کروڑ سے زیادہ انسان بے روزگاری کا شکار ہوئے لیکن اب بے روزگاری کا مکمل خاتمہ ہو گیا ہے پروفیسر پیگو نے مکمل روزگار کی یوں تعریف کی ہے کہ

"یہ ایسی حالت کا نام ہے جس کے تحت ہر شخص رائج مزدوری پر کام کرنے کے لئے تیار ہو اور کام کر رہا ہو تمام ماہرین معاشیات اس امر پر متفق ہیں کہ

"کسی مرد یا عورت کے لئے اس سے زیادہ تباہ کن احساس اور کوئی نہیں کہ سماج کو میری ضرورت نہیں ہے۔"

۲۷ مارچ ۱۹۵۶ء کو لائل پور کی ایک ٹیکسٹائل مل نے کپڑے کی کثرت پیداوار کا عذر کر کے ایک ہزار مزدوروں کو برطرف کر دیا حالانکہ کثرت پیداوار کا عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

کارلائل نے سرمایہ داروں کی اسی قسم کی ظالمانہ روش سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

"کارخانہ دار ابھی ۲۰ لاکھ قمیصوں کیلئے کارخانہ چلا رہے ہیں جن کے لئے کوئی گاہک نہیں اور بیس لاکھ مزدور اپنی کمر چھپانے کے لئے کام کر رہے ہیں جن کے لئے کوئی قمیص نہیں ہے"[1]

پاکستانی ملوں کا بنا ہوا کپڑا جس قدر گراں قیمت پر فروخت ہو رہا ہے وہ متوسط الحال طبقہ کی قوت خرید سے باہر ہے۔ لیکن حکومت کی تمام ہمدردیاں مل مالکوں کے ساتھ ہیں۔ ایڈیٹر ٹریڈ پاکستان رقمطراز ہیں:-

"پٹ سن کے کارخانوں کے قیام میں نجی سرمایہ کاروں نے دل کھول کر حصہ لیا آدم جی اور اصفہانی نے پچاس فیصدی سے زیادہ حصص خریدے۔ کارپوریشن نے طے کیا ہے کہ بالآخر اس صنعت کو نجی سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں دیدیا جائے۔"

اس تند گرانی پر بھی یہ ہمت افزائی ناقابل فہم ہے۔ گرانی اور کمیابی اشیاء کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ درآمدی لائسنس جاری ہوتے ہی اُن کا بلیک شروع ہو جاتا ہے اور کم از کم آٹھ دس ہاتھوں کی لوٹ پھیر کے بعد درآمدی اشیاء مارکیٹ میں آتی ہیں۔

---

[1] کارلائل ماضی و حال۔

ب لائسنس دار کو اپنا منافع بھی اس میں سے نکالنا ہوتا ہے اس لئے وہ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اشیاء کو اس قت مارکیٹ میں لاتے ہیں جب مانگیں بڑھ جاتی ہیں رھاؤ چڑھ جاتا ہے۔ پیاز۔ پان اور ایسی ہی ضروری چھوٹی شیاء کے درآمدی لائسنس کچی کیمیا کہلاتے ہیں مثلاً گزشتہ سال سے مشرقی بنگال جس بُری طرح بھوک اور غربت کے خوفناک پنجوں میں جکڑا ہوا ہے اس کا اندازہ سیلاب کی طلاع پاتے ہی ہو گیا تھا اور جو غذائی کمیٹی حالات بگڑنے کے بعد بنائی گئی اس کو اسی وقت بن جانا چاہئے تھا۔ لیکن مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اس وقت بجز اس کے نا تجویزیں پاس کر دینے کے کوئی زوردار عملی قدم نہیں اٹھایا۔ اور چار کروڑ انسانوں کے غذائی مسئلہ کو بیرونی اور اندرونی سرمایہ داروں کے سپرد کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ جو چاول ان لوگوں نے فصل پر ۱۴-۱۵ روپیہ من کے حساب سے خریدا تھا۔ وہ اس سے چوگنی قیمتوں پر بنگال بھیجا۔ نہ صرف بلکہ جبکہ اس وقت جبکہ بنگال قحط کے دور سے گزر رہا تھا انہوں نے ۵۳-۱۹۵۲ء کے اجرائی لائسنسوں کی بنا پر لاکھوں من چاول بحرین۔ عدن۔ مسقط۔ گوا۔ بنغازی اور جنوبی افریقہ کو برآمد کیا۔ اس طرح انہوں نے مشرقی بنگال کی صورت حال کو بد سے بدتر بنا دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے غریب عوام کی قوت خرید بہت جلد جواب دے گئی لوگ ہزاروں کی تعداد میں دیہات چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرنے لگے کیا دبازاری انسانی محنت کو سستے داموں فروخت کرنے لگی۔ چھنٹنی اور بیکاری کے خوف نے سرمایہ داروں کی تجوریوں کو سیم و زر سے بھر دیا۔ جب محنت اور سرمایہ کی کشمکش پوری زور آزمائی کے ساتھ ہو چکی۔ امیر اور زیادہ امیر اور غریب عوام جن کی اکثریت ہے گداگر بن گئے تو حکومت نے بھی ہوش کے ناخن لئے اور چاول کی سپلائی کا کام اپنے ذمہ لیا۔ لیکن اب باقی ہی کیا رہ گیا تھا جو چارہ گری کا سامان ہو رہا ہے ؎

جلا ہے جسم وہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

فی زمانہ پاکستان کا مزدور جس زبوں حالی کا شکار ہے اس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملے گی۔ کسی مزدور کو دو ڈھائی روپیہ سے زیادہ مزدوری نہیں ملتی اس کے تمام جائز اور معقول مطالبوں کا صرف ایک جواب ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کارخانوں کو غیر معینہ مدت کیلئے بند کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ارزاں محنت سے خریدے ہوئے مال سے گودام بھرے ہوتے ہیں اس لئے جب تک چاہیں بند رکھیں۔ لیکن اس عرصہ میں مزدور خاندانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں پیٹ کی آگ مل مالکوں کی ہر ایک شرط ماننے پر مجبور کر دیتی ہے کہاں کی اُجرتیں اور کیسے مطالبے عباسی ٹیکسٹائل مل نے رحیم یار خاں میں ۱۹۵۵ء میں یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ نئے اُمیدوار کو صرف آٹھ آنے اُجرت دیتے۔ حالانکہ وہ ایک ماہ بعد کام کرنے کے قابل ہو جاتا۔ لیکن لوگ بیکاری کے خوف سے یہ تمام مصیبتیں جھیلتے رہتے ہیں۔ ایک ماہر معاشیات نے کہا ہے کہ

"کام کرنا ان طبقوں کا فرض ہے جو ملکیت سے

بالکل محروم ہیں۔ محنت اور کام کا پھل اور اُن تمام اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا حق جو کام کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں، سرمایہ داروں کے حصے میں آتا ہے۔"

سب کہتے تھے کہ ہم آٹھ سال سے بغیر آئین کے زندگی گذار رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے تو برصغیر پاک و ہند ڈیڑھ سو سال سے سرزمین بے آئین بنا ہوا ہے، بارے خدا کا شکر ہے کہ اس قدر عظیم اور صبر آزما مدت کے بعد دستور بنا اور وہ بھی اسلامی سے

شۓ دو آتشہ کی جس دن سے خبر پائی ہے
ہم سے رندوں کی ذرا جان میں جان آئی ہے

جب ستائشوں اور سپاس گذاریوں کا سلسلہ ختم ہو کر قدرے سکون ہوا تو نافذ شدہ اسلامی آئین کے دوسرے اُمور کو چھوڑ کر جو ہمارے بحث سے خارج تھے صرف اس کے اقتصادی و معاشی پہلو پر غور کرنے کا موقع ملا۔

معلوم یہ ہوا کہ مقنن نے اس مسئلہ کے حل کرنے میں اسلامی اصول و قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی ہے اور اُس کا معاشی پہلو اسلام کے نظام معیشت کے بالکل برعکس ہے۔ سب سے پہلی چیز جو محل نظر ہے وہ اس نظام کا موجود رکھنا ہے جس کا نام جاگیرداری ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ جابرانہ نظام مصر و روم اور ایران کی قدیم شہنشاہیت کی یادگار ہے۔ اسلام کے نزدیک زمین خدا کی ملک ہے اس لئے قوم یا حکومت کو ہی اس پر کلی اختیار حاصل ہے[1]۔ زمین کے بارے میں لکھے ہوئے احکام اسلامی موجود ہیں حضرت عمرؓ کے عہد میں جب عراق۔ شام اور مصر فتح ہوئے تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ زمین بھی اموال غنیمت کی طرح مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے، لیکن تمام صحابہ کرام کے مشورہ سے قرار پایا کہ زمینوں کو قومی بیت المال کے تصرف میں رہنا چاہئے اور کاشتکاروں سے حکومت براہ راست پیداوار کا مقررہ حصہ بطور زکوٰۃ یا خراج وصول کرے۔ خلافت راشدہ کا عہد زرّیں شروع ہو چکا ہے اسلامی فتوحات کے سیلاب بے پناہ نے ایشیا سے گذر کر یورپ تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ خدا کی یہ وسیع و عریض سرزمین مسلمان فاتحوں کی جودت جولانیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے جس قدر چاہیں اپنے اور اپنے افراد کے تصرف میں لے آئیں لیکن ہوا کیا ہے جن ممالک پر اسلامی کا قبضہ ہوتا ہے زمینوں کو وہاں کے کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ کیا اسلامی آئین میں اس مثال سے استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صرف زمینداروں اور اسامیوں کے درمیان حقوق کی منصفانہ مطابقت کا انتظام کر کے زمین کے معاملہ میں اسلام کے وضع کردہ قوانین کے تحت ہرگز اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نجی شغل سرمایہ کاری کو اسلامی اصولوں کے تحت قومی ملکیت بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ سرمایہ اُس دولت کا نام ہے جو مزید دولت پیدا کر سکے۔ اسلام نے ایک جانب سود کی ممانعت کر کے سرمایہ کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکا نیز ہر قسم کے مال پر ہر سال کے

[1] نظام نو۔ عبدالوحید خالد

آخر میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا نکال کر بیت المال میں داخل کرنے یا حاجتمندوں پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔ نجی ملکیتوں کا وجود موجودہ صورت میں اسلامی نقطۂ نظر سے قطعی ناجائز ہے۔ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ ایک محدود جماعت ذخیرہ اندوزی کر کے جب چاہے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دے۔ سورۂ حشر میں اس کی ممانعت اس طرح کی گئی ہے:۔

"اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے
چاندی کو اور اُس کی راہ میں خرچ نہیں
کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری
دے دو۔"

تیسرا اہم مسئلہ سرکاری خدمات کے صلہ میں ہماری اسلامی اسٹیٹ جو معاوضہ قومی بیت المال سے دے گی اس کی عدم مطابقت ہے۔ تقسیم دولت کا غیر مساویانہ طریقہ معاشرہ کے اخلاق و کردار کو اسلامی سانچوں میں کس طرح ڈھال سکتا ہے۔ جبکہ اعلیٰ عہدہ داروں کی تنخواہوں کا جو اسکیل مقرر کیا گیا ہے وہ شرعی نقطۂ نظر سے حد درجہ غیر مساویانہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی مندرجہ ذیل تقریر میں ایک اسلامی اسٹیٹ کے اعلیٰ ترین حاکم کا جو تصور پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

"مجھ کو تمہارے مال (یعنی بیت المال)
میں اس قدر حق ہے جتنا یتیم کے مربی
کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں دولتمند ہونگا
تو کچھ نہ لونگا اور اگر ضرورت پڑے گی تو
دستور کے مطابق کھانے کے لئے لے لونگا
صاحبو! میرے اوپر تم لوگوں کے متعدد حقوق
ہیں جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیئے
ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت
بے جا طور سے جمع نہ کیا جائے۔ دوسرے
یہ کہ جب میرے ہاتھ میں خراج اور مال
غنیمت آئے تو بیجا طور پر صرف نہ ہونے
پائے۔"[۱]

فتح قادسیہ کی خبر سُن کر مسجد نبوی میں جو تقریر فرمائی آپ نے اُس کے آخر میں خود کو تمام مسلمانوں کی خوشحالی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ارشاد فرمایا:۔

"بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمام
کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں، میں تو خود اللہ
تعالیٰ کا غلام ہوں۔ البتہ خدمت کا کام
میرے سپرد ہے اگر میں یہ کام اس طرح
انجام دوں کہ تم آرام سے اپنے گھروں
میں اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرو تو
یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔"

حضرت معاذ بن جبل نے رومیوں کے دربار میں امیر ملت کے متعلق فرمایا تھا:۔

"ہم نے جس کو بادشاہ بنایا ہے وہ کسی
بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا
وہ پردہ میں نہیں بیٹھتا اپنے آپ کو
ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔ مال و دولت
میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔"

۱۔ الفاروق ص [illegible]

یہ ہے اسلامی مساوات کا وہ عملی نمونہ جس کو شمع ہدایت بنا کر اس خلیج منافرت کو مٹانا چاہئے جس نے پوری مملکت کو طبقہ وارانہ کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب کوئی عامل مقرر کیا جاتا تو اس سے عہد لیا جاتا "ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا"۔

نہ صرف یہ بلکہ تقرر کے وقت اس کے پاس جس قسم کا اسباب و سامان ہوتا اس کی فہرست بنائی جاتی اگر بعد میں اس کی مالی حالت میں غیر معمولی تغیر ہوتا تو اس سے باز پرس کی جاتی۔ کیا رشوت ستانی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے اسلامی آئین میں کوئی ایسا فارمولا رکھا گیا ہے جس سے اس کی روک تھام ہو سکے۔

وزیر اعظم نے ۲۹ اپریل ۱۹۵۴ء کو چاٹگام کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر فخر کیا ہے کہ

"تمام مسلمان چھوٹے ہوں یا بڑے خدا کے حضور میں شانہ بشانہ کھڑے ہوتے ہیں اور یہ اسلامی مساوات کی سب سے بڑی مثال ہے"۔

لیکن اب مساوات اسلامی کے اصولوں کو مسجد و منبر تک محدود رکھ کر جمعہ اور عیدین میں شانہ بشانہ کھڑے ہو جانے کو ہی اخوت کی بنیاد تصور نہیں جا سکتا۔ اور نہ محض نظریاتی طور پر مساوات کے اصولوں کو مان لینے سے کام چلے گا۔ ضرورت ہے کہ ملک کے سربراہ زیادہ عرصہ تک اپنے آپ کو اور دوسروں کو مغالطہ میں نہ رکھیں اور ایسی راہ عمل اختیار کریں جو حق و انصاف پر مبنی ہو اور اس پر گامزن ہونے سے پاکستان کا افلاس جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے جلد از جلد دور ہو جائے"۔

مطالعے کی اہمیت

معاشی حالات کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے ہمارے معاشی اداروں کے عمل اور ان کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مطالعہ کی روشنی میں ہم اپنی پوزیشن پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم اپنے مادی ذرائع سے کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہم قدرت کی تمام عنایات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے سے کیوں قاصر رہتے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنی حالت کو کیونکر استوار کر سکتے ہیں۔ معاشی حالات کے مطالعہ سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے ملک کے معاشی امور کا ان معاشی امور سے مقابلہ کر سکیں جو دنیا کے متمدن ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ پھر اس مقابلہ کے عمل سے ہم اپنی معاشی کمزوریوں کا سدباب کرنے کی طرف توجہ دے سکتے ہیں اس مطالعہ کا اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کی اقتصادی خوشحالی کو بڑھانے کے وسائل اور ذرائع تلاش کر سکیں تاکہ ہمارے ملک کے عوام کو بھی وہی آسائشیں میسر آ جائیں جو دوسرے ممالک کے لوگوں کو حاصل ہیں۔ ایسا ہونا تب ہی ممکن ہے جبکہ ہمیں پورا پورا اور صحیح علم ہو کہ ہمارے ملک کے معاشی حالات کیا ہیں؟ بس ہمارے مطالعہ کی یہی غرض و غایت ہونی چاہیئے"۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اختر لاہور)

حالی کے ہم عصر غالی کی مثنوی

از نظیر حسین زیدی ایم اے

حالی نے اپنے شعر سے مخاطب ہوکر کیا خوب کہا ہے ؎

صنعت پہ ہو فریفتۂ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

اسی لئے اُن کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ شعر میں صحیح اور سچی بات بیان کی جائے۔ سادگی اور اغراق سے احتراز یہ ہی وہ خصوصیات تھیں جس نے حالی کے کلام کو دوام بخشا اور "ان کا کلام قوم کے نام اک حیات بخش پیغام تھا جو اس کو پہنچا اس نے حسب استعداد قبول کیا اور اب وہ اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب کی ایک عزیز دولت ہے جس سے اہل نظر اور اہل دل صدیوں استفادہ کرتے رہیں گے۔"

حالی نے جدید شاعری کے متعلق جو کچھ اظہار کیا وہ اس قدر حقیقت لئے ہوئے تھا کہ اس نے تمام قوم کو چونکا دیا۔ اور یہ عام طور سے محسوس کیا جانے لگا کہ ہماری زندگی کے لئے اب ایک موثر کی ضرورت ہے جو ہمارے اقتصادی سیاسی اور تعلیمی حالات کو بدل دے۔ ورنہ اگر ہم نے ان تبدیلیوں کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا تو ہم ہر لحاظ سے سب پیچھے رہ جائیں گے اور یہ بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر اک افسردگی و کم مائیگی کا جو اثر دماغ پر غالب آچکا تھا اس نے تمام اعضا کو مفلوج بنا دیا اور پست ہمتی نے سب ترقی کی راہوں کی طرف سے مونہہ موڑ لیا تھا۔

دہلی کے قرب و جوار کا علاقہ خاص طور سے اس جنگ آزادی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اتفاق سے حالی بھی علاقہ کے باشندہ تھے۔ پانی پت مسکن قدیم تھا اور دلی ان کے لئے ترقی کا میدان، پانی پت و دلی کا فاصلہ ہی کتنا پچیس کوس ہی تو تھے۔ وہاں کے تباہ حال خاندانوں میں سے بہت سے لوگوں نے پانی پت کو منتخب کیا اور دلی سے بھاگ بھاگ کر یہاں آ گئے۔ اس زمانہ میں غدر کے تین چار سال تک حالی یہیں رہے اور تحصیل علم کرتے رہے آخرکار حالی کو بھی فکر معاش میں گھر سے نکلنا پڑا۔

۱۸۷۴ء کا سال ہماری جدید شاعری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد لاہور میں پڑی۔

اس وقت تو کیا بلکہ کچھ عرصے تک یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ ہماری جدید شاعری کا سنگ بنیاد جو لاہور میں رکھا گیا ہے اس نے کس کس کو اپنی طرف متوجہ کیا، اور اس کے اثرات محض وہیں تک محدود نہیں بلکہ دور دور تک پہنچ گئے

ہیں۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ معلوم ہوتا گیا کہ ہمیں کن تقاضوں کی ضرورت ہے اور اس جنگِ آزادی سے جس قدر نقصانات پہونچ چکے ہیں ان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ گویا جدید شاعری حالات زمانہ کے لحاظ سے جن تقاضوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے سرسید کی علمی کوششیں اب واضح طور سے سامنے آ چکی تھیں۔

زیرِ نظر کتاب جس انسان کی تصنیف ہے اس کا وطن پانی پت سے سات میل دور مشرق کی طرف دریائے جمنا کے کنارے پر بستا تھا۔ یہ بستی سادات کی تھی اور مردم خیز خطہ تھا جہاں سے اکثر صاحبانِ علم پیدا ہوئے جنہوں نے علوم عربی و فارسی[1] و علم فقہ میں کمال حاصل کیا۔ قصبہ برست (جس کو بستی کہنا زیادہ مناسب ہے) غدر کے زمانے تک ۵، ۶ ہزار کی آبادی تھی اس کا اصل نام موضع رسول پر قسطا تھا۔ جو مخدومات کے بعد برست رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ ان عالموں کے سبب جو اس زمانے میں تھے اور نواب حامد علی خاں کے اثرات کے باعث برست کسی زمانہ میں ایک اچھا خاصا مقام تھا۔

مولوی احمد حسین صاحب اس مثنوی کے مصنف بھی قصبہ کے باشندے تھے۔ والد کا نام سید غلام حسن تھا اور مورث اعلیٰ سید غلام حیدر (جو بانیٔ قصبہ برست بھی تھے) سید غلام حیدر کے والد ماجد سید جمال الدین موضع سرسی ضلع مرادآباد میں مدفون ہیں اس طرح یہ سلسلہ نسب ابوالفرح واسطی پر ختم ہوتا ہے جو زید شہید کی اولاد سے ہیں۔

مولوی احمد حسن صاحب مرحوم کے اور چار بھائی تھے۔ سب سے بڑے سید محمد حسین صاحب گاؤں میں نمبردار تھے۔ اس زمانہ میں نمبردار گاؤں کا چودھری و سرپنچ ہوتا تھا ان سے چھوٹے مولوی سید علی حسن صاحب جو لکھنؤ میں تحصیل علم کے سلسلہ میں رہ گئے تھے۔ عالم متبحر تھے انہوں نے شرائع الاسلام (شیعی فقہ پر مستند کتاب) پر حاشیہ لکھا ہے (حاشیہ لکھنا یعنی اس کی توضیح و تشریح کرنا ایک بہت ہی اہم کام تھا۔ جو کسی کے علمی ثبوت کے لئے کافی تھا) ان سے چھوٹے مولوی سید جعفر حسین صاحب اور سب سے چھوٹے مولوی سید نیاز حسن صاحب تھے جو درجۂ اجتہاد پر پہونچے ہوئے تھے۔

اس تفصیل سے ان کے خاندان کی علمی حالت پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ خود انہوں نے کسی علمی ماحول میں پرورش پائی ہوگی۔ موجودہ دور میں اولین بیت گاہ (گھر) میں بچہ کی تربیت اور اس کی صلاحیتوں کی نشو و نما پر توجہ کم دی جانے لگی ہے یہی وجہ ہے کہ بچہ کی تربیت صحیح طور سے مدرسہ میں نہیں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے گھر کے اچھے ماحول سے بچہ متاثر ہوگا۔۔۔ تو وہ آگے چل کر انفرادی صلاحیتوں کی تکمیل کے بعد سوسائٹی کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

مولوی احمد حسن صاحب حالی مرحوم کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے خاندان میں علوم درسیہ معقول و منقول کی تکمیل کی۔ حالی مرحوم کے بڑے بھائی مولوی نیاز حسن صاحب جب عراق سے تکمیل تعلیم فقہ کے بعد حیدرآباد پہونچے اور ان کے کمال علمی کی شہرت نے

---

[1] تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء مؤلفہ مولوی محمد حسین زکازی مطبوعہ دہلی ۱۹۳۰ء

سرسالار جنگ بہادر کو بھی اپنی طرف مائل کیا اور انہوں نے مولوی نیاز حسن صاحب مرحوم کو حیدرآباد میں قیام کرنے کی طرف مائل کر دیا تو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی عالی مرحوم کو بریلی سے بلوایا۔ عالی مرحوم پانچ چھ ماہ میں پیدل حیدرآباد پہنچے اور اپنے بھائی (مولوی نیاز حسن صاحب) کے پاس قیام کیا۔ چند روز کے بعد مولوی احمد حسن عالی مرحوم کا تعارف نواب مختارالملک وزیر مملکت سے کرایا۔ نواب صاحب اُن سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اپنے خسر نواب فخرالملک کی جاگیرات کا منتظم مقرر فرمایا، اور نواب خان خانان اور فخرالملک خود کا اتالیق کیا۔ اسی دوران میں نواب صاحب کو ایک مقام کے پیمائش کی ضرورت ہوئی مولوی عالی مرحوم نے ارادہ ظاہر کیا اور اجازت لے کر مقام معینہ پر روانہ ہوئے بعد معائنہ مقام و موضع بحیثیت مجموعی تفصیلی رپورٹ مع خاکہ پیش کی نواب صاحب از حد مسرور ہوئے اور مولوی صاحب کی مہربانی کی قدر فرماتے ہوئے مبلغ یک صد روپیہ ماہوار منصب نسلاً بعد نسلٍ جاری فرمایا جو اب تک مولوی صاحب کی اولاد کو ملتا ہے۔

نواب سالار جنگ مختارالملک کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند سالار جنگ ثانی نواب میر لائق علی خاں بھی مولوی صاحب کی قدر و منزلت فرماتے رہے۔ اور انکی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ اور بعد میں عہدۂ دوم تعلقداری پر مامور فرمایا۔ غرض عالی مرحوم نے سرکاری خدمات کو بحسن وجوہ انجام دیا اور بعد میں خانہ نشین ہو گئے۔ مولوی صاحب کے ایک فرزند سید مرتضےٰ جو فاضل تھے عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ بعد میں انہوں نے (عالی مرحوم نے) تین فرزند چھوڑے (جن میں سے ایک فرزند رشید کرنل محمد حسن صاحب حیدرآباد میں اب بفضلہٖ موجود ہیں۔

عالی مرحوم کا سلسلۂ درس و تدریس سرکاری خدمات کے باوجود جاری رہا اکثر شاگردوں کو ایران سے کتابیں منگا کر دیں۔ اِن کے خاص شاگردوں میں مولوی سلطان حسین مرحوم مبین اور شیخ الطاف حسین رنگین ممتاز تھے۔

اخلاق وعادات

زیر بحث مثنوی حقیقت میں خود ان کی حق گوئی کا خاکہ ہے نہایت صلح کن مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ دائرۂ احباب وسیع تھا۔ اسی طرح عالی مرحوم کنبہ پرور بھی تھے تا بمقدور اپنے غریب اعزا کو غیر کا دست نگر نہیں ہونے دیتے تھے اپنی خصوصیات کی وجہ سے مقبول تھے۔ مرحوم باوجود اپنی قدر و منزلت کے عام مسلمانوں کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے

ایک دفعہ ایک صاحب کو عالی مرحوم نے ایکہزار روپیۂ بغرض تجارت قرضۂ حسنہ دیئے تھے بعد میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ اُن صاحب سے رقم کی ادائیگی نہ ہو سکی۔ لیکن اور قرض خواہوں نے دعوے کر کے ڈگریاں حاصل کر لیں اس واقعہ کی اطلاع چند احباب نے عالی مرحوم کو کی اور یہ رائے دی کہ آپ کا قرضہ مرجح ہے لہٰذا آپ درخواست دے کر قرقی ملتوی کرا دیجئے اور وصولی رقم کا انتظام کیجئے یہ سُنکر فرمایا کہ میں ایک غریب مسلمان پر ازدیاد فکر کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ ایک تو وہ یوں ہی قرض خواہوں کی وجہ سے پریشان ہیں اور پھر میں ایک دعویٰ اور کر دوں۔ میں نے معاف کیا۔

اسی ضمن میں ایک اور خاص واقعہ مولوی سید

علی حیدر نظم طباطبائی کے متعلق ہے کہ وہ حالی مرحوم کے خاص احباب میں سے تھے لیکن دور رہتے تھے جس کی وجہ سے ہفتہ دو ہفتہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اسی درمیان میں حالی مرحوم نے اپنے شوق سے ایک زمین خریدی اور اس میں بہت کشادہ اور جدید طرز کا مکان بنوایا دوران تعمیر میں دفتر سے آکر شام کو کام کا جائزہ لیتے اور حسب منشا کچھ تغیر و تبدل کرتے جاتے تھے۔ اس روز نظم طباطبائی بھی اتفاقاً ہمراہ تھے نظم صاحب نے مکان کو دیکھ کر اس کی وضع قطع کی بہت تعریف کی اس وقت تو مرحوم خاموش رہے۔ لیکن مکان آکر دوسرے روز دارو غہ کی معرفت اس روز تک کا حساب اور ایک خط مولوی صاحب موصوف (نظم) کی خدمت میں ارسال فرمایا کہ یہ مکان آپ کی پسند خاطر ہے لہذا آپ کی نذر ہے بشرطیکہ آپ اس محلہ میں تشریف لے آئیں۔ مولوی صاحب فوراً واپس آئے اور باصرار فرمانے لگے کہ میں نے کسی اور خیال سے نہیں کہا تھا خدا آپ کو مبارک کرے۔ حالی مرحوم نے قبول نہیں فرمایا اور فرمانے لگے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا برکت ہوگی کہ آپ اس میں تشریف لائیں اور میری تقویت کا باعث ہو۔ چنانچہ مولوی صاحب (نظم طباطبائی) فوراً تشریف لائے اور مع اہل و عیال رہنے لگے۔

یہ چیز ان کی نیک نفسی کی دلیل ہے کہ ان کی مکان کی جگہ اب تک ان کے ہی نام سے مشہور ہے۔

حالی مرحوم کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ حیدرآباد سے دوسرے تیسرے سال ضرور یہاں آتے۔ مرحوم نے وطن کا آخری سفر ۱۳۳۱ھ میں کیا اور یہاں سے واپسی کے بعد ۱۰ صفر ۱۳۳۲ھ م ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔

حالی مرحوم کی فن شعر سے دلچسپی کافی تھی البتہ مرحوم نے غزل کی طرف توجہ نہیں کی۔ مرحوم کے چند مسدس، مراثی اور قصائد غیر مطبوعہ ہیں البتہ زیر نظر مثنوی مطبوعہ ہے جو بوجہ مقبولیت عامہ کے چند بار طبع ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۳۳۱ھ میں شائع ہوئی جو مرحوم کے انتقال سے ۱ سال کا عرصہ ہوتا ہے البتہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے قبل یہ کس کس سنہ میں لکھی گئی۔

یہ مثنوی پند و نصائح میں گویا حالی مرحوم کی گفتگو کا خاکہ ہے جو شعر کے لباس میں اپنے مقصد کو اور زیادہ پر اثر بنانے کے لئے ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ اس انقلابی دور کی مثنوی ہے جب کہ مسلمانوں میں زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے زیر اثر کم بختی و مفلسی بھی تھی اور عام معاشی حالت خراب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق انحطاط پذیر تھے۔ گو اس مثنوی کو وہ مقبولیت عامہ حاصل نہ ہو سکی جو حالی کی مسدس کو لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ اس زمانہ میں چند بار شائع ہوئی اور اس نے لوگوں کے اخلاق درست کرنے میں کافی مدد دی۔ سادگی بیان اور خلوص اس مثنوی کی جان ہے حالی مرحوم نے اپنی سوسائٹی میں جن خرابیوں کو دیکھا ان کے درست کرنے میں انہوں نے شعر کا سہارا لیا۔ وہ ایسے متوسط طبقہ کے انسان تھے جو اپنے عالمانہ جوہر کے سبب اعلیٰ طبقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور خود چونکہ تکلیف کے دور سے گذرے تھے اس لئے غریبوں کی تکلیف کا احساس تھا۔ یہ وہ احساس تھا جو اپنے وطن کی طرف بار بار کھینچ کر لاتا تھا۔ اور یہاں سے وہ اپنے ہمراہ

کسی نہ کسی فرود کو ساتھ لے جاتے تھے اور اس کی تعلیم و تربیت اور وجہ معاش میں مدد دیتے تھے۔

جبکہ وہ خود ایک جگہ کہتے ہیں۔

کوئی مارا گیا لُٹا کوئی   خویش و فرزند سے چُھٹا کوئی
کر دیا اکثروں نے ترک وطن   پہنچا جس کو جہاں ملا مامن
خانماں سے بچھڑ گئے اکثر   اہلِ دولت بگڑ گئے اکثر
مدتوں ملک کا یہ حال رہا   مورد آفت و زوال رہا
دشت پُر خار نے ضیافت کی   فقر و افلاس نے رفاقت کی
ہوگئی پھر تو کثرت جُہال   لے لیا اپنے ساتھ اہل کمال

یہی زندگی میں ان کا مقصد رہا نہ معلوم کتنے افراد ہوں گے جن کی زندگیاں بنا کر خاندانوں کو تباہی سے بچا لیا۔ اور آج وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

زیر نظر مثنوی اپنی چند خصوصیات کے باعث قابل توجہ ہے۔ مثنوی میں جو قدیم طریقہ مدح و نعت کا رائج تھا وہ اس میں بدستور موجود ہے۔ اس کے بعد التجا بدرگاہ خدائے تعالےٰ ہے اس کے معذرت کے طور پر چند شعر ہیں۔ پھر ترقی اسلام کے متعلق پھر تنزل اسلام کا مفصل تذکرہ ہے۔ اسلام کے تنزل کے بعد نصاریٰ کی ترقی کا ذکر ہے۔ اس کے بعد مختلف عنوانات پر اشعار لکھے گئے ہیں۔

ہر عنوان کا نام پہلے لکھا گیا ہے مثلاً در بیان استعمال اشیاء ملکی۔ در بیان علاج بیماران۔ مذمت لہو و لعب وغیرہ۔ معاشرت نواز۔ ترغیب اولاد۔ مذمت تغیر وضع و لباس بعد میں نماز روزہ کی پابندی کا بیان خاتمہ پر محاسن اخلاق کے متعلق اشعار۔ اس طرح یہ مثنوی ۵۵۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور مطبع اخبار آصفی حیدرآباد میں باہتمام سر محمد حیدر دہلوی طبع ہوئی ہے۔

اس مثنوی کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ جس جگہ ترقی اسلام کا ذکر ہے وہاں آنحضرتؐ کی کوششوں کا خاص طور سے اور نماز روزہ کی پابند کا خاص طور سے ذکر ہے:—

کی نبی نے پیغمبری نو سال   اکثر اس میں رہی جدال و قتال
جم گیا خوب پایۂ اسلام   ہوگیا دین حق کا استحکام
ہوگیا فضل ایزد باری   ہر جگہ حکم شرع تھا جاری

اس کے بعد تنزل اسلام کا ذکر ہے:—

خواہش نفس نے کیا مجبور   آخرکار ہوگئے مقہور

چند اشعار کے بعد:

ہوگئی سلطنت تہ و بالا   نہ رہا کوئی پوچھنے والا
شرع کے ترک سے یہ حال ہوا   رفتہ رفتہ یونہی زوال ہوا
مسجدیں ہیں پڑی ہوئی سنسان   نظر آتے نہیں کوئی انسان
عقل کی انہیں کوئی بات نہیں   خیر کی جانب التفات نہیں
غیرت و شرم و ننگ و عار نہیں   نفس خیرہ پر اختیار نہیں!

آخری دور میں جو مسلمانوں کی کیفیت ہوائی تھی اس کا شاعر نے اس طرح اظہار کیا ہے جس میں حقیقت ہی حقیقت ہے:—

قابلیت نہیں کمال نہیں   بے کمالی پہ انفعال نہیں
چار پیسے جو ہاتھ میں آئیں   خوب کھائیں پیئیں کھلائیں
اس لئے و قعت و وقار نہیں   غیر قوموں میں اعتبار نہیں
گھٹ گئے سب کاروبار دیکھ چکے   اپنا انجام کار دیکھ چکے

اس کے بعد شاعر الٹا افراد کی طرف متوجہ ہو کر انہیں غیرت و شرم دلا کر موجودہ زمانہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔

کس کا شکوہ کروں مجھے یہ بتاؤ
آپ منجدھار میں ڈبوئی ناؤ

علم حاصل کرو ہنر سیکھو
فن تحصیل مال و زر سیکھو

شاعر اسی ضمن میں پھر زوال کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :-

جب سے پھیرا ہے منہ شریعت سے
کل کے معبود کی اطاعت سے
سب پہ ایک سخت آ گیا ادبار
مبتلائے بلا ہیں لیل و نہار
علم و حرفت کا انہیں نام نہیں
خیر و خوبی کا کوئی کام نہیں

اگر ادب و زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اس سے ہماری قدریں متعین ہوتی ہیں اس سے انسانی جوہر ظاہر ہوتے ہیں یہی ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس مثنوی میں شاعر ان تمام کمزوریوں کا اظہار بھی کرتا ہے جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح لگ گئی تھیں جس نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا تھا اور ہمدردی نام کو نہ رہی تھی اگر میرا خیال صحیح ہے تو میں کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ انقلاب کے بعد اس قسم کی چیزوں کا آنا تاریخی حالات سے ثابت ہے۔ غدر اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں جو ہر کس و ناکس پر یقینی پڑتی ہیں اس کے بعد انسان دوسروں کی دیکھا دیکھی خود غرض ہوتا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس زمانہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ادبار و نکبت کے زمانے میں ہمدردیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ مثنوی میں اس قسم کے اظہار اکثر ملتے ہیں

اک کھاتا ہے پیٹ بھرتا ہے
دوسرا پاس بھوکا مرتا ہے

مثنوی میں بعض ایسے واقعات کا اظہار بھی ملتا ہے جن چیزوں کو لوگوں نے بطور لازم اختیار کر لیا تھا اور اس کے برے اثرات کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔ موصوف صاحب چونکہ حیدرآباد دکن میں کافی عرصہ مقیم رہے تھے اس لئے اس چیز کو خاص طور سے ذکر کیا ؂

اب تو سیندھی شراب عیب نہیں

سادگیٔ بیان اور روزمرہ کا استعمال اس مثنوی کی خصوصیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اثر دہلی کی وجہ سے ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

خاک اب رہ گئی مسلمانی
سر سے اونچا تو ہو گیا پانی
چرخ نے ایسے تفرقے ڈالے
سب کو جانوں کے پڑ گئے لالے

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں شاعر کو اپنی قومی صنعت کے ضائع ہونے کا افسوس ہے اور وہ استعمال اشیائے ملکی پر بہت زور دیتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس سے ملک آباد و شاد رہے گا۔ کوئی عسرت کا شاکی نہ ہوگا اور سب خوشحال ہوں گے۔

شاعر کی نظر میں وہ تمام چیزیں ہیں جو یہاں تیار ہوتی ہیں اس کے باوجود لوگوں کی توجہ باقی نہیں۔ اس کے خیال میں ملک کے زوال کا باعث ملکی اشیا کا عدم استعمال ہے کہ

کونسی چیز یہاں نہیں موجود؟
کونسا مال ہو گیا مفقود!
لیں نہ زنہار غیر ملک کی چیز
چاہیئے اپنی نیک و بد میں تمیز
اس میں ہو پری جو کامیابی ہو
ہر طرف قوم کی خرابی ہو

تنزل کے دور میں جو اخلاقی کمزوریاں بڑھتے بڑھتے عیب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور جن فضول کاموں میں وقت ضائع ہوتا ہے شاعر ان باتوں کی طرف لطیف چوٹیں کرتا ہے

اور نہایت واضح الفاظ میں ان تمام کمزوریوں کا اظہار کرتا ہے جو اس زمانہ کے زوال پذیر دور کی یادگار باتیں تھیں ؎

کہیں شغل پتنگ بازی ہے — کہیں بیہودہ کارسازی ہے
کہیں طبلہ پر تھاپ پڑتی ہے — کہیں غرفہ میں آنکھ لڑتی ہے
کہیں ڈھولک ستار کی آواز — کہیں دلکش ہے نغمہ و ساز
اس پہ شکوہ ہے تنگدستی کا — شور ہے ان کی فاقہ مستی کا
واہ کیا خوب ہے لیاقت واہ — مرحبا آفریں جزاک اللہ

معاشرت کی حالت کا نقشہ

پرانے جاگیردارانہ نظام کے زیر اثر جو خرابیاں ہمارے معاشرہ پر داخل ہو گئی تھیں اور جو اب بھی باقی ہیں ان کو اس مثنوی میں بہت واضح طور سے بیان کیا گیا ہے مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر خاندان اور برادری میں نام پیدا کرنے کے لئے قرض لینا ایک خاص طریقہ کار رہا اور اس سے جو برے اثرات گھر کے دوسرے افراد پر بھی پڑتے ہیں اور اس سے جو تباہی مستقلاً خاندان پر آتی ہے اس کو خوب بیان کیا ہے ؎

شادیوں میں ہے بدعت اسراف — مفلس و قرضدار ہیں اشراف
کوئی گھر بیچ درہن کرتا ہے — کوئی فاقوں کے مارے مرتا ہے
قوم کا بس ہے ہر طرح ادبار — کیوں نہ ہو یہ ہی خوبی کردار

افراد کے بگڑنے سے قوم کس طرح بگڑتی ہے اس کو شاعر نے طنز کے لطیف پیرایہ میں خوب بیان کیا ہے۔ آگے چل کر کہتے ہیں ؎

دردِ حقا تو یہ نہیں شادی — ہے حقیقت میں خانہ بربادی

معاشرت نسواں

حالی اس زمانہ میں ہوتے تو معلوم نہیں معاشرت نسواں پر کیا کیا لکھتے لیکن وہ تو اس قدر حساس ہیں کہ ان کے نزدیک ہوا خوری بے حیائی کے مرادف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام گھروں میں معمولی معمولی باتوں پر جو خانگی تنازعات بڑھکر جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ گھروں میں رنج و غم کی گھٹاؤں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ حالی (سوء تعلیم) نامناسب تربیت کورس کی بنیاد قرار دیتے ہیں ؎

ڈھیلی چھوڑی گئی ہے جو ڈوری — روز ہوتی ہے اب ہوا خوری
سوء تعلیم سے ہوا یہ حال — شوہروں سے سدا ہے جنگ و جدل
بیوی بدخو میاں ہیں جنٹلمین — راحت ان کو کبھی نہ اس کو چین

اولاد کی طرف سے تعلیم میں عدم توجہی

حالی اولاد کی تعلیم کی طرف سے والدین کی عدم توجہی کی خاص طور سے شکایت کرتے ہیں۔ وہ اخلاق تعلیم سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں جس کے لیے ع

قرآن پاک سے بہتر کوئی کتاب نہیں

لیکن اس کے ساتھ وہ انگریزی تعلیم سے سخت ناراض ہیں اور اس پر خوب لے دے کرتے ہیں یہ ہماری غلط تربیت کا نتیجہ ہی ہے کہ ہم زبان کو بحیثیت زبان اختیار نہیں کرتے، بلکہ انگریزیت کا لبادہ پہن کر اپنے کو مغربی قوموں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی تمنائیں دل میں لئے رہتے ہیں اور اس کے لئے وہ ہی مثال صادق آتی ہے۔

"کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا"

حالی اپنے الفاظ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بس یہی شغل صبح و شام رہا — ایک مدت تک اہتمام رہا
وہی وضع و لباس اور کردار — وہی رفتار اور وہی گفتار

سب لوازم بھی ہو گئے جاری   ہو گیا پھر تو شغل مے خواری
نہ رہے کاروبار کے قابل   ہوش گم عقل ہو گئی زائل
کچھ بزرگوں کا احترام نہیں   غیر کیا باپ کو سلام نہیں

ہم نے اپنی ظاہری آرائش کو اپنے کردار و اطوار کو چھپانے کے لئے جو ضروری قرار دے رکھا ہے اور اس ٹیپ ٹاپ سے جو نقصانات پہنچتے ہیں حالی اس کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہتے،

زینت و زیب ظاہری ہے ضرور   گرچہ اس مرتبہ نہ ہو مقدور
بنگلہ آراستہ ہو روح افزا   باغ سرسبز خوشنما زیبا

وہی قرض کا پرانا حربہ استعمال کرتے ہیں۔

اور خان صاحب کے تقاضے اپنے اثر دکھاتے ہیں۔

دوسروں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں ؎

خوب ہے خرچ جس قدر ہو سوا   قرض بھی ہو تو کچھ نہیں پروا
قرضخواہوں کا جب ہجوم ہوا   بدمزاج ان سے نفس شوم ہوا
پھر تو ہوتی ہیں بگھیاں نیلام   گھوڑے بکتے ہیں یہ ہوا انجام
کیا سعید و رشید ہے اولاد   ہے عدالت میں باپ پر فریاد

حالی مرحوم نے ہر عنوان میں طنز کے بے پناہ حربوں سے نشتر کا کام لیا ہے اور اس چابک دستی سے کام لیتے ہیں کہ با غیرت کے لئے گھاؤ گہرا پڑے وہ لوگوں کی اس نفسیات سے خوب واقف ہیں کہ عام آدمی کسی چالاک کو کیا سمجھتے ہیں عوام کی نگاہ میں چالاک ہونا۔ ہر راہ سے گزرنا ہر قسم کی ذلت سہ کر اپنی مطلب برآری کرنا ہی ہوشیاری کی علامت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج ہمارا ماحول بالکل ویسا ہی ہو گیا ہے جیسا کہ اس جنگ آزادی کے بعد۔ اس وقت شکست کے سبب اور آج نشہ و بدمستی کے باعث نتائج ایک ہی ہیں گو اسباب مختلف تھے۔ آج ہم نے آرائش و زیبائش کو جو عزت کا سبب سمجھ رکھا ہے وہ ہی در اصل ہماری خام تربیت کا اثر ہے ؎

لوگ کس درجہ ہو گئے بیباک   وہی ہشیار ہے جو ہے چالاک
کوئی کیسا ہی ہو ہنر پرور   عالم و کامل و زبان آور
گر نہ ہو یہ نیا لباس پسند   ہو نہ وضع جدید کا پابند
ہمسروں میں اگرچہ ہو فائق   پر ہے وہ انتہا کا نالائق
سب کی نظروں میں ہے ذلیل حقیر   کون سنتا ہے التماس فقیر

حالی مرحوم انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے غلط اثرات جو مرتب کئے ان کو وہ ضرور بیان کرتے ہیں ؎

انگریزی پڑھے نہال ہوئے   عہدہ پایا تو ذی کمال ہوئے
عیب کیا خوب ہے زباں دانی   پر جو باقی رہے مسلمانی!

وہ نہ ملنے جلنے کے مخالف ہیں نہ ارتباط بڑھانے کے خلاف ہیں لیکن ہم نے جو اپنے عقائد مسلمہ اور عادات کو ترک کر کے یہ جدید راستہ اختیار کیا۔ اس کے خلاف ہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہم زبان سیکھتے سیکھتے خود اپنے اصولوں کو ترک کر دیں ؎

سب سے ملتا ہو اختلاط بھی ہے   ہو ملاقات ارتباط بھی ہے
بدل اخلاق ہو مروت ہو   مذہب دین حق کو قوت ہو

ایک خاص چیز جو اس مثنوی میں ہے کہ مصنف بعض بعض جگہ مشکل الفاظ استعمال کرتا ہے اور عربی الفاظ کا استعمال بہت بے تکلفی سے کیا ہے ؎

حکم کرتی ہے اس پہ عقل سلیم   ہے برا اتباع نفس لئیم

ایک آدھ جگہ عربی کے اشعار بھی ہیں۔ بعض جگہ ایسے مصرع عربی کے ہیں اور انہیں بلا تکلف اس طرح استعمال کیا ہے جو نہایت موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے

عربی الفاظ جیسے مُتنبہ ۔ و عذر غیر مُتعذر

آخری شعر اشعار میں اصول دین اور نماز روزہ، حج و زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر اک کا الگ الگ بیان ہے۔ مکہ معظمہ جانے کے لئے شاعر اسی طنز کے طریقے کو اختیار کرتا ہے حسد سے کہ ٹیس دل میں پیدا ہو جائے ؎

جائیں اٹلی سوئیس لندن کو — آسٹریا فرانس جرمن کو
مصر جائیں گے شام جائیں گے — پر نہ مکہ کی راہ آئیں گے
حج کو جائیں تو کیا قباحت ہے — شغل امیروں کا اب سیاحت ہے
یہاں سیاحت ہے اور طاعت ہے — اور جا تو فقط سیاحت ہے

زیارت مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے جو روحانیت و تقویت روح و ایمان کو حاصل ہوتی ہے اس کو شاعر نظر انداز نہیں کرتا۔ شعر کی یہ تڑپ شاعرانہ نہیں بلکہ اس دیار میں پہونچنے والوں کے دل سے پوچھئے کہ کیا ملا؟ اقبال کے کلام سے پوچھئے کہ کیا مقصد سفر ہے۔

آج بین الاقوامی طرز پر کانفرنسیں بلائے جانے کی جو تجاویز زیر نظر ہیں اسلام کے نزدیک یہی مقصد خاص تھا کہ ہر خطۂ ملک کے لوگ اس طرح مل لیں کہ ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو جائیں۔ اور ایک دوسرے کے مسائل سمجھ سکیں ؎

پھر حج مکہ کو اگر جائیں — سیکڑوں فائدے وہاں پائیں
لوگ آتے ہیں ملک ملک کے وہاں — ملتے ہیں صنف صنف کے انساں
سب ترقی کی سمت مائل ہو۔
ہو ملاقات پختہ کاروں سے — عقلمندوں سے ہوشیاروں سے
سب مسلمان ہیں سب نماز گزار
سب خداترس سب ہیں تجربہ کار

رضا بقضا

رضا بہ قضا کا مطلب یہ ہے کہ جو حالت پیش آجائے اسے خوش دلی سے قبول کر لینا اور دل میں خفیف سا رنج بھی پیدا نہ ہونے دینا۔ یہ مقام صرف کامل مومنوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اسی مقام کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی صحابہ کرام خدائے پاک سے راضی رہے۔ کوئی سختی، کوئی تنگی اور کوئی مصیبت ان کی رضا و خوشنودی کو مکدر نہ کر سکی ؎

در کوئے مراد خود پسنداں دگر اند — در وادیٔ عشق مستمنداں دگر اند
آناں کہ بجز رضائے جاناں طلبند — آناں دگر اند و دردمنداں دگر اند

(مولانا مہر)

مقاصد صالحین

نواب خان بہادر خان شہید کی ایک تصنیف

(از پروفیسر بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے)

الحمد للہ! آج مجھے یہ سعادت نصیب ہے کہ نواب خان بہادر خاں شہید ابن نواب ذوالفقار خاں ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کو بحیثیت ایک مصنف کے ارباب علم کے سامنے پیش کرسکوں۔ یہ محض فضلِ ایزدی ہے جو ان کی تصنیف میرے ہاتھ لگی۔ یہ کیونکر دستیاب ہوئی؟ یہ داستان بھی بڑی دلچسپ ہے پہلے اس کو سُن لیجئے۔ آپ کے العلم کی جلد چہارم بابت ماہ جون ۱۹۵۸ء میرے اکثر احباب کے مطالعہ میں رہی۔ ایک نے دوسرے اور دوسرے نے تیسرے کو پہنچائی، یہاں تک کہ محب مکرم قاضی شہر سید حسن صاحب کے مطالعہ میں آئی۔ ایک دن اچانک قاضی صاحب موصوف غریب خانہ پر تشریف لائے میں کہیں باہر گیا ہوا تھا واپسی میں مکان کے اندر قدم رکھتے ہی آپ سے مطلع کیا گیا فوراً بالاخانہ[1] پر پہنچا کہ جہاں موصوف میرے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو غلط سلط لکھ دیتے ہیں ساتھ ہی ساتھ العلم کا صفحہ ۳۷ کھول کر سامنے رکھ دیا اور قاضی سرفراز علی[2] صاحب کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ میرے جدامجد تھے انہیں گورکھپوری لکھدیا۔ ان کی متعدد قلمی تصانیف نثر و نظم میں میرے پاس محفوظ ہیں۔

یہ حقیقتاً ایک نیا انکشاف تھا۔ انکشاف اس لیے کہ میں بھی ان کو اب تک غلطی سے گورکھپوری ہی سمجھتا تھا۔ جس طرح کہ مولوی مظہر کریم[3] کو بہرائچی۔ میں نے قاضی صاحب سے درخواست کی کہ کیا مجھے مرحوم و مغفور کی تصانیف دیکھنے کے لئے مل سکیں گی۔ چنانچہ موصوف کے مکان پر جاکر میں نے دو گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد منتشر اوراق میں سے چھانٹ چھانٹ کر کچھ کاغذات جمع کیے۔ مقاصد صالحین

---

[1] شاہجہانپور خواتین ناغہ کی مشہور بستی ہے یہاں کے مکانوں کی ترکیب ساخت بدایوں و بریلی کے مکانات سے قدرے مختلف ہے نشست تو شاید ہی کسی مکان کے ساتھ ہو ورنہ زنانخانہ اور مردانخانے کی مستقل علاحدہ ہوتی تھیں اب یہ صورت باقی نہیں ہے اسلئے ہر مکان کے ساتھ نشست کیلئے کوئی کوئی انتظام الگ سے کرنا پڑتا ہے۔

[2] قاضی سرفراز علی صاحب شاہجہانپور کے ایک مقتدر رئیس و جاگیردار تھے۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے انڈمان بھیجے گئے چار برس کے بعد ایک کارنمایاں کے سبب رہائی پائی۔ واپسی کے وقت نکٹ نہ تھے آخر میں بحار منہ فلک سویم بیار وہ کر ۱۲ رجادی الثانی ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ رجولائی ۱۸۷۴ء کو وفات پائی۔ مرحوم کے تفصیلی حالات نیز کلام کے نمونہ و تبصرہ کیلئے دوسری قسط کا انتظار فرمائیے۔

[3] مولوی مظہر کریم بہرائچی نہیں ہیں بلکہ الحاج حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے بزرگوں میں سے ہیں اس پر ایک مبسوط نوٹ غلط فہمی دور کرنے کیلئے حضرت

نامی مخطوطہ موصوف نے لکھنؤ سے عنایت فرمایا جس کو وہ غلطی سے سرفراز علی صاحب کی تصنیف سمجھے ہوئے تھے۔

مکان پر واپس آکر میں نے اور کاغذات تو الگ رکھ دیئے جن کے پڑھنے کی نوبت آجتک نہیں آئی البتہ مخطوطہ کو اول تا آخر دیکھ گیا۔ پہلے ہی صفحہ پر مصنف کا نام معلوم ہو گیا تھا اسلئے اس کو اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ چونکہ نئی تھی اس لئے ایک مہینہ لگاتار محنت کر کے اس کی نقل بھی لے لی۔ اس طرح مقاصد الصالحین کی قلمی جلدیں میرے پاس دو ہیں۔ اب فکر ہوئی کہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ ہاتھ لگے تو دونوں کا مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔

میں نے مخطوطہ ملتے ہی سنہا صاحب ایڈیٹر روہیلکھنڈ اخبار بریلی کو لکھا کہ وہ براہ کرم خان بہادر خان مرحوم و مغفور کے گھر والوں سے مل کر مجھے مطلع فرمائیں کہ آیا کوئی نسخہ ان کے پاس مل سکے گا جواب آنے سے پیشتر ہی مجھے عرس قادری میں شرکت کیلئے بدایوں جانا پڑا۔ بریلی اسٹیشن پر سنہا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے بتایا کہ وہ خان بہادر خان شہید کے پوتے احمد بہادر خاں صاحب سے جا کر ملے تھے وہاں کتاب تو کیا ایک ورق بھی موجود نہیں اس لئے کہ اُن کے والد جان بہادر خاں صاحب اپنے والد کی شہادت کے وقت صرف آٹھ برس کے تھے جن کو لیکر ان کی والدہ (یعنی احمد بہادر خاں صاحب کی دادی صاحبہ) گوالیار چلی گئیں اور ایک عرصہ تک وہیں مقیم رہیں۔ انگریزوں نے کونسا ایسا ستم باقی تھا جو اس گھرانے کے لئے اُٹھا رکھا اور پھر سال دو سال نہیں بلکہ سالہا سال تک شہید نواب کے گھر والے معتوبین میں شمار کئے جاتے رہے استصواب میں کسے ہوش تھا جو کتابوں کو بچانے کی فکر کرتا۔ اکثر تو محلّہ کے ساتھ نذرِ آتش ہو گئی ہونگی اور جو باقی بچی ہونگی اُن پر رحم کھا کر گرد و غبار نے پردہ ڈال دیا ہو گا۔ بہرحال یہ سوگ داستان ہے۔ سکندر، چنگیز اور ہلاکو کی تلوار نے لاکھوں افراد انسانی کو لقمۂ اجل بنایا پھر بھی دنیا کی آبادی آج اُن کے دَور سے کچھ آگے ہی ہے لیکن جو کتب خانے اُن کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے اُن کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی۔ اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی مرحوم "الفاروق" کی خاطر بلاد اسلامیہ کا سفر کرنا پڑا تو استنبول کے شاہی کتب خانہ میں صرف اٹھارہ ہزار جلدیں ملیں۔ یہ کل اثاثہ تھا۔ علماء اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی جد و جہد کا جو زمانہ کی دست برد سے بچکر ترکوں کی امانت میں پہونچا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ سرمایہ تو اُس بحرِ ذخار میں کوزہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا جو علماء سلف کی علمی کاوشوں[1] نے فراہم کیا تھا۔ دس دس اور بارہ بارہ ہزار

مولانائے محترم سپردِ قلم فرما چکے ہیں۔ یہ غلط فہمی غالباً مریم کی شاعری کی وجہ سے عام ہو چلی ہے کہ وہ بہرائچ کے رہنے والے تھے۔

[1] بغداد میں بیت الحکمۃ نیز شہر کے دوسرے کتب خانوں کو جلانے کے بعد بھی بچی ۴ لاکھ کتابوں سے نصیرالدین طوسی کے لئے ہلاکو تاتاری نے مراغہ میں ایک کتب خانہ قایم کیا تھا۔ مصر میں "خزائن القصور" کے اندر ۱۶ لاکھ کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ قاہرہ ہی میں "دار الحکمۃ" کے اندر ایک لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔ کتب خانہ طرابلس (واقع شام) میں ۳۰ لاکھ کتابیں تھیں جب عیسائیوں نے اس کو فتح کیا تو تمام کتابوں کو جلا ڈالا۔ قرطبہ میں "الحکم" کے اندر ۴ لاکھ کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ صرف غرناطہ میں ۷۰ کتب خانے عوام کیلئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ بلاد اسلامیہ کے دیگر شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ ہند کا قرون وسطیٰ

جلدیں تو معمولی امراء کے بھی کتب خانوں میں ہوتی تھیں[1]۔ بہ صورت میں ۸۰ ہزار کی تعداد تو کچھ زیادہ وقیع نہیں۔ نادانوں نے بزعم باطل ملت اسلامیہ کو اس کے علمی اثاثہ کو ضائع کرکے مٹانے کی ناپاک کوشش کی تھی اس لئے کہ کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس سے اس کے زبان اور علمی کارناموں کو چھین لو۔ اس اصول پر استبداد پسندوں نے عمل کیا ہے اور اب بھی عمل پیرا ہیں انہیں کوئی کیسے سمجھائے کہ یہ اُمّت بڑی سخت جان ہے تمہارے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ دب کر اُبھرتی ہے اور پھر اُبھر کر چار دانگ عالم پر چھا جاتی ہے بقول حضرت مولانا محمد علی جوہرؔ ؎

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

یہ نہیں سمجھتے کہ یہ خیر الامت ہے اس کے مٹانے کی کوشش کرتے کرتے کہیں خود ہی نہ فنا ہو جائیں اور اگر سچ پوچھئے تو کہیں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دیدۂ عبرت نگاہ نے بارہا دیکھا ہے اور بقول حضرت جوہرؔ پھر دیکھے گی کہ ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بات کہاں سے کہاں پہونچی ذکر تھا مقاصد صالحین کے دوسرے نسخہ کی تلاش کا۔ نسخہ کے حصول کے لئے بدایوں میں بھی جستجو کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی سفر میں سوروں (واقع ضلع ایٹہ) جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ہندوؤں کی ایک بڑی اور مسلمانوں کی نہایت چھوٹی سی آبادی ہے جہاں نسخے کے ملنے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ دل میں ایک لگن تھی ہر کس و ناکس سے اسی کی داستان کہی جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے دوران گفتگو میں محب مکرم الحاج محمد یٰسین صاحب تسکین سوروی ریٹائرڈ کورٹ انسپکٹر آف پولیس نے وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے آبائی کتب خانہ میں تلاش کرکے اگر نسخہ دستیاب ہوا تو مجھے اطلاع دیں گے اطلاع دینے کی بات تو دیر طلب تھی اس لئے میں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر قیام کی مدت کو اور بڑھا دیا دوسرے دن موصوف نے مجھے مقاصد صالحین کا ایک مطبوعہ نسخہ عنایت فرمایا۔ اس طرح اب میرے پاس ۲ دو قلمی اور ایک مطبوعہ نسخے مقاصد صالحین کے موجود ہیں۔ تیسرے نسخہ کا پتہ برادرم ایوب قادری نے دیا جو ۱۳۲۲ھ میں نظامی پریس کانپور میں چھپا مطبوعہ نسخے اور حضرات کے پاس بھی ہوں گے لیکن قلمی نسخہ شائد ہی کسی کے پاس ہو۔

مطبوعہ نسخہ ۱۲۸۹ھ کا ہے اور مطبع نظامی کانپور میں باہتمام محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں مغفور شائع کیا گیا ہے۔ سائز: ۲۶ × ۲۰ اور صفحات ۹۶ ہیں۔

قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخوں کے مقابلہ کی ہجوم افکار نے اب تک تو اجازت ہی نہیں۔ انشاء اللہ العزیز پہلی فرصت میں کوشش کروں گا کہ تقابل مطالعہ کر سکوں۔ سرسری طور پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوا کہ مطبوعہ نسخہ زبان و بیان دونوں کے اعتبار سے قلمی کے مقابلہ میں کچھ مختلف ہے طابع و ناشر کے پیش نظر جو نسخہ رہا ہے اس میں یا تو نواب خان بہادر خاں شہید کا نام محذوف تھا یا خود ہی اسے

---

[1] افواہم طلیب نے ۲۰ ہزار کتابیں، امین الدولہ نے بھی اسی قدر، موفق الدین نے دس ہزار کتابیں جمع کیں۔ دیگر امراء کا بھی یہی حال تھا۔

حذف کر دیا اس لئے کہ سن طباعت جنگ آزادی کے ۱۵ سال بعد کی ہے جبکہ شہید نواب کا نام لینا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا کجا نام کی اشاعت ۔ بہرکیف ناشر کی اتنی خدمت بھی مستحسن ہے جو اس نے ایک نایاب تصنیف مقاصدِ صالحین کو "مقاصد الصالحین" کے نام سے شائع کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

قلمی نسخہ کا سائز بھی ۲۰×۲۶ ہے۔ کاغذ بانسی کا ورمیانی لیکن مضبوط۔ قلم اوسط درجہ کا "بخط بے ربط"۔ ۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخہ مجموعی طور پر اچھی حالت میں ہے شروع کے دو ورق کرم خوردہ باقی اوراق پر بھی کیڑوں نے دانت مارا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ سنہ کتابت ۱۳ شعبان المعظم یوم شنبہ سنہ ۱۲۷۱ھ[1] یعنی جنگ آزادی سے ٹھیک تین سال پیشتر جیسا کہ مخطوطہ کی آخری سطور سے ظاہر ہے:۔

قلمی نسخہ صلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھزاروں حمد اور لاکھوں شکر اُس خلاق اکبر کو کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء و ذوی الاحترام کی تبلیغ واسطی رھنائی گمرا ہونکی مخلوق اور مبعوث فرمایا اور درود نامحدود اوس خلاصہ موجودات پر کہ نور باسرور جسکی سی ظلمات کفر اور نفاق مرتفع ہو کر آفتاب ہدایت نے جہان کو روشن کیا ایسی ہی رحمت کامل او پر روح پر فتوح اہل بیت اور اصحاب والانصاب اور اولیائے عالیجناب اور علماء فضیلت اکتساب کے کہ شمع ارشاد اور اجتہاد انکی سی تاریکی دلوں نور ایمان سے مبدل ہوئی بعد اس کی بندۂ گنہگار خان بہادر خان ابن محمد ذوالفقار خان خلف حافظ الملک حافظ رحمت خاں

"الحمد للہ کہ کتاب مقاصد صالحین تصنیف نواب خان بہادر خاں صاحب بہادر صدر امین بریلی حسب فرمائش جناب قاضی سرفراز علی صاحب بخط بے ربط بندہ گنہ گار محمد نیاز علی ولد محمد ناصر علی خاں ساکن محلہ ثنا و محلہ خلیل بتاریخ ۱۳ شعبان المعظم یوم شنبہ سنہ ۱۲۷۱ھ باتمام رسید"

مطبوعہ نسخہ میں زبان و بیان کے اعتبار سے کافی تبدیلیاں کی گئی ہیں جن کا ناشر کو اقرار ہے۔

"پس بعد درستی عبارت باعانت میر وارث علی جا دام فیضہٗ کے اکثر مقام اُردو اس کتاب کے مربوط نہ تھے مطبع نظامی میں چھپوائی"۔ مثال کے طور پر اول و آخر صفحات کی عبارت پیش کی جا رہی ہے تاکہ صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔

ملاحظہ ہو:۔

مطبوعہ نسخہ صلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہزاروں حمد اور لاکھوں شکر اُس خالق اکبر کو سزاوار ہے کہ جس نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اولیائے ذوی الاحترام کو واسطے ہدایت گمراہوں کے مبعوث اور مخلوق فرمایا اور درود بے شمار اس سرور کائنات خلاصۂ موجودات کو لائق ہو کہ جن کے نور افاضت ظہور سے ظلمت کفر و نفاق کی زائل ہوئی اور آفتاب ہدایت سے ایک عالم روشن ہوا اور رحمت کاملہ اوپر ارواح طیبات حضرات اہل بیت اور اصحاب حمیدہ صفات اور اولیائے خوش اوقات اور علمائے فضائل سمات کے کہ اُنکی شمع ارشاد اور اجتہاد کی روشنی سے تاریکی دلوں کی نور ایمان سے

[1] ۱۳ شعبان المعظم کا از روئے حساب پنجشنبہ ہونا چاہئے شنبہ کی وجہ سمجھ میں نہ آئی غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

شہید مغفور چند حکایات بزرگان سلف کی کتابوں معتبر سے بان ہندی میں بیان کرتا ہی تاکہ خواندہ اور ناخواندہ اس دستور العمل سے فائدہ حاصل کری۔ جو یہ نسخہ معنوی ہی اوپر مقاصد صلحا کی اس واسطی مقاصد صالحین نام رکھا اور دس مقصد بہ ترتیب مقرر کی۔

مبدل ہوئی بعد اس کے یہ بندۂ گنہگار عرض کرتا ہے کہ چند حکایات رشادت آیات بزرگان سلف کی معتبر کتابوں سے انتخاب کرکے زبان اُردو میں بیان کی ہیں تاکہ ہر شخص اُن کے پڑھنے اور سُننے سے فائدہ حاصل کرے اور چونکہ یہ نسخہ شامل اوپر مقاصد صلحا کے ہے نام بھی اسکا مقاصد الصالحین رکھا گیا اور دس مقصد اسمیں مرتب کئے گئے۔

صفحہ ۸

قلمی نسخہ

ص۱۲۵ کی تیسری سطر کے آگے تا اختتام

بعضے علما یوں لکھتے ہیں کہ جب خلیل الرحمٰن نے اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری رکھی اور چاہا کہ کھینچے حکم الٰہی سے جبرئیل علیہ السلام نے دھار چھری کی پھیر دی ہر چند زور کئے خط نہ پڑا غیب سے آواز ہوئی کہ اے خلیل! برگزیدہ بندہ اپنے بیٹے کی (قربانی) کی تو نے اور اے بندہ پسندیدہ آزمائش میں صادق پایا تجھ کو یہ گوسفند ذبح کر اور بیٹے کو دے دیکھتے کیا ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام ایک گوسفند ہوا پر لوڑاتے (اڑاتے) لاتے ہیں اور سلام علیک کرکے کہتے ہیں کہ عوض اسمٰعیل کا لے لیجئے اور قربانی کیجئے بعد اس کے جبرئیل علیہ السلام نے ہاتھ اُٹھا کے کہا اللہ اکبر حضرت خلیل صلوٰۃ الرحمٰن نے فرمایا لا الہ الا اللہ واللہ اکبر جناب ذبیح اللہ نے ارشاد کیا اللہ اکبر و للہ الحمد ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا اسی دن سے ایام تشریق کی تکبیریں واجب ہوئیں۔ بعض کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ اس وقت فرشتے متعجب ہوئے اور اس حال کو دیکھ کر حیرت کرتے تھے بعض کہتے تھے ابراہیم بڑا سچا ہے کہ ایسی شے کو قربان کرتا ہے اور بعضے اسمٰعیل کو کہتے تھے کہ یہ بڑا جوانمرد کہ

مطبوعہ نسخہ

ص۹۵ کی آخری سطر سے تا اختتام ص۹۶

بعضے علما نے یوں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری رکھ کر چاہا کہ کھینچیں حضرت جبرئیل نے حکم الٰہی سے دھار چھری کی پھیر دی ہر چند زور کیا خط تک نہ پڑا غیب سے آواز آئی کہ اے خلیل برگزیدہ تو نے اپنے خواب کو سچا کیا اور اے بندے پسندیدہ! تو آزمائش میں صادق نکلا اب یہ گوسفند ذبح کر اور اپنے بیٹے کو چھوڑ دے حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک گوسفند ہوا پر اڑاتے ہوئے لاتے ہیں پس حضرت جبرئیل نے ایک دنبہ بہشت کا لاکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ یا ابراہیم عوض اسمٰعیل کا لیجئے اور قربانی کیجئے بعد اس کے جبرئیل علیہ السلام نے ہاتھ اُٹھا کر کہا اللہ اکبر اللہ اکبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا لا الہ الا اللہ واللہ اکبر حضرت اسمٰعیل نے کہا اللہ اکبر و للہ الحمد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دنبے کو ذبح کیا اس دن سے ایام تشریق کی تکبیریں واجب ہوئیں۔ اور بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ اس وقت فرشتے متعجب ہو اور اس حال کو دیکھ کے حیرت کرتے تھے بعضے کہتے تھے ابراہیم

جان اپنی واسطے رضامندی دوست کے دیتا ہے حضرت خلیل
تے ہیں میں بڑا سخی ہوں کہ بیٹے سی چیز کو راہِ خدا میں دیتا ہوں
ور جناب ذبیح اللہ جانتے تھے کہ میں بڑا جوانمرد ہوں جان سی
عزیز چیز راہِ خدا میں تصدق کرتا ہوں کارساز حقیقی نے دونوں
طرف سے فرمایا کہ میں بڑا داتا ہوں کہ بغیر مانگے قصاص
دیتا ہوں اور بے مانگے جو تمہارے وہم و خیال میں نہیں
آتا بھیجتا ہوں جب ابراہیم علیہ السلام ذبح کے شغل سے
فارغ ہوئے حیران کھڑے تھے جناب الٰہی سے خطاب ہوا کہ
اے خلیل خلت بے علت کے واسطے یہ قربانی فرزند کی گو
فی گذرانی تو نے اور اے اسمٰعیل تو نے جو اس آزمائش پر
صبر کیا تیغ بلا پر گلا رکھا تسلیم اور رضا اور اطاعت کی رسم
بجا لایا اب مانگو جو دعا کہ مانگتے ہو اور چاہو جو مطلب کہ
چاہتے ہو دونوں پیغمبروں نے دعا کی کہ الٰہی پیغمبر آخر الزماں
کی اُمت میں جو شخص کہ مرنے کے وقت کلمۂ شہادت سے
محروم رہے اس کو ہماری خاطر بخش اور زبان اُس کی کلمۂ
توحید پر جاری کر۔ حکم ہوا دعا تمہاری قبول ہوئی سارے
عاصی بخشے گئے۔ آمین یا رب العالمین۔

بڑا جوانمرد ہے کہ اپنے بیٹے کو قربان کرتا ہے اور بیٹے کہتے تھے کہ
اسمٰعیل بڑا جوانمرد ہے کہ اپنی جان خدا کی رضامندی کے واسطے
دیتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے فارغ
ہوئے جناب الٰہی سے خطاب ہوا کہ اے خلیل خلت بے علت
کے لئے تو نے یہ قربانی گواہ گزرانی اور اسمٰعیل نے جو اس
امتحان و ابتلا پر صبر کیا اور تسلیم و رضا پر قائم رہا میں تم دونوں
سے بہت راضی ہوا۔ اب جو مطلب تم دونوں مانگو میں
دوں دونوں صاحبوں نے دعا کی کہ الٰہی پیغمبر آخر الزماں
صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا جو شخص گنہگار اور زیادہ گناہ ہو
اُس کی مغفرت ہم دونوں کی التماس سے فرمانا اور زبان
اس کی کلمۂ شہادت پر جاری کرنا۔ حکم ہوا کہ دعا تمہاری
قبول ہوئی اور تمام اُمت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و
آلہ وسلم بخشی گئی۔ تم خاطر جمع رکھو اور شکر کرو آمین یا
رب العالمین۔

مخطوطہ میں کتابت کے لحاظ سے:۔

(۱) یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہیں کیا گیا۔
(۲) کاف و گاف میں امتیاز صرف عبارت کے ربط کو ملحوظ رکھ کر ہو سکتا ہے ورنہ گاف کا مرکز ہر جگہ غائب ہے۔
(۳) آج کل کی بول چال میں جملہ کی ترکیب کے لئے فاعل، مفعول اور فعل اور ان کے متعلقات کی ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن مخطوطہ میں اس کا کم خیال رکھا گیا ہے۔
(۴) بعض الفاظ کا املاء دیہی زبان میں ہے جیسے تلوار کے لئے تروار۔
(۵) حروف کے نقطوں سے کاتب بے نیاز معلوم ہوتا ہے۔
(۶) بعض الفاظ باوجود کوشش کے پڑھنے میں نہیں آئے۔

مثلاً:۔

لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ	لفظ	صفحہ
ڈکاتبن	۱۷	میل طرف نکی	۴۵	غام	۶۳
بازنی نیا پچا	۱۹	بہس منت	۴۷	پوچھاکہ کیا	۶۴

(۷) بعض جگہ عبارت میں درمیانی الفاظ یا حروف لکھنے سے رہ گئے جیسے :-

غلط عبارت	صحیح عبارت	صفحہ
نارحق سے	زاری حق سے	۴۰
قابل بخشنے	قابل بخشنے کے نہیں	۴۱
درندد	درندوں	۴۱
کنارمدی	کنارے پر سے	۴۳
ہی	ہیں	۵۱
اس شخص کہ	اس شخص کو کہ	۵۲
پوچھاکہ کیا	پوچھا	۶۴ وغیرہ وغیرہ

(۸) زائد عبارت اکثر جگہ ملتی ہے مثلاً

عبارت	صفحہ	عبارت	صفحہ
سب سے	۴۵	گنہ گار امت میری کا	۵۴
کہ کیا	۶۴	تو نے	۵۵

سب طرح کا عذاب کے عذاب سے حشر وغیرہ وغیرہ

(۹) مخطوطہ میں صفحات نہیں ڈالے گئے دوسرے صفحہ کی ابتدا اول صفحہ کے آخری لفظ سے کی گئی ہے۔

(۱۰) مضامین کی فہرست نسخے کے نہ تو شروع صفحات پر نظر آتی ہے اور نہ آخر کے صفحات پر۔

(۱۱) بعض جگہ عبارت نہایت سلجھی ہوئی اور صاف ہے۔

(۱۲) کتابت کا اندازہ لگانے کے لئے مثال کی چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ صحیح الفاظ قوسین میں لکھدیئے گئے ہیں تاکہ پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی آہ وزاری نقل کرتے ہوئے کاتب لکھتا ہے،

"ایک رات (رات) رو تی روتی (روتے روتے) سو گی (سو گئے) جبرل (جبرئیل) علیہ السلام کو حکم ہوا کہ صورت یوسف (یوسف) کی بنا کر اپنی تیں (اپنے تئیں) یعقوب کو دیکھا (یعقوب کو دکھا) جبرل (جبرئیل) علیہ السلام حکم بجا لای (لائے) یعقوب (یعقوب) علیہ السلام نی (نے) ویسا ہے (ہی) جمال اور حسن دیکھی (دیکھ کے) جانا (جانا) کہ یوسف ہی ہے (ہے)" وغیرہ وغیرہ

دیکھو۔ امام زین العابدین صلواۃ علیہ (صلواۃ اللہ علیہ) جب وضو (وضو) کرتی (کرتے) رنگ (رنگ) جہرہ (چہرہ) مبارک کا متغیر (متغیر) ہو جاتا (ہو جاتا) لوگوں نی (نے) پوچھا (پوچھا) کہ یہ سبب کیا ہی (ہے) فرمایا (فرمایا) کہ بادشاہ عالم کی خدمت میں جاتا ہوں رعب او ہراس (اور ہراس) سی (سے) رنگ (رنگ) او ہوش (اور ہوش) بجا نہیں (نہیں) رہتا (رہتا) وغیرہ وغیرہ

ان تمام کوتاہیوں کے باوجود نسخے کی قدر و قیمت اور وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے نزدیک اس میں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کو ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جو نواب خان بہادر خاں شہید کے ذاتی کیرکیٹر اور اُن کی بے لوث خدمات پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اس نسخہ میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انبیاء کرام اور علماء سلف کی آپ بیتی روایات و حکایات درج کی گئی ہیں جو سب کی سب نہایت سبق آموز، ایمان میں تازگی اور روح کو بالیدگی بخشنے والی ہیں۔ مصنف علیہ الرحمۃ نے جگہ جگہ خلوص قلب کے ساتھ دعا مانگی ہے جو دو طرح کی ہے ایک عمومی جس کا تعلق عامۃ المسلمین سے ہے اور دوسری خصوصی جس کا تعلق مصنف کی اپنی ذات سے ہے اور جس میں وہ کسی کا اشتراک پسند نہیں کرتے۔ اسی آخری قسم کی دعا سے مصنف کے کیریکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ وضاحت کیلئے دو چار مثالیں کافی ہونگی۔

ذوق شہادت کی داخلی شہادت

پہلے مقصد کی چوتھی حکایت ہے۔ حضرت شیخ شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک اللہ والے کو بھاری بیڑیاں پہنے ہوئے ایک تنگ و تاریک مکان میں مقید دیکھا۔ شدتِ تکلیف سے اس کا رنگ زرد اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی نظر حضرت شیخ رح پر پڑی تو خوش ہوا اور یوں کہنے لگا:-

"اے شیخ! تم عارف باللہ ہو بعد سلام
کے یہ پیغام میرا دوست کو پہنچا دیجیو
کہ اگر ساتویں آسمان کا ایک طوق کرکے
گلے میں میرے ڈالے اور ساتویں زمین
کو زنجیر بنا کر پاؤں میرے میں ڈالے تو ذرا
بھی راہ طلب سے قدم نہ اٹھاؤں گا
شیخ نے وقتِ خاص میں مناجات کی
کہ خداوندا جیسے تو سب مخلوق سے

نرالا ہے۔ بے پرواہی اور بے نیازی بھی تیری سب کی بے نیازیوں سے نرالی ہے الٰہی سب دوست کو پالتے ہیں اور دشمن کو مارتے ہیں تو دوست کو مارتا ہے اور دشمن کو پالتا ہے۔ الہام ہوا کہ اے شبلی! زبان تھام اور ترکِ ادب چھوڑ کہ جو مجھکو دوست رکھتا ہے اُس کو میں بلائے سخت میں گرفتار کرتا ہوں اور جس کو میں دوست رکھتا ہوں قتل کرتا ہوں اور خون بہا میں دیدار اپنا اور جیتا جاودانی دیتا ہوں۔ اے کریم یہ قتل اور خون بہا اس عاجز پُرمعاصی کو عنایت کر صدقہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا۔"

ذرا خط کشیدہ عبارت پر نظر ڈالئے اور اس کی روشنی میں شہید نواب کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ شہید ہونے کی تمنا سب کرتے ہیں لیکن کتنے ایسے ہیں جن کی تمنائیں مولائے کریم کی بارگاہ عالی میں شرف قبولیت سے ممتاز ہوتی ہیں۔ نواب علیہ الرحمۃ یقیناً دُنیا دار تھے اُن کو اپنے تقدس و بزرگی پر نہ تو ناز تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا پھر درجۂ شہادت انہیں نصیب ہوگیا تو یہ کس کے بس کی بات ہے بقول حضرت مولانا محمد علی جوہر مرحوم ع

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

جنگ آزادی کے نامور رہنماؤں پر ایک نظر ڈال جائیے۔ ایک طرف لکھنؤ کے مرزا برجیس قدر، کان پور کے نانا صاحب اور تانتیا ٹوپی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی

فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں، جگدیش پور کے راجہ کنور سنگھ وغیرہم کی جماعت[1] ہے جو انگریزوں کے خلاف برسرپیکار نظر آتی ہے غیر ملکی حکمرانوں کے غلبہ اور غلامی کے پھندے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے لوثی کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے کھوئے اقتدار کو واپس لینے اور آبائی حکومتوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے دوسری طرف مولانا قاسم دانا پوری مولانا غلام امام شہید، مفتی انعام اللہ گوپاموی، ڈاکٹر وزیر خان مولوی رحمت اللہ کیرانوی، مولوی فیض احمد عثمانی بدایونی مولوی رضی اللہ بدایونی۔ سید گلزار علی امروہوی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولوی سکندر شاہ فیض آبادی مولوی احمد سعید سبط شاہ غلام علی لکھنوی، قاضی سرفراز علی شاہجہانپوری (بھارت) جنرل بخت خاں روہیلہ، مولوی منظر کریم دریابادی مولانا شاہ سید نیاز احمد شہید سہسوانی، مولانا شاہ عبدالقادر لدھیانوی وغیرہم کی بے لوث جماعت ہے جو نہ اپنے کسی آبائی ملک کو واپس لینے کی فکر میں ہے اور نہ طلب منفعت کی خاطر انگریزوں سے نبرد آزما ہے۔ غلامی سے نجات حاصل کرنا اور اعلاء کلمۃ الحق جس کا مقصد وحید ہے۔

مولوی احمد اللہ شاہ شہید مدراسی، اور خان بہادر خاں شہید بریلوی اس جماعت میں منفرد ہیں۔ مولوی احمد اللہ شاہ کے عزائم روشن، جماعت منظم لیکن آخر الذکر کے دل میں ذوقِ شہادت کی آرزو پنہاں اور بظاہر حصولِ مقصد کے ذرائع مفقود۔ اسباب مہیا ہوتے ہی دل میں سلگتی ہوئی چنگاری شعلہ بن جاتی ہو تاریخ شاہد ہو کہ اگر آبائی ملک پر قابض ہونے اور اپنے نام و نمود کے اظہار کی خواہش ہوتی تو مسٹر الگزینڈر کمشنر بریلی کی پیش کش کو قابلِ اعتنا سمجھکر عمل پیرا ہوتے اور انگریزوں سے عہد کو استوار کرکے سرخروئی حاصل کرتے۔ اس صورت میں اگر عہد کو توڑ کر میدان میں آتے تو اسلامی نقطۂ نظر سے شریعت کے مجرم ٹھہرتے اور جہاد کے تصور سے کوسوں دور جا پڑتے اس لئے بجا طور پر وہی راستہ اختیار کیا جس کی آرزو جنگِ آزادی سے تین سال پیشتر دل میں لئے بیٹھے تھے[2] کہ:۔

"اے کریم: یہ قتل اور خون بہا اس عاجز پر معاف کو عنایت کر صدقہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا"۔ اور پھر وقت آنے پر دنیا نے دیکھا کہ یہ آرزو کتنے شاندار طریقے سے حرف بحرف پوری ہوئی۔ پھانسی کا تختہ سامنے ہے نصیحت و وصیت کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے جواب دیا جاتا ہو کہ:۔

"مجھ کو کسی سے کچھ کہنا نہیں ہے اور چشم پُر آب ہو کر یہ شعر زبان پر لائے ؎

بہ جرم کلمۂ حق میکشند و غوغائے است
زمرگِ زندگیم میشود تماشائے است

بزرگوں سے عقیدت و محبّت

پہلے مقصد کی جستجو ہے
حکایت ہے شیخ

شبلی علیہ الرحمۃ بغداد میں بیمار خانہ کو گئے ایک طبیب کو دیکھا کہ دوائیں آگے کھلی ہیں اور علاج بیماروں کا کرتا ہے کہا اُس

---

[1] تو ہماری گورنمنٹ (بھارت) جماعت نمبر اول کی یادگاریں قائم کرنے کی فکر میں ہو اور خصوصاً ان حضرات کی جو صرف ایک مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اصل یادگاریں تو ان حضرات کی قائم کرنا چاہئیں جن کا تعلق جماعت نمبر ۲ سے ہے دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب ادھر متوجہ ہوتی ہو۔

[2] حیات حافظ رحمت خاں مؤلفہ سید الطاف علی بریلوی۔

طبیب! کوئی علاج گناہ کا بھی ہے کہاں نہیں۔ ایک دیوانے نے مانند پروانہ کے سوز و گداز سے آواز دی کہ "اے شبلی! اگر درد گناہ کی دارو چاہتا ہے جڑ نیاز مندی کی اور پتی پشیمانی کی اور بیج شکیبائی کی لے کر توبہ کی ہاون میں کوٹ اور پانی صدق کا ڈال کر محبت کی آگ سے جوش دے اور پرہیزگاری کی پاؤ۔ ٹھنڈا کر کے بارو نیاز پی جا اور کہہ الٰہی گناہ میرے بخش توبہ کی سہل سے مواد گناہ کے پاک ہو جاویں گے۔ شبلی نے کہا اے دیوانے! تو نے عاقلوں کی سی بات کہی۔

الٰہی صدقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبت اپنی اور اپنے دوستوں کی۔ اس عاصی پُر معاصی کو عنایت کر۔"

اسی طرح دوسرے مقصد کی اکسٹھویں حکایت لکھتے وقت ایک بزرگ کے اتقاء و پرہیزگاری سے طلب متاثر ہے۔ دیکھئے کتنے خلوص قلب کے ساتھ خود بھی ویسا ہی بننے کے لئے انکی متابعت کی دعا مانگتے ہیں "خداوندا صدقہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا برکت و متابعت ان بزرگواروں کی اس عاصی پر معاصی کو عنایت کر آمین یا رب العالمین۔"

مولانا ظفر علی خان

"پچھلے سال ۱۹۵۵ء میں جب مولانا کی تراسیویں سال گرہ کے جلسے کی صدارت کے لئے کرم آباد گیا تو مولانا کو خاموش اور بے حس و حرکت دیکھ کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ وہ بہت ہی کم کسی کو پہچانتے تھے۔ لیکن جب میں سامنے آیا اور اختر علی خاں نے ان سے پوچھا "ابا! آپ نے ان کو پہچانا؟" نہایت دھیمی آواز میں فرمایا، "ان کو نہ پہچانوں گا تو اور کس کو پہچانوں گا ـــ سالک صاحب ہیں!" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ شخص جس کی دہاڑ سے کبھی پورا ہندوستان گونجتا تھا اور جس کا ایک قدم لاہور میں، دوسرا رنگون میں اور تیسرا بمبئی میں ہوتا تھا، آج اس کی خاموشی اور بے حرکتی نہایت عجیب درس عبرت تھی۔ اب چند سال سے مولانا گرمیوں کے چند مہینے مری گزارتے ہیں اور سردیوں میں کرم آباد آ جاتے ہیں، ان کے برادر حقیقی چودھری غلام حیدر خاں دن رات ان کے پاس ہی رہتے اور ان کی تیمارداری اور خبرگیری کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ مولانا کو صحت تندرستی کے ساتھ زندہ رکھے، وہ مسلمانان پاک و ہند کا بہت عزیز سرمایہ ہیں۔"

(مولانا سالک)

روئداد سالانہ اجلاس

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

حسب قرارداد جلسۂ ورکنگ کمیٹی منعقدہ ۲۶ مارچ ۱۹۵۶ء

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ستادنواں (پاکستان میں تیسرا) سالانہ اجلاس ۲۷، ۲۸ اپریل ۱۹۵۶ء کو سرسید گرلز کالج واقع ناظم آباد۔ بی روڈ کراچی میں منعقد ہوا۔

مجلس استقبالیہ قبل اجلاس ۲۳ اپریل کو کانفرنس کے انتظامات کے لئے ایک مجلس استقبالیہ کا انتخاب عمل میں آیا جس کے حسب ذیل عہدہ دار و ارکان منتخب ہوئے :۔

(۱) بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحب میونسپل کونسلر — صدر
(۲) مولوی سید ظفر حسین واسطی صاحب ایڈوکیٹ۔ نائب صدر
(۳) بیگم لفٹنٹ کرنل شہاب الدین صدیقی صاجبہ "
(۴) سیٹھ مہرالٰہی صاحب کراچی "
(۵) بیگم اختر حسین صاجبہ " "
(۶) مسٹر محمد صدیق وہاب " "
(۷) سید الطاف علی بریلوی " سکریٹری

ارکان :۔

(۱) ڈاکٹر سید معین الحق صاحب
(۲) سید معین الدین رضوی صاحب
(۳) ایس۔ ایم۔ یوسف صاحب
(۴) راحیل بیگم صاجبہ شروانیہ
(۵) بیگم مریم فاروقی صاجبہ
(۶) پرنسپل حسن عادل صاحب
(۷) ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب
(۸) بیگم نواب صدیق علی خاں صاحبہ
(۹) پروفیسر قاضی محمد فرید صاحب
(۱۰) سید ناصر حسین صاحب ہیڈ ماسٹر سندھ مدرسہ
(۱۱) مسٹر شیخ پروفیسر لا کالج
(۱۲) مسٹر ضیاء شیخ ایڈوکیٹ
(۱۳) محمد نعمان تاثیر صاحب
(۱۴) پروفیسر اختیار الملک صاحب
(۱۵) ذکرالرحمٰن صاحب

(۱۶) مفتی محمد رشید الدین صاحب

(۱۷) ڈاکٹر محمد یاسین زبیری صاحب

(۱۸) ڈاکٹر زبیدا احمد صاحب

ایکس آفیشو ارکان

(۱) الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب

۲) سیٹھ احمد۔ ای۔ ایچ جعفر صاحب

۳) مسٹر حسن علی۔ اے۔ رحمان

۴) بیگم عبدالحفیظ صاحبہ

۵) بیگم غنی صاحبہ

۶) مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب

۷) مولوی محمد عظیم الدین صاحب

۸) ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی صاحب

۹) مرزا علی اظہر برلاس صاحب

۱۰) مولوی محمد عظمت اللہ صاحب ایڈوکیٹ

۱۱) مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی صاحب

۱۲) بیگم ڈاکٹر الٰہی علوی صاحبہ

مجلس استقبالیہ کا دفتر سرسید گرلس کالج ہی میں [illegible] یوم قبل قایم ہو گیا تھا جس میں شبانہ روز کام ہوتا رہا۔ کثیر التعداد دعوت ناموں، پوسٹروں، ہینڈبلوں اور اخباری اسٹوں کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر پبلسٹی کی گئی۔

عطیات اخراجات کے واسطے سرسید گرلس کالج فنڈ سے ایک ہزار روپیہ کی رقم کے علاوہ حسب ذیل عطیات بزم بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحبہ صدر مجلس استقبالیہ۔ بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ۔ مسٹر صدیق وہاب اور بیگم حفیظ صاحبہ کی معرفت وصول ہوئے۔

(۱) مسٹر صدیق وہاب (میئر کراچی کارپوریشن) Rs 500/-

(۲) مسرز ہربینا اینڈ کمپنی لمیٹڈ کراچی " 500/-

(۳) جناب حامد جمیل صاحب " 250/-

(۴) سیٹھ مہر الٰہی صاحب کراچی " 200/-

(۵) مسٹر حسن علی عبدالرحمٰن بیرسٹر ایٹ لا " 200/-

(۶) سیٹھ قاضی محمد ابراہیم صاحب کراچی " 200/-

(۷) جناب محمد خلیل سوت والا صاحب " 125/-

(۸) جناب نعمان جمیل صاحب " 100/-

(۹) جناب محمد یامین پیرزادہ صاحب " 100/-

(۱۰) جناب ایف زبّی صاحب " 100/-

(۱۱) جناب ایس۔ ایم یوسف صاحب " 100/-

(۱۲) جناب ایس۔ ایم جمیل صاحب " 100/-

(۱۳) جناب ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی صاحب " 60/-

(۱۴) میسرز دہلی گلاس ورکس فیکٹری " 50/-

(۱۵) میسرز سنٹرل موبائل گیس اسٹیشن " 25/-

(۱۶) محترمہ بیگم فیاض علی صاحبہ " 10/-

(۱۷) محترمہ بیگم اختر حسین صاحبہ " 10/-

(۱۸) جناب خواجہ علاء الدین صاحب " 10/-

(۱۹) جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب " 10/-

(۲۰) محترمہ راحیل بیگم صاحبہ شروانیہ " 10/-

(۲۱) جناب مختار الملک صاحب " 10/-

(۲۲) محترمہ بیگم " " صاحبہ " 10/-

(۲۳) محترمہ بیگم عبدالرحمٰن احمدی صاحبہ " 10/-

(٢٤) محترمہ بیگم اصغری رحیم صاحبہ Rs 10/-

برائے اخراجات اجلاس شعبۂ نسواں

(١)	محترمہ لیڈی ہدایت اللہ صاحبہ	Rs 125/-
(٢)	محترمہ بیگم ماجدہ پارک صاحبہ	" 10/-
(٣)	بیگم شوکت علی خاں صاحبہ	" 10/-
(٤)	بیگم ناصرہ صدیقی صاحبہ	" 10/- "
(٥)	بیگم عبدالحفیظ صاحبہ	" 10/-
(٦)	بیگم زبیدہ ایچ لاری صاحبہ	" 10/- "
(٧)	" بیگم ڈاکٹر عبداللہ صاحبہ	" 10/-
(٨)	" بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ	" 10/- "
(٩)	" بیگم ڈاکٹر الٰہی علوی صاحبہ	" 10/- "
(١٠)	" مسز قزلباش صاحبہ	" 5/-
(١١)	" بیگم رفیق الدین صاحبہ	" 5/- [١]

احاطۂ سرسید گرلس کالج میں کانفرنس کے لئے ایک نہایت شاندار پنڈال بنایا گیا جس میں قیمتی فرش و فروش تھا تو اور صوفوں و کرسیوں کے اہتمام کے علاوہ خوبصورت جھالر ٹکی جھنڈیاں اور سجاوٹ کا دوسرا سامان نہایت سلیقے کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ بجلی کی روشنی کا بھی غیر معمولی عمدہ انتظام تھا۔ مہمانوں کی سہولت کے لئے ایک زنانہ مردانہ چائے خانہ پنڈال کے قریب ہی کھول دیا گیا تھا جس میں تین شبانہ روز کافی چہل پہل رہی۔

پہلا اجلاس عام

پروگرام کے مطابق جمعہ ٦/اپریل ١٩٥٦ء کو پونے سات بجے شام کانفرنس کا پہلا اجلاس عام ہوا۔ مقامی و بیرونی مندوبین کی آمد کا سلسلہ چھ بجے سے ہی شروع ہو گیا تھا ½٦ بجے کے قریب صدرِ منتخب جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی تشریف لائے اور عہدہ دارانِ مجلسِ استقبالیہ نے صدر دروازہ کے باہر آکر پرجوش استقبال کیا۔

ٹھیک بعد مغرب (سات بجے شام) عالی جناب عبدالستار صاحب وزیر تعلیم حکومتِ پاکستان کی تشریف آوری ہوئی اور آپ کا بھی شاندار خیر مقدم کیا گیا۔

کارروائی اجلاس کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ محترمہ بیگم سید عبدالحفیظ صاحبہ سکریٹری شعبۂ نسواں نے حد درجہ پر اثر انداز میں تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاول پور و صدر مجلسِ منتظمہ کانفرنس نے عالی جناب وزیر تعلیم کے خیر مقدم میں حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

تقریر خیر مقدم میجر شمس الدین محمد صاحب

آج کی رسم افتتاح کانفرنس جس ماحول میں ہو رہی ہے اس کی تاریخی حیثیت قومی اور ملی تعمیر میں یہ

---

[١] ان عطیات میں وہ چندہ رقوم شامل نہیں ہیں جو محترمہ بیگم مریم فاروقی صاحبہ وغیرہ نے مارچ و اپریل ١٩٥٦ء میں کانفرنس کے عشائیہ اجلاس کے موقع پر اس وقت کی مجلس استقبالیہ کو مرحمت کئے تھے۔

نئے باب کا اضافہ کر رہی ہے۔ شاید صد سالہ غیر ملکی حکومت کے اثرات اور نقوش کو، جو غلامانہ ذہنیت کی پیداوار تھے مٹانے کے لئے اتنے خطرناک حادثات کا جن سے کہ قوم کو دوچار ہونا پڑا رونما ہونا قدرت کے تعمیری پروگرام کی ایک ضروری کڑی تھی۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

تو نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

ہلاکو نے سلطنت عباسیہ کے علم و حکمت کے ذخیرے جس دم فنا کر دیئے اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ ہماری روایات پھر برصغیر پاک و ہند میں زندہ ہونگی۔ دہلی۔ مالوہ۔ گجرات ٹھٹھہ اور دیگر مراکز علم نیشاپور۔ غزنی اور بغداد کی یاد کو تازہ کرینگے۔

ہمارے علم نواز بادشاہوں کے زیر سرپرستی علوم و فنون کی جو ترقی ہوئی اوراقِ تاریخ اُس کے شاہد ہیں۔ لیکن اسلامی خصوصیات میں ایک حقیقت جو ناقابل تردید حیثیت رکھتی ہے وہ ہمارے بلند پایہ بلغا۔ شعرا۔ فقہا اور بادۂ عرفان سے سرشار حضرات کے کارنامے ہیں۔ یہ حضرات متاع علم سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ فکر انسانی کے اعلیٰ تصورات کے حامل تھے وہ علمی فریضہ کی تکمیل احکام خداوندی کے تحت بجا لانا اپنی زندگی کا اہم پروگرام سمجھتے تھے۔ اسپین۔ صقلیہ اور ان کے اثرات سے یورپ میں جو شمع علم فروزاں ہوئی۔ اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سرکاری تعلیم کے جو پروگرام مرتب ہوئے وہ ہمارے رجحانات اسلامی کے بالکل برعکس تھے۔ یہ ایک خونچکاں داستان ہے جس کا ذکر ہمارے جگر کو ہمیشہ مجروح کرتا رہے گا۔ تاہم بطور ردِ عمل علیگڑھ دیوبند اور ندوہ وغیرہ میں جو کام ہوا وہ ہمارے نیک نفس مسلم رہنماؤں کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اس موقع پر جس خاص اہمیت کا تصور میرے ذہن میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا معرض وجود میں آنا ہے اگر آپ اس نوزائیدہ اسلامی جمہوریت کو زندگی دوام بخشنا چاہتے ہیں اور انہی کی شاندار روایات کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں تو پاکستانی نوجوانوں میں جذبۂ ملی و قومی کا احساس پیدا کیجئے۔ ان کے طریقہ تعلیم میں ایک منظم منصوبہ کے ماتحت غیر معمولی تعلیمی تغیر پیدا کیجئے اُن منصوبوں میں تعلیمی افادیت کے ساتھ ساتھ نونہالوں کی تعمیر کردار اور جذبۂ ملی پیدا کرنے کا مقصد عظیم بھی شامل ہو۔ ننھے دماغ بہت جو جلد اثر قبول کرتے ہیں اُن کی ذہنیت اور تصورات پھلنے پلنے کے لئے ایسی فضا اور علمی ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو ہمارے ملکی اور ملی تقاضوں کو پورا کرے۔ کتابی لٹریچر سینما۔ ریڈیو۔ تقاریر اور مضامین جس سرعت سے انسانی تصورات پر حاوی ہوسکتے ہیں۔ آپ کا روزانہ کا تجربہ اس امر کی اہمیت کی تصدیق کرسکتا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد وحید اسلامی جمہوریہ کی بقا ہے اور یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ قانون اسلامی کا نفاذ تھا۔

اس قانون کو چلانے کے لئے اگر کوئی طبقہ پاکستان کی امداد کرسکتا ہے وہ پاکستان کی آنے والی نسل ہے۔ اس موقع پر جبکہ ہم ایجوکیشنل کانفرنس کی افتتاحیہ رسم ادا کرنے کی غرض سے کانفرنس کی طرف سے جناب ایجوکیشن منسٹر پاکستان کو خوش آمدید کر رہے ہیں ہم اپنا فرض عین سمجھتے ہیں کہ موصوف کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اُن کی توجہ اِن اہم قومی اور ملی ضرورت کی طرف مبذول کرائیں۔ اس وقت ہمارے نوجوان ملت اسلامی کے تقاضوں سے ناآشنا اپنے سود و زیاں کے علم سے بے بہرہ اور قومی و ملی صلاحیتوں کے

تقاضوں سے بے خبر ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نے اس کا کیا اچھا ترجمہ کیا ہے۔

زمین گیر ایں کرم ردگوہر چشے　　　زبینائی غلط بینے نکوتر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکوکیش　　　زدانشمند بے دینے نکوتر

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے ہم اس تمہید کے بعد ایک دو ضروری تجاویز پیش کرتا ہوں جو اس پروگرام کی تکمیل کی مدد ہو سکتی ہیں۔

(۱) ایک ایجوکیشنل انفارمیشن سنٹر کا اجرا اس کے ساتھ پبلسٹی برانچ۔ دارالترجمہ اور ادارۂ تصنیف و تالیف جو کہ آج کل کی ضروریت قومی کا جز بن چکی ہیں: ایک اخبار یا پمفلٹ کا اجراء یہ سنٹر دوسرے ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک سے ضروری معلومات بہم پہنچائے۔ اور اپنے پروگرام مرتب کر کے ریڈیو اور اخباروں کے ذریعہ تمام کوائف سے طلبا اور ملک کے دوسرے لوگوں کو بیدار کرے۔

عطاکن شور رومی سوز خسرو　　　عطاکن صدق و اخلاص سنائی
چناں با بندگی در ساختم من　　　نگیرم گر مرا بخشی خدائی

آخر میں عالیجناب وزیر معارف کی تشریف آوری کا پرخلوص خیر مقدم کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ وہ آج کے اجلاس کانفرنس کی رسم افتتاح ادا فرمائیں۔

خطبۂ افتتاحیہ عالیجناب وزیر تعلیم

میجر صاحب کی تقریر کے بعد عالیجناب عبدالستار صاحب تالیوں کی گونج میں اپنا خطبۂ افتتاحیہ ارشاد فرمانے کھڑے ہوئے۔ عین اُس وقت آں موصوف۔ پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب صدر کانفرنس اور دوسرے ممتاز ڈائس نشین حضرات و خواتین کو ہار پہنائے گئے۔

جناب عبدالستار صاحب نے اپنا فصیح و بلیغ اور پر از معلومات خطبہ انگریزی زبان میں پڑھا جو نہایت غور و توجہ کے ساتھ سُنا گیا بالخصوص آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اعتراف خدمات کرتے ہوئے اُس کی سالانہ گرانٹ پانچ ہزار سے پچیس ہزار روپے کئے جانے کے اعلان پر دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اسی طرح کانفرنس کے قائم کردہ سرسید گرلس کالج اور اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے معرضِ وجود میں آنے پر جو اظہار امتنان فرمایا اُس پر بھی حاضرین کانفرنس نے تالیاں بجائیں۔ [1]

متذکرۂ بالا خطبۂ افتتاحیہ ختم ہونے پر جناب مولوی سید ظفر حسین دہلوی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈووکیٹ وائس پریسیڈنٹ کانفرنس نے ایک ولولہ انگیز اور پُر مغز تقریر کرتے ہوئے منجانب کارکنان کانفرنس جناب وزیر تعلیم کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح رسم افتتاح کانفرنس کی تکمیل ہوئی جس کے بعد صدر کانفرنس کا رسمی انتخاب عمل میں آیا۔ جس کی تحریک محترمہ بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ چیرمین سرسید گرلس کالج گورننگ باڈی نے اور تائید جناب حسن علی عبدالرحمٰن صاحب بیرسٹر ایٹ لا آنریری جنرل سکریٹری کانفرنس نے فرمائی۔ ہر دو مقررین نے جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب کی تعلیمی و قومی خدمات کو پرشوکت الفاظ میں سراہا اور اُن مہربانیوں کا خصوصی شکریہ ادا کیا جو آپ نے سرسید گرلس کالج کے قیام کے سلسلہ میں مبذول فرمائی تھیں۔

تحریک و تائید اور جملہ حاضرین کانفرنس کی تائید مزید کے بعد جناب حلیم صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے۔

[1] جناب وزیر تعلیم کے اس خطبہ کا اُردو ترجمہ العلم بابت جنوری تا مارچ (جلد ۱ شمارہ ۳ ۱۹۵۱ء) میں شائع کیا جا چکا ہے۔

خطبۂ استقبالیہ

انتخاب صدارت کی کارروائی ختم ہونے پر محترمہ ڈاکٹر زینب عبد اللہ صاحبہ نے خطبۂ استقبالیہ صدر و مندوبین کانفرنس ارشاد فرمایا[1] جس کے ختم ہونے کے بعد جناب صدر محترم نے اپنا عالمانہ خطبہ پڑھا جو درج ذیل ہے۔

خطبۂ صدارت کانفرنس

ارکان مجلس استقبالیہ، مندوبین، خواتین و حضرات!

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا مجھے صدر مقرر کرکے میری عزت افزائی فرمائی اور اس بات کا موقع دیا کہ میں بعض تعلیمی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکوں۔

اس کانفرنس سے میرا دیرینہ تعلق ہے تیس پینتیس سال سے میں اس کے ساتھ کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ اس کانفرنس کی تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے جا ملتی ہے یہ وہ جماعت تھی جو سرسید علیہ الرحمۃ نے غدر کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے احیاء کے لئے قائم کی تھی اور پچھلے پچاس ساٹھ سال میں مشکل ہی سے کوئی ایسا جلیل القدر مسلمان گزرا ہوگا جس نے اس کانفرنس کی خدمت میں اپنا حصہ نہ ادا کیا ہو، اس کانفرنس کے کارہائے نمایاں کے ذکر کا نہ یہ وقت ہے اور نہ اس کی ضرورت۔

اس وقت کانفرنس کے وہ ذرائع اور وسائل تو نہیں ہیں جو اسے پہلے میسر تھے۔ لیکن اسکے قدیم کارکنوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے اس کانفرنس کو پاکستان میں قائم کرکے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ اور اب ہم سب کا فرض ہے کہ اس کو فروغ دینے میں بانیانِ کانفرنس کا ہاتھ بٹائیں اس لئے کہ ملک میں ایک ایسے ادارے کی تو بہرحال ضرورت ہے جس میں ماہرین تعلیم جمع ہوکر ملک و ملت کے تعلیمی مسائل پر غور و فکر کرسکیں۔

حضرات! دستور بننے کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ملک کے مقتدر ماہران تعلیم غور و فکر کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں، پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے کا اعلان اس بات کا مقتضی ہے کہ اس میں زندگی کے تمام گوناگوں پہلو اور متضاد حقیقتوں کو توحیدی نظام فکر میں جمع کرکے ہر عضو کو اس کا جائز اور صحیح مقام عطا کیا جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں سب سے پہلے تعلیم کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبے تعلیم کے محتاج ہیں یہاں تک کہ صنعتی توسیع اور زرعی ترقی بھی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے بغیر ممکن نہیں، انسان کی اخلاقی تربیت اور اس کی سیرت کی تشکیل بھی تعلیم ہی سے ہوسکتی ہے۔ غرض جماعت کا پورا شیرازہ تعلیم ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور ہمارے عزائم اور عالمگیر اصولوں کی تکمیل کے لئے تعلیم کا عام کردینا اور اس کا معیار بلند کرنا سب سے پہلا فرض ہے۔ قومیں مادی وسائل کی کمی اور صنعتی یا زرعی پیداوار کی قلت کے باوجود بھی زندہ رہ سکتی ہیں۔ لیکن جہالت، کم علمی اور اخلاقی افلاس میں مبتلا ہونے کے بعد کوئی قوم اپنا امتیازی وجود قائم نہیں رکھ سکتی پھر

---

[1] بیگم صاحبہ کا یہ خطبہ تمام و کمال "العلم" بابت جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں شائع کیا جا چکا ہے۔

آج کی دُنیا میں تو تمام مادی وسائل تعلیم ہی کے تابع ہیں اسلئے ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ جلد سے جلد تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔

تعلیم لازمی اور عام کردینے کی اسکیمیں اب تک بہت سی مرتب ہو چکی ہیں اور بعض کو بروئے کار لانے کی کوشش بھی ہورہی ہے لیکن اس راہ میں وسائل کی کمی ہمیشہ حائل ہوتی ہے۔ اسکولوں کے لئے جگہ، عمارت، اساتذہ اور ان کی تنخواہوں کے مصارف جیسے اہم سوالات سامنے آتے رہے ہیں اسلئے ہمیں ایسے طریقے سوچنے کی ضرورت ہے جس سے جلد سے جلد پاکستان میں تعلیم عام، مفت اور لازمی ہوسکے۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مسجدوں میں مکاتب کی تجویز کو اس قدر توجہ حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہئے۔ اپنے خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میری رائے میں یہی ایک قابل عمل تجویز ہے اس کے لئے ایک باقاعدہ نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے اس تجویز کے ماتحت کم سے کم خرچ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس تجویز میں خوبیاں یہ ہیں کہ اس سے جگہ اور عمارت کا سوال ختم ہوجاتا ہے۔ مسجدیں بہترین مکاتب بن سکتی ہیں۔ پیش امام ابتدائی مدرس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ نظام اوقاف اور زکوٰۃ فنڈ سرمایہ کی کمی پوری کرسکتا ہے۔ میں نے اپنے ترکی کے سفر میں جو اہم چیزیں دیکھیں ان میں ایک وہاں کی تنظیم مساجد بھی ہے۔ ترکی میں مساجد کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے ترکی کے علاوہ دُنیا کی غیر مذہبی حکومتوں میں بھی کلیسا کی نگرانی حکومت کے ذمہ ہے۔ اگر ضلع تحصیلات اور محلوں میں مساجد کمیٹیاں بنادی جائیں اور حکومت ان کمیٹیوں کی امداد اور ان سے تعاون کا بیڑا اٹھالے اور ان کی ہدایت اور مشورے کے لئے اعلیٰ تربیت یافتہ مخصوص عہدیدار مقرر کردے تو یہ کام بہت جلد اور خوبی سے انجام پاسکتا ہے۔

ان مدرسین کو تعلیم دینے کے طریقے سکھانے کے لئے ہنگامی تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں اس کی متعدد صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ تربیت دینے والوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں نقل وحرکت کرکے مختلف علاقوں میں پہنچتی رہیں اور وہاں اساتذہ کو تعلیم دینے کی موٹی موٹی باتیں سمجھاکر اور ان کی مشق کراکے انہیں درس وتدریس کا اہل بنادیں، دوسری صورت یہ ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں اور اسکولوں میں مختصر مدت کے لئے کورس جاری کئے جائیں وقس علیٰ ہذا جہاں ان مکاتب کے ذریعہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جاسکتا ہے وہاں انہیں مسجدوں میں بالغوں کی اساسی تعلیم وتربیت کا سامان بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔ اگر دن میں بچوں کو تعلیم دی جاسکتی ہے تو رات میں بالغوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام ہوسکتا ہے۔

اس اساسی تعلیم وتربیت کے نصاب کو بھی ہمیں اپنی تہذیب وتمدن کے قالب میں ڈھالنا ہوگا اس میں اخلاقی ذہنی تربیت کا خاص لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس میں تعلق باللہ، خدمت خلق، جذبۂ ہمدردی اور ایثار کی روح پیدا کرنی پڑے گی۔ اگر اس میں ہمیں کامیابی ہوگئی تو اساسی تعلیم وتربیت ہماری ترقی وفلاح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

ابتدائی مدارس کے بعد تین برس کے وسطی اسکولوں کا انتظام کرنا چاہئے۔ جہاں طلبا کے لئے زیادہ سے زیادہ اختیاری مضامین کا انتظام ہو تاکہ طلبا ایک طرف تو بہتر سے بہتر طریقہ

ے خداشناسی حاصل کرلیں اور دوسری طرف عملی زندگی
ں معاشرے کے ہر شعبے اور ہر گوشے کی ضرورت کو پورا کرنے
ے لئے اپنے اپنے رجحان کے مطابق تیار ہو سکیں۔ زیادہ
ختیاری مضامین کا یہ فائدہ ہوگا کہ ان کو متوازی کریکولم کے
لئے تیار کیا جا سکے گا۔

وسطی اسکولوں کے بعد چار سالہ ثانوی تعلیم میں متوازی
ریکولم ہونا چاہئے تاکہ طلبا اپنے اپنے رجحانات کے مطابق
ضامین لے سکیں۔ اس میں زبان جنرل سائنس اور وہ
ضامین جو ایک اسلامیہ جمہوریہ کے شہری بننے کے لئے ضروری
یں لازمی اور بقیہ اختیاری ہونے چاہئیں۔ مثلاً علوم و فنون
صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت، چار برس کی اس
علیم کے بعد طلبا اس قابل ہو سکیں گے کہ کسی نہ کسی پیشے
ں داخل ہو کر اپنی معاش پیدا کر سکیں۔ اور اگر کارکردگی اور
ہنروں دستکاری آئندہ ترقی کا معیار قرار دے دیا جائے تو
نصف قوم کے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد نو عمری میں اپنی
معاش پیدا کر سکیگی۔ اور بغیر اعلے تعلیم حاصل کئے ہوئے ان
معاشی ترقی کے دروازے کھل جائیں گے بلکہ اس سے
لک و ملت کو اہل ہنر و حرفت کی ایک بڑی تعداد ہاتھ
جائے گی اور اعلےٰ تعلیم کی طرف وہی نوجوان رجوع
ہوں گے جن میں اس کے لئے خاص مناسبت اور صلاحیت
ہوگی۔ اس طریقے سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بغیر روک
ٹوک کے داخلے کا مسئلہ بھی خود بخود برطرف ہو جائے گا۔

جب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہونہار طالب علم
ہوں گے تو اس سے استادوں کا شغف بھی اپنے اپنے
علم و فن کے ساتھ بڑھ جائے گا۔ اور ان کی تعلیم و تربیت

اور تحقیق و تفحص کا معیار اس وقت سے زیادہ بلند
ہو جائے گا۔ تحقیق و تفحص کے معیار کو بلند کرنے کے لئے
ضروری ہے کہ خالص تحقیقی ادارے بھی قایم کئے جائیں ہمارے
ملک میں تحقیق کا معیار ابھی تک اتنا بلند نہیں ہو سکا ہے
جتنا کہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ اگرچہ اس میں
سامان کی کمیابی اور وسائل کے محدود ہونے کو بھی دخل
ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری نظر و فکر بسا اوقات
اس معیار کو نہیں پہونچی جس پر اہل تحقیق کے کارناموں کو پورا
اُترنا چاہیئے۔ ہم اس وقت اہل مغرب کے معیار کو بھی نہیں
پہنچتے علمی کارناموں میں ان پر گوئے سبقت لے جانا تو کجا
حالانکہ کام کی بہت گنجائش ہی نہیں بلکہ ضرورت ہے
متعدد شعبے تشنۂ تحقیق ہیں اور ان میں کام کرنا ہمارا فرض
ہے۔ یہاں میں دو چار اداروں کا مشتے نمونہ از خروارے
ذکر کرتا ہوں جن کا قیام ضروری ہے۔

سیرۃ النبی کا منصوبہ

یہ ایک انتہائی افسوسناک بات ہے کہ سیرت النبی صلے اللہ
علیہ وسلم اور اسلامی تعلیمات پر اب تک یورپ کی کسی زبان
میں کوئی جامع مستند اور معیاری تصنیف نہیں ہے مغربی
دُنیا حضور کی عظمت سے ناآشنا ہے جتنی کتابیں ہیں وہ
سب غیر معتبر اور تعصب و نفرت سے بھری ہوئی ہیں غیر
مسلم مصنفین نے اسلام کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور
سیرت رسولؐ کو اپنے تعصب کے انداز میں بیان کیا ہے۔
افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے اب تک مغربی زبان میں کوئی
مستند تصنیف پیش نہیں کی۔ اس لئے اہل پاکستان کا جو
اسلام کے علمبردار اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے

نام لیوا ہیں۔ فرض ہے کہ مغربی زبانوں میں سیرت پر معیاری تصانیف پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں۔

قانون و اصول قانون کا تحقیقی ادارہ!

اسی طرح قانون اور اصول قانون پر اعلیٰ تحقیق و تفتیش کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی ادارہ نہیں ہے، اسلامی جمہوریہ کے قیام کے بعد سے اسلامی قانون کی اہمیت پاکستان میں بہت بڑھ گئی ہے، اب تک وراثت، طلاق، ہبہ اور وقف وغیرہ کے محدود قوانین اسلامی قانون کے نام سے رائج تھے لیکن اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات سمجھ کر زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ سے متعلق اسلامی قوانین کی چھان بین کی جائے، اس غرض کے لئے ایک تحقیقی ادارہ کی فوری ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے معاملات کا تحقیقی ادارہ

اسی طرح آج کل تمام دُنیا سمٹ کر بالکل قریب ہوگئی ہے اور روز بروز قریب ہوتی جا رہی ہے، کوئی قوم دُنیا سے الگ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتی ترقی یافتہ ممالک اپنے علاوہ غیر ممالک کے حالات کی تحقیق میں سرگرم ہیں۔ اور اس تحقیق کا نام انہوں نے خطہ واری مطالعہ رکھا ہے لیکن ہم ابھی اسلامی ممالک کے حالات سے بھی پوری طرح باخبر نہیں اپنے مستقبل اور بین الاقوامی تعلقات کے پیش نظر اسلامی دُنیا پر تحقیق کرنا بے انتہا ضروری ہوگیا ہے، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایسے ادارہ کا قیام ازبس ضروری ہے، جو مسلمانوں کے حالات و معاملات کی تحقیق و تفتیش کرے۔

ان تحقیقی اداروں کے علاوہ ٹریننگ کے متعلق تجربہ اور تحقیق کے لئے ایک اعلیٰ تحقیقی ادارے کی ضرورت ہے تاکہ فن تعلیم و تربیت کے مسائل پر تجربہ تحقیق اور غور و فکر کیا جاسکے یہ زمانہ جمود کا نہیں ہے بلکہ حرکت کا ہے۔ ہر علم و فن میں بڑی تیز رفتاری سے ترقی ہو رہی ہے ان ترقیوں کے ساتھ ہمقدم رہنے کے لئے اور اپنے خاص مزاج اور مذاق کے مطابق تعلیم و تربیت کو ڈھالنے کے لئے اس قسم کا تحقیقی ادارہ ضروری ہے۔ چونکہ آج کل تعلیم اور نفسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اس ادارے کے ساتھ نفسیاتی تحقیق کے لئے ایک سائیکالوجیکل بیورو بھی ملحق ہونا چاہئے۔

ان تحقیقی اداروں کے علاوہ تعلیم و تربیت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے ٹریننگ کالجوں اور اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور موجودہ کالجوں اور اسکولوں کو وسعت دی جائے تاکہ معقول تعداد میں اساتذہ سال بہ سال پیدا ہوسکیں۔

تعلیم پھیلانے اور اس وقت معیار زندگی کے بلند کرنے کی جو روح ہے اور مختلف پیشے اس کے حصول کے لئے جو امکانات فراہم کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں تعلیمی پیشہ بہت پسماندہ رہ جاتا ہے اس لئے ہونہار اور ذی صلاحیت آدمی تعلیمی پیشہ اختیار کرنے کی بجائے ایسے پیشوں کی طرف مائل ہوتے ہیں جن میں انہیں زیادہ مالی فائدہ اور دنیوی نفع معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر ہم زیادہ سے زیادہ لائق آدمیوں کو تعلیمی خدمت کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ایسے سامان زندگی فراہم کرنے ہوں گے کہ وہ یکسوئی اور آسودگی کے ساتھ کام کرسکیں مثلاً ان کی

...وں میں معقول اضافہ ترقی کے امکانات، علاج معالجہ
...رعایتیں اور ان کے بچوں کے لئے بیمہ وغیرہ اسی طرح
...کے کام کی قدر و منزلت بھی کرنی ہوگی تاکہ معاشرے میں
...ن کا ایک باعزت مقام ہو۔

تعلیم عام کرنے اور اس کا معیار بلند کرنے کے لئے
...یں اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے کہ ہونہار اور ذوق
...کھنے والے طالب علم اپنی ناداری اور افلاس کی وجہ سے
...علیٰ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں اس لئے کہ اس محرومی
...ے صرف افراد کو نہیں بلکہ ملک و ملت کو نقصان پہنچتا ہے
...وقت بھی ایسے طالب علموں کی مدد کرنے کے لئے
...کے حالات مساعد نہیں ہیں کچھ نہ کچھ صورتیں تو موجود
...لیکن یہ انتظامات بہت ناکافی ہیں ان وسائل کو
...بہت زیادہ ترقی دینی چاہیئے۔ اہل ثروت اور قومی انجمنوں
...لیمی اداروں اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر مستحق طالبعلم
تعلیم کی کفالت کریں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈیوٹی فنڈ سے قرض حسنہ
لینے والے طلبا میں بڑے بڑے قابل فخر عالم اور رہنما
...دا ہوئے ہیں۔ اس مقام پر پاکستان میں پارسی قوم کے
...ثار اور جذبۂ تعلیم پروری کی اگر مثال پیش کی جائے تو
بے محل نہ ہوگا۔ پارسی قوم نے اپنے نادار طلبا کی امداد
...عانت کے لئے اس حد تک انتظام کیا ہے کہ کوئی ہونہار
...الب علم مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم
...نہیں رہتا یہ فرقہ اس کارنامہ پر مبارکباد کا مستحق ہے۔
...ستان کے دوسرے فرقوں کو بھی چاہیئے کہ وہ ان سے سبق
...حاصل کریں۔

تعلیم عام کرنے کے لئے اساتذہ کی کمیابی اور مالی
وسائل کے محدود ہونے کا علاج میں اس شکل میں پیش
کرنا چاہتا ہوں کہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں کسی منزل پر
یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ ہر طالب علم ایک مقررہ
مدت کے لئے مخلوق خدا کی خدمت کا پابند ہو۔ اس مقررہ
مدت میں طلبا سے تعلیم عام کرنے کی خدمت لی جائے،
اس کے لئے ایک ضابطۂ عمل بنایا جائے۔ اس مدت
میں طلبا اور طالبات کی خدمات سے ملک کی کافی تعداد
کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔

علم و تعلیم سے متعلق ایک ضروری مسئلہ زبان کا ہے
ہماری توسیع تعلیم کی اسکیم اس وقت تک نہیں کامیاب
ہو سکتی جب تک کہ ہم اس کی طرف پوری توجہ نہیں دینگے۔

حضرات! اس مملکت خداداد پاکستان میں جہاں
ہمیں اپنے تصور حیات کو عملی جامہ پہنانے اپنی تہذیب
و روایات کو زندہ کرنے اور قومی و ملی زندگی کو فروغ دینے
کا موقع ملا ہے۔ وہاں فیضانِ خداوندی سے ایک بڑی دولت
قومی سرمایہ بھی ہاتھ آیا ہے یہ قومی سرمایہ جس پر ہم بجا طور
پر فخر کر سکتے ہیں برعظیم کے دو مختلف صوبوں اور قوموں کی
مشترکہ کوششوں کا ماحصل "اردو" زبان ہے جو صدیوں
کی مسلسل محنت اور کاوشوں کے بعد اپنے ادبی محاسن علمی
ثروت اور عام مقبولیت کی بدولت اس عظیم رتبے کو پہنچ
گئی ہے کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی تیسری زبان
شمار کی جاتی ہے۔

اس میں مذہب، تاریخ، ادب اور دیگر علوم و
فنون کی کتابوں کی کثرت ہے اور زندگی کے ہر شعبے کی

کیفیتوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے اس لئے اس کی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے اس کا ایجاد قیمتی کارنامہ ہے اور اس کا اس قدر عظیم الشان مستقبل ہے کہ اس سے مزید غفلت ایک نعمت گرانمایہ کی ناشکری کے مترادف ہوگی۔

وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی مملکت کے شایان شان قومی زبان کی ترویج میں کوشش کریں۔ اور اس کو ذریعۂ تعلیم اور دفتری زبان قرار دے کر اس کا حق ادا کریں۔

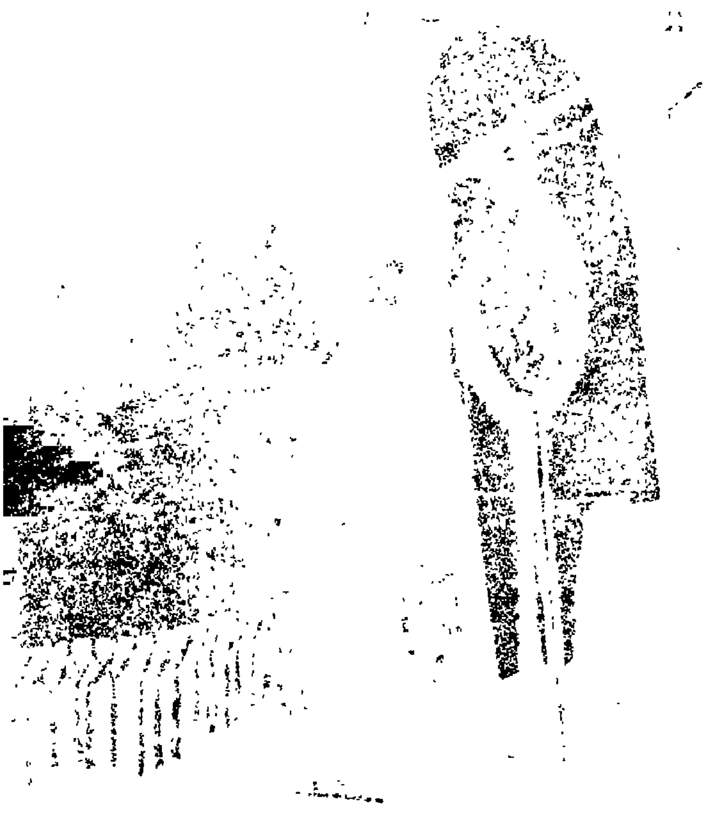
حضرات! یہ امر اچھی طرح روشن ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ مصر یونان و روما اور ہندو فارس کے تمام علمی ذخیرے مسلمانوں کے ذریعہ تمام عالم میں عام ہوئے یونانی زبان سے مسلمانوں نے ہزاروں کتابوں کا براہ راست ترجمہ کیا اور شرح و بسط کے ساتھ ان علوم و فنون کو مدون کیا۔ فلسفہ، منطق، طب، سیاست، قانون، فصاحت و بلاغت کے اصول تنقید و تعریض کے اصول۔ علم الحیوانات جغرافیہ علم الالسنہ تہذیب و تمدن کے ارتقائی مسائل ہیئت علم ریاضی موسیقی، تاریخ اور کیمیا کا زبردست سرمایہ عربی میں حاصل کیا۔ مسلمانوں کے اس سرمایۂ علم و ادب اور تہذیب و تمدن پر اُردو کی بنیاد استوار ہوتی ہے دارالمصنفین دائرۂ معارف، انجمن ترقی اُردو، دارالترجمہ حیدرآباد دکن "محکمۂ تاریخ بھوپال" اور رام پور، نول کشور پریس، مجتبائی پریس اور دوسرے اداروں نے تاریخ و سیر، فلسفہ، تہذیب و تمدن، منطق و فقہ، تفسیر، طب، ادب، صنعت و حرفت اور دوسرے علوم و فنون کا کافی حصہ اور معتدبہ سرمایہ اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔

ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن عربی، ابن رشد، طبرانی، خلدون، البیرونی، غزالی، رازی، بوعلی سینا سے لیکر شاہ ولی اللہ کے زمانہ تک کے اکثر آئمہ کرام اور مصنفین کبار کی عربی فارسی کتب کا اُردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

اس حقیقت سے اب بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی اُردو میں صلاحیت ہے اس کا تجربہ عثمانیہ یونیورسٹی میں برسوں کا کیا جا چکا ہے۔ کراچی میں بھی علوم و فنون کی تعلیم کا یہی مقصد انجام دینے کے لئے "اُردو کالج" کھولا گیا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کی ان صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جائیں جن کے بغیر مقصد کی تکمیل ناممکن ہے۔

میرے خیال میں جس طرح سابق صوبہ پنجاب نے دو اہم ادارے قائم کئے تھے ایک سرکاری زبان کی کمیٹی جو اصطلاحات وضع کر کے ان کو تمام دفاتر اور اداروں میں بھیجتی تھی اور دوسرا ادارہ ترجمہ برائے علمی کتابوں کے تراجم کے لئے بنایا گیا تھا۔ اگر اس قسم کے ادارے کراچی میں بھی قائم کر دیئے جائیں جو دوسرے چھوٹے اداروں کی بھی نگرانی کریں تو ان اداروں کے کام میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی اور اعلیٰ مرکزی ادارے کے قیام سے کاموں میں یکسانیت پیدا ہو سکے گی۔

حضرات! آخری بات جو مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری تعلیم کا سب سے مشکل مسئلہ اسے اسلامی بنانا ہے۔ اسلامی روح پھونکنا ہے



پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی
اپریل سنہ ۱۹۵۰ء کو کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس میں
خطبہ صدارت دے رہے ہیں

لامی سیرت دکردار پیدا کرنا اور اسلام کے متعلق اتنا علم
ل کرانا جتنا مختلف مدارج کے طلبا کے لئے ضروری ہے
سان کام نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اسلام ہی وہ زندگی ہے
و ہم اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔
ارے لئے اسلامی تعلیم و تربیت ناگزیر ہے۔

اس وقت تو اسلام کی تعلیم ہمارے یہاں برائے
م ہو رہی ہے۔ اسکولوں میں نہ تو دینیات کا امتحان ہوتا
ہے اور نہ اس مضمون میں سختی سے حاضری لی جاتی ہے۔ نہ طریقۂ
علیم کی طرف توجہ ہے اور نہ تربیت کی طرف پچھلے چند
سالوں میں نصاب پر تو نظر ثانی ہوئی ہے اور شاید کچھ اچھی
سی کتابیں بھی لکھی گئی ہوں۔ لیکن جب تک تعلیم کے ساتھ
ربیت جمع نہیں کی جائے گی۔ طریقۂ تعلیم اور اساتذہ کی
ربیت پر زور نہیں دیا جائے گا ہماری دینی تعلیم ناقص
و کم اثر رہے گی بلکہ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اور
ضامین مثلاً زبان و ادب تاریخ حفظانِ صحت وغیرہ
کو بھی اسلام کے ساتھ ربط دیا جائے اور طالب علم کے
ہنی اور اخلاقی نشو و نما کے ساتھ ساتھ دین و مذہب کو
بھی مختلف طریقوں سے اور مختلف معیار پر بتایا جائے
ل وقت کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اکثر جگہ دینیات
ازمی مضمون نہیں ہے۔ اور ہے بھی تو اس کو کم و بیش
یسی اہمیت حاصل ہے جو اس کو اسکولوں میں دی جاتی ہے
مغربی علوم و فنون کا کچھ لب و لہجہ ایسا ہے کہ اس
سے لادینی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ردِ عمل کے لئے ان
علوم و فنون کی حدود کا بتا دینا اور دین کی حقانیت کو ظاہر
کر دینا بہت ضروری ہے۔

میں آخر میں داعیانِ کانفرنس کا شکریہ ادا کرتا ہوں
کہ انہوں نے باوجود ان دشواریوں کے جو ان کے راستے
میں حائل تھیں کانفرنس کا انعقاد کیا یہ خواتین اور حضرات
ذرائع اور وسائل کی کمی کے باوجود بڑے بڑے کام انجام
دینے کا عزم رکھتے ہیں کانفرنس نے ادارۂ تصنیف و
تالیف قائم کر کے ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے یقین ہے
کہ اس سلسلے میں خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے کانفرنس
نے ریسرچ اکیڈیمی بھی قائم کی ہے یہ بھی ایک محنت
طلب کام ہے خدا کانفرنس کو اس مہم میں کامیابی دے۔

کانفرنس کے کارکنوں نے سرسید گرلس کالج قائم
کر کے خود کو بڑی آزمائش میں ڈالا ہے۔ تعلیم نسواں کی طرف
کافی توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس زمانہ میں جبکہ علوم کی
سرپرستی بہت کم ہو رہی ہے کانفرنس کے کارکنوں کا ایک
گرلس کالج قائم کر دینا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ سرسید
گرلس کالج کا نام ہی مستقل کوشش اور مخلوق کی ترقی کی
بہی خواہی کی ضمانت ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ
یہ ادارہ جلد ترقی کر کے جلیل القدر خدمت انجام دے
سکے گا۔

میری دعا ہے کہ یہ ادارے ترقی کریں
اور پروان چڑھیں ارکان کانفرنس
اور مندوبین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد
تمام حاضرین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں
نے اس طویل تقریر کو نہایت صبر و تحمل
سے سنا خدا ہم سب کی صحیح رہنمائی فرمائے
اور آئندہ ترقی کیلئے اسباب ساعد کرے۔ آمین

(۱۴) جناب آغا عبدالحمید صاحب سکریٹری کیبنٹ سکریٹریٹ
(۱۵) " عبدالرشید ابراہیم صاحب ڈپٹی سکریٹری اکنامک آفیسرز
(۱۶) " ڈائرکٹر صاحب پبلک وبزنس ایڈمنسٹریشن
(۱۷) مولوی امیرالدین قدوائی صاحب ایڈوکیٹ لاہور
(۱۸) اے۔ آر۔ رحمان صاحب پرنسپل اسلامیہ خواتین کالج لاہور
(۱۹) پرنسپل صاحب پنجاب زراعتی کالج لائل پور
(۲۰) اے مجید میاں صاحب اسلامیہ کالج پشاور
(۲۱) جناب ایس۔ ایم عبداللہ صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور
(۲۲) پرنسپل صاحب گورنمنٹ زنانہ کالج کوئٹہ
(۲۳) پرنسپل صاحب امرسن کالج ملتان
(۲۴) پرنسپل صاحب مرے کالج سیالکوٹ
(۲۵) پرنسپل صاحب گرامر اسکول کراچی
(۲۶) پرنسپل صاحب شاہ عبداللطیف کالج میرپور خاص
(۲۷) پرنسپل صاحب سرسید ناہنڈ کالج دیناج پور مشرقی پاکستان
(۲۸) مولوی محمد نور عالم صاحب خیر لوبزپریس
(۲۹) جناب حسن معزالدین صاحب خیبر ڈسٹرکٹ مل خیرپور
(۳۰) جناب احسان الدین صاحب جوائنٹ سکریٹری منسٹر آف اکنامک افیئرز
(۳۱) جناب خواجہ ظفرالحق صاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ مغربی پاکستان
(۳۲) محترمہ ایڈیٹر صاحبہ مستورات کراچی
(۳۳) جناب کلکٹر صاحب آف کسٹم
(۳۴) ڈاکٹر ہاف مین صاحب کراچی
(۳۵) جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ سکنڈری اسکول صدر کراچی
(۳۶) جناب ہیڈ ماسٹر صاحب حسینی ہائی اسکول ناظم آباد کراچی
(۳۷) جناب رجسٹرار ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ
(۳۸) جناب بی۔ اے۔ خان صاحب ڈائرکٹر آف ٹریننگ منسٹری آف لیبر
(۳۹) جناب سید انوار احمد زیدی پبلسٹی سکریٹری ایسٹ
وسیٹ پاکستان یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن کراچی۔
(۴۰) جناب سکریٹری صاحب بزم اقبال لاہور
(۴۱) مسٹر ڈبلو ایف جیفرے ایجوکیشنل پبلشرز کراچی
(۴۲) مسٹر سہراب کے۔ ایچ۔ کٹرک۔ کٹرک ولا کراچی
(۴۳) اُستاد حسین کاتب مصری ماڈرن عربک کالج کراچی
(۴۴) اُستاد رحیم مصری " " " "
(۴۵) اُستاد احمد الاحمد " " " "
(۴۶) مسٹر جان بینیگا جون آف ایشیا فونڈیشن
(۴۷) جناب جی۔ ڈی خواجہ صاحب آنریری سکریٹری انجمن
حمایت الاسلام لاہور۔
(۴۸) مسٹر محبوب علی ایم۔ جناب پرنسپل سرداری اسلامیہ
کالج ہالہ مغربی پاکستان

پیغامات سنانے کے بعد باجازت صدر محترم اگلے روز کے پروگرام اور ارکان سبجکٹس کمیٹی مجلس مضامین کے اسماء گرامی کا اعلان کیا۔

اس قدر کارروائی کے بعد کانفرنس کا پہلا اور افتتاحی اجلاس عام قریب دس بجے شب بخیر و خوبی ختم ہوا۔

اجلاس کا دوسرا دن

۱۰؍ اپریل ۱۹۵۶ء

سبجکٹس کمیٹی ۱۰؍ اپریل کی تاریخ کا آغاز اس طرح ہوا کہ اس روز شب میں سخت طوفان باد آیا تھا جس نے پنڈال، اُس کے ساز و سامان ہر قسم کی سجاوٹ اور بجلی کے فٹنگ

علمی شاعرات یعنی لیکچرز کا بھی اہتمام ہے۔ چنانچہ تعلیمی سنہ رواں میں مندرجہ ذیل اطلاعاً عرض ہیں:۔

موضوع	مقرر	صدر
۱- امیر سید مرحوم کی علمی خدمت	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی جو دانش کدہ حیدرآباد سندھ میں پروفیسر تھے	صدر کانفرنس میجر شمس الدین محمد صاحب
۲- حسان بن ثابت جلیل القدر صحابی رسول کریم	جناب جلیل الرحمن اعظمی	ڈاکٹر زبید احمد صاحب سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ الہ آباد
۳- عہد غزنوی تک عربی زبان ہندوستان کا حصہ	از ڈاکٹر سید احمد صاحب بالقابہ	استاد عبدالعزیز میمن سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، حال صدر شعبۂ عربی کراچی
۴- برصغیر ہند و پاک کے مسلمان حکمرانوں کے سکوں پر ایک نظر	خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب سابق نائب ناظم محکمۂ آثار قدیمہ پاکستان	ہماری کانفرنس کے نائب صدر مولوی ظفر حسین صاحب واسطی
۵- تمدن مصر بہ زمانۂ فراعنہ	از جناب امتیاز محمد خاں صاحب سابق ناظم تعلیمات کراچی	میجر قیصر حسین صاحب بختیاری
۶- تاریخ اسلام بطرز جدید لکھنے کی اہمیت	از ڈاکٹر سید معین الحق	بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب بالقابہ
۷- پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی	از جناب قرنی صاحب جائنٹ سکریٹری محکمۂ مالیات پاکستان	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب چیئرمین ٹیرف بورڈ
۸- پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی میں ملازمت کی تشکیل	از جناب ڈاکٹر عزیز سعید صاحب	ڈاکٹر واجد خاں صاحب ناظم شعبۂ معلومات تجارت حکومت پاکستان

کانفرنس کیوں مخصوص اساتذہ کی جانب متوجہ ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ مختلف ادارے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے کارگزاروں کے حسب انہا کام کر رہے ہیں لہٰذا کانفرنس نے ہی یہ فرض اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اساتذہ کا معیار ذوق اور معلومات کے طور طریقے بلند و بالا ہوں۔ اگر وہ اعلیٰ و ارفع ہوں گے تو قوم بھر کی تعلیم اعلیٰ و ارفع ہوگی عام طور پر تعلیم پانا بڑی بات ہے۔ لیکن اس تعلیم کی حقیقی قدر و منزلت اسی حالت میں مناسب متصور ہو سکتی ہے جبکہ اس کے افراد کارہائے نمایاں سے مختص و ممیز ہوں۔ اگر اس کے لئے آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ ہیں کہاں؟ سنئیے دنیا کا سب سے مشہور انعام الفرڈ برنارڈ نوبل نام کا انعام ہے۔ جو طبیعیات کیمیا۔ طب۔ جسے ہم طب بولتے ہیں۔ ادب اور قیام امن میں تخصص کے حصول پر دیا جاتا ہے ۱۹۰۱ء سے یہ انعام بٹتا ہے یعنی ۵۵ برس سے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس عرصہ میں انعام تقسیم ہوئے ہیں جنہیں سے ۴۴ جرمن یہ انعام لے چکے ہیں۔ برطانوی ۲۹ - ریاستہائے متحدہ فرانس ۲۸ ہندوستان ۲ جاپان ۱ - یہاں تک کہ چلی بھی ایک انعام حاصل کر چکا ہے لیکن ساری اسلامی دنیا بھر میں آپ کو آج تک بھی یہ انعام نہیں مل سکا - ہندوستان ۲ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اور پاکستان کا ندجہ تو صفر ہے۔ فرمائیے دنیا کے اس کھلے مقابلہ میں جس میں قوم و مذہب کی کوئی قید نہیں آپ کی کیا حیثیت ہے؟

وغیرہ کو مسمار کر دیا۔ ۹ بجے صبح مجلس کمیٹی مجلس مضامین کا جلسہ تھا جس کے شروع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے نہایت تیز بارش آئی اور جلسہ گاہ مکمل طور پر زیر آب ہو گئی۔

ان قدرتی افتادوں کے باوجود جلسوں کے پروگرام کو بہر صورت جاری رکھا گیا۔ اور سرسید گرلس کالج کے ہال میں قالینوں اور صوفوں کو لگا دیا گیا۔

مجلس مضامین کی کارروائی زیر صدارت جناب پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب شروع ہوئی۔ اجلاس کانفرنس کے ریزولیوشنوں کے مسودات کچھ پہلے سے تیار تھے اور بقیہ وقت کے وقت تیار کئے گئے۔ ان کی ابتدائی تیاری میں صدر محترم کے علاوہ جناب ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں صاحب سابق ڈائرکٹر تعلیم یو۔پی (بھارت) و حال چیرمین جغرافیہ ڈپارٹمنٹ کراچی یونیورسٹی نے نمایاں حصہ لیا۔ مولوی کریم احمد خاں صاحب، سکریٹری بزم اقبال لاہور۔ مولوی محمد عظیم الدین صاحب ایم۔اے۔ ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری۔ ڈاکٹر ایم۔ ایم احمد بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ۔ بیگم اختر حسین صاحبہ، بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحبہ اور مسز انعام عظیم برنی ایم۔اے نے بھی تعلیمی مسائل میں گہری نظر کا ثبوت دیا اور کارآمد و موثر ریزولیوشنوں کی ترتیب میں قیمتی امداد دی۔

جلسہ شعبہ تحقیق و تعمیم و تنشیر

۷ اپریل کو ۲½ بجے شعبہ مذکور کا اجلاس زیر صدارت جناب ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب ایم۔اے۔ ڈی۔لٹ منعقد ہوا۔ یہ جلسہ بھی بادوباراں کی وجہ سے کالج ہال میں منعقد ہوا۔

آغاز کارروائی تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ جناب الحاج شمس الدین محمد صاحب کی تحریک اور جناب مولوی سید ظفر حسین واسطی صاحب ایم۔اے ایڈووکیٹ کی تائید نیز حاضرین جلسہ کی تائید مزید سے ڈاکٹر صوفی صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ آپ کو اور دیگر ممتاز حاضرین جلسہ کو ہار پہنائے گئے۔ جناب صوفی صاحب نے تالیوں کی گونج میں درج ذیل عالمانہ خطبہ صدارت ارشاد فرمایا:۔

خطبہ صدارت ڈاکٹر صوفی صاحب

حضرات! اس سال مجھے پھر یہ اعزاز نصیب ہوا ہے کہ کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسے میں اس شعبہ تحقیق و تعمیم و تنشیر کا ذکر خیر بطور عرض خدمت کروں۔

حسب معمول کانفرنس کا رسالہ "العلم" شائع ہو رہا ہے جسے سید الطاف علی بریلوی صاحب بی۔اے اس قدر بڑی تندہی اور کاوش سے ادارت فرما رہے ہیں۔ اس سال حکومت پاکستان کی خدمت میں ایک تجویز کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تجویز کی رو سے ایک تعلیمی کتب خانہ کی تشکیل مقصود ہے۔ چیدہ کتب فن تعلیم کا انگریزی سے اردو ترجمہ وقت کی بڑی ضرورت ہے جس سے ایک بیش بہا سرمایہ ہماری زبان میں منتقل ہو سکے گا۔ اور ہمارے مدارس کے معلمین کے لئے بڑے ہی استفادے کا باعث ہوگا۔ تعلیم کی تاریخ تعلیم کے مختلف اصناف۔ ان کی تاریخی ترقی۔ مختلف طریق تعلیم کا ارتقاء اور آخری منزل میں یہ سب کچھ گویا ایک قاموس الاعلام یا تعلیمی انسائیکلوپیڈیا کی جانب قدم ہوگا جیسا کہ اقصائے مغرب میں ڈاکٹر پال امریکی نے انسائیکلوپیڈیا آف ایجوکیشن مرتب فرمایا۔ دارالمطالعہ اسی سلسلے کی ایک شاخ ہوگا۔ جہاں اساتذہ کو خاموشی سے اپنے علم میں معقول اضافے کے مواقع مہیا ہوں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مفید

علمی محاضرات یعنی لیکچرز کا بھی اہتمام ہے۔ چنانچہ تعلیمی سنہ رواں میں مندرجہ ذیل اطلاعاً عرض ہیں:۔

موضوع	مقرر	صدر
۱۔ میر سید مرحوم کی علمی خدمت	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی جو داخل کردہ حیدرآباد سندھ میں تفسیر لکھے	صدر کانفرنس میجر شمس الدین محمد صاحب
۲۔ حسان بن ثابت جلیل القدر صحابی رسولؐ	جناب جلیل الرحمٰن اعظمی	ڈاکٹر زبید احمد صاحب سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ الہ آباد
۳۔ عہد غزنوی تک عربی زبان میں ہندوستان کا حصہ	از ڈاکٹر زبید احمد صاحب بالقابہ	استاد عبدالعزیز میمن سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، حال صدر شعبۂ عربی کراچی
۴۔ برصغیر ہند و پاک کے مسلمان حکمرانوں کے سکوں پر ایک نظر	خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب سابق نائب ناظم محکمۂ آثار قدیمہ پاکستان	ہماری کانفرنس کے نائب صدر مولوی ظفر حسین صاحب واسطی
۵۔ تمدن مصر بہ زمانۂ فراعنہ	از جناب امتیاز محمد خاں صاحب سابق ناظم تعلیمات کراچی	میجر قیصر حسین صاحب بختیاری
۶۔ تاریخ اسلام بطرز جدید لکھنے کی اہمیت	از ڈاکٹر سید معین الحق	بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب بالقابہ
۷۔ پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی	از جناب قرنی صاحب جائنٹ سکریٹری حکومت پاکستان	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب چیرمین ٹیرف بورڈ
۸۔ پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی میں ملازمت کی تشکیل	از جناب ڈاکٹر نذیر سعید صاحب	ڈاکٹر واجد خاں صاحب ناظم شعبۂ معلومات تجارت حکومتِ پاکستان

کانفرنس کیوں مخصوص اساتذہ کی جانب متوجہ ہے؟

اس کا جواب یہی ہے کہ مختلف ادارے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے کارگزاروں کے حسب اپنا کام کر رہے ہیں لہٰذا کانفرنس نے ہی یہ فرض اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اساتذہ کا معیار ذوق اور معلومات کے طور طریقے بلند و بالا ہوں۔ اگر وہ اعلیٰ و ارفع ہوں گے تو قوم بھر کی تعلیم اعلیٰ و ارفع ہوگی۔ عام طور پر تعلیم پانا بڑی بات ہے۔ لیکن اس تعلیم کی حقیقی قدر و منزلت اسی حالت میں مناسب تصور ہو سکتی ہے جبکہ اس کے افراد کا امتیاز نمایاں سے مختص و ممیز ہوں۔ اگر اس کے لئے آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ ہیں کہاں؟ سنئے دنیا کا سب سے مشہور انعام الفرڈ برنارڈ نوبل نام کا انعام ہے۔ جو طبیعیات کیمیا، طب، جسے ہم طب کہتے ہیں۔ ادب اور قیام امن میں تخصص کے حصول پر دیا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے یہ انعام بٹ رہا ہے یعنی ۵۵ برس سے، اور آپ کو معلوم ہے کہ اس عرصہ میں انعام تقسیم ہوئے ہیں جنہیں سے ۴۴ جرمن یہ انعام لے چکے ہیں۔ برطانوی ۳۹ - ریاستہائے متحدہ فرانس ۲۰ ہندوستان ۲ جاپان ۱ - یہاں تک کہ چلی بھی ایک انعام حاصل کر چکا ہے لیکن ساری اسلامی دنیا بھر میں آپ کو آج تک بھی یہ انعام نہیں مل سکا۔ ہندوستان ۲ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اور پاکستان کا درجہ تو صفر ہے۔ فرمائیے دنیا کے اس کھلے مقابلہ میں جسمیں قوم و مذہب کی کوئی قید نہیں آپ کی کیا حیثیت ہے؟

کیا ساری کوششوں کی ترویج کی سے بھی جو جنوبی امریکہ کا کوئی چنداں معروف ملک نہیں، گئی گذری؟ کیمیا آپ کی تھی۔ طب یا طب آپ کی تھی۔ ادب میں آپ کو خطبات پر شاعری میں آپ کا یدِ طُولیٰ کہلا گیا؟ اب آپ کی وہ برتری کہاں ہے؟ امن تو درحقیقت اسلام کا مذہبی شعار ہے! پروفیسر ایڈورڈ براؤن آنجہانی نے خوب کہا۔ اپنی ادبیات ایران کی جلد دوم میں لکھا ہے کہ زوالِ بغداد سے مسلمانوں نے اسلام چھوڑا کہ پھر کوئی متقدمین سا لائق و فائق پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ مرثیہ بالکل بجا ہے۔ گو اس عرصہ میں بعض باکمال ہستیاں ضرور ہوئی ہیں لیکن ان کا کوئی شہرہ نہ ہو سکا۔ اسی نوبل انعام کا حال آپ کو معلوم ہو گیا۔ کیا یہ ایک زبردست شہادت نہیں کہ ۵۵ برس کی نصف صدی سے زائد مدت میں تمام دنیائے اسلام میں کہیں کوئی ایک فرد بھی ہمارے اِن سے نہ پیدا ہوا جو اس فہرست میں ہمارا نام لکھواتا۔ خدا کرے میری یہ صدائے افسردہ صاحبانِ فکر و نظر کے گوش گذار ہو اور اس جانب توجہ دی جاوے کہ آخر کب تک تلافی ممکن ہو گی۔

دوسرا موقع اعزاز فیلو رائل سوسائٹی لندن ہے جو برطانیہ اور آئرلینڈ کی شہرۂ آفاق مجلس سائنس ہے۔ اس میں ۴۸۹ اراکین میں سے ۴۶ خارجی ممالک کے ہیں اور ان میں ایک بھی مسلمان نہیں دو ہندو ضرور ہیں۔

تیسری جانچ عالمی اداروں کے بڑے بڑے عہدوں کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان میں ہمارا کیا حصہ ہے؟ کچھ تو ملکوں کے نمائندوں کی حیثیت سے نازتا ہیں خانہ پُری کے موقعے ملتے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ محض قابلیت کی بنا پر کتنے افراد ہم میں سے لئے گئے ہیں۔

چوتھی صورتِ حال یہ بھی ہے کہ ہمارے اِن سے بھی کوئی ماہر کسی درجۂ اوّل کے غیر ملک میں مدعو ہوا ہے؟ بلکہ ہماری انجینئر، جرمن جہاز ساز، ڈچ ماہر پرواز، کان کنی کے لئے ٹیکنیشن یا سار کے کسی کان کن روسی یا امریکی یا انگریز ایٹمی قوت کے راہنما و ماہرہ وغیرہ کے محتاج ہیں۔ کیا کسی ملک نے ہمارے اِن سے بھی کوئی ماہر مانگا ہے؟

یہ مسائل گہری فکر کے طالب ہیں اور کیا اچھا ہو کہ کوئی مناسب ادارہ ان امور کے اعداد و شمار اور مختصر سی روداد گاہے گاہے شائع کر کے ہماری بیداری کا باعث ہو۔

یہ تمنع خراشی میں نے یوں کی ہے کہ ہماری تعلیم بہتر سے بہتر ہو اور ہمارے اساتذہ اعلیٰ سے اعلیٰ۔ تا کہ ہم بھی دنیا کی اونچی منزلوں میں کچھ تو شمار میں آویں۔!

اب آپ کی توجہ تحقیق یا تصنیف علوم اور اُن کی تعمیم یا تشہیر کی جانب دلانا بھی ضروری ہے کہ آپ کی کانفرنس کس ہمدردی سے دلچسپی لے رہی ہے۔ جناب حسن اعظمی صاحب نے اپنی مجوزہ لغت عربی اردو پانچ جلدوں میں اسی سال مکمل کر کے شائع کر دی ہے۔ دوسری طباعت مطبع معجم الاعظمی میں سے جو کالج اور مدارس کے کام آ سکے گی۔ اس کے علاوہ عربی حاصل کرنے کی کئی ایک مفید کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔ مولوی محمود الحسن خسرو صاحب کی لغت ابھی تک چھپ نہ سکی اس کا انتظار ہے اور وہ کچھ سندھی ادبی بورڈ کے کام میں بھی مشغول ہیں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب نے اس سال سات کتابوں کی اشاعت فرمائی ہے۔ کتاب ثانی جلد اول از ابن خلدون اردو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے باقی خلاصہ احکام سلطانیہ یعنی

اسلامی نظام حکومت اسلامی معاشرت اور جغرافیہ القرآن وغیرہ بھی بازار میں بک رہی ہیں۔ جناب میجر شمس الدین ہمارے صدر اور جناب شہابی صاحب ہمیں انشاء اللہ ڈیڑھ ہزار مصنفین اردو، فارسی، عربی کے حالات اردو میں ترتیب دیکر قاموس المصنفین سے قریب میں نوازنے والے ہیں۔

پروفیسر حلیم صاحب کی تجویز سیرت نبوی خدا کرے جلد پوری ہو۔ اس سلسلے میں جو کام اب تک موجودہ زمانہ میں عربی میں ہوا وہ غور سے مطالعہ کے قابل ہے۔

اب بڑے بڑے اداروں کی طرف آیئے۔ انجمن ترقی اردو حسب معمول بڑی تندہی سے مصروف ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی نگرانی میں سال حال میں بیس کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ کتابوں کے معیار اور تنوع کے لئے مولوی صاحب کا اسم گرامی کافی ہے۔

کراچی میں تاریخی کانفرنس ایک بڑا اہم واقعہ ہے بڑے عالمانہ مقالوں کے علاوہ ٹھوس تاریخی تصنیفات کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ اور ڈاکٹر معین الحق صاحب کی سرگرمی سے ہمیں امید ہے کہ کئی ایک مفید اور نہایت ہی کارآمد کتابیں شائع ہوں گی۔ سابق وزیر تعلیم جناب فضل الرحمٰن کا حصہ اس تاریخی کانفرنس میں قابل تعریف ہے۔ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز باعث فخر سیاسی کام کر رہا ہے۔ یہاں محاضرات بھی ہیں اور تالیفات بھی وزیر خارجہ اس کے صدر ہیں اور خواجہ سرور حسین پانی پتی اس کے سکرٹری۔ انسٹیٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ لاہور نے بعض بڑے پایہ کی کتابوں کو مکمل کیا ہے۔ اور خلیفہ عبدالحکیم صاحب آئے دن فکر میں ہیں کہ ترقی کی رفتار تیز ہو خارجی ممالک میں لیکچرز اور جلسوں کی شرکت کے باوجود ان کا انہماک قابل ستائش ہے۔ اسلامک ریسرچ کا سلسلہ کراچی میں بھی قابل ذکر ہے۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن اب مستقلاً کراچی میں اقامت پذیر ہیں اور اپنے اس ادارے کے ابتدائی مراحل طے کرنے پر یونیورسٹی میں عربی کی تعلیم سے طلبا اعلیٰ امتحانات کو بھی فائدہ پہونچا رہے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی۔ سندھ یونیورسٹی۔ کراچی یونیورسٹی میں لوگ اپنے اپنے ذوق کے مصروف کار ہیں۔ اور جلد یا بدیر ہمیں اپنی کاوشوں سے مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔ سندھ ادبی بورڈ کی کارگذاری اپنی نوعیت میں ممتاز ہے۔

اقبال اکیڈیمی کراچی اردو میں اور ندائے اسلام اکیڈمی ڈھاکہ بنگالی میں تحقیق و تدقیق میں لگی ہوئی ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی تصنیفات اور تالیفات کا مفید سلسلہ بدستور جاری ہے۔
کی پاکستانی شاخ کو نہ بھولنا چاہیئے اور نہ ہی جماعت اسلامی کو جس کی سرگرمیاں کافی شہرت پا چکی ہیں۔

جامعہ پنجاب کا معرکۃ الآرا کارنامہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے لئے ہماری آنکھیں لاہور کی طرف لگی ہوئی ہیں لیکن ہم ترس رہے ہیں کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے جو میاں افضل حسین اور مولوی محمد شفیع نے کچھ ایسی نویں میسٹری بنا رکھی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ عظیم الشان کام کس منزل میں ہے؟ کتنا کام ہو چکا ہے؟ کتنا انسائیکلو پیڈیا چھپ چکا ہے؟ کتنا باقی ہے؟ کتنی رقم صرف ہو چکی ہے؟ کتنی اور مطلوب ہوگی؟ کس کس کی امداد شامل حال ہے؟ کون کون شعبے کا رکن ہیں؟ اور ہماری مشتاق نگاہیں کب مسرور ہونگی؟ ہم نے سنا ہے کہ بہار میں پٹنہ سے انگریزی انسائیکلو پیڈیا کا اردو

ترجمے کی ایک جلد مشتمل بر ۸ صفحات عرصہ ہوا چھپ چکی ہے۔ تدوین فلسفۂ اسلامی کی تحریک کو لبیک کہنا چاہیے جس کے لئے ابھی ابھی سرکاری اعلان ہوا ہے۔ ہسٹری کانفرنس اور ترتیب ادبیات کی کانفرنس دونوں بڑی ہی مفید ہیں۔

میرا یہ مختصر سا خاکہ بالکل ہی نامکمل ہوگا اگر میں سائنس کانفرنس کی نسبت کچھ بھی عرض نہ کروں۔ ترقی سائنس کی مجلس اور سائنس کانفرنس بڑی جماعتیں ہیں جو بڑے قابل ہاتھوں میں ہیں۔

سال گزشتہ میں نے عرض خدمت کیا تھا کہ اُردو کو ہماری تعلیم کا ذریعہ بنائے بغیر ہماری ترقی وسیع نہیں ہو سکتی جامعہ عثمانیہ کی مثال تو پیش نظر تھی ہی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے تو بجا طور پر اردو یونیورسٹی کی تجویز قوم کے سامنے رکھدی ہے اور اللہ کا نام لے کر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ لیکن مجھے قاہرہ اور دمشق کے قیام میں جو مشاہدہ کا موقع نصیب ہوا اُس میں میں نے جامعہ سوریہ کو قابلِ مثال پایا۔ قاہرہ میں اعلیٰ تعلیم بالعموم نسبتاً انگریزی میں ہو رہی ہے۔ لیکن دمشق کے سر یہ سہرا ہے کہ طب قانون زراعت اور ہندسہ جسے ہم انجنیرنگ کہتے ہیں نیز فن تعلیم سب میں عربی ہی کے ذریعہ تعلیم ہو رہی ہے۔ میری تو گزارش ہے کہ ہمارے ماہران تعلیم جا کر دیکھیں کہ جامعہ سوریہ کس درجہ کوشاں ہے اور اصطلاحات مغرب کو کیسے عربی کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔

خدا کے فضل سے پاکستان میں اس وقت چھ جامعات ہیں۔ راولپنڈی اور ملتان اِس خدمت کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ جیسے چاٹگام اور ٹھٹھ کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے اس طرح دس کی تعداد ہوگی۔ عجب نہیں کچھ عرصہ بعد کوئٹہ اور بہاولپور یعنی بغداد الجدید بھی آگے بڑھیں۔ تو ہم ایک درجن جامعات کی تعداد پوری کر ڈالیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ہم قاہرہ ہی کی مثال پر کار بند رہیں گے یا جامعہ السوریا کو نمونہ بنائیں گے۔

قاہرہ اور دمشق میں مجمع اللغت العربیہ ہیں۔ اُن کے ہاں کتب خانے بھی ہیں۔ محاضرات یعنی لیکچرز بھی ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی عمارتیں بھی ہیں۔ مجلات بھی اپنے اپنے شائع کرتے ہیں۔ ترویج و ترقیِ عربی میں اپنے اپنے طور کوشاں بھی ہیں۔ لیکن ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کی مجالس میں غیر عرب فاضل بھی بُلائے جاتے ہیں۔ اور ان کو اعزازی رکنیت بھی پیش کی جاتی ہے مثلاً قاہرہ کے مجمع میں سوربون پیرس کے مشہور مستشرق پروفیسر ماسینون بھی اعزازی رُکن ہیں۔ دمشق میں بھی ایسا ہی رواج ہے۔ ہمارے ہاں ایسی مجالس میں اگر اس کا لحاظ رکھا جائے تو ایسے چیدہ فضلا کی موجودگی گاہ بگاہ مشورت کے لئے مفید ہوگی ایسا ہی مجمعۂ بغداد میں بھی ہے لیکن وہاں میں اس سال نہ جا سکا اور حالاتِ حاضرہ سے واقف نہ ہو سکا۔ دمشق کے مجمع کی خاص بات یہ ہے کہ وہاں کی عمارت قدیم ہے۔ کسی زمانہ میں مشہور مورخ قاضی ابن عساکر جو اپنے وقت میں قاضی القضاۃ یا لارڈ چیف جسٹس بھی تھے اُن کا مسکن رہ چکا ہے۔ بیس ہزار کتابیں۔ اور چار ہزار مخطوطات محفوظ ہیں۔ دمشق کی مشہور تاریخی جامع اُموی سے نصف فرلانگ سے کم فاصلہ پر ہے۔

ختم کرنے سے پہلے یہ بھی یاد دلانا ضروری ہے

سنہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہماری خواندگی صرف ۱۸ فی صدی ہے۔ لہذا یہ خیال رہے کہ ہم ایسی قوم کے پسماندہ افراد ہیں جس میں ہر سو میں بیاسی اَن پڑھ ہیں۔ اور اس جہالت کو رفع کرنا ہمارا ہی فرض ہے۔ اور ہماری اس کانفرنس کے مقاصد اولین میں ہے۔ کیا اچھا ہو جو ڈاکٹر لوباک کی طرح ہر ایک، ہر دوسرے کو پڑھانا شروع کر دے تب ہی تو ہم اس نبی کی قوم کہلانے کے مستحق ہوں گے جو باوجود امی ہونے کے دُنیا کو تعلیم دلانے میں سب سے بے مثل رہا اور جس نے قرآن ہی سے سب سے پہلے پڑھنا سکھایا اور پھر قلم کے استعمال کی تلقین فرمائی!

ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ ستاونواں جلسہ اس لحاظ سے مخصوص ہے کہ اس کی استقبالیہ مجلس کی صدر ایک معزز خاتون یعنی ڈاکٹر زینب عبداللہ ہیں۔ اور یہ امر اس کانفرنس کی تاریخ میں تاریخی ہے۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی قابل خواتین کی حقوق شناسی کریں۔ اور خدا اور رسول کے عطا کردہ حقوق نسواں کی جانب دل سے متوجہ ہوں۔

جناب ڈاکٹر صاحب کا مندرجۂ بالا خطبہ نہایت غور و توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سُنا گیا۔

مقالہ مولوی عبدالعلی خان صاحب اُس کے ختم ہونے پر مولوی عبدالعلی خانصاحب مددگار ناظم انجمن ترقی اُردو نے ایک معلوماتی مقالہ بعنوان "موسیٰ بن نصیر" پڑھا۔ یہ مقالہ العلم کے آئندہ شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔

بعد ازاں منجانب صدارت درج ذیل رزولیوشن پیش ہو کر بالاتفاق منظور ہوا۔

سیرت رسول پر معیاری کتاب چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات پر مغربی زبانوں میں کوئی قابل اعتبار اور معیاری کتاب موجود نہیں ہے اس لئے یہ کانفرنس اس فروگذاشت کی جانب حکومت پاکستان کو توجہ دلاتی ہے۔ اور اس ضرورت پر زور دیتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ کی سیرت و تعلیمات پر معتبر اور معیاری کتابیں مغربی زبانوں میں تیار کرنے اور شائع کرنے کے منصوبے پر عمل در آمد کرے۔"

رزولیوشن کی منظوری کے بعد جلسہ کی کارروائی صدر محترم اور شرکاء کے شکریہ پر ختم ہوئی۔

اُردو مشاعرہ ۷ر اپریل کی شب میں موسم کی خرابی کے باوجود رسم قدیم کے مطابق اُردو مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ مسٹر معین الدین رضوی ایڈیٹر قومی زبان و جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو مشاعرہ کے ناظم اور جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب صدر تھے۔

چونکہ عین اُس وقت ریڈیو پاکستان اور سندھ مدرسہ میں بھی مشاعرے تھے اس لئے مدعو شدہ شعرا حضرات کافی تعداد میں تشریف نہ لا سکے اور مشاعرہ توقع کے مطابق کامیاب نہ ہو سکا۔

اجلاس کا تیسرا دن

۸ر اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

جلسۂ شعبۂ تعلیم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں شعبۂ تعلیم کے جلسہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ تمام تر تعلیمی رزولیوشن اسی میں پیش ہو کر اجلاس عام میں بغرض توثیق جاتے ہیں۔

شعبۂ تعلیمی کی صدارت کے واسطے بھی ہمیشہ سے
مستند ماہران تعلیم کو تلاش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس
سے قبل پاکستان میں کانفرنس کے جو دو سالانہ اجلاس ہوئے
اُن کی صدارت ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب اور
ڈاکٹر محمود حسین صاحب سابق وزیر تعلیم نے فرمائی۔
قیام پاکستان سے پہلے بھی اس شعبہ کی صدارت ڈاکٹر
سر ضیاء الدین احمد صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب
سر عزیز الحق صاحب اور نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب
جیسے مشاہیر ملت اور ماہران تعلیم نے کی۔ اس شعبہ کے
سکریٹری کے منصب پر بھی۔ خواجہ غلام السیدین صاحب
پروفیسر بشیر ہاشمی صاحب اور خان بہادر سید آل علی نقوی
صاحب اور خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب
جیسے حضرات فائز رہ چکے ہیں۔

اس وقت شعبۂ مذکور کے سکریٹری خانصاحب
مولوی عظیم الدین صاحب ایم۔ اے سابق انسپکٹر آف
محمڈن ایجوکیشن یو۔ پی ہیں۔ اور اس سال کی صدارت
کے واسطے جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب ایم
اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی سابق اُستاد تاریخ مسلم یونیورسٹی
وحال جنرل سکریٹری و ڈائرکٹر آف ریسرچ پاکستان
ہسٹاریکل سوسائٹی منتخب کئے گئے تھے۔

پروگرام کے مطابق ۱۰ بجے صبح تلاوت کلام پاک
کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا۔ جناب مولوی سید ظفر حسین
دہلوی صاحب وائس پریسیڈنٹ کانفرنس کی تحریک
اور ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب و الحاج میجر
شمس الدین محمد صاحب کی تائید و تائید مزید سے جناب
ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز
ہوئے۔ آپ کو اور دوسرے ممتاز شرکاء جلسہ کو ہار پہنائے
گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے تالیوں
کی گونج میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جو درج ذیل ہے۔

خطبۂ صدارت ڈاکٹر سید معین الحق صاحب

خواتین و حضرات!

میں ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کا شکریہ ادا کرتا
ہوں کہ اس نے شعبۂ تعلیم کا صدر منتخب کرکے مجھے موقع دیا کہ
ماہرین تعلیم کے اس عظیم الشان اجتماع میں اپنے خیالات
پیش کرسکوں۔ کانفرنس کی یہ پیشکش میرے لئے باعث افتخار
بھی ہے اور موجب حیرت بھی۔ میں آپ کے سلسلۂ انتظامات
میں ابتدا ہی سے منتظمین کانفرنس کا شریک کار رہا لیکن
اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ؎

یار دارد سر صید دل حافظ یاراں

اگر اطلاع کے وقت ٹیلیفون پر سید الطاف علی صاحب
کی دیرآشنا آواز نہ ہوتی تو شاید یہ خیال ہوتا کہ کوئی ایڈیٹر
اپنی خوش مذاقی کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ وقت کی تنگی حالات
کی نزاکت، مسائل کی اہمیت اور خود اپنی مصروفیت یہ تمام
تصورات ایک لمحے کے اندر یکے بعد دیگرے دماغ میں آئے
اور سب یہی تھا کہ میں معذرت کرلوں لیکن کوئی عذر
قبول نہ ہوا اور بالآخر سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جس کا سنگ
بنیاد سر سید احمد خاں صاحب نے ۱۸۸۶ء میں رکھا تھا اور
جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو تعلیمی مسائل سے دلچسپی پیدا
ہو ہماری تاریخ میں ایک مخصوص مقام رکھتی ہے ابتداء میں تو

نفرنس تعلیمی مسائل کے علاوہ سیاسی معاملات میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہی لیکن بعد میں ماحول بدل گیا اور مسلم لیگ کے م کے بعد کانفرنس کی تمامتر توجہ خالص تعلیمی مسائل پر مرکوز ہی۔ اس سلسلے میں کانفرنس نے جو نمایاں خدمات انجام یں ان پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ یہاں ان کا اعادہ تحصیل اصل ہے [illegible]ء میں آنریبل راجہ سر محمد علی خان نے کانفرنس ے سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"کوئی شخص اس کانفرنس کے سابقہ ریکارڈ
پر تفصیلی نظر ڈالنے کے بعد اس حقیقت کا
اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مسلمانوں
کے درمیان تعلیمی سرگرمیوں میں عظیم الشان
تحریک پیدا کی جا چکی ہے"

تقسیم ہند کے وقت کانفرنس بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور دوسرے اداروں کی طرح ہندوستان کو سب سے بڑا حصہ ملا اور ازسقف بام تا بہ ثریا پاکستان کے حصے میں آیا۔ گویا ایجوکیشنل کانفرنس بھی پاکستان میں مہاجرین کر آئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس کے قدیم خیرخواہوں اور کارپردازوں میں سے بعض حضرات یہاں موجود تھے۔ سید الطاف علی صاحب نے جو کم و بیش بیس سال سے کانفرنس سے منسلک ہیں اور ن کے بغیر سلطان جہاں منزل کا نقشہ تصور میں نہیں ملتا تھا کانفرنس کو ایک جاندار اور باعمل ادارہ بنانے کی تحریک ۔ میجر شمس الدین صاحب، ممتاز حسن صاحب قزلباش، ہری ظفر حسن صاحب واسطی، پروفیسر حسن علی عبدالرحمٰن علیم الدین خان صاحب۔ مرزا علی اظہر برلاس صاحب اور چند دیگر خیرخواہان کانفرنس نے اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے میں پوری جدوجہد کی اور انہیں حضرات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج کانفرنس مفید ترین علمی اداروں میں شمار کی جاتی ہے۔

مسلمانوں کی تعلیمی، علمی، ثقافتی اور لسانی ترقی و صلاح کی تدابیر کو عمل میں لانا کانفرنس کے مقاصد میں شامل ہے اس کے سامنے بہت وسیع پروگرام ہے اور اس کے کارکنوں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ خود کراچی کے تعلیمی مسائل اور یہاں کے اداروں کی حالت بڑی حد تک محتاج اصلاح ہے اور اس سلسلے میں کانفرنس بہت کچھ کر سکتی ہے کراچی کی آبادی اس تیزی سے بڑھی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے کہ حکومت اور بعض دردمندان قوم کی کوششوں کے باوجود ہزارہا بچے ایسے ہیں جنہیں زیر تعلیم ہونا چاہئے تھا لیکن نہیں ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس ہی نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے ناکافی ہیں، ان میں تعلیم کی گرانی بھی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ غربا کا تو ذکر کیا متوسط الحال طبقے کے لوگ بھی اپنے بچوں کو ان میں بمشکل ہی تعلیم دلا سکتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ بعض لوگوں نے تعلیم کو بھی تجارت پرستی کا موضوع بنا لیا ہے۔ درحقیقت ہم کو ایسے اداروں کے کھولنے کی ضرورت ہے جن کا مقصد تعلیم و تربیت کے علاوہ کچھ اور نہ ہو۔ اس ضمن میں جامعہ ملی اسلامیہ ملیر کی شاندار مثال ہمارے سامنے ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین کی قیادت میں اس ادارے نے چند سال ہی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور جیسا کہ چند روز ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے وزیراعظم پاکستان کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا۔ ان سب بچوں کو جو وہاں تعلیم حاصل کرتا

چاہتے ہیں جامعہ میں داخل کرنا اب ان کے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ ادارہ عمر میں بہت کم ہے لیکن رفتار ترقی کے لحاظ سے کراچی بلکہ پاکستان کے اداروں میں صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

یونیورسٹی اور کالجوں سے متعلق بھی چند امور غور طلب ہیں تقسیم کے بعد کئی نئے کالج قائم ہوئے لیکن اب بھی بعض علاقوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کافی سہولتیں موجود نہیں۔ طلبا کو خصوصاً لڑکیوں کو دور کے فاصلے طے کر کے کالجوں تک پہنچنے میں جو تکالیف کرنی پڑتی ہیں ظاہر ہیں بعض کالج اپنی مخصوص حیثیتوں کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔

سرسید گرلز کالج کانفرنس کے کارکنوں بالخصوص اس کے شعبۂ نسواں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان خواتین کی خدمت ہر طرح سے قابل ستائش ہے جس بے سروسامانی اور توکل کی حالت میں یہ ادارہ کھولا گیا ہے اس میں صرف ان کا خلوص اور کارکنوں کی انتھک کوششیں ہی اس کالج کو قائم کر سکتی تھیں۔ یہ کالج پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ میں ایک عظیم کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا غیر سرکاری گرلز کالج خواتین اُردو کالج ہے جو بابائے اُردو کی سرپرستی میں قائم ہوا ہے۔ اس کو وجود میں لانے کا سہرا انجمن ترقی اُردو کے جواں عمر، مخلص اور سرگرم کارکن سید علیم الدین رضوی کے سر ہے۔ ایسے عالی ہمت نوجوان ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں اور رہنمایان قوم ان سے بہت مفید کام لے سکتے ہیں۔

خواتین و حضرات!

اب میں آپ کو بعض عمومی مسائل پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو اپنی نوعیت میں بہت اہم ہیں اور ان پر فوری توجہ کی سخت ضرورت ہے۔

ہم لوگ اس وقت اپنی تاریخ کے نہایت اہم اور نازک دور سے گزر رہے ہیں ہمیں ایک ایسے معاشرے کی عمارت تیار کرنی ہے جس کی بنیاد اسلام کے ہمہ گیر اصولوں پر رکھی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس میں وہ وسعت بھی موجود ہو جو ترقی پذیر تمدن کی جملہ ضروریات کی کفیل ہو سکے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام نے ایک ایسا جامع اور مکمل نظام حیات پیش کیا ہے جو تہذیب و تمدن کے ہر دور میں بنی نوع انسان کے لئے صرف قابل عمل ہی نہیں بلکہ بہترین رہنما ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد اب ہماری پہلی ذمہ داری یہی ہے کہ ہم اس دعوے کا عملی ثبوت دیں اور متمدن اقوام کو بتلائیں کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرون وسطےٰ میں مسلمانوں نے کئی سو برس تک انسانیت کی رہنمائی کی۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کی اور ایسے دور میں علم و ادب کی مشعل روشن کی جبکہ ساری دنیا پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایک غیر مسلم مصنف نے ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ

"وہ سب سے بڑا فلسفی الفارابی مسلمان تھا عظیم ترین ریاضی داں ابوکاس اور ابراہیم بن سنان مسلمان تھے، سب سے بڑا جغرافیہ داں اور دائرۃ المعارف کا مؤلف مسعودی مسلمان تھا اور عظیم ترین مورخ الطبری بھی مسلمان تھا

تاریخ اسلام کے اس پہلو سے ہمیں ایک بڑا سبق ملتا ہے یعنی جس وقت تک ہم اپنے اصولوں اور روایتوں پر قائم رہے ہم نے دنیا کی رہنمائی کی اور تہذیب کی رفتار کو بڑھایا۔ اب بھی اگر وہی راستہ اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوبارہ مسلمان ترقی نہ کریں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہم لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو چکا ہے پاکستان کی تخلیق اور اس کے لئے اسلامی دستور کی تشکیل اسی راستے کے سنگ ہائے میل ہیں لیکن ہمارے سفر کی یہ ابتدائی منزلیں تھیں جو ہم نے طے کی ہیں۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ابھی تک ایک طویل اور دشوار گذار راستہ طے کرنا ہے اس مقصد کی تکمیل میں ان حضرات کو ایک نمایاں حصہ لینا ہے جن کا تعلق تعلیم و تعلم سے ہے ان پر بہت بھاری ذمہ داری ہے اور اگر انہوں نے اس سے عہدہ برآ ہونے میں کوتاہی کی تو تاریخ ان کو ہمیشہ ملزم کی حیثیت سے دیکھے گی۔

ایک ایسے اجتماع میں جہاں حاضرین کی بڑی تعداد ماہرین تعلیم پر مشتمل ہو، موجودہ تعلیمی تنظیم کی تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان حالات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کر دوں جو موجودہ طرزِ تعلیم کا باعث ہوئے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریز کا قبضہ ہوا مغل بادشاہی اس کے بعد بھی پچاس سال سے زیادہ زندہ رہی۔ لیکن یہ زندگی برائے نام تھی کیونکہ مغل اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا سولہ سترہ برس بعد مرہٹوں کی قوت بھی ختم ہو گئی اور ۱۸۱۸ء کے بعد پنجاب، سندھ اور قبائلی علاقہ کو چھوڑ کر سارا ہندوستان انگریزوں کے زیر حکومت آگیا ایک نئی غیر ملکی حکومت کے سامنے اب یہ مسئلہ تھا کہ اس کا اقتدار قائم رکھنے کے لئے مضبوط اور دیرپا بنیادیں کس طرح تیار کی جائیں۔ اس سلسلے میں یہاں کی آبادی میں ایک کارآمد اور وفادار تعلیم یافتہ طبقے کی موجودگی ناگزیر تھی اور یہ طبقہ صرف انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے وجود میں آ سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب حکومت نے دس بارہ سال کی بحث و مباحثہ کے بعد ۱۸۳۵ء میں اپنی تعلیمی پالیسی کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر ولسن وغیرہ جیسے ماہران تعلیم کے مقابلہ میں لارڈ میکالے اور اس کے ہم خیالوں کی رائے کو ترجیح دی اور اس پر عمل کیا۔ اس پالیسی کے جو نتائج ہوئے ان پر مؤرخوں نے بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے منجملہ ان کے میں صرف دو امور کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مغربی تعلیم نے ہمارے نصاب اور نظم تعلیم کو اس عنصر سے محروم کر دیا جو ہمارے مخصوص تمدن اور روایات کا سنگ بنیاد تھا یعنی روحانیت اور مادیت کا وہ امتزاج جو اسلامی طرز فکر کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل عبارت میں اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن کے مطابق آخری حقیقت روحانی ہے اور اس کی بقا اس کی دنیوی عملیات پر مشتمل ہے۔ روح اپنے اظہار کا موقع قدرتی، مادی اور دنیادارانہ فضا ہی میں پاتی ہے اس لئے وہ سب کچھ جو دنیا دارانہ ہے اپنی بقا کی اصل اور جڑ کے اعتبار سے مقدس ہے فکر جدید نے اسلام کی اور ایک نفس الامری حقیقت کے طور پر تمام مذاہب کی جو سب سے بڑی خدمت سرانجام دی ہے وہ اس چیز کی تنقید پر مشتمل ہے جسے ہم مادی کہتے ہیں اور یہ تنقید وہ ہے جو اس امر کو آشکارا کرتی ہے کہ جب تک ہم ذہنیت

کی جڑیں روحانیت میں جمی ہوئی نہ دیکھ لیں مادیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہاں (اسلام میں) ناپاک دُنیا کا کوئی وجود نہیں مادے کی یہ تمام بے پایانی روح کے لئے استکمال نفس کی گنجائش بہم پہنچاتی ہے جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت خوشنما اور بلیغ فقرہ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

"یہ زمین ساری کی ساری ایک مسجد ہے"

شمس العلماء مولانا نذیر احمد نے اسی کانفرنس کے چودھویں سالانہ جلسے میں ۱۸۹۹ء میں تقریر کرتے ہوئے سرسید علیہ الرحمۃ کے متعلق یہ الفاظ کہے تھے۔

"جو لوگ سید احمد خاں کو سمجھتے تھے وہ یہ بھی
خوب سمجھتے تھے کہ سید احمد خاں اس تعلیم کو
جو انگریزی کالجوں اور اسکولوں میں ہو رہی
ہے مسلمانوں کی اصلاحِ حالت کے لئے ہرگز
کافی نہیں سمجھتے لیکن مشکل یہ آ پڑی تھی کہ
جیسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم سید احمد خاں مسلمانوں
کو دلانی چاہتے تھے حالات موجودہ پر نظر
کرتے ہوئے اس کا سامان مہیا کرنا کچھ
آسان نہ تھا اور اسے کاش اتنا ہی ہوتا
کہ آسان نہ تھا ے

ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں"

مولانا کے اس اشارے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے ذہن میں بھی وہی اصول تھا جس کی تشریح علامہ اقبال نے کی ہے ۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہمارے رہنما جو تحریک پاکستان سے منسلک رہے ہیں اور پاکستانی معاشرے کی اسلامی اصولوں ہی پر قائم کرنے کے حامی ہیں تعلیمی اصلاح کے اس پہلو کو کافی اہمیت دیتے ہیں مسٹر فضل الرحمان۔ جو پاکستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"تعلیم کے ان تین عناصر میں سب سے زیادہ اہمیت میں روحانی عنصر کو دیتا ہوں کیونکہ اس کی جانب سے تغافل جو تعلیم جدید کی نمایاں خصوصیت بن گیا ہے تباہ کن نتائج کا حامل رہ چکا ہے۔ دو عالمگیر جنگوں کا تجربہ اور اس کے ساتھ زمانہ حال کی وسیع فنی ایجادات جو ہلاکت و بربادی کا نا قابل شمار امکانات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں اس حقیقت کو روز روشن کی طرح آشکارا کر چکی ہیں کہ جب تک آدمی کا اخلاق سائنس کے قدم بقدم نہ ہو انسان کا بری طرح برباد ہونا ایک یقینی امر ہے۔"

ان نظریات کی بنا پر کانفرنس نے ایک رزولیوشن پاس کر کے پاکستان کی تعلیمی پالیسی کا اصول واضح کر دیا ہے لیکن شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا ان کی عملی جہت میں ہم نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی ہے ابھی تک ہمارے نصابوں میں وہ انقلابی تبدیلیاں نمایاں نظر نہیں آتیں جو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری ہیں اس میں شک نہیں کہ اس انقلاب کے لئے ایک مدت درکار ہے لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس مدت کو جتنا مختصر کیا جا سکتا ہو کیا جائے گزشتہ سترہ سال میں ایجوکیشنل کانفرنس نے متعدد موقعوں پر تعلیمی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو وہ راستہ دکھایا ہے جو ان کے لئے مفید

ثابت ہوا اس موقع پر بھی اگر کانفرنس یہ خدمت انجام دے تو اس کا یہ عظیم کارنامہ یقیناً ہند و پاکستان کی تاریخ کے صفحات پر زریں الفاظ میں لکھا جائے گا۔

نصاب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کا بھی انتظار کرنا ہے کہ ہمارے اساتذہ صحیح تعلیم و تربیت دینے کے اہل ہوں انسانی معاشرے میں استاد ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہے ہر طبقے میں اور ہر زمانہ میں اسے احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ استاد کے متعلق ہمیشہ اور ہر جگہ یہ تصور رہا ہے کہ اس کا کردار بہت بلند ہونا چاہیئے تاکہ اس کی زندگی شاگردوں کے لئے نمونہ بن سکے مسلمانوں کے عہد حکومت میں اکثر و بیشتر اساتذہ بغیر کسی مشاہرے کے تعلیم دیتے تھے اس کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں تزکیۂ نفس کی تعلیم دی جاتی تھی گویا تعلیم و تربیت کا کام علما اور مشائخ کے درمیان منقسم تھا۔ سیاسی قوت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام کا شیرازہ بھی منتشر ہوتا رہا اور انگریزی اقتدار قایم ہونے کے بعد صرف ضروریات زندگی ہی نہیں بلکہ اقدار بھی بدل گئیں یوں بھی تہذیب جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے ہماری زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے مادیت کی بالا دستی نے ایسے معاشی مسائل پیدا کر دیئے ہیں کہ ان کے حل کرنے میں ہمیں پچھلے ادارہ کے تجربوں سے بہت زیادہ مدد نہ مل سکے گی مثلاً موجودہ معاشرے میں یہ ممکن نہیں کہ اساتذہ اتنی عظیم الشان قربانیاں کر سکیں جیسی پہلے زمانے میں ممکن تھیں لیکن اس بنیادی اصول میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی کہ تعلیمی نظام میں کیرکٹر بلڈنگ (سیرت سازی) پر بہت زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک ہم ایسے اساتذہ پیدا نہ کریں جو فنی قابلیت اور علمی کمالات کے علاوہ ایک مثالی کردار بھی رکھتے ہوں اس کے بعد طلبا کے لئے ہوسٹلوں کے قیام کی زیادہ سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہوگی۔ علی گڑھ کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طالب علم کے لئے اقامت خانے کی زندگی کس قدر مفید ہو سکتی ہے یہ نظام جن اصول اور تقاضوں کے ماتحت قایم کیا گیا تھا ان کے پیش نظر وہ نہایت کامیاب رہا مسلمان قوم جو امید علی گڑھ سے کر سکتی تھی وہ اس نے پاکستان کی تحریک کو کامیاب بنا کر پوری کر دی قائد اعظم نے علی گڑھ کو فخریہ انداز میں مسلمانوں کا اسلحہ خانہ کہا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علی گڑھ نے اپنے آپ کو اس امتیاز کا حقدار ثابت کر دکھایا۔

اب میں آپ کی توجہ ایک اور اہم مسئلے کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں کمپنی کی حکومت نے لارڈ منٹو کے عہد میں یہ طے کیا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے میکالے جو اس نظریئے کا بہت بڑا حامی تھا اس کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علوم اس قابل نہ تھے کہ ان پر حکومت کا روپیہ صرف کیا جائے یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ یہ میکالے اور اس کے ہم خیالوں کی جہالت اور ان کا تعصب تھا جس نے انہیں اس رائے پر جما دیا۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں مسلمانوں کے ان علمی کارناموں کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے جن کے ذریعہ انہوں نے اقوام یورپ نشاۃ ثانیہ کے لئے تیار کیا۔ میکالے نے انہی علوم کو اور ان کے ساتھ ہندوؤں کے علوم کو بھی شامل کر کے ارشاد فرمایا تھا:-

"سر دست ہم ایسی کتابیں چھاپیں گے

ایک بورڈ ہیں جو اس سادہ کاغذ سے بھی زیادہ کم قیمت ہیں جس پر ان کی طباعت ہوتی ہے ہم ایک ایسا بورڈ ہیں جو مہمل تاریخ، فضول، بدطبیعیات اور مہمل دینیات کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

اگر حقیقتاً میکالے علوم شرقیہ کے معاملے میں اتنا ہی جاہل تھا جتنا اس کے ان الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے تو اس مسئلے میں اس کی رائے کو کوئی وقعت ہی نہ دینی چاہئے اور اگر اس کو علوم کا کچھ بھی اندازہ تھا تو اس نے کسی خاص مقصد کے تحت یہ الفاظ استعمال کئے تھے بہر حال بینٹنگ کی حکومت نے اسی کے مشورہ پر عمل کیا اور ہماری تعلیم کی عمارت نہایت خطرناک بنیادوں پر کھڑی کر دی یہ فیصلہ ۱۸۳۵ء میں کیا گیا تھا اس کے بعد بیس سال کے اندر چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے علاوہ پنجاب سندھ صوبہ سرحد اور اودھ کے علاقہ انگریزی حکومت میں شامل کر لئے گئے۔ یا یوں کہیئے کہ برصغیر ہند و پاک کے سارے علاقے پر براہ راست یا زیر دست ریاستوں کی شکل میں انگریزی حکومت قائم ہو گئی اس قدر وسیع علاقے کی شمولیت نے برطانیہ کو دنیا کی عظیم ترین سلطنت بنا دیا اور انگریز کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ اس کی سلطنت میں سورج کبھی نہیں چھپتا۔ نخوت و پندار کے نشہ نے اس کو یہ سوچنے کا موقع نہ دیا کہ ہندوستان کے باشندوں اور حکمرانوں کے ساتھ اس کو کیا سلوک کرنا چاہیئے انگریزی فتوحات تمام تر خود ہندستانی فوجوں کی فتوحات تھیں کمپنی کی ان فوجوں میں جو دیسی حکمرانوں کے مقابلے میں کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہوئی تھیں انگریز بہت کم تعداد میں ہوتے تھے یہ سپاہی جو کمپنی بہادر کی خاطر اپنا خون بہاتے تھے اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ کمپنی کی حکومت بھی ان کے لئے ایسی ہی باعث رحمت ہوگی جیسی مسلمانوں کی فتوحات کے بعد مسلمانوں کی حکومت ثابت ہوئی۔ لیکن یہاں صورت حال دگرگوں تھی انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں بالخصوص ہند و پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ آزادی لڑی لیکن بدقسمتی سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اس شکست اور وحشیانہ مظالم نے جو اس کے بعد ان پر توڑے گئے صرف ان کے سیاسی اقتدار اور ان کی معاشی صیانت کو ہی تباہ نہ کیا بلکہ ان کی ذہنیت کو بھی مفلوج کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جنگ آزادی کے فوراً بعد جو دور آیا وہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک دور ہے وہ مغربی تعلیم کے پہلے ہی کچھ زیادہ حامی نہ تھے اور اب تو جذبۂ نفرت شدید تر ہو گیا تھا ایک زبردست عنصر جو اس دور کی زندگی میں کارفرما تھا وہ حکومت کی یہ پالیسی تھی کہ مسلمانوں کو جہاں تک ممکن ہو دبایا جائے اور ان کو ابھرنے نہ دیا جائے ان حالات کے پیش نظر سر سید احمد خاں نے قوم کو مغربی تعلیم کی طرف بلایا اور انہی کی بنا پر انگریزی کالجوں کی تعلیم ان کے لئے ضروری سمجھی گئی حالانکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے یہ وہ تعلیم نہ تھی جس کے وہ دل سے خواہش مند تھے لیکن قوم کو مکمل تباہی سے بچانے کیلئے یہ ضروری تھا کہ اس وقت وہی طرز تعلیم اختیار کیا جائے جس کو حکومت رائج کرنا چاہتی تھی اس وقت سیاسی ماحول کا یہی تقاضا تھا اور سر سید احمد خاں کے رفقاء کار نے بڑی دور اندیشی سے کام لے کر مسلمانوں کی رہنمائی اس نہج پر کی کہ وہ کشمکش حیات میں دوسری قوم کے دوش بدوش

تعلیم یافتہ انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے کو وہ تعلیمی مسئلے کا ایک حل تصور نہ کرتے تھے چنانچہ ۱۸۶۷ء میں علی گڑھ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک درخواست بھیجی گئی جو سرسید احمد خان نے مرتب کی تھی اور جس کا منشا تھا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک سررشتہ قائم ہو جائے اور کامیاب طلبا کو سندیں دی جائیں. مگر یہ اسکیم ہندوؤں کی مخالفت کے سبب ختم ہو گئی. سرسید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے اُردو کے لئے جو جدوجہد کی وہ ان کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے لیکن اب اُردو کا مسئلہ سیاسی رنگ اختیار کر چکا تھا اور انیسویں صدی کے آخری سال میں میکڈانلڈ کی حکومت نے سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں ناگری کی اجازت دے کر اس مسئلہ کو پیچیدہ بنا دیا تھا. ہمارے نئے دستور نے اُردو اور بنگالی کو سرکاری زبانیں قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ابھی بیس سال تک انگریزی میں سرکاری اور دفتری کام کرنے کی اجازت ہے اس مدت کے ختم ہونے پر یا اگر ممکن ہو تو اس سے قبل ہی حکومت زبانوں میں سرکاری و دفتری کام کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیے. اس موقع پر صرف اُردو کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں. حال میں صدر انجمن ترقی اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اعلان کیا ہے کہ وہ اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں اور بہت جلد اس کام کو شروع کرنے والے ہیں. درحقیقت اُردو یونیورسٹی کا قیام اس وقت ہماری تعلیمی ضروریات کا سب سے بہتر اور واحد حل ہے اور قوم کو چاہیے کہ وہ اس کام میں مولوی عبدالحق کا پورا ساتھ دے. انجمن ترقی اُردو کے ماتحت اُردو یونیورسٹی کا تخیل نیا نہیں ہے ۱۹۲۶ء میں انجمن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ناگپور میں یہ رزولیوشن پاس ہوا تھا

> اس کانفرنس کی رائے ہے کہ اُردو زبان کی مقبولیت و وسعت کے خیال سے لوگوں کی افادیت کو زیادہ وسیع اور موثر طریقہ پہ کام میں لانے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ برطانوی ہند میں کسی مرکزی مقام پر ایک ایسی چارٹرڈ اُردو یونیورسٹی قائم کی جائے جو تمام ساز و سامان سے لیس ہو اس لئے کل ہند انجمن ترقی اُردو سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کے قیام کے امکان پر غور کرے اور اس جہت میں ابتدائی اقدامات کرے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک ہماری سیاست جس نازک دور سے گزری ہے اس سے ہم سب واقف ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ انجمن کے اس رزولیوشن کی عملی تشکیل کے لئے موثر قدم اُٹھایا جائے. غالباً اس مسئلہ پر بحث کی گنجائش نہیں کہ آیا اُردو آرٹس کے علاوہ سائنس اور فنی تعلیم کے اعلیٰ مدارج کے لئے بھی موزوں ہے یا نہیں. عثمانیہ یونیورسٹی اور خود اُردو کالج کے کامیاب تجربوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو اس کی اہل ہے اُردو کالج کا قیام انجمن ترقی اُردو کا ایک انقلابی قدم تھا. پاکستان کو قائم ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا قوم کے سامنے اہم مسائل تھے حکومت کو گردن اُٹھانے کی فرصت تک نہ تھی لیکن خوش قسمتی سے وزیر تعلیم یعنی مسٹر فضل الرحمٰن علمی ادبی تعلیمی اور ثقافتی معاملات سے خاص دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اس سلسلے میں انجمن و بابائے اُردو کی بڑی مدد کی.

ہم لوگوں کو مسرت ہے کہ فضل الرحمٰن صاحب نے

جس تجربے کے خیال سے اُردو کالج کے قیام میں مدد فراہم کی تھی وہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور اب اس میں کسی کو شک نہیں کہ اُردو میں اعلیٰ ترین مدارج کی تعلیم آسانی سے دی جا سکتی ہے۔ یہ کالج اگرچہ کراچی یونیورسٹی کے قوانین و ضوابط کی پابندیوں میں جکڑ جانے کے بعد بابائے اُردو کے اصلی خیال کے مطابق اُردو تحریک کے ادبی شعبے کا ایک مرکزی سنگِ بنیاد نہ بن سکا لیکن اس کے طلبہ کی قابلیت اور متواتر شاندار کامیابیوں نے یہ بات اچھی طرح ثابت کر دی ہے کہ اب اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا کوئی جواز باقی نہیں ہے ان کامیاب تجربات کی روشنی میں اور دستور بن جانے کے بعد یہ مسئلہ ہمارے لئے بہت اہم ہو گیا ہے۔ دراصل اُردو یونیورسٹی کا قیام ہماری ضروریات کا اہم تقاضا ہے اور اس کی تکمیل میں جتنی بھی تاخیر ہوگی ہماری معاشرتی تشکیل کی منزل ہم سے اتنی ہی دور ہوتی چلی جائے گی۔

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میرے خطبے کو توجہ سے سُنا اور مجھے موقع دیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر سکوں۔

ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اپنا مندرجۂ بالا خطبۂ صدارت تقریباً چالیس منٹ میں ختم کیا اس کے بعد مندرجۂ ذیل تجاویز فرداً فرداً پیش ہو کر منظور ہوئیں۔

الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب۔ جناب ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب۔ مولوی سید ظفر حسین واسطی صاحب۔ علامہ ابن حسن جارچوی صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ صاحب۔ مفتی محمد نظام اللہ شہابی صاحب۔ مولوی محمد عظیم الدین صاحب۔ بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحبہ اور سید الطاف علی بریلوی نے اس تحریک تائیدی بحث و گفتگو میں نمایاں حصہ لیا۔

تجاویز

۱۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ بن گیا ہے اور اس ذمہ داریوں کے پیشِ نظر جو اس کی وجہ سے حکومت اور عوام پر عائد ہوتی ہیں تعلیمی پالیسی کی تنظیم نو ضروری ہو گئی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ

(الف) پرائمری تعلیم مفت اور عام ہونی چاہیئے اور اس مقصد کے واسطے مسجدوں کو پرائمری اور بنیادی تعلیم کا مرکز قرار دیا جائے۔

(ب) مسجدوں کا انتظام مقامی کمیٹیوں کے سپرد کیا جائے جن کی نگرانی اور مدد کے واسطے گورنمنٹ اسپیشل افسر مقرر کرے۔

(ج) امام تعلیم یافتہ موزوں اشخاص مقرر کیے جائیں جو معلمین کے فرائض انجام دینے کے بھی اہل ہوں

(د۔الف) ان معلمین کو ٹریننگ دینے کے واسطے ابتدائی منزل میں ہنگامی اقدام کئے جائیں مثلاً گشتی ٹریننگ جماعتی ریفریشر کورسیز وغیرہ۔

(د۔ب) ان مدرسوں کے مصارف کے واسطے مسلم اوقاف۔ زکوٰۃ فنڈ اور دوسرے وسائل سے روپیہ فراہم کیا جائے۔

(ہ) ابتدائی تعلیم کے ۵ سالہ کورس کے بعد مڈل کی تعلیم کا تین سالہ کورس ہونا چاہیئے جس کا نصاب

وسیع بنیادوں پر مرتب کیا جائے اور اس میں سائنسی، فنی اور عمومی تعلیم کے عنصر شامل کئے جائیں تاکہ بچوں کے رجحانات کا پتہ لگ سکے۔

(د) ثانوی مدارج میں بچوں کے مختلف رجحانات کے لئے سہولت بہم پہونچانے کی غرض سے چار سالہ نصاب مرتب کیا جائے جسمیں مختلف النوع اور متعدد مضامین شامل ہوں تاکہ بچے نصاب کے اختتام پر اپنی دماغی صلاحیتوں کی مناسبت سے پیشے اختیار کرسکیں۔

(ز) متذکرہ بالا ضروریات کو پورا کرنے کے واسطے یا تو علیحدہ ادارے۔ آرٹس۔ سائنس۔ کامرس۔ ایگریکلچر اور صنعتی تعلیم کے لئے کھولے جائیں۔ یا ایک ہی ادارہ کے مختلف شعبوں میں متوازی نصاب جاری کئے جائیں۔

(ح) ٹریننگ ادارے بہت کم ہیں جس کی وجہ سے توسیع تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ ٹریننگ کے اداروں کی تعداد بڑھائی جائے اور ٹریننگ کے نصاب پر نظرثانی کی جائے تاکہ وہ تعلیم کی جدید تنظیم اور مختلف النوع ضروریات سے ہم آہنگ ہوسکے۔

(ط) حصول علم کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ تحقیق کو ترقی دینے اور ملک میں علمیت کی سطح کو بلند کرنے کے لئے متعدد تحقیقی اداروں کا قیام ضروری ہے اس سلسلے میں حکومت کی توجہ خاص طور پر اس طرف دلائی جاتی ہے کہ پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے ماتحت مندرجہ ذیل اداروں کا قیام بہت ضروری ہے جن کی کمی بری طرح محسوس کی جارہی ہے۔

ط۔ (الف) انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن جس سے ایک سائیکالوجیکل بیورو بھی ملحق ہو۔ تاکہ تعلیمی نظریہ اور مشق کے متعلق تحقیق کو ترقی دی جاسکے اور پاکستان کے بچوں کی ضروریات کے مطابق نفسیاتی تجربات کئے جاسکیں۔

(ط۔ ب) فقۂ اسلامی کو ازسرنو ترتیب دینے کا کام انجام دینے کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ آف لاء کا قیام عمل میں لایا جائے جو پاکستان کے قوانین کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ازسرنو مدون کرسکے۔

(ط۔ ج) اسلامی ممالک کی سیاسی سماجی اور تعلیمی و معاشری حالت کا مطالعہ کرنے کے لئے "انسٹیٹیوٹ آف مسلم افیسرس" کا قیام۔

(ی) تعلیمی پیشہ کی طرف یونیورسٹی اور مدرسوں کے قابل ترین فارغ التحصیل لوگوں کو راغب کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اساتذہ کی تنخواہوں کے اسکیل اور ملازمت کی شرائط تعلیم کے تمام مدارج میں نمایاں طور پر بہتر کی جائیں تاکہ تعلیمی ملازمت دوسری ملازمتوں کے مقابلہ میں قابل ترجیح سمجھی جائے۔ یہ بھی بہتر ہوگا کہ اساتذہ کے لئے طبی امداد۔ زندگی کا بیمہ اور بچوں کی تعلیم کے لئے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

(ک) ہماری نوجوان نسل میں ایثار اور سماجی خدمت کی ذہنیت پیدا کرنے کے لئے اور اس کو زندگی کی

جو بچوں کے لئے تیار کرنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ ایک معقول مدت تک سماجی خدمات انجام دینے اور خاص طور پر بنیادی تعلیم کو یونیورسٹی ڈگری اور ڈپلوما حاصل کرنے کے لئے شرط اولیں قرار دیا جائے۔ اس اقدام سے معلمین کی کمی کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔

(ل) اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اہل طلبہ کی ایک بڑی تعداد مالی حالت خراب ہونے کے باعث تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔ کانفرنس اس کو ایک قومی نقصان سمجھتی ہے اور حکومت اور پبلک پر زور دیتی ہے کہ معافی فیس۔ اور وظائف وغیرہ وسیع پیمانے پر دینے کے لئے سرمایہ فراہم کریں تاکہ کوئی مستحق طالب علم اعلیٰ تعلیم کے فائدوں سے محروم نہ رہے۔

(۲) اردو کو ذریعۂ تعلیم اور پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ بلاتاخیر ایک کمیٹی قائم کرے جو دفتری و کاروباری زبان کا معیار متعین کرے نیز ایک دارالترجمہ والاشاعت قائم کرے جو سائنس کی اصطلاحوں کو معیار کے مطابق بنائے اور دنیا کی مختلف زبانوں میں مختلف مضامین کی قدیم و جدید مستند تصانیف کا اردو ترجمہ کرے۔

(۳) بالغ العمر جوان العمر لوگوں میں اسلامی روح اور کردار پیدا کرنے اور ان کو اسلامی تعلیم دینے کے واسطے کانفرنس گورنمنٹ اور تعلیمی اداروں پر زور دیتی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں تک مذہبی تعلیم لازمی

دیا جائے یعنی کہ امتحان کے لئے [illegible] قرار دیا جائے اس کا دائرہ وسیع تر کیا جائے اور اس کی تعلیم کے طریقہ کو بہتر بنایا جائے تاکہ مذہبی تعلیم موثر ہو اور طلباء کی زندگی کا رخ بہتر بنا سکے۔

(۴) تجویز کیا جاتا ہے کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صوبائی شاخوں کی مشرقی و مغربی پاکستان میں تنظیم کی جائے اور صوبائی حکومتوں سے استدعا کی جائے کہ وہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو معقول "گرانٹ اِن ایڈ" دیں۔

نیز کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں جو تعلیمی ملازمین شرکت کریں ان کو "ڈیوٹی لیو" اور سفر خرچ دیں۔

(۵) قرار پایا کہ یہ کانفرنس ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی پاکستان میں اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی پرزور حمایت کرتی ہے۔

(۶) عوام میں تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھانے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ تعلیمی سہولتوں میں جلد توسیع کی جائے۔ اس کے واسطے یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ بلدیہ کراچی ان رقبوں میں جہاں پرائمری مدارس نہیں ہیں۔ جلد سرکاری پرائمری اسکول قائم کرے۔

(۷) یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اسکول [illegible] سروس کے فائدوں کو پورے [illegible] [illegible] دے۔

(۸) کراچی میں [illegible] کی اعلیٰ تعلیم کے [illegible] بہت کم ہیں اس لئے یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے

کر کے ان کے موجودہ کالجوں کو توسیع دی جائے اور غیر سرکاری کالجوں کو بہتر بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ امداد دی جائے۔

(۹) کانفرنس کا یہ اجلاس اپنی اُس سابقہ تجویز کا اعادہ کرتا ہے جس میں لڑکیوں کے لئے ڈھاکہ اور کراچی میں ایک علیحدہ میڈیکل کالج کھولنے کی درخواست کی گئی تھی اور حکومت سے سفارش کرتا ہے کہ جب تک یہ کالج قائم ہوں۔ موجودہ میڈیکل کالجوں میں داخلہ کے لئے لڑکیوں کی تعداد ۴۰ فیصدی مقرر کی جائے۔

(۱۰) کراچی یونیورسٹی کے مجاز کالجوں کے لئے امداد کے موجودہ قواعد میں درج ہے کہ امداد گزشتہ سال کے آڈٹ شدہ حسابات اور تعلیمی سالِ رواں کے بجٹ اسٹیمیٹ کی بنیاد پر دی جائے گی اور دو قسطوں میں ادا کی جائے گی جن میں سے پہلی قسط اکتوبر میں اور دوسری فروری میں ادا ہوگی لیکن عملاً گذشتہ سال کے اصلی اخراجات پر امداد کا حساب لگایا جاتا ہے اور سال کے آخر میں ایک ہی قسط میں ادا کی جاتی ہے۔

کانفرنس کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریقے سے کراچی کے کالجوں کو بڑی پریشانی ہوتی ہے اور اس لئے تجویز کرتا ہے کہ مرکزی حکومت سے درخواست کی جائے کہ موجودہ قواعد کی پوری پابندی کی جائے۔

(۱۱) یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ حکومت تعلیمی اداروں کو زمین مفت عطا کرے اور اگر معاوضہ لینا ناگزیر ہو تو معاوضہ ایک روپیہ فی مربع گز سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔

(۱۲) قرار پایا کہ کے جی اور نرسری اسکولوں کے لئے قانون اور قاعدے بنائے جائیں اور ان پر عمل کرانے اور ان کی نگرانی کا معقول انتظام کیا جائے اور ان میں طبی سروس بھی جاری کی جائے۔

(۱۳) یہ کانفرنس حکومت سے استدعا کرتی ہے کہ کراچی میں ایک طبیہ کالج قائم کیا جائے تاکہ عوام کیلئے یونانی طریقِ علاج کی سہولتوں میں توسیع ہو سکے۔

(۱۴) قرار پایا کہ عربی کی تعلیم کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے اقدامات کئے جائیں اور اس کے لئے موزوں طریقۂ تعلیم دریافت کر کے اس کو ترقی دی جائے۔

(۱۵) قرار پایا کہ گورنمنٹ گرانٹ جو علمی اداروں کو دی جاتی ہے ہر سال جنوری تک ادا کر دی جایا کرے کیونکہ گرانٹ کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے ان اداروں کی کارکردگی بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔

چونکہ تجاویز کافی تعداد میں تھیں اس لئے شعبہ تعلیمی کے جلسہ کا تمام وقت انہیں کی منظوری میں صرف ہو گیا۔

آخر میں جناب سید شمس الدین محمد صاحب نے منجانب پاکستان کانفرنس ڈاکٹر سید معین الحق صاحب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کارروائی جلسہ دو بجے بعد دوپہر ختم ہوئی۔

ملت کے تعمیری کاموں سے دلچسپی برابر بڑھ رہی ہے اور آزاد باوقار ملکوں کی خواتین کی طرح ہماری بہنیں بھی تعمیر و ترقی کے کاموں کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل نظر آتی ہیں اس احساس کے باعث ملک میں عورتوں کی تعلیم ویسی ہی اہمیت رکھتی ہے جیسی مردوں کی تعلیم۔ جب تک مرد اور عورت دونوں تعلیم نہ پائیں گے، ہم پوری رفتار سے ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمارے رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ

"علم کا حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کا فرض ہے"۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بچوں کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ سلیقہ شعار ہوگی تو اس کی اولاد بھی متمدن اور باادب ہوگی۔ بچوں کی تربیت تعلیم یافتہ ماؤں اور بہنوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ نپولین کا قول ہے کہ

بہترین مائیں بہترین بچے پیدا کر سکتی ہیں
جو بعد میں قوم و ملت کے لئے مایۂ ناز
ہستیاں ثابت ہوتی ہیں۔

ہم میں اکثر برائیاں عدم تعلیم کی وجہ سے ہوتی ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ علم پڑھ کر عورتیں بگڑ جاتی ہیں اور اُن کا اخلاق خراب ہو جاتا ہے اور اپنے خاوندوں کی نافرمان بردار ہو جاتی ہیں۔ گھریلو کام میں کما حقہٗ توجہ نہیں دے سکتیں۔ درحقیقت یہ خیال خام ہے۔ علم ایک نور ہے جو جہالت سے بچاتا ہے اور معیار اخلاق کو بلند کرتا ہے ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

خواتین اگر اس تعلیم کو پیش نظر رکھیں تو اُن میں اپنی اصلاح کا حقیقی احساس ہوگا۔

ہماری گذشتہ صد سالہ تاریخ زوال و انحطاط انہی واماندگیوں سے عبارت ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان برصغیر کے پاس کیا رہ گیا تھا۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ سب پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی راستہ اور کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔ خدا غریق رحمت کرے سرسیدؒ اور اُن کے مخلص اور ہوشمند ساتھیوں کو اُنہوں نے موانع و مشکلات کے ہجوم کے باوجود ملت کا ایک ٹھوس پروگرام بنا کر تنقیص و تحسین سے بے پرواہ ہو کر اس جرأت و محنت سے کام لیا کہ بالآخر ترقی و تعمیر کی گم شدہ راہ مل گئی ورنہ ہم خدا جانے سود و زیاں کے تذبذب اور احساس کمتری کی کشمکش میں کب تک مبتلا رہتے۔ میں یہاں سرسید اور اُن کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ساٹھ سالہ جدوجہد اور تعلیم و ثقافت کے میدان میں اُن کے کارناموں کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ ملی انفرادیت کی سعی جدوجہد اور سیاسی حقوق کی تاریخ کے اوراق ان سے بھرے ہوئے ہیں

بہرحال میں یہ عرض کر رہی تھی کہ سرسید کی قائم کردہ اس عظیم ایجوکیشنل کانفرنس کے نظام کار میں تعلیم نسواں پر ابتداء ہی سے زور دیا گیا ہے۔

اس شعبہ نسواں کی صدارت و سربراہی اس تمام عرصے میں مردوں کے ہاتھوں میں رہی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیم و ترقی کے میدان میں مسلم خواتین مردوں کے دوش بدوش نہیں تھیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء کے سالانہ اجلاس رامپور کے شعبہ نسواں کی صدارت

قائد ملت لیاقت علی خاں نے فرمائی لیکن تحریک پاکستان کے جوش و خروش نے اس کمی کو بڑی تیزی سے پورا کر دیا۔ اور ہماری بہنیں بھی قومی آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۴۹ء میں پہلے سالانہ جلسہ کی صدارت بیگم فضل الرحمٰن نے کی اور دوسرے کی بیگم شاہنواز نے اور اس اجلاس کی صدارت کراچی اور سندھ کے مرحوم قائد اور سندھ کے سابق گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ کی بیگم ادا فرمائیں گی۔ اللہ کے فضل و کرم سے آج ہم آزاد اور خود مختار ہیں۔ اپنی فلاح اور صلاح کے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کسی کی مزاحمت و مداخلت کا خوف نہیں۔ تعمیر و ترقی کا ایک وسیع میدان سامنے ہے۔ اور ہمیں جدوجہد بسیار سے کام لینا ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کا اوسط نہایت پست ہے۔ یعنی پوری قوم میں صرف تیرہ فی صدی لوگ خواندہ ہیں۔ پھر ان میں بھی مردوں اور عورتوں کا تناسب چھ اور ایک کا ہے۔ اس صورت میں طبقۂ نسواں کی تعلیم پر خاص درجہ توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل ظاہر ہے کہ ہماری قوم کی آئندہ نسل جن ماؤں کی گود میں پرورش پائے گی ان میں صرف دو فی صدی خواندہ ہوں گی اور ۹۸ فی صدی ناخواندہ لہٰذا جاہل اور بے علم ماؤں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت اور ذہنی و اخلاقی تربیت صحیح طور پر کر سکتی ہیں۔

تعلیم نسواں کے سلسلے میں مجھے مختصراً اتنا اور عرض کرنا ہے کہ اب تک ساری لڑکیوں کی جداگانہ ضروریات کی تکمیل کا سامان بہت کم ہے ورنہ بالعموم جو مضامین لڑکوں کو پڑھائے جاتے ہیں انہی کی تعلیم لڑکیوں کو دی جاتی ہے۔ ان کے مضامین نصاب ان کی زندگی کے مخصوص فرائض کے مطابق مقرر کئے جانے چاہئیں ان مضامین میں امور خانہ داری۔ معاشرتی خدمات گھریلو صنعتیں اور حفظان صحت و صفائی سب سے زیادہ اہم ہیں اور ان کی ہی تحصیل و تکمیل سے وہ آئندہ زندگی میں بہن بیوی اور ماں کے مختلف فرائض عمدگی سے انجام دے سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ دوسری بڑی ضرورت یہ ہے کہ تعلیم کا موجودہ نظام بدل کر اس کی بنیاد قرآن سنت پر رکھی جائے تاکہ زندگی کی صحیح قدر و قیمت اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اہمیت از اول تا آخر ان کے فکر و عمل کے پورے دائرے کو محیط کرے۔

اس میں شبہ نہیں کہ لڑکیوں کے لئے جداگانہ نصاب تعلیم مقرر کرنے، علیحدہ درسگاہیں کھولنے اور تربیت یافتہ استانیوں کا عملہ فراہم کرنے کے لئے وقت اور سرمایہ کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ضرورت ایسی نہیں جو ذرا سی توجہ اور تھوڑی سی ہوشمندی اور ایثار سے پوری نہ ہو سکے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہماری اہل ثروت بہنیں اور بھائی اس کے لئے تیار ہو جائیں ـــ اور حکومت امداد اور رہنمائی میں بخل اور تغافل سے کام نہ لے۔

غور کیجئے کہ ترقی اور عقلیت پرستی کے اس زمانے میں ہم فرسودہ رسموں اور فضول تقریبوں پھر

کتنا روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ شادی اور جہیز پر کس طرح
بے دریغ سرمایہ صرف کرتے ہیں اور یہ جانتے کے باوجود
کرتے ہیں کہ عملاً لڑکی کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں
پہونچتا جیسا نمائشی کپڑے، زیورات اور چاندی سونے
کے ظروف وغیرہ۔ روزمرہ کی زندگی میں ان کی قطعاً
کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری قوموں نے اس فضول خرچی
کو بالکل ترک کردیا ہے حتیٰ کہ بعض ممالک کی ایسی
قوموں نے بھی جو سراپا اوہام و روایات کے بندھنوں
میں جکڑی ہوئی ہیں۔ شادی اور جہیز کے مصارف کو
انتہائی کم کردیا ہے۔ اور اب ان کا اوسط تین فیصدی
سے زیادہ نہیں، لیکن ہمارے یہاں یہ مسرفانہ رسمیں
برابر جاری ہیں۔ اگر اسی روپے کو پس انداز کرکے
لڑکیوں کی تعلیم پر خرچ کیا جائے تو اس سے لڑکیوں
کی زندگیاں سنوارنے اور قوم کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا
کرنے میں زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس اور اس کا شعبۂ نسواں ایسا معتبر اور فکر و عمل
کا صحیح منہاج رکھنے والا ادارہ ہے۔ جو اس سلسلے میں تنظیم
کا بہترین کام کرسکتا ہے۔ یوں تو اس کے اخلاص اور
جذبۂ خدمت کا ثبوت برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی،
ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں اور ترقیوں کی پوری تاریخ
سے مل سکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں احیاء کے بعد سخت
و شدید موانع و مشکلات کے بعد بھی اس کا سلسلہ بند
نہیں ہوا پانچ سال کی مدت قیام اس کے کارکنوں اور
مخلص خدمت گذاروں کی صعوبت انگیزیوں کی ایک طویل
داستان ہو لیکن اس کے باوجود اس نے کراچی میں بالکل
بے سر و سامانی کے عالم میں بھی اول درجہ کا ایک گرلز کالج
قایم کردیا۔ یہ کالج سر سید گرلز کالج کے نام سے
موسوم ہے۔ کراچی یونیورسٹی نے اسے رجسٹرڈ کرلیا اور
مرکزی حکومت نے کالج کیلئے سالانہ گرانٹ کی منظوری
دے دی ہے اور امید ہے کہ جس طرح یہ مراحل
طے ہوگئے اس طرح اور بھی مراحل طے ہو جائیں گے۔
انشاء اللہ۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

ان معروضات کے بعد میں ایک دفعہ پھر شعبۂ
نسواں کی کارکنوں اور مجلس استقبالیہ کی ممبر طلبا اور
معاونوں کی طرف سے آپ سب کا خیر مقدم کرتی ہوں
اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہماری
مدد اور رہنمائی فرمائے اور ہمارے غور و فکر کے نتائج کو
شرف قبولیت بخشے آمین ثم آمین

محترمہ بیگم مریم فاروقی صاحبہ صدر مجلس استقبالیہ
کا مندرجہ بالا خطبہ بہت پسند کیا گیا اور متعدد بار حاضرین نے
تالیاں بجائیں۔ خطبۂ مذکور کے خاتمہ کے بعد جنابہ لیڈی
غلام حسین ہدایت اللہ صاحبہ صدر اجلاس شعبۂ نسواں
نے درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

خطبۂ صدارت لیڈی غلام حسین ہدایت اللہ صاحبہ

معزز بہنو! اور بیٹیو!
میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ

نسوں کے ذمہ داروں کی انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔

تاریخی واقعات کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو ہم ایک عظیم تہذیب کے علمبردار اور ایک شاندار ثقافت کے وارث ہیں، ہمارے تہذیبی و ثقافتی کارناموں سے تاریخ کا ہر دور روشن و تابناک ہے۔ دوسری طرف تعمیر و ترقی کے میدان میں دیکھئے تو ہمعصر ترقی یافتہ قوموں میں بہت ہی پسماندہ ہیں، ماضی وہ ——— اور حال یہ۔ رہا مستقبل تو وہ بڑی حد تک غیر متعین اور غیر واضح ہے۔

جب تک ہم دوسروں کے محکوم و دست نگر تھے، ابنائے ملک سے ہر شعبۂ زندگی میں مسابقہ تھا اور ہمارے سامنے کوئی راستہ اور کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا ترقی کی راہیں محدود و مسدود تھیں۔ مگر سرسید علیہ الرحمۃ اور ان کے ساتھیوں اور جانشینوں نے مجبوری و محکومی کے ماحول میں وہ کارنامہ انجام دیا جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ حکام دشمن اور بدگمان قوم کے چھوٹے بڑے عزت و وقعت سے محروم، خوف و احساس کمتری کے شکار، علم و دولت سے تہی دامن، صنعت و حرفت اور تجارت میں کورے، حال سے مایوس اور مستقبل سے پریشان گویا زندگی کی کوئی کل اور کوئی پہلو درست نہ تھا لیکن سرسید نے ان کے نظم و شیرازہ بندی اور تعمیر و ترقی کے لئے زندگی کی راحت و آرام کو تج کر وہ کام کیا کہ کایا پلٹ گئی

انہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، توسیع تعلیم کا پروگرام بنایا، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنا ڈالی اور ان تدبیروں سے ترقی و تعمیر کی ایسی فضا ہموار کی کہ مسلمان اس پر چل کر ایک قوم بنے ان میں حرکت و بیداری پیدا ہوئی اور بیدار و متحد ہو کر انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک خوددار قوم کر سکتی ہے دولت خداداد پاکستان اسی بیداری اتحاد اور خودداری کا کرشمہ ہے۔

آج خدا کے فضل سے ہم آزاد و خود مختار ہیں۔ اپنے تمام معاملات کے انصرام کے خود مختار ہیں۔ ملک ماشاء اللہ ترقی کے راستے پر گامزن ہے لیکن اس آزادی و ترقی کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف ہر شخص کو افسوس کے ساتھ کرنا پڑتا ہے کہ سات سال کے بعد تعلیمی میدان میں ہمارا مقام آج بھی کم و بیش وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ پاکستان بننے کے بعد اسکولوں اور کالجوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ سرکاری و غیر سرکاری طور پر تعلیم کے معاملہ کو کچھ نہ کچھ آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی گئی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظریہ و مقصد اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوا۔

تعلیم ملک کے حفظ و دفاع کے بعد قومی زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے۔ قوم و ملک کی ساری ترقیوں کا مدار تعلیم اور صرف تعلیم پر ہوتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں وہ سب سے زیادہ غفلت و بے توجہی کا شکار رہا ہے۔

اگرچہ کہا بہت کچھ جاتا ہے، اسکیمیں بہت سی بنتی ہیں

تعلیم و صحت اور تحقیقات کا غلغلہ بہت کچھ بلند ہوتا ہے رپورٹیں اور منصوبے بہت سے مرتب ہوتے ہیں لیکن عمل کی نوبت نہیں آتی۔ سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہمارے یہاں خواندگی کا تناسب صرف ۱۳ فی صد ہے

یعنی آٹھ کروڑ کی آبادی میں صرف ایک کروڑ دس لاکھ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ ان میں عورتوں کی خواندگی کا تناسب اور بھی کم ہے یعنی اگر مرد خواندہ چھ ہیں تو عورت صرف ایک ہی ہے۔

یہ صورتِ حال افسوسناک ہی نہیں انتہائی تشویشناک ہے۔ تعلیم کی توسیع اس کے نظام کی درستی اور صحیح مقصد و منشا کے تعین کے بغیر آپ یہ کیسے توقع کر سکتی ہیں کہ قوم صحیح معنی میں ترقی کر سکتی ہے۔

کولمبو پلان کے شش سالہ منصوبہ ترقی کے ماتحت حکومت پاکستان نے ایک پنجسالہ تعلیمی پروگرام بنایا تھا اور یہ توقع دلائی گئی تھی کہ بیس سال کے عرصہ میں سارے ملک میں مفت جبری تعلیم جاری ہو جائے گی اور اس طرح اس ہولناک جہالت کا خاتمہ ہو جائیگا بعد کو یہ پروگرام ترک کر دیا گیا اور اب ایک پلاننگ بورڈ کے ماتحت ہمہ جہتی ترقیاتی اسکیموں کے ساتھ توسیع و ترقیِ تعلیم کا بھی کوئی پروگرام بن رہا ہے جو ہنوز منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔

جہاں تک موجودہ تعلیمی نظام اور اسکولوں اور کالجوں کی تعداد کا تعلق ہے میں ابھی عرض کر چکی ہوں کہ اس کے اعتبار سے متحدہ بھارت کی نسبت صورتِ حال بہر حال بہتر ہے لیکن مقصد و نگرانی کا معاملہ بہت زیادہ اصلاح طلب ہے۔ تعلیم کا منشا یہ نہیں ہے کہ مجرد نوشت و خواند کا فن سکھا دیا جائے یا کلرک پیدا کئے جائیں بلکہ یہ ہے کہ ہماری قومی و ملی خصوصیات اور ثقافتی روایات زندہ رہیں اور آنے والی نسلوں کو منتقل و متوارث ہوتی چلی جائیں۔ ہر لڑکی اور لڑکے کے ذاتی جوہر نمایاں ہوں اور اسے اپنی شخصیت کے اظہار کا پورا پورا موقع ملے۔

لیکن یہاں جو کچھ ہے وہ مٹی کے گھروندے اور دہ انگریز دورِ محکومی کا ایک ورثہ ہے جوں کا توں قائم و برقرار رکھا جا رہا ہے۔ اس میں نہ لڑکوں کی ترقی و بہتری کا کوئی نظم ہے نہ لڑکیوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا۔ جو نصاب اور طریقِ تعلیم لڑکوں کے لئے ہے وہی قریب قریب لڑکیوں کے لئے ہے۔ حالانکہ کوئی سمجھدار انسان بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بالکل علیحدہ اور ایک مستقل مسئلہ ہے اور اس پر ان کی صنفی ضروریات و مقتضیات کے مطابق غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ہماری قومی روایات کا اقتضاء یہ ہے کہ تعلیم کے ہر مرحلہ پر لڑکیوں کی تعلیم کا معقول انتظام علیحدہ ہو مگر موجودہ نظام میں اول تو ان کی تعداد بہت کم ہے پھر بعض مقامات پر لڑکیوں اور لڑکوں کو ساتھ ساتھ تعلیم دی جاتی ہے حالانکہ مخلوط تعلیم اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً غلط ہے اور اس سے انسانی وقار کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ موجودہ مدارس کی تعداد اور لڑکیوں کی آبادی کو دیکھئے تو زمین و آسمان

ترجیح اس لیے دیتی ہوں کہ ابھی تک لڑکوں کے
مقابلے میں لڑکیوں کی تعلیم پر نصف بھی توجہ نہیں۔ حالانکہ
یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی قوم اور بالخصوص اس
زمانے کی کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی
جب تک لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی پوری
پوری توجہ نہ دی جائے۔ پاکستان کو اگر ترقی کی شاہراہ
پر گامزن ہو کر متمدن قوموں کی ہمدوشی حاصل کرنا ہے
تو اسے لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔

جہاں تک نظام تعلیم کی درستی کا تعلق ہے
میں اس میں مذہبی رنگ کی شمولیت بہت ضروری
سمجھتی ہوں اور ابتدائی سے اعلیٰ درجوں تک ہر
مرحلے میں اسلام کے تعلیمی اصولوں کو اساس و بنیاد کی
حیثیت سے شامل دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ ہماری بچیاں
عام تعلیم کے ساتھ اپنے حقوق و فرائض سے واقف
ہو سکیں، اسلام کی اخلاقی قدروں کو پہچانیں، اپنے سامنے
امہات المومنین اور صحابیات کی سیرت کا معیار رکھیں
اور اسلامی معاشرت کی خصوصیات کو غیر اسلامی معاشرت
کے نقائص سے پاک رکھ سکیں۔

مگر اس سے یہ نہ سمجھئے کہ میں تعلیم، معاشرت یا
اقتصادی معیشت کے جدید تقاضوں کی تکمیل کو کچھ کم اہم
سمجھتی ہوں۔ ہمیں بلاشبہ ڈاکٹروں، طبیباؤں،
نرسوں، سائنس دانوں، قانون دانوں اور سوشل ورکروں
کی ضرورت ہے مگر ایسی ڈاکٹروں اور ایسی طبیباؤں اور
سوشل ورکروں کی جو زندگی کے اعلیٰ مقصد اور اسلامی
نظریہ سے آگاہ ہوں۔ مذہب کے اصول و احکام سے
واقف ہوں اور علم و بصیرت کے ساتھ [illegible]
کی ذہانت اور صلاحیت رکھتی ہوں تاکہ خاندان [illegible]
اور ملک سب کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں اور
ان کی گود میں جو نسل پرورش پائے وہ اخلاق و کردار
کے اعتبار سے اعلیٰ اور فائق درجہ پر فائز ہو۔

(۲) اصلاح نصاب و درسیات کا معاملہ تو موجودہ
نصاب اور طریق تعلیم کے نقائص اتنے واضح ہیں کہ
یہاں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی
مختصر بات یہ ہے کہ اس میں نہ فکر و نظر میں کوئی وسعت
پیدا ہونے کا سامان ہے نہ جدت و اختراع کی
صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا کوئی وسیلہ۔ امتحان کے
لئے بس رٹ لینا کافی ہے یہی ڈھرہ لڑکوں کے لیے ہے
حالانکہ یہ ڈھرہ اگر قائم بھی ہے تب بھی لڑکیوں کی تعلیم
ان کی ذہنی و جسمانی ساخت کے فرق کے مطابق دوسرے
نہج پر ہونی چاہیئے تاکہ وہ اپنے مراحل زندگی کامیابی
کے ساتھ طے کر سکیں۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے
کہ وہ با شعور و سلیقہ شعار اور صحت مند مائیں بنیں تاکہ
آنے والی نسل کی صحیح تربیت کر سکیں اور ان کی وجہ سے
قوم اپنی ملی خصوصیات و روایات کی حامل رہے۔ ہمارے
یہاں دوسری خرابیوں اور کوتاہیوں کے علاوہ ایک بڑی
خرابی یہی ہے کہ بچوں کی مائیں جاہل ہیں اور اس کے نتائج
قوم اور افراد کے اخلاق و کردار پر نہایت مضر
اثرات ڈال رہے ہیں۔ صحیح اور صحت مند تربیت کے لیے
گھر اور اسکول دونوں کی ہم آہنگی [illegible] ضروری ہے۔
لڑکیوں کی تعلیم کا [illegible] کے مطابق

ان کی ... تعلیم کے مستحق ہیں کہ انہیں دوسرے
مروجہ مضامین کے علاوہ ڈومیسٹک سائنس، سوشل
سروس، گھریلو صنعتیں اور صحت وصفائی کی خصوصیت
سے تعلیم دی جائے۔ لیکن اس وقت سارے پاکستان
میں کہیں بھی اس کا پورا پورا انتظام نہیں۔ جہاں
لڑکوں کے ۱۴۰ کالجوں کے مقابلہ میں سارے ملک کے
اندر لڑکیوں کے کالجوں کی تعداد بیس ہے وہاں ڈومیسٹک
سائنس کے کالج نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مثلاً مغربی پاکستان
کے صوبہ میں صرف ایک ڈومیسٹک سائنس کالج لاہور
میں ہے جس میں صرف پچاس طالبات کے ڈپلومہ حاصل
کرنے کا انتظام ہے۔ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ ٹریننگ
کالج ہی میں لڑکیوں کو ڈومیسٹک سائنس کی تعلیم دی جاتی
ہے کوئی علیحدہ ادارہ نہیں ہے۔ تیسرا کالج کراچی میں قیام
واجراء کے ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے۔ سوشل سروس کی
تعلیم کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے مطالبوں
اور تقاضوں کی کچھ کمی نہیں ہے لیکن حکومت نے انہیں
حیلوں حوالوں سے ٹالتے رہنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا
ہے۔ اور جب دیکھتی ہے کہ زور زیادہ دیا جا رہا ہے
تو اقتصادی کمزوری اور دفاعی انتظامات کے مصارف
کی گراں باری کا عذر کرنے لگتی ہے۔ حالانکہ اگر حقیقت
کی نظر سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی عذر بھی ایسا نہیں
جسے اصلاح تعلیم اور ترقی تعلیم کے مطالبہ کو پس پشت
ڈالنے کے لئے پیش کیا جا سکے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے
کہ دفاع کی اہمیت اولین ہے تو دوسرے شعبوں پر تو
اسے فوقیت ملنی چاہیئے۔ چونکہ پڑھی لکھی بہنوں کی
سے اقتصادی وفوجی امداد کے معاہدوں کے بعد اس
کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے۔ کیا اب بھی اسے آئی
پیش کیا جا سکتا ہے اور کیا اب بھی تعلیم کی اصلاح
ترقی کے کام کو ملتوی رکھنے کا کوئی جواز دکھوٹا

اب مختصراً والدین اور سرپرستوں کی خدمت
میں بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ ہمارے
لڑکیوں کی تعلیم کی طرف عموماً مالی کمزوری کی وجہ
کم توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن جہاں ایک طرف مالی کمزوری
کا عذر اپنی جگہ صحیح ہے وہاں دوسری طرف یہ بھی
کہ اس زمانہ میں بھی فضول خرچی کی بہت سی رسمیں اور
سی مدیں جاری ہیں۔ اگر یہ رسمیں ختم کر دی جائیں
وجہیز کی فراہمی کو مقدم سمجھنے کے بجائے مسلمان بھائی
بہنیں بچیوں کی تعلیم کے لئے شروع ہی سے کچھ بچا
کرنے کا طریقہ اختیار کریں اور سوجھ بوجھ رکھنے
ان کی تعلیم کا بیمہ کرا لیا کریں تو اس سے نہ صرف
کی زندگیاں سنور سکتی ہیں، نہ صرف یہ کہ اپنے خاندان
کے لائق فخر بن سکتی ہیں بلکہ والدین کو شادی کے
کے خرخشوں سے بھی نجات دلا سکتی ہیں۔

اسی طرح اہل ثروت اور مخیر حضرات کا فرض
کہ وہ قوم کی بچیوں کی تعلیم کو اہم ترین مسئلہ سمجھیں
نادار و غیر مستطیع طالبات کی امداد کرنے اور ان
وظیفے مقرر کرنے کے علاوہ انہیں چاہیے کہ تو
کے پروگرام بنا کر ان پر نظم و باقاعدگی سے عمل
حتی الوسع اس بات کی کوشش کریں کہ لڑکیوں

میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ اس سے دنیا میں بھی بہتری و سرخروئی حاصل ہوگی اور عقبیٰ میں بھی انشاءاللہ تعالیٰ۔

آخر میں میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے عہدیداروں اور کارکنوں کے جذبۂ خدمت و عمل اور اس کے شعبۂ نسواں کی کارپرداز و ذمہ دار خواتین کی سعی و جہد کی ستائش کئے بغیر نہیں رہ سکتی جنہوں نے ناساعد حالات اور سخت مشکلات کے زمانہ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی سنت ایثار و بے نفسی پر عمل کرکے ان کے نام پر کراچی میں ایک اعلیٰ درجہ کا گرلز کالج قایم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سعی و جہد اور اخلاص مندی کو اتنی جلد مقبول فرمایا کہ ایک طرف جہاں ارباب نظر اور اصحاب خیر نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہاں دوسری طرف کراچی یونیورسٹی نے اسے ریکگنائز کر لیا مرکزی حکومت اور کراچی کارپوریشن نے سالانہ گرانٹ دینے کا اعلان کیا اور ریاست خیر پور نے پانچ ہزار روپیہ کا عطیۂ خصوصی عنایت کیا۔ کراچی کا یہ سرسید گرلز کالج ایسا ہی ہے جیسا علی گڑھ کا ایم۔ اے۔ او کالج اور مسلم گرلز کالج۔ اللہ تعالیٰ اسے دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور عام تعلیم گاہوں کی روش عام سے ہٹ کر اسے صحیح اصولوں اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے اور لڑکیوں کی سیرت و اخلاق کے سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

میں امید کرتی ہوں کہ کالج اپنے قائم کردہ سرسید گرلز کالج کی تعلیم و تربیت کے ان تمام نقائص سے پاک رکھے گی جن کا میں نے [illegible] ذکر کیا اور ان تمام اصلاحات سے کام لے گی اور ان مفید مشوروں پر عمل کرے گی جن پر وہ دوسرے تعلیمی اداروں میں عملدرآمد کرنا چاہتی ہے۔

ان معروضات کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے مخلص خدمت گزاروں اور شعبۂ [illegible] فرض شناس بہنوں کے اعمال نیک کی جزا [illegible] دے اور ہمیں ان کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین [illegible] آمین۔

لیڈی ہدایت اللہ صاحبہ کا مندرجہ بالا خطبۂ صدارت تیس منٹ میں ختم ہوا اور نہایت غور و توجہ سے سنا گیا۔

خطبہ ختم ہونے کے بعد فدائے ملت محترمہ بیگم حفیظ صاحبہ سکریٹری شعبۂ نسواں نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھی۔

سالانہ رپورٹ بیگم حفیظ صاحبہ سکریٹری شعبۂ نسواں

صدر محترمہ!

و

معزز خواتین!

شعبۂ نسواں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جو کہ ملک میں تعلیم نسواں کے مسائل پر ۱۹۱۳ء سے عملی جد و جہد میں مصروف ہے ۱۹۵۳ء کے اجلاس عام کی جو تجاویز زیر صدارت بیگم فضل الرحمٰن صاحبہ منظور کرائی تھیں وہ متعلقہ محکموں کو روانہ کی گئیں اور جاری

کانفرنس کی اکثر قراردادیں بھی وصول ہوئے اور بیشتر تجاویز پر عملدرآمد بھی کیا گیا۔ اس طرح خواتین کو اپنے تعلیمی مسائل پر غور کرنے اور سوچنے کے لئے ایک پلیٹ فارم مل گیا۔ ۱۹۵۳ء کے اجلاس کے بعد جن خواتین نے اجلاس کے سلسلہ میں کانفرنس کا ہاتھ بٹایا ان کی کارکنان کانفرنس نے حوصلہ افزائی کی بالخصوص شیدائے علم جناب سید الطاف علی بریلوی صاحب کی قدر افزائی نے خواتین کو کانفرنس سے مستقل طور پر منسلک کر دیا جسکے نتیجہ میں ہمارا ۱۹۵۵ء کا اجلاس بھی بہت شاندار رہا جس کی صدارت ملک کی مایۂ ناز کہنہ مشق قابل خاتون جناب بیگم شاہنواز صاحبہ نے کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں زرّیں خیالات کی گہرباری کی اور ہمارے دامن تجسس کو اپنے قیمتی مشوروں سے بہرہ ور کیا۔ اس اجلاس کے موقع پر لاہور کی نمائندگان میں بیگم فاطمہ صاحبہ۔ سلمہ تصدق حسین صاحبہ۔ اور بیگم خان عبدالقیوم خان صاحبہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس اجلاس میں بھی جو تجاویز پیش ہوئیں وہ بالاتفاق آرا منظور ہوئیں اور متعلقہ محکموں کو ارسال کی گئیں۔

اجلاس کے بعد غیر رسمی طریقہ پر شعبہ نے ممبرسازی وغیرہ کا کام بھی شروع کر دیا یہاں تک کہ ۲ جولائی ۱۹۵۶ء کی وہ یادگار ساعت آپہونچی جبکہ کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے میٹرک کے بعد لڑکیوں کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے جذبہ کو محسوس کرتے ہوئے اور مقامی کالجوں میں جگہوں کی کمی کے باعث داخلہ نہ ملنے کی دقتوں کا اندازہ کرکے اپنے زیر نگرانی کے تحت ایک کالج سید ہ علیہ الرحمۃ کی یادگار میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت بحیثیت نمائندہ شعبۂ خواتین محترمہ جناب بیگم صدیقی۔ بیگم راحیل شیروانیہ۔ بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحبہ۔ بیگم ڈاکٹر الٰہی علوی صاحبہ اور خاکسارہ موجود تھیں۔ تجویز کی منظوری کے بعد ابتدائی انتظام کیلئے ایک ایڈہاک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اور خاکسارہ کو کنوینر مقرر کیا گیا۔ میں نے بعد شکریہ محترمہ راحیل بیگم صاحبہ کا نام پیش کیا جس کی تائید ہماری سب بہنوں نے کی اور طے پایا کہ کالج کے لئے عمارت اور فنڈ وغیرہ کی فراہمی کے لئے فوری جد و جہد کی جائے۔ ایڈہاک کمیٹی کی اراکین مندرجہ ذیل خواتین مقرر ہوئیں محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ۔ محترمہ بیگم خان عبدالقیوم خان صاحبہ محترمہ بیگم شعیب قریشی صاحبہ۔ محترمہ بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ۔ محترمہ راحیل بیگم شیروانیہ صاحبہ۔ بیگم حسن علی عبدالرحمٰن صاحبہ۔ محترمہ بیگم الٰہی علوی صاحبہ محترمہ بیگم عبدالغنی صاحبہ۔ محترمہ بیگم الطاف علی بریلوی صاحبہ۔ بیگم تزئین فریدی صاحبہ۔ بیگم ڈاکٹر عبداللہ صاحبہ۔ بیگم اختر حسین صاحبہ۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب۔ عظیم الدین خانصاحب اور جناب سید الطاف علی بریلوی صاحب۔

اس ایڈہاک کمیٹی کی تجاویز پر فوری عمل درآمد ہوئی اور ابتدائی مراحل پر عبور حاصل ہونے کے بعد ۲۴ جولائی سے ہمارے سرسید گرلز کالج کا ... سیدہ منزل ناظم آباد ... میں تعلیم کا آغاز ہوگیا۔ خوش قسمتی سے پرنسپل بیگم شاہانی صاحبہ ...

بھی نہایت قابل اور مخلص ہیں۔ اور خدائے قدیر کا ہزار بار شکر ہے کہ ہمارے دوش نازک پر جو اہم تعلیمی خدمت رکھی گئی وہ بہ احسن الوجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ہم نے اپنے کو پر افتخار اور سر بلند پایا۔ کالج کی فیس بہت ہی قلیل یعنی حسب ضابطہ محکمہ تعلیم مقرر کی اور حسب قاعدہ کالج کے معاملات پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک گورننگ باڈی بھی ترتیب پا گئی۔ اس موقع پر مردانہ کانفرنس ورکنگ کمیٹی نے پھر بحیثیت سکریٹری کے خاکسار کا نام تجویز کیا۔ اور کچھ دنوں یہ گرانقدر خدمت مجھے انجام بھی دینا پڑی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد دوسری قومی مصروفیات کے باعث میں نے محترمہ بیگم اختر حسین صاحبہ کا نام تجویز کیا جو ایک قابل خاتون ہیں۔ انہوں نے اس خدمت کو بہت ہمدردی سے انجام دیا۔ ہمیں اس بات سے بھی بڑی مسرت ہوئی کہ ہم سب کے اصرار پر محترمہ بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ نے جو کہ ایک صلح کل فہم و فراست میں غیر معمولی حیثیت کی مالک ہیں کالج کی گورننگ باڈی کی صدارت قبول فرمالی۔ ابتدائی دور کالج کے انتظامی اور تعلیمی امور میں جس قدر حوصلہ افزا تھا اتنا ہی مالی لحاظ سے کمیٹی کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ دور ایک سخت امتحان کا تھا۔ لیکن اس تمام جد و جہد میں صرف ایک ہی بات جو ہماری حوصلہ افزائی کرتی تھی وہ ہماری مہربان بیگم صدیقی کا جذبۂ اخلاص اور اولو العزمی کا تصور تھا آخرش ہمارے ادارہ میں معقول تعلیمی سہولتوں کو مانتے ہوئے کراچی یونیورسٹی نے کالج کو ملحق کر لیا۔ اور ممبر خواتین و حضرات کے علاوہ اور حکومت کی گرانقدر مالی امداد نے کالج چلانے میں اطمینانی لمحات عطا کئے۔ لیکن کام کرنے والوں کو اطمینان بھی نصیب ہوا ہے؟ کسی کا مقولہ ہے "عمل ہی حیات ہے اور سکون موت ہے" اب ہم اس فکر میں ہیں کہ ہمارے کالج کی اپنی عمارت بن جائے اور ہم سائنس کی کلاسیں کھول دیں۔ امید ہے کہ خدا ہماری مدد کرے گا اور اس میں ہمیں کامیابی نصیب ہوگی۔

سال گزشتہ مورخہ ۴ مارچ کو ہمارے شعبہ کا الکشن ہوا اور منتخب شدہ عہدہ داران و ارکان کی کا ورکنگ کمیٹی نے اپنے جلسہ منعقدہ ۲۴ جون ۱۹۵۵ء میں بجنسہ توثیق کر دی۔ اور اس وقت سے شعبہ نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

اس موقع پر ہماری خوش قسمتی تھی کہ سندھ کی معروف گراں مایہ اور مخلص ہستی محترمہ لیڈی غلام حسین نے شعبہ کی صدارت منظور فرمائی اور آپ کی قیادت میں ہمارے شعبہ کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔

۴ اپریل ۱۹۵۵ء کو شعبہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی بعد ازاں ۸ جولائی ۱۹۵۵ء میٹنگ منعقد ہوئی جس میں طے پایا کا دستور العمل مرتب کیا جائے تاکہ کام میں ترقی ہو۔ ۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو تیسری میٹنگ میں شعبہ کے ضوابط مردانہ کمیٹی کے مشورہ اور ان کے دستور کی روشنی میں مرتب و منظور ہوئے اور مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۵۶ء کے جلسہ میں طے پایا کہ مردانہ کانفرنس کے اجلاس کے

نسواں کا اجلاس بھی منعقد کیا جائے اور سال گذشتہ کی طرح مجلس استقبالیہ تشکیل کی گئی۔ صدر اجلاس محترمہ لیڈی ہدایت اللہ صاحبہ اور صدر استقبالیہ بیگم مریم فاروقی صاحبہ مقرر ہوئیں۔ یہ شعبہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ملک کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کا تعاون اور رہنمائی حاصل ہے۔

اور اراکین استقبالیہ کے قابلانہ تعاون سے اس سال بھی شعبہ کی جانب سے آپ کے سامنے بہترین تجاویز جن کا ملک میں تعلیم نسواں کی ترقی اور ضروریات سے خاص تعلق ہے۔ ہماری محترم اور قابل بہنیں پیش کریں گی۔

میری اس مختصر رپورٹ نے آپ پر یہ بات واضح کر دی ہوگی کہ شعبۂ نسواں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ملک میں بے غرض مخلصانہ، ان تھک اور شاندار خدمت انجام دے رہا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ کیا آپ کا یہ فرض نہیں کہ آپ بھی ہمارے شعبہ کی ممبر بن کر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

میں اپنے شعبہ کی تمام عہدہ داران ممبرات اور مجلس استقبالیہ کی صدر و اراکین کی مشکور ہوں کہ ان کے تعاون سے ہم اپنے منصوبہ کو ترقی کی منازل پر پہنچا سکے۔ علاوہ ازیں ہم کانفرنس کے جملہ اراکین کے بھی مشکور ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہمارے ساتھ تعاون کیا بلکہ ہماری ہر وقت حوصلہ افزائی کی۔

شعبۂ نسواں کے سامنے ایک سکول کے قیام کا منصوبہ بھی ہے اور تعلیم بالغان کی مہم کو باقاعدہ چلانے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کاموں میں بھی آپ پہلے کی طرح بدرجہ اتم تعاون سے ہمیں سرفراز [فرمائیں گی]۔

فرمائیں گی۔

آخر میں چند کلمے پیش ہونے والی تجاویز کے بارے میں مجھے عرض کرنے ہیں۔ آج جو تجاویز آپ پاس کریں گی اُن کا بیشتر تعلق جمہوریہ کے باشندگان اور خصوصاً نسواں کی فلاح و بہبود سے ہے۔ آج ہمیں اس بات پر بجا طور پر فخر و ناز ہے کہ ہم اپنا یہ اجلاس جمہوریہ اسلامیہ کے بعد منا رہے ہیں۔ ہمارا ہر شہری آزاد ہے اور اس کی اپنی رائے بڑی وقعت کی مالک ہے۔

کانفرنس کے مردانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب نے ملک کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں جن بیش بہا خیالات اور تجاویز کا اظہار فرمایا ہے وہ واقعی بے حد قابل ستائش ہیں۔ اور اگر ان پر عمل پیرا ہو جائے تو یقیناً ہمارے ملک سے جہالت کا دور بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ خصوصاً اسلامی رجحانات پیدا کئے جانے کے بارے میں آپ کے زرّیں خیالات قابل قبول ہیں۔ ہم جناب حلیم صاحب کی اس رہنمائی کے مشکور ہیں اور انشاءاللہ ہم اپنے شعبۂ نسواں میں بھی ان کے تعلیمی منصوبے بہت جلد رائج کرنے کی کوشش کریں گے۔

آزاد جمہوریہ اسلامیہ کے قیام اور دستور کی ترتیب و تکمیل نے ہماری مملکت کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔ اب ہمارے ہر شہری باشندے کا فرض ہے کہ وہ اپنے قول و کردار کو اپنی جمہوریہ کے شایانِ شان بنائے۔ اور حقیقی اسوۂ حسنہ اور حقیقی تعلیم قرآنی و اسلامی کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائے۔ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک سے جہالت دور ہو اور تعلیم عام ہو۔

جہالت دور کرنا ہو جہاں سے نقش انسانی
اٹھو اے خوابیدہ مسلم عام کر تعلیم قرآنی
کہ جس تعلیم نے انساں کی تقدیریں بنا ڈالیں
عمل اور جہد پیہم اور وہی تعلیم ایمانی

سکریٹری صاحبہ کی یہ رپورٹ جو بڑے ولولہ سے پڑھی گئی نہایت جوش کے ساتھ سنی گئی۔ بار بار تالیاں بجیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔

خاتمۂ رپورٹ پر بیگم اختر حسین صاحبہ۔ بیگم حفیظ [illegible] مسز ماجدہ بیگم صاحبہ۔ بیگم ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب۔ بیگم فیاض علی صاحبہ۔ بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ۔ بیگم ڈاکٹر آئی۔ آر۔ خان صاحبہ۔ مسز مریم فاروقی صاحبہ۔ مسز صفیہ خان صاحبہ۔ بیگم اقبال حسین صاحبہ۔ مسز احمد صاحبہ بیگم عبدالغنی صاحبہ۔ بیگم شاکرہ کریم الدین صاحبہ۔ بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحبہ۔ بیگم سلطانہ یوسف صاحبہ۔ بیگم عبدالرسول صاحبہ۔ بیگم ڈاکٹر الہٰی علوی صاحبہ۔ مسز انجینیر صاحبہ۔ پروفیسر حسن باقر قزلباش صاحبہ۔ پروفیسر آمنہ مینائی صاحبہ اور بیگم ڈاکٹر وجیہ الدین صاحبہ نے شعبۂ خواتین کے مختلف رزولیوشنوں کی تحریک و تائید کی اور ان پر نہایت معلومات افزا اور پُر اثر تقاریر کیں۔ ذیل میں ان رزولیوشنوں کا خلاصہ مرتبہ جناب پروفیسر ڈاکٹر علاء الرحمن خان صاحب پیش کیا جاتا ہے اس خلاصہ میں ان تجاویز کو درج نہیں کیا گیا ہے جو کانفرنس کے شعبۂ تعلیمی میں بیگم ڈاکٹر زینب عبداللہ صاحبہ و دیگر صاحبان پیش کر چکے تھے اور جو منظور ہو چکی تھیں۔

تجاویز منظور کردہ شعبۂ خواتین

(۱) یہ کانفرنس حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ لڑکیوں کے لئے صنعتی مرکز ملک کے مختلف حصوں میں قائم کئے جائیں جہاں تعلیم یافتہ لڑکیوں کو مفید اور کارآمد ہنر اور دستکاری سکھانے کا انتظام ہو۔

(۲) قرار پایا کہ استانیوں کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں موزوں رہائش گاہوں کا انتظام کیا جائے۔

(۳) قرار پایا کہ محکمہ تعلیم ملک کے تمام مدارس کیلئے مناسب حفظانِ صحت طبی معائنہ کا انتظام کرے۔

(۴) قرار پایا کہ مرکزی ٹریننگ کالج میں کم از کم ۵۰ فیصدی جگہیں خواتین امیدواروں کے لئے مخصوص کی جائیں۔

(۵) قرار پایا کہ ٹریننگ کے اداروں میں خواتین کے لئے رہائش کا انتظام کیا جائے۔

(۶) یہ کانفرنس حکومت سے استدعا کرتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کو لانے اور لے جانے کے لئے موزوں سواری کا انتظام کیا جائے۔

رزولیوشنوں کی منظوری کے بعد بیگم سید الطاف علی بریلوی کا تعلیمی موضوع پر ایک مقالہ ہونے والا تھا لیکن وہ بوجہ علالت جلسہ میں تشریف نہ لا سکیں۔

آخر میں محترمہ بیگم شہاب الدین صدیقی صاحبہ عارضی پریسیڈنٹ شعبۂ خواتین نے صدر مجلس، شعبہ داران، ارکان مجلس استقبالیہ [illegible] شرکائے جلسہ

[illegible] گیا۔ جس میں صاحبان نے تقریر کی [illegible]
[illegible] اور [illegible] پر مشتمل تھی۔

قریب چھ بجے شام نہایت جوش و مسرت کی فضا میں شعبۂ نسواں کا اجلاس ختم ہوا۔

آخری اجلاس عام

[illegible] اپریل کو ۶ بجے شام کانفرنس کا آخری اجلاس زیرِ صدارت جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی منعقد ہوا۔ سب سے پہلے تلاوتِ کلام پاک ہوئی۔ اس کے بعد مسٹر محمد عظیم الدین خان ایم۔ اے سکریٹری شعبۂ تعلیمی نے باجازت صدر اپنے شعبے کے نیز دوسرے شعبوں کے ریزولیوشن بغرض توثیق ایک ایک کرکے پڑھ کر سنائے۔ صاحبِ صدر نے ہر ایک ریزولیوشن کے پڑھے جانے کے بعد جلسہ کی رائے طلب کی اور چار ریزولیوشن بالاتفاق منظور ہوئے۔

شعبۂ نسواں کے ایک ریزولیوشن کی اس کی محرک پروفیسر حسن بانو قزلباش ایم۔ اے سے وضاحت چاہی گئی۔ موصوفہ نے دلائل سے اپنے نقطۂ نظر کی حسبِ دلخواہ توضیح کی اور یہ ریزولیوشن بھی صاحبِ صدر کی مجوزہ اصلاح کے بعد بالاتفاق منظور ہوگیا۔

ریزولیوشن کی منظوری کے بعد اسلامی نظریہ و [illegible] کے عنوان پر ایک اہم مذاکرہ ہوا۔ صدر محترم نے [illegible] کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے [illegible] کی کہ ہر ایک مقرر کا تعارف

سے پہلے تعارف کرا دیا جائے چنانچہ شرکائے مذاکرہ:

(۱) حضرت علامہ ابن حسن صاحب جارچوی
(۲) ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری ایم۔ ایس۔ سی، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ ایس۔ سی، ڈین آف دی فیکلٹی آف سائنس کراچی یونیورسٹی اور
(۳) مولوی عبدالصمد صاحب سکری

کا تعارف کرایا گیا۔ اس مذاکرہ میں حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی بھی شرکت کرنے والے تھے، لیکن جب آپ کو یہ علم ہوا کہ کانفرنس کے جلسوں میں عورتیں بھی شریک ہوتی ہیں تو آپ نے تشریف لانے سے احتراز فرمایا۔

سید الطاف علی بریلوی نے حضرت علامہ ابن حسن جارچوی صاحب کے متعلق بتایا کہ آپ ہمارے ملک کے نہایت ممتاز عالموں میں سے ہیں۔ حد درجہ متوکلانہ اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ [illegible] کے تمام مشاغل علمی اور قومی ہیں۔ آپ علی گڑھ کے ایک نامور اولڈ بوائے ہیں اور شیعہ کالج لکھنؤ کے کامیاب پرنسپل رہ چکے ہیں۔ جناب راجہ امیر احمد خاں رئیس محمود آباد کے عرصہ دراز تک رفیقِ خاص رہے ہیں۔ راجہ صاحب موصوف میں قوم و ملک کی خدمت گزاری کا جو بے پناہ جذبہ نیز جیسی صالح اور سادہ زندگی ایک امیر کبیر ہونے کے باوجود بسر کرتے ہیں وہ علامہ جارچوی کی صحبت کا ہی نتیجہ ہے۔ ہمارے لئے باعثِ [illegible] ہے کہ [illegible] جس [illegible] اس وقت آپ کی [illegible] ہو گا۔

تقریر علامہ ابن حسن جارچوی

علامہ نے فرمایا کہ اسلامی نظریہ و نظامِ تعلیم کا موضوع بہت وسیع ہے آج صرف یہ بتانا ہے کہ خداوند عزوجل نے سورۃ جمعہ میں رسولؐ کی آمد کے سلسلے کے متعلق اطلاع دی۔ اور بتایا ہے کہ خالق کی طرف سے تعلیم کا منشا کیا ہے اور طریقۂ تعلیم کیا ہے؟ عرب کے ان پڑھ لوگوں پر اللہ جل شانہٗ نے آنحضرت صلعم کو معلم مقرر کیا جو انہیں میں سے تھے"۔ اس میں واضح ہو جاتا ہے کہ تعلیم اُسی زبان میں دی جانی چاہئے جو تعلیم پانے والوں کی مادری زبان ہے اور معلم بھی انہیں لوگوں میں سے ہونا چاہئے جن کی تعلیم مقصود ہے۔ غیر مسلم استادوں سے پڑھ کر مسلم طالب علم یقیناً اپنی خصوصیتوں سے محروم ہو جاتا ہے غیر قوموں میں مذہب کی کمی اسی وجہ سے ہے کہ ان کے معلم پابند اپنی قوم سے نہ تھے۔ ہمارے نظامِ تعلیم کی پہلی شرط یہ ہونی چاہئے کہ اس کے بنانے والے اسلامی تخیل رکھتے ہوں۔ اسلام فطری مذہب ہے ہماری تعلیم فطری اصول پر ہونی چاہئے تاکہ ہماری فطری صلاحیتیں اُبھر سکیں تعلیم کے علاوہ تزکیۂ نفس کی بھی ضرورت ہے سب سے پہلے کتاب و سنت کی تعلیم ہونی چاہئے۔ اس کے بعد حکمت یا سائنس کی۔ پہلے ہم کو اپنی تعلیم کا مقصد متعین کر لینا چاہئے کیونکہ ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ بن چکا ہے۔ اس لئے ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ طلباء کو مومن بنایا جائے جو ایمان کی روشنی سے خود بھی منور ہوں اور دوسروں کو بھی منور کر سکیں اور فطری طاقتوں کو بروئے کار لا سکیں زندگی اور علم میں ربط ہونا چاہئے۔ رسول صلعم کی زندگی کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی جائے اور ابتدائی درجات ہی سے بچوں کو اس پر مائل بنایا جائے۔ طلبا کی تمام زندگی رسول صلعم کی سیرت پر مبنی ہو۔ اور اسی کے مطابق نصابِ تعلیم بھی ترتیب دیا جائے تعلیمِ بالغان کے نصاب میں بھی یہی امر پیشِ نظر رہنا چاہئے"۔

یہ خلاصہ ہے جناب علامہ کے قیمتی خیالات کا۔

آپ تقریباً ۴۵ منٹ تک بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ مسحور کن انداز میں بولتے رہے۔ آپ کی تقریر کے بعد سید الطاف علی بریلوی نے مذاکرہ کے دوسرے مقرر جناب ڈاکٹر افضال حسین قادری صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب ایک مایۂ ناز سائنس داں ہونے کے علاوہ ہمیشہ سے اسلامی فکر و نظر کے آدمی ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل اپنے دورانِ قیام علی گڑھ میں آپ مسلسل تعلیمی کام کرتے رہے۔ آپ اُس مشہور تعلیمی اسکیم کے مصنفین میں سے ہیں جو مسلم لیگ کی جانب سے "واردھا" اور "ودیا مندر" اسکیم کے جواب میں مرتب کی گئی تھی۔ اور جس کا بھارت کے راشٹرپتی شری راجندر پرشاد جی نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ نہایت تلخی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ میں اپنے عزیز و محترم دوست ڈاکٹر افضال حسین قادری صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ اب جبکہ ان کے خواب کی تعبیر پاکستان کی شکل میں پوری ہو گئی تو وہ ہمیں بتائیں کہ ان کے منصوبے اور نظریات کس حد تک عملی جامہ پہن چکے ہیں یا پہننے والے ہیں۔

ان اجمالی تذکرے کے بعد ڈاکٹر افضال صاحب

ڈائس پر تشریف لائے اور خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

تقریر ڈاکٹر افضال قادری صاحب

جلسہ میں آنے سے پہلے تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھ کو تقریر کرنی ہوگی اور وہ بھی اس پوزیشن میں پڑ کر جس میں کہ سید الطاف علی صاحب نے میرے تعارف میں مجھے ڈال دیا ہے۔

"اسلامی نظام و نظریۂ تعلیم" بڑا شاندار موضوع ہے اور اس پر جناب پروفیسر حلیم صاحب اپنے خطبۂ صدارت میں اور مولانا حاجوی صاحب اپنی بصیرت افروز تقریر میں وہ سب کچھ بیان کر چکے ہیں جس کے بیان کی مجھ سے توقع کی جا سکتی تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے جو کام ہم اور آپ غیر سرکاری طور پر آزادانہ کیا کرتے تھے۔۔۔ اب وہ کام پاکستان کی منظم اور منضبط حکومت قایم ہو جانے کے بعد کچھ ضابطوں اور قاعدوں کے پابند ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اب نصاب تعلیم اور تعلیمی منصوبوں کی ترتیب و تدوین مرکزی و صوبائی وزارت ہائے تعلیم ان کے ماتحت ادارے مثلاً پاکستان کی مختلف یونیورسٹیاں، انٹر یونیورسٹی بورڈ، سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن اور پلاننگ بورڈ وغیرہ کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور ہم اور آپ ان کی تجویز کردہ راہ عمل کے پابند ہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں میری بنائی ہوئی کوئی بھی اسکیم موجودہ نظام کار میں اب آ ، حل دقتوں کے لئے کسی حد تک نشانِ راہ تو بن سکتی ہے لیکن لائحہ عمل نہیں ہو سکتی۔ اس محدودیت فکر و عمل کے باوجود اتنا تو میں بہر صورت عرض کر سکتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ہر ایک مدرسہ میں قرآنی تعلیم لازمی اور معنی و مطلب کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ دینی تعلیم کو صحیح معنوں میں پھیلانے کے لئے ایسے مدارس کا ہونا بھی ضروری ہے جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم موجودہ پر بھی نظر رکھتے ہوں۔۔ کیونکہ میری ناچیز رائے میں تمام علوم کا منبع قرآن و احادیث نبوی ہیں قرآنی تعلیم پر جس قدر اپنی توجہ کو مرکوز کیا جائے گا اسی قدر ہر قسم کی تعلیمی و فکری گتھیاں خود بخود سلجھتی چلی جائینگی یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس پر طویل تقریر بھی کافی نہیں ہو سکتی اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اسی قرآنی پیغام پر اپنی تقریر ختم کر دوں۔"

ڈاکٹر مولانا عبد الصمد صاحب سکھری

محترمہ، نفضال حسین قادری صاحب کی تقریر کے بعد سید الطاف علی بریلوی نے اس علمی صحبت کے تیسرے مقرر جناب مولانا عبد الصمد خانصاحب سکھری کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مولوی صاحب راجپوتانہ کے بہت قدیم اور مشہور قومی کارکن ہیں پاکستان آکر آپ نے سکھر کو اپنا مستقر بنایا۔ جہاں خصوصیت سے مہاجرین بڑی کثیر تعداد میں آباد ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب شب و روز اپنے مظلوم بھائیوں کی خدمت میں اپنے اوقات عزیز صرف کرتے ہیں اور بالخصوص دینی تعلیم کے پھیلانے میں سرگرمی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ آپ ہماری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بہت اچھے مددگار رہے ہیں سے ہیں نہ خود ممبر ہیں بلکہ سکھر کے کافی بڑی تعداد میں دوسرے

ذی علم حضرات کو ممبر بنا چکے ہیں۔ آپ کانفرنس کے ہر ایک سالانہ اجلاس میں بڑے ذوق و شوق اور پابندی کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ اور اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرماتے ہیں۔ اس تعارف کے بعد مولانا ممدوح موصوف نے حدیث شریف "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" اور "العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" کو موضوع تقریر بنایا اور کافی دیر تک پُر جوش انداز میں حاضرینِ کانفرنس کو مخاطب فرماتے رہے۔ آپ کی تقریر دلپذیر سے سُننے والوں کے نورِ ایمان کو تازگی نصیب ہوئی۔

چونکہ مذاکرہ میں حصہ لینے والے اب کوئی اور مقرر موجود نہ تھے لہٰذا صاحبِ صدر نے موضوع پر عام روشنی ڈالتے ہوئے معزز مقررین کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اپنی آخری تقریرِ صدارت سے سامعین کو مستفید فرمایا۔

جنابِ صدر کی آخری تقریر:-

خواتین و حضرات!

میرا یہ خوش گوار فرض ہے کہ میں اراکینِ کانفرنس کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کروں جن حالات اور دقتوں کا سامنا کر کے انہوں نے اپنی سعی سے اس اجلاس کو کامیاب بنایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہ صرف عام جلسے بلکہ مختلف شعبوں کے جلسوں میں بھی بڑے ہی جوش و استقلال کے ساتھ کام کیا گیا۔ شعبۂ نسواں بھی اس سلسلہ میں خاص مبارکباد کا مستحق ہے۔

پاکستان بننے کے بعد قوم کی حالت ایک حد تک بدل گئی ہے۔ اور بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرنے لگے ہیں کہ اس کانفرنس کی اب ضرورت نہیں رہی۔ [illegible] کے زمانہ میں اس کی ضرورت تھی۔ جبکہ ایک غیر قومی حکومت کو توجہ دلانے کے لئے اس قسم کے ادارے کا وجود ناگزیر تھا اور اس کا اعتراف ہر شخص کو ہے کہ کانفرنس نے گذشتہ ستر (۷۰) سال کے عرصہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اب بھی یہ کانفرنس بہت مفید کام انجام دے رہی ہے اور مجھے واقعی تعجب ہوتا ہے جبکہ پڑھے لکھے اور غور و فکر کے عادی حضرات کانفرنس کی عدمِ ضرورت کے خیالات ظاہر فرماتے ہیں۔ پاکستان کی آٹھ سال کی تاریخ شاہد ہے کہ اس ادارے کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ کیونکہ حکومت قوم کے تعلیمی مسائل پر پوری توجہ نہیں دے رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ قومی احساسات کو حکومت کے سامنے پیش کیا جائے اور ملک کے صاحبِ ثروت اشخاص کو بھی قوم کی اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یہ نامناسب ہے کہ آزاد حکومت قائم ہونے کے باوجود بھی کچھ لوگ اپنی زندگی عیش و عشرت میں گزار دیں اور عوامی فلاح و بہبود کے کام تنہا حکومت پر چھوڑ دئے جائیں۔ اس زمانہ میں اصحابِ ثروت کو قومی فلاح کے کاموں میں اور خاص کر تعلیمی ضروریات میں حکومت اور عوام کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

اس کانفرنس نے اپنے گذشتہ اجلاسوں میں نیز اس اجلاس میں جو تجاویز پیش کی ہیں وہ مفید ہیں اور اس قابل ہیں کہ حکومت ان پر عمل کرے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم حکومت کے ساتھ تعاون کریں اور عوام کو بھی اس تعاون پر آمادہ کریں۔

آخر میں آپ سب خواتین و حضرات کا [illegible]

[illegible] الافکر تا الطاف اور آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

تقریر میجر شمس الدین محمد

علیم صاحب کی تقریر ختم ہونے کے بعد کانفرنس کے مستقل صدر جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب نے محترم صدر کا منجانب کانفرنس شکریہ ادا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میں آپ کی اجازت سے ایک خوش گوار فرض کی ادائیگی کر رہا ہوں جو میرے سپرد کیا گیا ہے۔ صدر اجلاس جناب علیم صاحب کسی تفصیلی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے آپ نے جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اب آپ نے پاکستان میں کراچی یونیورسٹی کا کام سنبھالا ہے۔ یہ کام بہت زیادہ فکر و عمل کا متقاضی ہے۔ سخت عدیم الفرصتی کے باوجود یہ ہماری اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ جناب موصوف نے ہماری کانفرنس کی رہنمائی فرمائی۔ آپ کی پیش کردہ تجاویز میں مساجد کی اسکیم بہت زیادہ لائق توجہ ہے۔ مساجد بحیثیت مرکز تعلیم و تبلیغ بہت پرانی چیز ہے۔ فرنگیوں نے تعلیم کے لئے مساجد کے مدرسوں کو بند کروا دیا اور وہ تعلیم جو انسانیت کی تکمیل کا باعث ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود مساجد و مسلمان آج بھی موجود ہیں۔ یہ الفاظ دیگر [illegible] بھی موجود ہے اور اس کو معمولی کوشش سے آتش [illegible] بنایا جا سکتا ہے۔ جب میں بہاولپور میں وزیر تعلیم [illegible] میں نے مساجد کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی [illegible] کے لئے مساجد یا پشتخانے [illegible] تیار کیا گیا تھا اور ان کے ٹریننگ سنٹر قائم کئے گئے تھے۔ نصاب کو اسلامی رنگ دیا گیا تھا تاکہ طلبوں کے دماغ اسلامی تعلیمات کے حامل ہو جائیں۔ میں صدر محترم کو ان کی تجویز پر مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ موجودہ احوال کے باوجود وہ اپنے تجربہ اور جذبہ اسلامی کی بنا پر ایسی اسکیم پیش کر سکے۔

میں ان تمام حضرات کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے کانفرنس کی صدا کو لبیک کہا۔ گزشتہ تین روز کے عرصہ میں ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اس کو استقلال نصیب ہوا تو آئندہ نسلوں کے لئے آپ ایک سلجھا ہوا اسلامی نظام تعلیم مدون کر دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ سب صاحبان علم ہیں اور علم کی روشنی سے دنیا کو منور کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ خدا آپ کے نیک ارادوں میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

تقریر سید الطاف علی بریلوی | جناب

میجر صاحب کی تقریر کے بعد سید الطاف علی بریلوی نے بحیثیت سکریٹری مجلس استقبالیہ جملہ کارکنان کانفرنس کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔ سب سے پہلے سرسید گرلز کالج اور دفتر کانفرنس کے چپراسی کالے خاں، صدیق، چمن، منشی احسان الحق، ثناء اللہ بیگ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کی وفاشعاری اور احساس فرض اس قابل ہے کہ اس پر جس قدر بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ان لوگوں نے دن رات کام کیا اور آندھی اور بارش کی حالت میں بھی ان کی ہمت نہ ٹوٹی۔ خورشید الیکٹرک سروس اور اسٹینڈرڈ ہائر کمپنی کے ارکان اور ملازمین بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہر کام عقیدت سے کیا جو کچھ

سے کیا اور باوجود اس کے بعد بڑی مستعدی کے ساتھ
پنڈال کو دوبارہ کھڑا کر دیا۔ پنڈال وغیرہ کے بنوانے
میں جناب پرنسپل حسن عادل صاحب اور [illegible] درانی
صاحب نے بھی ان تھک کام کیا۔ دفتری کام میں
مسٹر افسر علی خاں کلرک سر سید گرلز کالج "منسٹریل اسٹاف"
کلرک دفتر کانفرنس، محبوب علی صاحب کلرک ڈائرکٹر
آف ایجوکیشن کراچی، منشی عنایت علی خاں صاحب اور جناب کفایت
صاحب نے بیحد امداد دی۔ انکے علاوہ رفقاء خاص جناب حسن علی صاحب
مولوی مظفر حسین اسلمی صاحب، مرزا اعلیٰ اظہر صاحب برلاس
مولوی عظمت اللہ صاحب، سید عبدالقدوس ہاشمی
ندوی صاحب، مولوی عظیم الدین خاں صاحب،
ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب، مفتی انتظام اللہ صاحب
شہابی اکبر آبادی، مسٹر انعام عظیم برنی، سید عین الدین
رضوی صاحب، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب،
ڈاکٹر سید معین الحق صاحب، سید اظہر حسین رضوی
صاحب ایم اے۔ مولوی بدر عیس احمد [illegible] صاحب مولوی
فضلت حسین صابری صاحب میرا بیٹا ساجد اور بھتیجے مصطفےٰ علی بھی
خصوصی تشکریہ کے مستحق ہیں۔ ان سب بزرگوں، دوستوں
اور عزیزوں کے تعاون کے بغیر دس روز کے قلیل عرصہ
میں اجلاس کے جملہ کام انجام کو نہ پہنچ سکتے تھے۔

ہم سب سے زیادہ پرخلوص شکریہ شعبۂ نسواں آل
پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خواتین محترم بیگم ڈاکٹر زینب
عبدالحمید صاحبہ صدر مجلس استقبالیہ، بیگم لفٹیننٹ کرنل [illegible]
احمد علی صاحبہ، بیگم اختر حسین صاحبہ، بیگم حفیظ صاحبہ،
راحیل نسیم صاحبہ [illegible] بیگم ڈاکٹر [illegible] علوی صاحبہ

اداروں کی [illegible] اور دوسری [illegible]
ان کی کوشش سے اخراجات کانفرنس کے لئے مطلوبہ
رقم نہایت آسانی کے ساتھ فراہم ہو گئی اور ہم اپنے متعلقہ کام
کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے۔

کانفرنس کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ ہر سال اس
کے اجلاس ہوتے رہیں کیونکہ بصورت دیگر اس کا ربط
عوام سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ غیر متوقع
وجوہ کی بنا پر پاکستان میں گذشتہ پانچ سال کے عرصہ
میں کانفرنس کے صرف تین سالانہ اجلاس ہو سکے کوشش
کی جائے گی کہ آئندہ کوئی سال ناغہ نہ جائے۔

صدر محترم نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا تھا کہ
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب کانفرنس کی ضرورت باقی
نہیں رہی۔ میں عرض کروں گا کہ کانفرنس کا کام صرف
جلسے منعقد کرنا اور ریزولیوشن پاس کرنا ہی نہیں ہے بلکہ
لائبریری، ادارۂ تصنیف و تالیف، رسالہ العلم، اور شعبہ جات
تعلیمی، تعلیم نسواں، اسلامیات اور حربی تعلیم وغیرہ کے
ذریعہ ملک میں تعلیمی اصلاح کی تحریک کو چلاتے رہنا ہے
ہم اس کے خادم ایک باضابطہ اور منظم دفتر کے تحت سال
کے ۳۶۵ دن مصروف رہتے ہیں۔ سالانہ اجلاس کا انعقاد
جیسا کہ میں نے عرض کیا عوام سے رابطہ قائم رکھنے اور
سال بھر کے کام کا جائزہ لینے کے لئے ہوتا ہے۔

ریزولیوشنوں کا پاس کرنا بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت
رکھتا ہے۔ ان کے ذریعہ قوم کی ضروریات، شکایات
اور مطالبات حکومت اور ملک پر [illegible] جاتے ہیں
اور ان ریزولیوشنوں کا سالانہ [illegible] معلومات صدارت

ذخیرہ کی بدولت ہی پالیسیاں بنتی ہیں اور منصوبے بنتے ہیں۔ ہم لوگوں کو [illegible] سے بےنیاز ہو کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنا پیغام بہرصورت ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ اگر اجلاس میں حاضرین کی تعداد کم ہو تو اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیوں کہ اجلاس کے سلسلے کے شائع کردہ لٹریچر کے ذریعہ ہمارے مخاطب لاکھوں آدمی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایک تعلیمی جلسے میں حاضرین کی کمی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ تعلیمی کانفرنس کی ضرورت ہے۔

علی گڑھ میں میں نے ایک پمفلٹ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "کانفرنس کیا کرتی ہے؟ یعنی کانفرنس کچھ کرتی ہے" اور یا یہ "کچھ نہیں کرتی ہے"۔ میں نے اس پمفلٹ میں دکھایا تھا کہ

سرسید علیہ الرحمۃ اور ان کے جانشین نواب محسن الملک وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ نواب اسحاق خاں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی۔ مولانا سید فضل احمد صاحب افغان۔ پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب سے بھی اپنے اپنے وقت میں یہی سوال کیا جاتا تھا کہ کانفرنس کیا کرتی ہے؟ اور [illegible] صفائی [illegible] اپنے اپنے دور کی بہت سی [illegible] انگیز بیانات دیتے تھے۔ کبھی کبھی اعتراف کوتاہی میں کانفرنس سے آگے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور پھر جلسوں کے حاضرین پر اس کا رد عمل ہوتا تھا [illegible]۔ آپ کام کرتے جائیے اور جو غلطیاں ہوتی [illegible]

کہ آئندہ خیال رکھئے کہ ہماری قوم میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ مردہ پرست ہے۔ ہمیشہ ان شخصیتوں کو جن کو زندگی بھر چین سے نہ بیٹھنے دیا، دنیا سے گزر جانے کے بعد یاد کرتی ہے۔ اور موجود الوقت لوگوں کو طعنہ دیتی ہے کہ جناب آپ سے پہلے کے لوگ تو ایسے تھے اور ویسے تھے اور آپ کچھ نہیں ہیں۔ یہ طریقہ عمل مخلص قومی کارکنوں کے لئے انتہا درجہ صبر آزما ہوتا ہے۔ صاحب صدر اگر مجھے اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ ایک زمانہ تھا جب آپ علی گڑھ میں صرف ہسٹری کے پروفیسر تھے اور آپ کی شخصیت سب کے لئے عزیز و محترم تھی، مختلف پارٹیوں میں شدید اختلافات ہوتے تھے تو آپ کو حکم بنایا جاتا اور آپ کے فیصلے ہر شخص کیلئے واجب التعمیل ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہو گئے تو آپ کی شخصیت متنازعہ ہو گئی اور حکم کے بجائے آپ بھی ایک فریق ہو گئے اور آپ کی اگلی پچھلی خدمات بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد [illegible] آپ سندھ یونیورسٹی کے [illegible] کراچی یونیورسٹی [illegible] میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا اور نہ تیس سال پیچھے [illegible] کا موقع ہے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ حلیم صاحب جیسے [illegible] کی اعلیٰ تعمیری خدمات کا کیا [illegible] ہو رہا ہے۔ [illegible] بعد جب آپ ریٹائر ہو جائیں گے تو آپ کی صحیح تاریخ لکھی جائے گی۔ بہرحال [illegible] حلیم صاحب [illegible] بہرحال [illegible] کام کر [illegible] کی [illegible] عبارت ہو گی جب تک دم میں دم ہے [illegible] حاضر ہوں گے [illegible] آخر میں [illegible]

[illegible] شکریہ ادا کرتا ہوں۔ والسلام

[illegible] آل انڈیا [illegible] کانفرنس [illegible] منعقدہ [illegible]

نقد و نظر

[illegible]

قاضی [illegible] صاحب [illegible]

نظم ترک وطن

حال ہی میں آل پاکستان [illegible] کے آرگن [illegible] کے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالہ علمی و تعلیمی مضامین اور تحقیقی معلومات پر مشتمل تھا۔ رسالہ مذکور میں ایک طویل نظم "ترک وطن" دیکھی جس کے اشعار کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ یہ نظم مثنوی کی شکل میں ہے جسے پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مصنف نے:

[illegible] پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

مصنف قاضی [illegible] صاحب [illegible] ایڈیٹر [illegible] بدایوں (یوپی بھارت) کے ایک معزز اور علمی خاندان کے فرد ہیں جنہوں نے ملک کی تقسیم [illegible] کے [illegible] سے پریشان ہو کر ہجرت [illegible] کے [illegible] پاکستان کو اپنا وطن بنایا [illegible] ان کے دل [illegible] جذبات غم کا آئینہ [illegible] کی طرح [illegible] ترک وطن کے احساسات کی ترجمانی ہے۔

بدایوں (جس کا نام اسلامی عہد میں بداؤں [illegible]) [illegible] کے زمانے میں [illegible] علم و فضل میں مشہور رہا ہے۔ [illegible] تمام علم [illegible] کا آفتاب چمکا [illegible] ہو گیا۔ [illegible]

سلطنت کے قائدان جب [illegible] کا رخ کرتے تو ان کا پہلا پڑاؤ دہلی اور دوسرا بدایوں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ [illegible] اس مرکز علم کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں جب بدایوں کے ایک لعل شب چراغ (حضرت نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہٗ) کے کمالات کی ضیا دنیا کو منور کر رہی تھی یہ بستی بقول حضرت محبوب الٰہی بڑے بڑے فضلا و علما کا مسکن تھی۔ جن میں حضرت کے استاد سید علاء الدین اصولی، مولانا ضیاء الدین نخشبی، شیخ شہاب الدین [illegible] استاد امیر خسرو، امیر حسن سجزی بدایونی مولف فوائد الفواد جیسے اصحاب کمال رہتے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ

"در بدایوں بسیار بزرگاں خفتہ اند"

جن کی شہادت [illegible] حضرت سلطان [illegible] حضرت شاہ ولایت [illegible] حضرت [illegible] حضرت نظام الدین اولیا [illegible] مولانا [illegible] [illegible]

[illegible] پیش ہوا جو [illegible] حالی [illegible]
[illegible] قریب [illegible] سید یونس [illegible]
[illegible] اور شعر [illegible]
[illegible]
[illegible] پر غور کر سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تھوڑے عرصے سے اس بستی پر ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس گئی گذری حالت میں بھی اس کی ایک شان تھی۔ البتہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد بدایوں کو ایسے حوادث سے دوچار ہونا پڑا جنہوں نے اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہی کر دیا۔ یہی داستان اس مثنوی کا موضوع ہے۔

انجم صاحب نے جو مثنوی لکھی ہے اس میں کہیں کہیں بندش کی سستی اور طرز ادا کی خامی پائی جاتی ہے تاہم اشعار درد و اثر سے خالی نہیں۔ انہوں نے اپنے دلی جذبات اور تاثرات کو نہایت بے ساختگی اور صفائی سے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے جس سے قارئین بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ایک سچے محب وطن کی طرح اپنے وطن کے اہل اصحاب (جو قومی علم و ادب، شعر گوئی اور فنون میں ممتاز درجہ رکھتے تھے) کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ اور اس طرح ایک مورخ کا فرض بھی انجام دیا ہے۔

[illegible] کا مقصد ہے کہ اس تاریخی مقام کے مشاہیر [illegible] ذکر اس نظم کی اشاعت [illegible]

اُن کے اس احسان کا اعتراف کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔

ضیا احمد بدایونی

سرسید کے عقائد و اعمال مذہبی

العلم [illegible] شمارہ [illegible] کے بعض مندرجات کے بارے میں [illegible] کچھ کہنا چاہتا ہوں [illegible]

(۱) مضمون سرسید کے عقائد و اعمال مذہبی [illegible] خاں زبیری (ص ۳۶) میں شمس العلماء مولوی سید شرف [illegible] دگیا صوبہ بہار [illegible] کا ذکر ہے۔ یہ [illegible] سید احمد خاں کے مکتوب الیہ [illegible] نہیں ہیں۔

تاریخ اور تذکرہ نویس

(۱) مضمون تاریخ اور تذکرہ نویس (از انعام عظیم برنی ایم۔ اے۔) ص [illegible] میں خواجہ عشرت لکھنوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ناصر صاحب تذکرۂ شعرا کا نام ناصر خاں تھا اور وہ دہلی سے لکھنؤ آئے تھے۔ ناصر کا نام ناصر خاں نہیں سعادت خاں تھا، اور ان کا وطن دہلی نہیں لکھنؤ تھا۔ (سراپا سخن [illegible])

(۲) ص [illegible] میں عشرت کی عبارت ذیل نقل ہوئی ہے

ناصر لکھتے ہیں شیخ امام بخش [illegible] آباد میں پیدا ہوئے [illegible] نے [illegible] کیا [illegible] پرورش کیا [illegible] ناصر کا ایک نسخہ پٹنہ میں ہے اور اس میں ناسخ کا [illegible] ہے۔ ناصر نے انہیں خدا بخش کا بیٹا لکھا ہے، لیکن [illegible] کا نام تک اس تذکرہ میں نہیں آیا۔ [illegible] پیدائش کا صراحتہ ذکر اس میں [illegible] میں اس وقت [illegible] ناصر [illegible]

(۳) ص [illegible] [illegible]

تقریباً ۱۰۰ برس کی ہوئی۔ شجاع الدولہ کی باتیں انھوں نے
دیکھی بیان کی تھیں۔ اس حساب سے ناسخ کی ولادت
۱۲۵۴ء میں ہوئی تھی ۱۱۵۲ھ کے لگ بھگ متولد ہوئے
اور وہ مصحفی، جرأت، انشا، قتیل وغیرہ سے عمر میں پیشتر متولد
ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذکی کا قول قیاس پر مبنی ہے جو
وفات ناسخ کے کچھ کم پچاس سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس
کا مدار اس پر ہے کہ ذکی نے عہد شجاع الدولہ کی بعض
باتیں آنکھوں دیکھی ناسخ سے سنی تھیں لیکن شجاع الدولہ
۱۱۸۸ھ میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کے آخری زمانے کے
چشم دید حالات وہ لوگ بھی بیان کر سکتے تھے جو عشرہ ہشتم
کی جگہ عشرہ نہم میں پیدا ہوئے تھے۔

(۵) ص۵ میں یہ بات کہ ناسخ ۱۱۸۰ھ میں متولد ہوئے
قرین قیاس بتائی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے تو وہ انشا و قتیل
کے ہم عمر ٹھہرتے ہیں جو مسلمات کے خلاف ہے۔ قرین
ہونے کا مدار اس امر پر ہے کہ ناسخ نے سودا (متوفی ۱۱۹۵)
کا قطعہ تاریخ وفات کہا تھا۔ قطعہ واقعی کلیات ناسخ (طبع
نولکشور ۱۲۰۰) میں موجود ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ
کیسے معلوم ہوا کہ اسی زمانے میں کہا گیا تھا۔ ناسخ کا قطعہ
دلیل اس پر ہے کہ ناسخ کی شاعری کا آغاز وفات سودا
کے بعد ہوا تھا۔

پہلے اپنے عہد سے افسوس سودا اٹھ گیا
کیوں نہ ہو غمگیں بھلا ناسخ رحل کا لازم ۱۱۹۵ھ

(۶) ص۵ لکھا ہے کہ ریاض الفصحا میں درج ہوئی عمر
لکھتے ہیں مصحفی نے تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ۱۲۳۰ھ میں
ختم کیا تھا اس میں ناسخ کی عمر ۳۰ سال بتائی ہے

[illegible] ناسخ [illegible]
بکثرت ہو چکی ہوں تو اس حساب سے ان کی ولادت
۱۱۸۰ھ کے لگ بھگ قرار پاتی ہے۔ یہ بات کہنے کی
کوئی وجہ نہیں کہ مصحفی نے عمر محض قیاساً لکھی ہے۔ وہ
ان کے متعلق تحقیقات کے جو مواقع انہیں حاصل تھے
ان سے ہم بالکل نا واقف نہیں ہوتا۔ ۱۱۸۰ھ یا ۱۱۸۱ھ کو تسلیم کرنے
سے ناسخ کی زندگی کے کسی ایسے واقعے کی جو عام طور پر صحیح
سمجھا جاتا ہے تغلیط نہیں ہوتی اور وہ اس سنہ میں پیدا
ہوئے تھے تو عہد شجاع الدولہ کی کچھ باتیں بھی چشم دید بیان
کر سکتے تھے۔ اس سوال سے کہ ناسخ کا حال مصحفی نے کب
لکھا، میں اپنے مضمون میں بحث کر چکا ہوں اور اس وقت
تفصیل سے گریز کرتا ہوں۔

(۷) ص۶ ناسخ کی شاعری کی ابتدا ۱۲۰۰ھ کے قریب
قرار دیا جانا قرین صحت ہے۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ ۲۰ برس کی
عمر میں ناسخ کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ پیدائش ۱۱۸۰ھ کے
لگ بھگ ہوئی تھی تو ۱۲۰۰ھ کے کچھ قبل یا بعد شعر کہنے
لگے ہوں گے۔

(۸) ص۶ میں پیچھے بعض امور سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے
کہ ناسخ [illegible] اور ۱۲۲۰ھ کے درمیان شعر عام ہو گئے اور
اس کے بعد یہ لکھا گیا ہے [illegible] مگر ذکی کا یہ قول کہ
وہ مرزا حاجی کے مکان پر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے
مگر صرف سننے کے لیے [illegible] اس وقت شعر کہتے تھے جب
انشا اور مصحفی کے معرکے ہو رہے تھے اور ناسخ کے ختم
ہو چکنے [illegible] تسلیم کیا جا سکتا [illegible]
کہ ناسخ [illegible]

[illegible] ۱۲۲۹ھ میں سعادت علی خاں کے عہد سے منسوب [illegible] اسی سال جرأت نے انتقال کیا اور اس امر کی [illegible] شہادت موجود ہے کہ ۱۲۲۹ھ میں ناسخ شہرت عام حاصل کر چکے تھے ۔ اس سلسلے میں امور ذیل قابل توجہ ہیں

(الف) زخمی کے قول میں "کہنا" سے مراد پڑھنا ہے اسے مانا جائے تو آغاز شعر گوئی کا زمانہ ۱۲۱۴ھ کے بھی بعد قرار پاتا ہے۔

(ب) انشا و مصحفی کے معرکے عہد آصف الدولہ (وفات ۱۲۱۲ھ) میں ختم ہو چکے تھے، نزاع جرأت و [illegible] کا زمانہ ممکن ہے ۱۲۰۹ھ سے بھی قبل ہو۔ یہ یقین ہے کہ سلطان کے لکھنؤ سے رخصت ہونے سے پیشتر ہو (معاصر حصہ ۲ ص [illegible])

(ج) [illegible] انشا کی برطرفی کا صحیح سال [illegible] کچھ انشا کے بارے میں" (قسط ۲) میں درج ہے۔

(د) جرأت کا صحیح سال وفات ۱۲۲۰ھ ہے جیسا کہ راقم کے مقالے سال وفات جرأت شائع کردہ رسالہ اردو سے ثابت ہے۔

(ہ) مصحفی نے ۱۲۲۲ھ تک اپنے دیوان چہارم کا دیباچہ لکھا تھا جس سے متعلق میرا ایک مضمون معارف میں چھپ چکا ہے اور جس کا اقتباس معاصر حصہ ۲ ص [illegible] میں بھی درج ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ناسخ کا صاحب طرز استاد ہونا مسلم تھا، اور آتش وغیرہ کے علاوہ [illegible] مصحفی بھی ان کا تتبع کرنے لگے تھے پہلے جو نتیجہ نکالا گیا تھا، وہ صحیح ہے۔

(۹) [illegible] ناسخ کا مصحفی اور تنہا سے مشورہ کرنا [illegible]

قیاس نہیں ہے۔ اگر ناسخ مصحفی یا تنہا سے مشورہ کرتے تھے تو ایسی بات نہیں جسے مصحفی اپنے تذکرے میں قلم انداز کر دیتے۔ میری رائے میں اس کی کچھ اصل نہیں۔

(۱۰) ص [illegible] میں ہے کہ ناسخ ۱۲۱۴ھ میں [illegible] کر گئے (بحوالہ خواجہ عشرت) یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ لکھنؤ جانے کا سنہ کیا تھا۔ خواجہ عشرت کے قول کا عدم وجود برابر ہے۔

(۱۱) ص [illegible] ناسخ مرزا محمد تقی، ترقی کی سرکار سے وابستہ تھے اس کا مدار بھی خواجہ عشرت کے قول پر ہے جو کسی طرح قرین قیاس نہیں۔ ان سے آتش کی وابستگی (ص [illegible]) بھی ثابت نہیں۔

(۱۲) ص [illegible] میں ہے کہ ترقی کو دس ہزار روپے [illegible] وظیفہ ملتا تھا۔ ترقی کا ماہانہ مشاہرہ دو ہزار یا پچیس سو ماہانہ تھا (تواریخ اودھ جلد [illegible] ص [illegible]) ان کی ذاتی اور اولاد کا مشاہرہ اس کے علاوہ تھا۔

(۱۳) ص [illegible] میں ہے محسن الدولہ کی شادی نصیر الدولہ کی بیٹی سے طے کرانے میں ناسخ کا ہاتھ تھا۔ (بحوالہ تاریخ اودھ) ناسخ کو جن معاملات سے تعلق تھا، ان کا ذکر تاریخ جلد ۱ ص [illegible] کی سطر ۱۴ پر ہو گیا۔ نصیر الدولہ کی بیٹی اور محسن الدولہ کی شادی کا ذکر سطر و ما بعد میں ہے اور اس میں مطلقاً شبہ کی گنجائش نہیں کہ شادی کرانے والا آغا میر معتمد الدولہ تھا۔ اس موقع پر صرف اسی شادی کا نہیں اور شادیوں کا بھی ذکر ہے اور ان سب میں آغا میر کا ہاتھ تھا۔

(۱۴) ص [illegible] میں نوسنگھ اور عسکری یہ عبارت نقل ہوئی ہے۔ جس قدر محسن الدولہ سے کہا یا لکھا صرف [illegible]

جنوری کی تحریر ہے [illegible] بیٹا زین العابدین تھا
شیخ صاحب مضمون کے نزدیک یہ عبارت ناسخ سے متعلق
ہے اور زین العابدین انہیں کا بیٹا تھا! لیکن ناسخ کا نفس
سے سروکار نہیں ہے مرزائی صاحب کے بارے میں جو
عبارت منقول ہے اس سے قبل تواریخ اودھ میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

"(معتمد الدولہ کی سفارش سے) مرزائی صاحب نے دست
قدیم شیخ جی (ناسخ) کو ۲۰۰ روپیہ ماہواری کا نوکر کروا دیا تھا
جنت مکان (امجد علی شاہ) کے عہد دولت تک از راہ
تحقیق بحال رہے، مگر صاحب سلیقہ تھے" (جلد ۲ ص [illegible])
تواریخ اودھ جلد ۲ ص [illegible] میں صراحتاً مرقوم ہے کہ مرزائی
صاحب مذکور محسن الدولہ کے داروغہ تھے اور انکا شاہی
دبدبہ [illegible] تھا۔ یہ طرفہ جس شخص کی ہوئی، اسی نے بچوں کو
اچھی تعلیم دلائی تھی۔ یہ ناسخ متوفی ۱۲۵۴ھ نہیں ہوسکتے
اس لئے کہ امجد علی شاہ کا زمانہ سلطنت وفات ناسخ کے کئی
سال بعد سے شروع ہوتا ہے۔ مرزائی صاحب کا ملازم محسن الدولہ
ہونا تذکرہ ناصر سے بھی ثابت ہے (حاشیہ متعلق بیان [illegible])
واضح ہے کہ مرزائی صاحب بقول ناصر لکھنؤ میں ناسخ کے
معشوق مشہور تھے اور ان کے بیان کے مطابق ناسخ نے
انہیں جو مکان اور دکانیں بھی خرید کر دی تھیں جن کے
کرائے سے بوقت تحریر حاشیہ تک ان کی اوقات کی
بسر اوقات بھی بخوبی ہوتی تھی۔

(۱۳) ص [illegible] میں [illegible] کے بارے میں لکھا ہے کہ ناسخ
کی دو بیبیاں ان سے متعلق ہیں، جن میں سے ایک میں
ناسخ کا تخلص نظم کیا گیا ہے۔ صاحب مضمون نے صراحتاً تو یہ
نہیں لکھا، لیکن ان کے [illegible] سے متبادر ہوتا ہے

کہ [illegible] تھا ناسخ [illegible]
ظاہر کیا گیا ہے [illegible] (کلیات [illegible]
دیکھئے ص [illegible] کی ولدیت کا جواب [illegible] تعجب
ہے کہ ناسخ کی وہ نظم جس میں ان کی کتخدائی کی مبارکباد
[illegible] کردی گئی ہے، غلط ثابت کردی گئی (کلیات ص [illegible])
اس سے بڑھ کر حیرت اس پر ہوگی کہ ناسخ کا ایک قطعہ
جس کا عنوان "تاریخ تولد فرزند ارجمند مرزائی بیگ" ہے ملاحظہ
جس کی بیت اول میں صراحتاً مرزائی بیگ (یعنی مرزائی
صاحب) کے بیٹے کا نام مرزا محمد مرقوم ہے؛ ان کی نظر
سے نہیں گزری۔

شد امروز مولود مرزا محمد
بکن طول عمرش خدایا الٰہی [illegible]

یہ بات بھی غور کرنے کی تھی کہ شیخ امام بخش کے بیٹے کا نام
مرزا محمد کس طرح ہوسکتا ہے۔

(۱۴) ص [illegible] میں غلطی طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ
ناسخ نے تنہا کی زندگی بسر کی تھی اور وہ صاحب اولاد
تھے۔ میں آزاد و عشرت کو معتبر راوی نہیں سمجھتا لیکن
ان کے اس بیان سے کہ ناسخ [illegible] مؤید ہے۔
اس امر سے بھی کہ بقول [illegible] ناسخ کے بیوی کی
وصیت کے مطابق ان کی کل املاک پر مرزائی صاحب قابض
و متصرف ہوگئے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] یہ بات اور بھی [illegible] مرزائی صاحب
[illegible]

ادب کا کوئی بڑی امداد نہیں کر سکتے تھے۔

(۱۸) ص۱۰ میں تاریخ کے دیوان دوم و دفتر پریشان سمجھے بیک وقت شیدا کا حوالہ ہے۔ کلیات کے مطبوعہ نسخوں میں دیوان دوم و سوم کی غزلیں مخلوط ہیں اور کل متفرق کلام یکجا ہے جناب ناصر علیم بیگ اگر شیدا بات دفتر پریشان پر ایک مستقل مضمون لکھیں تو یہ ایک مفید ادبی خدمت ہوگی۔ تاریخ کی جو ولی کے بارے میں تفصیل کے ساتھ آغاز بحیثیت محقق کی قسط دوم میں لکھوں گا جو نئی شاخ ادب کی میں شائع ہوگی۔

ناصر نے تاریخ کے ترجمے میں فیض آباد کا مطلقاً ذکر نہیں کیا۔ ناسخ کی ولادت کس سنہ میں ہوئی معلوم نہیں ہوا یہ یقینی ہے کہ ۱۸۰۰ء محرم کو پیدا ہوئے تھے، کلیات کا یہ شعر اس پر شاہد ہے کیونکر شدید ہو دم نشاط مگر کہ پیدا ہوا تولد اختر ماہ محرم کا

تاریخ اسلام از سرِ نو لکھنے کی ضرورت

(۱۹) ص۱ میں گبن کے تعصب سے خالی نہ ہونے کی یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ وہ آنحضرت کو نبی صادق نہیں مانتا مگر یہ بات قابل الزام ہے تو گبن پر کیا موقوف ہے کل غیر مسلم علماء اسی کے تحت ملزم ہو سکتے ہیں۔

(۲۰) ص۲ میں جدو ناتھ سرکار کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ان کی یہ عادت ہے کہ حسب منشاء غلط ترجمہ کرکے بعض دلیل کے لئے شہادت پیدا کرتے ہیں عہد عالمگیری کی جو فارسی عبارت نقل کی گئی ہے، جس کا ترجمہ غلط کیا ہے لیکن غلط ترجمہ کرنا ایسے مصنفین کے یہاں زیادہ تر لاعلمی کی وجہ سے ہوتا ہے تعصب کی وجہ سے نہیں، اس کی ذمہ داری فارسی نہ جاننے پر ہے یا فارسی کا علم صحیح طور پر نہ جاننا۔ جناب ڈاکٹر صاحب کو اگر اپنے مطلب کے لئے یہ امر درپیش ہے تو زیادہ نہیں غلط ترجمہ کی دس مثالیں ہی پیش کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جدو ناتھ سرکار کو مسلمانوں سے تعصب نہیں ہے وہ ضرور ہے، مگر وہ اتنے نادان نہیں کہ ارادی طور پر عبارات کا غلط ترجمہ کریں۔

(۲۱) ص۲ میں ہے کہ سرکار نے اس جملے میں دو مغلوں کو زخمی کیا، شاہجہاں کا قاتل تھا اور گستاخ "گستاخی" تو عالمگیری فارسی عبارت سے بھی ثابت ہے۔ خسرو پرویز کے مقتول ہونے یا نہ ہونے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۲۲) ص۳ میں ایک انگریزی عبارت کا ترجمہ صحیح نہیں یہ الفاظ آئے ہیں "عظیم ترین" خواہ سفر الغالب البشیر... ابو کامل اور اعادہ عظیم ترین جغرافیہ دان اور صاحب معجم المسعودی "عظیم ترین" انگریزی لفظ کا صحیح ترجمہ معلوم نہیں ہوتا میں ممنون ہوں گا اگر وہ لفظ جس کا یہ ترجمہ ہے پیش کیا جائے گا۔

عربی زبان پاکستان میں انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے

(۲۳) ص۳ میں ہے کہ مصر میں عربی روزناموں کی تعداد اشاعت تین لاکھ تک ہے۔ مصر کا روزنامہ الاہلال ایک ہفتے میں دس لاکھ کاپیاں شائع کر چکا ہے۔

مصر کے کسی روزنامہ کی تعداد اشاعت دس لاکھ سے زیادہ نہیں تھا تو الاہلال ہی تعداد کیسے پہنچا ہے (باقی حاشیہ صفحہ)

بزم کانفرنس

سید لطیف حسین ادیب ایم اے۔ بریلی (بھارت)

میں آپ کو دو تین ہفتے پہلے ایک خط ہوائی ڈاک سے بھیج چکا ہوں جو آپ کو مل چکا ہو گا۔ مضمون بعنوان: "نواب محبت خاں محبت اور مثنوی اسرار محبت" آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ یہ میرا پہلا مضمون اس حیثیت سے ہے کہ اس میں مجرد تنقید ہی نہیں تحقیق کا دخل بھی ہے بالفاظ دیگر مواد اکٹھا کر کے تلاش و جستجو کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، محض شعری تخلیق ہی نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ یہ مضمون ضرور پسند کریں گے۔ اپنے تاثرات سے اولین فرصت میں مطلع کریں۔ میری دلی خواہش تھی کہ آپ اس کو زیر ترتیب پرچے ہی میں جگہ دیں۔ میں مضمون میں "حیات حافظ رحمت خاں" سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ ایک کتاب جو نہ صرف مستند ہی نہیں ہے بلکہ روہیل کھنڈ کی تمدنی روایات اور ادبی کاوشوں کا منظر بھی ہے۔ اگر اتفاق سے آپ کو اختلاف ہو تو نوٹ ڈال دیجئے گا تاکہ وہ آئندہ میری رہنمائی کرے کیونکہ میں جوش اور جوش پر مقالہ لکھ رہا ہوں جن کی کلیات میں نے مرتب کی ہیں۔

کی گوناگوں مصروفیتوں نے اس سال کچھ ایسا مجبور کر دیا کہ نہ تو ہشاریکل کانفرنس ہی میں شرکت کر سکا اور نہ الملح جیسے موقر جریدہ کی وصولیابی کی رسید ہی بھیج سکا۔ غیر ارادی تاخیر کو نواکر العلم کے لئے پیش از پیش شکریہ قبول فرمائیں۔

یوں تو سبھی مضامین اپنی جگہ پرخلوص اور علمی معلومات سے پُر ہیں لیکن "تذکرۂ حیات پر نظر" (از خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب) اور "ملت پاکستان کا اخلاقی جائزہ" از جناب محمود اکبر آبادی جاذب نظر ہیں۔ اول الذکر صاحب مقالہ سلطان ناصر الدین محمود اور قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے سکوں پر نظر ڈالنا غالباً بھول گئے۔ تصاویر کی غلطی بر طرف "ہو سکتا ہے کہ غیاث الدین بلبن کے اختتام حکومت پر عمل میں لائی ہو لیکن اس کی ابتدا بہت پہلے سے ہو چکی تھی۔ میرے پاس سلطان ناصر الدین محمود کے کئی سکے موجود ہیں جو تصاویر سے بالکل پاک ہیں۔ ساتھ ہی دوسری طرف [illegible] سلطان علاء الدین خلجی کے سکے جو میرے پاس ہیں ان پر بھی [illegible] ہے جو صاحب مقالہ نے [illegible] پہنچی ہے۔ [illegible]

جناب پروفیسر شریف الدین پنڈت صاحب ایم اے

[illegible]

سلاطین بھی خلیفہ کو اظہارِ اطاعت کے لئے "یمین الخلافت" اور "ناصر امیر المؤمنین" کے القاب باقی رکھے تھے۔ قطب الدین نے ان کو غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا اور خود ہی خلیفہ بن بیٹھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے سکہ جات کا ذکر بھی ضروری تھا لیکن اس کی تلافی محمد بن تغلق کے سکہ جات کے حوالے اس کے دورِ حکومت کا جو تجزیہ کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ میری طرف سے مبارکباد پیش کیجئے۔

مملکتِ پاکستان میں ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے بحمد اللہ اسلامی قانون نافذ ہے۔ سیدنا عمرؓ کو اگر اپنے دور کے معاشرہ کی اخلاقی حالت کو سدھارنے کے لئے محکمۂ احتساب کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تو اس چودھویں صدی کے معاشرہ کو تو اس کی اور بھی اشد ضرورت ہے کاش حکومتِ پاکستان ادھر جلد متوجہ ہو۔

عزیز مکرم سید مصطفےٰ علی اور برادر عزیز محمد ایوب قادری کے اصرار کی بنا پر چند سطریں نواب خان بہادر خاں شہید بریلوی کی نایاب تصنیف (مقاصد صالحین) کے متعلق لکھی ہیں۔ شاید آپ کو پسند آجائیں اور میں العلم کی وجہ سے طویل جواب لکھنے سے نجات پا جاؤں۔ زائد کیا عرض کروں۔ امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

جناب مولوی حسن امام صاحب کراچی

"العلم" جنوری تا مارچ کی یکجائی اشاعت کے مطالعہ سے خوشی و مسرت ہوئی۔ جناب محمد ایوب قادری کا مقالہ "مولانا علی احمد ٹونکی" تیسرے حصے کی تکمیل کافی دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ صفحہ ۲۰ کے ذیلی حاشیہ نمبر ۳ میں غلطی ہو

نوشہ عباسی کا نام بجائے خلیل الدین کے دیکھ کر مجھے اپنے ایک محبِ مکرم کی یاد تازہ ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں میرا طویل قیام لکھنؤ میں تھا۔ گورنمنٹ پولیس کے افسروں میں حافظ توقیر الاسلام صاحب کی قیام گاہ پر نوشہ میاں صاحب سے ملنا ہوا کرتا تھا۔ ممدوح سے میرا تعارف کا ذریعہ جناب حکیم سید احمد صاحب و جناب مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب مرحوم و مغفور تھے۔ کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ شاید یا تو نوشہ میاں کا نام بھی "خلیل الدین" ہی تھا۔ وہ بھی عباسی ہی تھے مگر بجائے "عباسی" ہم ان کو فریدی یعنی حضرت خواجہ سلیم چشتی آسودہ فتح پور سیکری سے منسوب جانتے تھے۔ صوفی مشرب بڑے خلیق بزرگ تھے۔ خلیل الدین نوشہ عباسی بن سعد الدین شائع یہ نہیں تھے تو میں شکر گزار ہوں گا۔ جناب محمد ایوب قادری صاحب یا کوئی اور صاحب ہمارے محبِ مکرم نیز حافظ توقیر الاسلام کے متعلق کچھ معلومات مجھے براہِ راست لکھ بھیجیں یا بذریعہ العلم آگاہ بخشیں ع

برکریماں کارہا دشوار نیست!

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

اہل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے حسب دستور العلم ایک خط کے ہمراہ بھیجے ہوئے آیا تھا۔ خیال تھا اسی وقت جواب لکھوں پھر کوئی فوری سفر پیش آگیا اور واپسی کے بعد بیمار ہو گیا۔ شعبان سے اب تک مسلسل علیل تھا اور علالت کے اثرات دماغ پر اب بھی باقی ہیں، تفصیل کیا عرض کروں، اس دفعہ

کافی پریشانی اٹھانی، کمی جیبوں سے عارضی طور پر پاکستان
کا ارادہ ہے کچھ بعید نہیں صحت نے اجازت دی تو
دو تین مہینوں کے بعد پہونچوں، انشاء اللہ اس وقت
آپ سے تفصیلی ملاقات ہوگی اور برسوں کی داستان
کو گھڑیوں میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی،

یوں آپ کو معلوم ہی ہے کہ ندوۃ المصنفین کی بنیاد
ہم نے یوں ہی ڈال دی تھی، دستوری انجمنوں میں نہیں
پڑا تھا، کام ہونا تھا یوں ہی ہے، ہر شخص کے کام کا ایک
انداز ہوتا ہے اور وہ اسی ڈھنگ سے اس کام کو انجام
دیتا ہے، بہرحال اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط
کی کاپی حاضر ہے، مفتی انتظام اللہ صاحب کہیں نظر
پڑ جائیں تو ان سے سلام فرما دیں۔ العلم براہ آتا ہے،
آپ کی صلاحیتِ کار اور قوتِ عمل کی داد دینی پڑتی
ہے مفتی انتظام اللہ صاحب کو چند کتب ارسال کی
گئیں تھیں جن کی رجسٹری کل واپس آگئی نہ معلوم
کیوں؟

ڈاکٹر عبدالغفور بسمل صاحب لاڑکانہ — الاسلام مل رہا ہے

آپ کی کہانی (بھائی جان) بہت دلچسپ ہے۔
یہ سلسلہ جاری رکھئے۔

بڑے شوق سے سن رہا ہے زمانہ

مولوی عبدالصمد خان صاحب سکھر — آپ کا پرچہ بابت

جنوری ۶۸ء کا وصول ہوا۔ پرچہ مذکور الصدر میں تاریخ
اسلام از سرِ نو لکھنے کی ضرورت کا اظہار جس پیرائے

میں ڈاکٹر سید معین الحق صاحب مدظلہ نے کیا ہے
وہ صرف داد کا ہی مستحق نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے کہ
ہم سب بڑی کوشش اس اہم مسئلہ پر توجہ کریں اور
ایسے اسباب فراہم کئے جائیں کہ یہ حاصل ہو سکے
یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا اہم بھی ہے۔

دوسرا مضمون مولوی محمد حسین خاں صاحب زبیری
کا قابل تحسین ہے جنہوں نے موقع سے توجہ فرمائی ہے
اکثر لوگوں نے اپنی ناواقفیت سے مجھ سے اس مسئلہ میں
جو اظہار خیال کیا تھا اس سے مجھے روحی صدمہ ہوا حالانکہ
میں نے کافی ان کی تسلی و تشفی کی تھی کہ سر سید مرحوم
کا احسان قوم پر بے حد ہے وہ اللہ پاک اور اس کے
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے و پکے عقیدتمندوں
میں سے تھے اور یہی سبب ہے کہ ان کے دل پر قوم
کے سنبھالنے و قابل بنانے کا جذبہ پیدا ہوا تھا اور قوم کا
وہ کام کر گئے ہیں کہ صدقہ جاریہ کے ثواب سے تاقیامت
مستفید ہو رہے ہیں۔

تیسرا مضمون حسن الاعظمی صاحب مدفیوضہ کا کہ
عربی کو انگریزی کی جگہ پاکستان میں ملنا چاہئے اور جو
خوبیاں و آسانی علم عربی کی ظاہر کی ہیں ان کو عمل میں
لانے کی سرجوڑ کوشش کرنی چاہئے۔ میری التجا ہے
کہ محض کسی پرچہ یا اخبار میں لکھ دینے سے کامیابی
نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے
عوام اور ہماری حکومت پر نقد پڑے کہ وہ
ابھی سے عربی کو اپنا کر انگریزی کو چھوڑ دیں۔

سرور حسین اے پی صاحب
جنرل سکریٹری گورنمنٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن کوئٹہ ڈویژن

میرا خیال ہے کہ مجھے تعارف کرانے کی اس سے زیادہ ضرورت نہیں کہ سنڈیمین اسکول کوئٹہ میں ٹیچر ہوں اور ابھی خاصی تفصیلی نشست کوئٹہ میں ہو چکی ہے۔

اس وقت یہ خط ارسال کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہم کوئٹہ میں ٹیچرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کرنا چاہتے ہیں، اور خیال ہے کہ اواخر اگست یا اوائل ستمبر میں انعقاد کیا جائے۔ اس سلسلے میں آپ کے مشورہ اور اعانت کی ضرورت ہے۔

۱۔ سہ روزہ کانفرنس۔ روزانہ دو اجلاس

۲۔ وہ ماہرین تعلیم جو پاکستان میں ترقی تعلیم کے ذرائع پر پیپر پڑھیں۔ کم از کم چار حضرات۔ اور جو تشریف لا سکیں ان کے پتے مطلوب ہیں۔

۳۔ سہ روزہ اجلاس کی تشکیل کس نوعیت سے کی جائے۔ اور طریق کار کیا ہو؟

میرے خیال میں اس سلسلے میں آپ سے زیادہ تجربہ اور واقفیت اور کوئی نہیں رکھتا۔ اس لئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ امید ہے کہ رہنمائی فرمائیں گے۔

مولوی احید الدین نظامی صاحب

۱۳ دو ہیل کھنڈ اخبار بریلی میں آپ کی بیگم صاحبہ (سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) کی کتاب "شبنم کے ہیرو" کا ریویو دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ ہم کو بالکل بھول گئے۔ بہرحال اب اس کی ایک کاپی بھیج دیں۔ "ذوالقرنین" کا بدایوں نمبر نکالا ہے اس کی ایک کاپی علیحدہ ڈاک سے ارسال ہے اس پر ریویو فرما دیجئے۔ رسالہ اب تو شاید تیار ہوگا۔ آپ کی ایجوکیشنل کانفرنس کا خطبہ صدارت پڑھا بہت عمدہ ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔

ظفر جاوید صاحب اسسٹنٹ ایڈیٹر
ایسٹرن اگزامنر۔ چٹاگانگ

آپ کا نوازش نامہ معہ مضمون ابھی ابھی موصول ہوا خوشی ہے کہ ۱۴ اگست کا ضمیمہ چھپ چکا ہے اور صرف [illegible] کے لئے پہلا صفحہ زیر ترتیب ہے۔ مضمون بہت اچھا ہے اس کو باقاعدہ ایڈٹ کر کے ایسٹرن اگزامنر اور ڈھاکہ کے پاکستان آبزرور میں شائع کرواؤں گا اور اگر ممکن ہوا تو اس کا ترجمہ بھی بنگلہ اور اردو اخبارات میں شائع کرانے کا انتظام ہو جائیگا۔ "العلم" کے پرچوں کا منتظر ہوں غالباً سہیل بھائی نے بھیجے گئے ہیں ان کے لئے کم از کم ایک ہفتہ لگے گا۔ آپ کی محبت بھری اور اطمینان بخش چٹھی کا شکریہ لیکن بھائی میں پاکستان آنے سے قبل تقدیر کا زیادہ قائل نہیں تھا لیکن اب تو تقدیر کا مسئلہ واضح بن کر رگ رگ میں پیوست ہو گیا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جلد ترقی عطا کرے اور میری [illegible]

کانفرنس کے محسن

(اپریل لغایت اگست ۱۹۵۵ء)

امداد منجانب گورنمنٹ آف پاکستان ۱۹۵۵ء		Rs 25,000/-
امداد منجانب حیدر آباد ٹرسٹ کراچی ۵۶-۱۹۵۵ء		〃 300/-
سید محمد زین العابدین صاحب رضوی کراچی		〃 150/-
مسٹر عبدالسلام فاروقی	〃	〃 125/-
مسرز ایچ غلام محمد اینڈ برادرز	〃	〃 125/-
محمد عالم صاحب	〃	〃 125/-
جناب محمد طاہر محسن علی صاحب	〃	〃 105/-
ایس۔ ایم یوسف صاحب دہلوی	〃	〃 100/-
محمد عزیز احمد صاحب	〃	〃 75/-
محمد انعام صاحب سوداگر بیرٹ روڈ	〃	〃 50/-
مسرز ذوالفقار اینڈ سنز	〃	〃 50/-
مفتی رشید الدین صاحب	〃	〃 30/-
مسٹر خورشید حسن ریڈیو والے	〃	〃 30/-
جناب محمد شفیع صاحب	〃	〃 30/-
محمد اسحاق خان صاحب خیر پور میرس		〃 25/-
پیرزادہ احتشام الدین صاحب	کراچی	〃 25/-
جناب منیر الدین صاحب	〃	〃 25/-
جناب ایس ایم سعید صاحب	〃	〃 25/-
چودھری محمد انور صاحب ایڈوکیٹ	〃	〃 25/-
مسرز محمد انعام اینڈ کو		〃 [illegible]
محمد طاہر مشیع علی صاحب		〃 [illegible]
خان بہادر مولوی شاہ عالم خانصاحب	پٹیالہ	〃 [illegible]

مطبوعات

ادارۂ تصنیف و تالیف

(اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

سرسید علیہ الرحمۃ اور ان کے رفقاء اور جانشینوں کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کی بنیاد ادب صالح کی تدوین واشاعت پر رکھی گئی تھی۔ سرسید علیہ الرحمۃ کے مشن کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ کام ایجوکیشنل کانفرنس نے کیا۔ یہ کانفرنس سرسید علیہ الرحمۃ نے ۱۸۸۶ء میں قائم کی اور متحدہ ہندوستان میں اس کی تعلیمی سرگرمیوں سے عوام بخوبی واقف ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۱ء اس ادارہ کا احیاء کراچی (پاکستان) میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نام سے کیا گیا۔ کانفرنس کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ "العلم" شائع ہوتا ہے جس میں علمی، ادبی، اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ کانفرنس کے ادارۂ تصنیف و تالیف سے رسالہ "العلم" کی اشاعت کے علاوہ علمی و تعلیمی کتابیں بھی شائع کی جارہی ہیں۔ چند کتابوں کے متعلق معلومات درج ذیل ہیں۔

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں

مصنفہ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی۔ یہ کتاب علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم کے آخری زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس میں علامہ نے مسلمان امراء و سلاطین کی رواداری اور وسیع القلبی کے ان نقوش کو اجاگر کیا ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ تھے اقوام یورپ اور بھارت سے بادیہ نشینان عرب کے سماجی اور کاروباری تعلقات تحصیل و ترویج علوم میں متحدہ سعی، سلاطین و امراء و علمائے اسلام کی وہ کوششیں جو انھوں نے ہندو رعایا میں ترویج علوم و فنون کے سلسلہ میں کیں بالتصریح درج ہیں۔ عربی و فارسی تصنیفات و تالیفات جو اہل ہنود کے رشحات قلم کی رہین منت ہیں مختلف علوم و فنون کے زیر عنوان مع مختصر حالات مصنفین درج کی گئی ہیں۔

کتاب ہر کتب خانہ اور علم دوست گھر میں رکھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۔/۲ روپے

(ا)سلامی نظریۂ تعلیم

بہ زبان انگریزی۔ مصنفہ
میجر شمس الدین صاحب

(س)ابق وزیر تعلیم بہاولپور و صدر آل پاکستان ایجوکیشنل (کانف)رنس کراچی۔ اس تصنیف میں مصنف نے تعلیم کے (مت)علق اسلامی نظریہ کو واضح کیا ہے۔ تحصیل علوم و فنون کے (مت)علق قرآنی احکام درج کئے گئے ہیں۔ اسلامی نظریات (اور) موجودہ نظریات سائنس سے تطبیق دی گئی ہے۔ آغاز (ا)سلام سے مسلمانوں نے جو کوششیں مختلف علوم و فنون (کی) ترویج کے لئے کی ہیں ان کو ہر صنف علم و فن کے (ذ)یل میں بیان کیا گیا ہے۔ علماء و فضلا نے اسلام کے مختصر حالات، ان کی تصنیفات پر اجمالی نظر (او)ر علوم و فنون میں مسلمانوں کی علمی جدوجہد سے (گر)اں قدر اضافہ کی تصریح اس کتاب کی ممتاز خصوصیات (ہ)یں۔ قیمت [illegible]

(م)سلم خواتین کی تعلیم

مصنفہ

(مو)لوی محمد امین زبیری
(س)ابق ناظم دفتر تاریخ بھوپال
(س)ابق اڈیٹر ظل السلطان بھوپال

مولوی محمد امین زبیری برصغیر پاک و ہند کے مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ آپ کی بلند (پا)یہ متعدد تصانیف منصۂ شہود پر آکر ملک کے (گ)وشہ گوشہ سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مسلم خواتین (کی) تعلیم بجائے خود ایک ضخیم اور مستقل تصنیف کی مستحق (ہ)ے۔ زبیری صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر قوم اور ملک کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ عہد حاضر میں اس موضوع کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ عہد اسلامی میں مسلمان خواتین کی تعلیم جس نہج پر چل رہی تھی اور اس سے جو نتائج پیدا ہوئے ان پر اس تصنیف میں دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو آئندہ نسلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے اور صنف نازک کو عملی جدوجہد کے لئے تیار کرنے میں یقیناً بڑی معاون ثابت ہوگی۔ زیر طبع ہے۔ قیمت [illegible]

اسلامی نظام تعلیم

مولفہ

مسٹر سعید احمد رفیق
پروفیسر گورنمنٹ کالج کوئٹہ

مولف نے اس کتاب میں برصغیر پاک و ہند کے قدیم اسلامی نظام تعلیم پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جس طور پر تعلیم نے عہد بہ عہد ترقی کی اور نظام تعلیم نصاب تعلیم اور فنون لطیفہ نے جو ارتقائی صورت اختیار کی اور برصغیر پاک و ہند کے مختلف حکمرانوں کے عہد میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف عام واقفیت ہی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اسلاف کے نقوش قدم مستقبل کے لئے لائحہ عمل مقرر کرنے میں رہبری کرتے ہیں۔ کتاب ۳۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ تعارف ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ پیش لفظ خود مصنف کا زور قلم کا نتیجہ ہے۔ زیر طبع ہے۔ قیمت [illegible]

اغراض و مقاصد

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

دفعہ ۳۔ پاکستان میں ہر قسم کی تعلیمی، علمی، ثقافتی اور لسانی ترقی و اصلاح کی تدابیر کو عمل میں لانا

دفعہ ۴۔ مقاصد کانفرنس کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے جائیں گے:۔

(الف) بنیادی حقوق کے پیش نظر اہل پاکستان کی تعلیمی، ثقافتی، لسانی ترقی و اصلاح اور تحفظ کیلئے مناسب تدابیر اختیار کرنا اور تعلیمی اداروں کیلئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل کرنے کی سعی کرنا۔

(ب) ہر علم و فن کی تصنیف و تالیف اور تراجم نیز درسی کتابوں کی تدوین کے لئے ذرائع اختیار کرنا۔

(ج) زیادہ سے زیادہ تعداد میں تعلیم گاہوں کے قیام اور ان کی تنظیم میں مدد کرنا

(د) تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے مناسب وسائل اختیار کرنا

(ہ) قدیم اسلامی نظام و طرز تعلیم کو ضروریات زمانہ کی روشنی میں مرتب و مدون کرنا

(و) ایسے لائق اساتذہ اور استانیوں کو تیار کرنا جو زمانہ کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ مذہبی تعلیم و تربیت کے اصول سے بھی واقف ہوں

(ز) سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں صحیح قسم کی مذہبی تعلیم کو رائج کرانے کی کوشش کرنا

(ح) ابتدائی تعلیم عام، مفت اور لازمی کئے جانے کی کوشش کرنا۔

(ط) تعلیم کے مختلف مدارج میں مضامین سائنس اور صنعت و حرفت کے شمول کی سعی کرنا۔

(ی) اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فوجی تعلیم کو بحیثیت لازمی کرانا اور حب وطنی [illegible] کی حیثیت سے تعلیم کا ایک نصاب میں شامل کرنا۔

(ک) عربی زبان کی تعلیم کو فروغ دینے اور لازم کرانے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔

(ل) پاکستان کے مختلف صوبوں میں تعلیمی ضروریات اور ان کی ترقی کا جائزہ لینا۔

(م) کانفرنس کے صدر دفتر میں ایک مرکزی کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کرنا۔

(ن) مقاصد کانفرنس کے حصول کیلئے صوبوں کی کانفرنسیں قائم کرنا ان کے سالانہ جلسوں کے انعقاد میں ہر قسم کا تعاون کرنا اور ان سے مستقل رابطہ رکھنے کے لئے رسالہ یا اخبار جاری کرنا۔

(س) ہر سال آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد کرنا۔

(ع) تعلیم بالغان کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس قائم کرانا، ناخواندگی دور کرانے کیلئے [illegible] تدابیر اختیار کرنا۔

(ف) جسمانی تربیت کو تعلیمی نصاب میں لازمی طور پر داخل کرانا۔

خواجہ سید الطاف علی بریلوی نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر [illegible] ناظم آباد [illegible] کراچی سے شائع کیا

ایسا تاریخی مواد نہیں تھا جس کو اطمینان بخش طریقے پہ ان کی معلومات کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے عہد کے مورخ جن کو یہ لوگ شک کا دور کہتے ہیں تعصب کا شکار رہے۔ اگر یہ مشرق کی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کرتے یا خود اپنی تہذیب کے سرچشمے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تو شاید اس قسم کے غلط نظریات سے اپنی فکر کو گندہ نہ کرتے۔ لیکن کلیسا کے استبداد اور عیسائیت کے خلاف ان مجاہدین نے خود انہی پتھروں سے ٹھوکر کھائی جن کو وہ راستے سے ہٹانا چاہتے تھے یعنی وہ تعصب کے زہریلے اثرات میں مبتلا ہو گئے۔

طبری کے قائم کیے ہوئے طرز کو بعد کے بعض مورخوں نے بھی اختیار کیا ان میں ابن اثیر خاص طور پر قابل ذکر ہو۔ اس طرز کے علاوہ دوسرے طریقے بھی اختیار کیے گئے تھے۔ مختلف مسائل کو عنوان بنا کر واقعات کو ان کے تحت جمع کیا گیا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ علاقائی بنیاد پر واقعات کی ترتیب کی جائے جیسا کہ بلاذری نے فتوح البلدان میں کیا۔ ایک اور طریقہ یہ ایجاد ہوا کہ طبقات کو پیش نظر رکھا جائے جیسا کہ ابن سعد نے کیا۔

تاریخ نویسی کے سلسلے میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قابل ذکر اور عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے تاریخی شہادت کی جانچ اور تنقید کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی ضرورت اور ابتدا تاریخ نہیں بلکہ حدیث کے مطالعے کے سلسلے میں ہوئی لیکن خوش قسمتی سے تاریخ کی تنقید بھی قریباً انہی اصولوں پر قائم کی گئی جو حدیث کے لیے وضع کیے گئے تھے اور ابتدا میں حدیث اور تاریخ کے عمل کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ اس سلسلے میں شبلی نعمانی کے چند فقرے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے وہ لکھتے ہیں:

"و دیگر نفاست علم تاریخ آنست کہ علم حدیث . . . در تنقید روایت و تعریف رواۃ و ماجرائے ورود احادیث و معاملات غزوات و جہاد حضرت مصطفیٰ علیہ السلام و در تقدیم و تاخیر ایام ناسخ و منسوخ احادیث بعلم تاریخ متعلق است و ازیں جہت است کہ علم حدیث با علم تاریخ تعلق تام است ائمہ حدیث گفتہ اند کہ علم الحدیث و علم التاریخ توامان۔ کہ اگر محدث مورخ نباشد او را از حالات حضرت مصطفیٰ و معاملات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کہ رواۃ احادیث در اصل ایشان اند علمی و خبرے نباشد و کیفیت اخلاص مخلصان صحابہ از غیر مخلصان و ملتزمان صحابہ از غیر ملتزمان روشن نبود و ہر گاہ محدث مورخ نباشد معاملات مذکورہ مرتب نشود و امام حدیث نتواند بود و حق بیان احادیث نتواند نمود۔" (تاریخ فیروز شاہی)

احادیث کی صحت جانچنے کا سلسلہ [illegible] جاری رہا لیکن اس سلسلے میں [illegible] لیے جن [illegible]